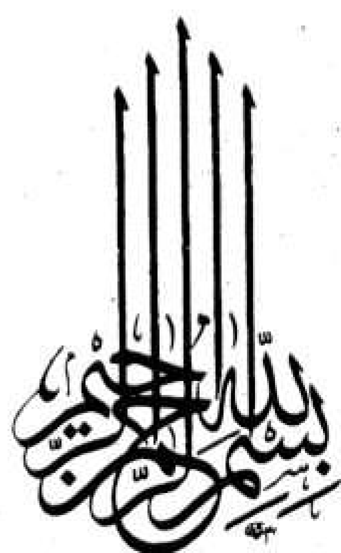
خطباتِ
حکیم الامّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240



فضائل صوم و صلوٰۃ

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۱۰

فضائل صوم وصلوٰۃ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ

ترتیب مواعظ

منشی عبدالرحمٰن خاںؒ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک، فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

فضائل صوم وصلوٰۃ

تاریخ اشاعت..........................محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
ناشر..........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت......................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان

ادارہ اسلامیات.........انار کلی.........لاہور　　دارالاشاعت.......اُردو بازار..........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.....لاہور　　ادارۃ الانور.......نیوٹاؤن..........کراچی
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار .... لاہور　　مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار......پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K　119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE　BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۱۰ ''فضائل صوم وصلوٰۃ''
جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ بتوفیقہ تعالیٰ خطبات کی تمام جلدوں میں احادیث کی تخریج حاشیہ میں اور ساتھ ہی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ دیدیا گیا ہے۔
ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے تخریج کا کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے کرایا۔
فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ العالی نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جون 2007ء

اجمالی فہرست

عسیٰ ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجاً خیرا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عٰبدات سائحات ثیبت وابکارًا. (التحریم:۵)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْآن . (البقرہ:۱۸۵)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْآن . (البقرہ:۱۸۵)

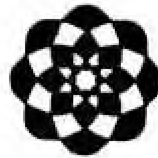
یایها الذین امنوا کتب علیکم الصیام الخ(البقرہ:۱۸۳)

کلو واشربوا هنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیة (الحاقہ:۲۴)

قد افلح من زکها وقد خاب من دسها (الشمس:۹،۱۰)

یرید الله بکم الیسر ولایرید بکم العسر ولتکملوا العدة الخ (البقرہ:۱۸۵)

فہرست عنوانات



الصلوٰۃ

نماز کے متعلق یہ وعظ ۱۱ رجب ۱۳۳۷ھ کو مسجد شاہ پیر محمد صاحبؒ متصل گومتی ندی واقع لکھنو تخت پر کھڑے ہو کر فرمایا، جو پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ تعداد سامعین تخمیناً دو ہزار تھی۔ محمد یوسف بجنوری ولد مردان علی نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ.اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی. (الاعلیٰ:١٤،١٥)

تمہید

یہ دو آیتیں ہیں جو اس کے قبل پرسوں کے بیان میں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ وہ مضمون ناتمام رہ گیا تھا اس لئے اس کا تتمہ اس وقت بیان ہوتا ہے اور اتفاق وقت سے وہ اس انجمن کے مناسب بھی ہے میں نے اس وقت دو آیتیں تلاوت کیں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی دوسری وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی. پہلی آیت کے متعلق پرسوں بیان ہوا تھا۔ دوسری آیت کا بیان رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت عرض کیا جائے گا۔

اس دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے آیت کے ختم پر فصلّٰی فرمایا جس کے معنی ہیں نماز پڑھی۔ اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں نماز کی فضیلت مذکور ہے اور اس انجمن کی بھی یہی غرض ہے۔ چنانچہ مولانا کے بیان (لکھنو میں ایک انجمن ہے جس کے بہت سے مقاصد ہیں ان میں سے اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بذریعہ واعظین کے لوگوں کو نماز کی تحریک کی جائے اور انجمن کی جانب سے ناواقفوں کو نماز سکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ حضرت والا کے وعظ شروع

کرنے سے پیشتر انجمن کے ارا کین میں سے ایک مولوی صاحب کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے انجمن کی بعض کارروائیاں لوگوں کو سنائی تھیں اور انجمن کا اعلیٰ مقصد نماز کی تعلیم اور اس کا اہتمام ہونا ظاہر کیا تھا۔ حضرت والا نے بھی حسب موقع نماز ہی کے متعلق بیان فرمایا۔ حضرت کی تقریر میں مولانا کے لفظ سے وہی صاحب مراد ہیں جنہوں نے انجمن کی کارروائی سنائی تھی۔ غالباً یہ وعظ بھی انجمن ہی کی تحریک سے ہوا تھا۔ گو کہ اہل انجمن نے حضرت والا سے خاص اسی بیان کے لئے نہ کہا تھا لیکن حضرت والا نے خود ہی حسب موقع اس بیان کو اختیار فرمایا تھا۔ ۱۲ جامع) سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ پس یہ مضمون موقع کے مناسب ہوگا۔

اسرار کلام الٰہی

ظاہراً یہ دونوں آیتیں مختصر ہیں مگر کلام اللہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ آیتیں جامعیت میں تام ہوں گی۔ ان کے اندر کسی قسم کی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے الفاظ کے اختصار پر نظر نہ کی جائے بلکہ اس کی حقیقت میں غور کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کے کلام کی خصوصیت ہے کہ نہایت مختصر الفاظ میں بڑے بڑے مہمات پر تنبیہ کر دیا ہے۔ پھر کمال یہ کہ وہ اختصار مطلب سمجھنے میں مخل نہیں ہوتا۔ گو حق تعالیٰ کے کلام میں بعض کلمات ایسے بھی ہیں جن کی مراد ہم کو معلوم نہیں۔ مگر ایسے کلمات صرف وہی ہیں جن کے متعلق عام افادہ نہیں ہے اور نہ ان کے اندر احکام کا بیان ہے بلکہ ان میں خاص خاص اسرار ہیں جو حضور کو منکشف کر دیئے گئے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ کنور مخفیہ میں سے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی جمہور کے نزدیک ان کا انکشاف نہیں ہوا لیکن چونکہ عام افادہ ان کے متعلق نہیں ہے اس لئے ان کے مخفی رہنے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ غرض کہ کلام اللہ میں اس قسم کے کلمات بھی موجود ہیں اور اس کے اندر بعض مضامین ایسے بھی ہیں کہ وہ بالکل تو مخفی نہیں ہیں مگر ہیں غامض کہ ہر شخص کا فہم ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی توضیح حضرات مجتہدین نے کر دی۔ ہاں جو باتیں محض عقائد یا ترغیب و ترہیب کے متعلق ہیں وہ بہت ہی سہل ہیں۔ ان میں کوئی غموض نہیں۔ کسی کو ان کے سمجھنے میں دقت واقع نہیں ہوتی۔ کلام اللہ ان تمام اقسام پر مشتمل ہے۔

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حق تعالیٰ تو قرآن کی نسبت یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو آسان کر دیا ہے پھر اس کے اندر امور مخفیہ و غامضہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آسان کرنے سے یہ مراد ہے کہ ہر حصہ سہل ہو۔ جو جزو سہل ہے اس کو خود بیان فرما دیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ ، کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے۔ للذکر کو جو بڑھایا تو اسی وجہ سے کہ یہ صرف نصیحت حاصل کرنے کے اعتبار سے سہل ہے۔ اگر مطلقاً سہل ہوتا تو صرف ولقد یسرنا القرآن فرماتے للذکر کی قید نہ بڑھاتے۔

اقسام کلام الٰہی

خوب سمجھ لیجئے کہ کلام اللہ میں دو قسم کے مضمون ہیں۔ ایک تو مضمون ہے تذکیر کا۔ قرآن کے جتنے حصہ میں یہ مضمون ہے وہ تو نہایت آسان ہے کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ولقد یسرنا القرآن للذکر (اور ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کر دیا ہے) اس بات کو صاف طور پر بتلایا جا رہا ہے کہ وہ حصہ قرآن کا اتنا سہل کیا گیا ہے کہ ہر شخص اس سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے اور واقعی وہ حصہ ہے بھی ایسا ہی کہ کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی مثلاً قیامت کا ہونا، عذاب، ثواب کا پایا جانا، جنت و دوزخ کا موجود ہونا۔ اسی طرح اور عقائد ہیں کہ ان کو ایسی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے بتلایئے تو کہ ان امور کے سمجھنے میں کسی کو کیا دقت ہے اور انہی کا سمجھانا منکر کو دلائل عقلیہ سے ضروری بھی ہے۔

رہے باقی احکام ان کا ایسے دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دین کے دو جزو قرار دیئے جاتے ہیں۔ ایک اصول ایک فروع۔ اصول تو وہی ہیں جن کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ پس وہ ایسے سہل کئے جائیں کہ کسی کو بھی ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ فروع جن کا دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں۔ ایک تو قرآن میں یہ مضمون ہے اور دوسرا مضمون ہے احکام غامضہ کا جس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

قوت استنباطیہ

ہر شخص کا فہم اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کیلئے خاص فہم کی حاجت ہے۔ قرآن کے جتنے حصوں میں یہ مضمون ہے وہ مشکل ہے اور احکام غامضہ کا سمجھنا اور ان میں استنباط کرنا تو کیسے مشکل نہ ہوتا جبکہ معمولی خبروں تک کا سمجھنا دشوار ہے۔

چنانچہ کلام اللہ میں حق تعالیٰ نے منافقین کی شکایت فرمائی ہے اس بناء پر کہ وہ لوگ امن وخوف کی خبریں سن کر مشہور کر دیتے تھے اور رسول اور اولی الامر کے حوالے ان کو نہیں کرتے تھے چنانچہ ارشاد ہے:

وذا جآء هم امر من الامن اوالخوف اذا عوابه ولو ردوه الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستبنطونه منهم.

کہ جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یاڈر کی پہنچتی ہے تواس کومشہور کردیتے ہیں اوراگراس کورسول صلی اللہ علیہ وسلم اوراپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تواہل تحقیق ان میں سے اس کی تحقیق کر لیتے (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یانہیں)

سومنافقین کی یہ کیفیت تھی کہ جیسی خبران کوپہنچتی مشہور کردیتے۔یہ نہ خیال کرتے کہ کون سی خبرعوام میں شائع کرنے کے قابل ہے اورکونسی نہیں۔سب خبروں کویکساں شائع کردیتے حق تعالیٰ اس بات پران کی اس آیت میں شکایت فرماتے ہیں۔ **اذاجآء هم امر من الامن اوالخوف اذا عوبه**۔(جب انکے پاس امن یاخوف کی کوئی خبرپہنچتی ہے اسکومشہور کردیتے ہیں) آگےان کومشورہ دیتے ہیں **ولو ردوه الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستبطونه منهم**، کہ ان کویوں چاہیے تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اوراولی الامر (یعنی جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے اوروہ صاحب اختیاراورتجربہ کارہیں ان) کے حوالے کردیتے۔ پس جن میں قوت استنباطیہ ہے وہ ان خبروں میں استنباط کرتے کہ آیا یہ قابل اشاعت ہیں یانہیں اور پھر یہ منافقین ان کی رائے کے موافق عمل کرتے۔

پس جب معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اورہرشخص اس کااہل نہیں بلکہ اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے توجواحکام غامض اوردقیق ہیں۔ان میں کیسے ہوسکتا ہے کہ ہرشخص ان کوسمجھ لے اوراہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی اس کوضرورت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ احکام کے سمجھنے اوراس کے اندراستنباط کرنے کوعام طور سے جائزنہیں قراردیا گیا کہ ہرشخص اس کوکرے۔پس یہ حصہ قرآن شریف کاغامض ہے اوردوسراجوتذکیر کاحصہ ہے جس میں ترغیب ترہیب اورعقائد کابیان ہے اس میں کچھ خفاءنہیں ہرشخص اس کوسمجھ سکتا ہے۔

قلبی توجہ کی ضرورت

اسی طرح احکام بھی درجہ اجمال میں آسان ہیں۔لیکن درجہ تفصیل میں دشوارہیں۔دیکھئے ایک توکلام اللہ میں یہ ہے کہ نماز پڑھو۔اس کے سمجھنے میں توکچھ اخفاءنہیں۔یہ تواجمالی درجہ ہے

اور ایک نماز کی تفصیل ہے کہ لاحق کے کیا احکام ہیں مسبوق کا کیا حکم ہے علیٰ ہذا۔ تو اس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے خاص فہم کی حاجت ہے۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ قرآن شریف میں ذکر کا حصہ نہایت آسان ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لئے ایک چیز کی اور ضرورت ہے۔ وہ کیا ہے، توجہ۔ جب تک توجہ نہ ہو اس وقت تک اس کا کوئی نفع نہیں ہوسکتا گو وہ کتنا ہی آسان ہو اگر کوئی شخص بغیر توجہ کے ان آیات کا ترجمہ دیکھے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھے گا بلکہ توجہ کے بغیر تو اپنی بول چال بھی نہیں سمجھتے۔

مثلاً بازار جایئے وہاں صدہا حکایات کان میں پڑتی ہیں جب لوٹ کر آتے ہیں تو خبر بھی نہیں رہتی کہ کیا سنا تھا۔ حتیٰ کہ وہ حکایات سوچنے سے بھی یاد نہیں آتیں۔ وجہ یہی ہے کہ ادھر توجہ نہیں۔ اس لئے اگر کوئی ترجمہ جانتا ہو مگر التفات نہ ہو تو قرآن شریف کے حصہ ذکر سے بھی پورا نفع حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے حق تعالیٰ کسی جگہ تو ارشاد فرماتے ہیں۔ **لیدبروا ایاته** کہ اس کی آیات میں تدبیر کریں۔ اور کسی جگہ فرماتے ہیں **لیتذکر اولوا الالباب** کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باوجود آسان ہونے کے تدبیر کی حاجت ہے۔ اس کا نفع بدون اس کے پورا حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ میں نے اس کو مثال سے واضح کردیا۔ قرآن شریف کے اندر ایک موقع پر اسی کو تصریحاً فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے:

ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب اوالقی السمع وهو شهید

کہ اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو (فہیم) دل رکھتا ہے یا (اگر زیادہ فہم نہ ہو) تو متوجہ ہو کر کان (ہی) لگا دیتا ہو۔

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ یہ نفع کا موقوف علیہ ہے کہ قلب فہیم سے کام لے یا متوجہ ہو کر سنے کہ بدون اس کے نفع نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہو گیا کہ قرآن کا وہ حصہ مشکل ہے جس میں ان احکام کا بیان ہے جن کے اندر اجتہاد کی ضرورت ہے۔

آج کل کے مجتہد

بعض مدعی اجتہاد اس زمانہ میں ایسے ہیں کہ صرف ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرتے ہیں اجتہاد کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تحریف کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے یہ رائے دی تھی کہ اب وضو کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے کہ وضو سے مقصود تطہیر اعضا ہے اور ہم لوگ اس زمانہ

میں ویسے ہی صاف ستھرے رہتے ہیں۔ اس لئے اب کیا ضرورت ہے وضو کی۔ پہلے زمانہ میں گردوغبار پڑتا رہتا تھا۔ میلے کچیلے رہتے تھے اس لئے وضو کی ضرورت تھی۔ اب ہم آئینوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ گردوغبار پاس کو بھی نہیں آتا۔ تو اب وضو کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ان صاحب نے اجتہاد کیا۔ یا تو اس قدر اجتہاد کا زعم اور یا اس طرف التفات بھی نہیں۔

چنانچہ مولوی محمد حسین صاحبؒ ایک بیرسٹر کا قصہ سناتے تھے کہ اس نے ان سے یہ کہا کہ علماء کو چاہیے کہ جمع ہوکر سود کی حلت کا فتویٰ دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ علماء کے گھر کی بات تھوڑا ہی ہے کہ جیسے چاہیں پھیرلیں۔ سود کی حرمت تو کلام اللہ میں منصوص ہے۔ کلام اللہ کے خلاف کون جرأت کرسکتا ہے اس پر آپ حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا سود کی حرمت قرآن شریف میں ہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ مولویوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔

دیکھئے یہ حال ہے ان لوگوں کی اجنبیت کا قرآن سے کہ اعلیٰ درجہ کی لیاقت کے بیرسٹر تھے اور مولوی بھی کہلاتے تھے مگر اتنی خبر نہ تھی کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے لیکن چونکہ مسلمان تھے اس وجہ سے معلوم ہونے کے بعد اپنے منہ پر طمانچے مارے اور بہت نادم ہوئے۔ سو آج کل کے عقلاء دعویٰ تو اجتہاد کا کرتے ہیں مگر ان کی اجنبیت کا قرآن سے یہ حال ہے۔

ایک اور قصہ ہے کسی معقولی کا کہ ان سے ایک دفعہ لوگوں نے کہا کہ کچھ بیان کیجئے۔ آپ نے نماز کا بیان شروع کیا۔ کچھ یاد تھا نہیں۔ بہت سوچ کر آپ نے فرمایا کہ آج کل لوگوں کا کیا حال ہوگیا ہے کہ نماز نہیں پڑھتے حالانکہ قرآن شریف میں ہے **من ترک الصلوٰۃ متعمدًا فقد کفر**۔ اس پر کسی نے ان حضرت کو ملامت کی کہ آپ نے اسے (یعنی حدیث شریف کو) قرآن شریف میں کیسے بتلادیا۔ تو آپ تعجب سے فرماتے ہیں کہ کیا یہ قرآن کی آیت نہیں ہے۔

یہ حالت رہ گئی ہے اس زمانہ میں۔ یہ بھی خبر نہیں کہ یہ قرآن کی آیت ہے یا حدیث ہے۔ اس حالت پر اندیشہ ہے کہ قیامت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں نہ فرمانے لگیں:

یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورًا.

کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو ترک کردیا تھا۔

قرآن نہ پڑھنے کا بہانہ

معنی سے تو غفلت تھی سہی وہ جو سہل چیز ہے (یعنی الفاظ قرآن) اس سے بھی غفلت ہوتی چلی

جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل کے بہت سے عقلا کی رائے ہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ہی فضول ہے۔

رام پور کا قصہ ہے ایک صاحب کا بچہ قرآن پڑھتا تھا۔ ان کے ایک دوست نے جو انگریزی کے بہت حامی تھے کہا کہ آپ اس لڑکے کو انگریزی پڑھایئے۔ ان کے دوست نے اس پر انکار نہیں کیا بلکہ یوں کہا کہ یہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ آدھا تو ہو چکا ہے آدھا اور رہا ہے۔ وہ ختم ہو جاوے تو انگریزی شروع کراؤں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آدھا کتنے دنوں میں پڑھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو برس میں ۔تو آپ کہتے ہیں کہ دو برس تو ضائع کر ہی چکے۔ اب اور دو برس کیوں ضائع کرتے ہو۔

ان عقلاء نے کلام اللہ نہ پڑھانے کا ایک بہانہ نکالا ہے کہ کہتے ہیں، اجی صاحب بدون مطلب سمجھے ہوئے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اگر پڑھا جاوے تو معنی مطلب کے ساتھ پڑھا جاوے۔ صرف الفاظ رٹنے سے کیا نتیجہ۔ اپنے نزدیک بڑی خیر خواہی کی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف نہ پڑھانے کا بہانہ ہے ۔مقصود تو ہے نہ پڑھانا اور اس کا بہانہ یہ تلاش کیا۔ اگر بہانہ نہیں تو ترجمے تو شائع ہو گئے ہیں پھر ترجمہ سمیت کیوں نہیں پڑھاتے۔ ہاں اس وقت بہانہ نہ سمجھا جاتا جب کہ یہ لوگ ویسے تو نہ پڑھاتے مگر ترجمہ کے ساتھ پڑھاتے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہ حضرات نہ ویسے پڑھاتے ہیں نہ ترجمہ سے پڑھاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس نہ پڑھانا ہی مقصود ہے۔ اور یہ صرف بہانہ ہے نہ پڑھانے کا۔

ترجمہ پڑھنے کا اصول

ہاں ترجمہ کی نسبت میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ترجمہ پڑھایا جاوے تو خود مطالعہ کرنے کی اجازت نہ دی جاوے بلکہ کسی واقف کار سے سبقاً سبقاً پڑھا جاوے اور جو مضامین دقیق ہوں ان کے اجمال پر اکتفا کیا جاوے ۔معلم بھی ان کی تفصیل نہ بیان کریں بلکہ اجمال کے ساتھ ان کا مطلب بیان کر دیں۔ تفصیل کی کاوش نہ کریں۔ جتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے اس کے بتلانے پر اکتفا کریں اور خود مطالعہ کر کے امتحان دے دیا کرو۔ استاد سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کہا جاوے کہ اقلیدس پیچیدہ ہے۔ اس لئے استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف ایسا نہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ قانون بھی تو ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ قانون ہی کی کتاب لیجئے اور خود اس کا مطالعہ کیجئے ضرور آپ اس کے سمجھنے میں غلطی کریں گے اور جو استاد سے پڑھے ہوں وہ غلطی نہ

کریں گے۔ قانون دان ہی جانتا ہے قانون کی باتوں کو۔

قانون کتاب کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک امر کے متعلق ایک جگہ اجمالی ہوتا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں بھی ایسا واقع ہوا ہے کہ ایک حکم کو دو مقام سے تعلق ہے۔ ایک موقع میں تو اس کو اجمالاً بیان کیا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی ہے جب تک تفصیل کے موقع کو سمجھے ہوئے نہ ہوگا تو یہاں کیا سمجھے گا اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ تفصیل اس موقع پر ہے اور کچھ دوسرے موقع پر۔ پس اس کے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کہ دونوں موقعوں کا علم ہو اور یہ بات واقف کار ہی جان سکتا ہے کہ اس کا ذکر کتنی جگہ ہوا ہے۔ خود مطالعہ کرنے والا کیا جانے گا۔ بس یہ ہوگا کہ ایک موقع میں مجمل دیکھ کر اس کو الجھن پیدا ہوگی اور شکوک واقع ہوں گے اور یہ کچھ کلام اللہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر فن میں یہی ہے۔

مثلاً فقہ ہی ہے۔ اس میں ایک مسئلہ ہے جس کا تعلق دو باب سے ہے۔ ایک باب میں مجمل ہے اور ایک باب میں مفصل ہے۔ تو جب تک دونوں موقعوں سے واقفیت نہ ہوگی تو کیا خود سمجھ سکے گا اور کیا دوسروں کو سمجھا سکے گا۔

ایک شافعی المذہب نے مجھ سے فقہ شافعی پڑھنا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے فقہ شافعی پڑھا ہی نہیں۔ شاید کوئی موقع ایسا ہو کہ ایک مسئلہ کا تعلق دو جگہ سے ہو اور ایک موقع پر اجمال ہو اور دوسری جگہ اس کی تفصیل ہو اور میں اس تفصیل سے واقف ہوں نہیں۔ پس میں غلطی کر بیٹھوں۔ اس لئے میں نے صاف کہہ دیا کہ آپ شافعی المذہب سے پڑھئے۔ پس یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ خود دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔ کسی محقق عالم سے پڑھ لینا چاہیے۔ لیکن اس کے لئے اگر فرصت نہ ہو تو یہ تو نہ ہو کہ الفاظ کو بھی بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے کیونکہ فائدہ قرآن شریف کا معانی کے ساتھ تو خاص نہیں۔ فائدہ کے اور اقسام بھی ہیں۔ ایک قسم کے انتفاء سے مقسم کا انتفاء تو نہیں ہوتا (مطلب یہ ہے کہ معنی سمجھنے کا فائدہ ہے۔ نرے الفاظ میں اس کے جاتے رہنے سے الفاظ قرآن کا دوسرا فائدہ تو مثلاً ثواب کہیں نہیں جاتا رہا)۔

ہم کو معلوم ہے کہ بعض انگریزی خواں اقلیدس کی عبارت یاد کر کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مطلب کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ بتلایئے کہ اس صورت میں اقلیدس کے محض الفاظ یاد کرنے مفید ہوئے یا عبث ہوئے۔ ہر شخص اس کو مفید ہی کہے گا۔

فائدہ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ پاس ہوجائے خواہ مطلب کچھ بھی نہ سمجھے اور یہ نفع صرف الفاظ یاد کرنے سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قرآن شریف کے ساتھ ہمارا یہ برتاؤ نہیں۔ اس کے الفاظ کا یاد کرنا محض بیکار سمجھتے ہیں۔

تلاوت کے فوائد

اب قرآن شریف کے الفاظ پر جو ثمرہ مرتب ہوتا ہے اس کو بتلاتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ قرآن شریف جب کوئی پڑھتا ہے تو ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو جس نے کھٰیٰعص ایک مرتبہ کہا تو اس کے نامہ اعمال میں پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ تو کیا یہ فائدہ نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ نفع کو منحصر سمجھتے ہیں نفع عاجلہ میں۔ جب اسے نہیں دیکھتے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کچھ نفع نہیں۔ حالانکہ نفع اس میں منحصر نہیں۔ ایک اور نفع بھی ہے جس کو نفع آجلہ کہتے ہیں یعنی آخرت کا نفع جس کو ثواب کہتے ہیں۔ مگر چونکہ نفع عاجلہ عاجلہ مشاہد ہے کہ وہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لئے اس کو تو نفع سمجھتے ہیں اور ثواب ملنا مشاہد نہیں اس لئے اس کو تو نفع نہیں خیال کرتے۔

چنانچہ بعض خواص تک کی زبان پر یہ آجاتا ہے جب کہ وہ کسی کو ذکر و شغل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میاں کام کرتے ہوئے تمہیں اتنے دن ہوگئے کچھ نفع بھی ہوا کچھ معلوم بھی ہونے لگا۔ یعنی کچھ نظر بھی آتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ معلوم تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو کہتے ہیں کہ بس میاں ثواب اکٹھا کئے جاؤ۔ گویا ان کے نزدیک ثواب ایسی بے قدر چیز ہوئی۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے۔ سو یہ ثواب نرے الفاظ میں بھی ہے۔ سو کیا ثواب نفع نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ قرآن کو پڑھنا فضول سمجھتے ہیں۔

اہل علم میں ایک کمی

اب ایک وہ ہیں جو الفاظ قرآن کو تو پڑھتے ہی ہیں اس کے ساتھ معانی کو بھی پڑھتے ہیں۔ ترجمہ بھی جانتے ہیں اور اہل علم بھی ہیں مگر ان میں ایک اور بات کی کمی ہے۔ وہ یہ کہ تدبیر نہیں کرتے۔ لفظی تحقیق تو بڑی لمبی چوڑی کریں گے۔ مثلاً قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقاید و اخلاق سے) پاک ہوگیا) میں قد حرف تحقیق ہے اور افلح ماضی کا صیغہ ہے اور من اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر فاعل ہے۔ یہ ساری لمبی چوڑی تحقیق کرلیں گے مگر حق تعالیٰ

کا مقصود اس سے کیا ہے اس کی طرف التفات بھی نہیں۔ قرآن شریف کو اس نظر سے دیکھتے ہی نہیں کہ یہ ہماری اصلاح کا کفیل ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے حکیم محمود خاں سے نسخہ لکھوایا اور اس کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ اس نسخہ کا خط کیسا ہے، دائرے کیسے ہیں۔ اس نظر سے نہیں دیکھا کہ اجزاء کیسے ہیں۔ مزاج کی کیسی رعایت کی ہے۔ صرف یہ دیکھا کہ خوشخط ہے، دائرے خوب بنائے ہیں۔ اور اس پر کہنے لگا کہ محمود خان بڑے طبیب ہیں، ان کے دائرے کیسے عمدہ ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ یہ شخص نسخہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھا۔ نسخہ کی حقیقت تو یہ ہے کہ مرض کے موافق ہو۔ اس سے اصلاح ہوتی ہو۔ نسخہ کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔

اسی طرح اہل علم قرآن کے الفاظ کی تو خوب تحقیق کرتے ہیں مگر اس کا خیال نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ کا اس سے مقصود کیا ہے یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر ہمارے امراض باطن کے کیسے علاج کئے گئے ہیں اور ہم کو اس سے نفع حاصل کرنا چاہیے۔

دنیا وآخرت کی مثال

اس وجہ سے میں اس طرف متوجہ کرتا ہوں کہ اس آیت کے اختصار الفاظ کی طرف نظر نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اس کے اندر کیا بات بتلائی ہے جس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے اصلی مطلوب کو بتلایا ہے کہ تمام مطالب اسی کے اندر منحصر ہیں۔ وہ مطلوب کیا ہے فلاح اور فلاح کا طریقہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ افلح میں تو مطلوب کو بتادیا کہ ہر ایک شخص کو فلاح مطلوب ہونی چاہیے اور من تزکی میں طریقہ ارشاد فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب ہے اور اس کا طریقہ ہے تزکیہ۔ پس جس کو فلاح کامل میسر ہوگئی تو اس سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

اب بیان اس کا ہونا چاہیے کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور اس کے بیان کی اس لئے ضرورت ہے کہ بعض آدمی ایسی باتیں کیا کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ نصیحت کرنے پر کہا کرتے ہیں کہ بس جی جنت میں پہلے تم ہی چلے جانا ہم دوزخ کی سزا بھگتنے کے بعد ہی چلے جائیں گے۔ سو ان کا مطلب کیا ہے کہ فلاح کامل کی ضرورت نہیں۔ اب میں اس کا فیصلہ کہ فلاح کامل کی ضرورت ہے یا نہیں دنیا کے

واقعات سے بتلائے دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے دنیوی امور میں فلاح کامل مقصود نہیں ہے حالانکہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے آخرت کے مقابلے میں۔

دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سمندر میں انگلی ڈبوئے۔ سو جیسی اس کو سمندر سے نسبت ہے ایسی ہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے بلکہ حقیقت میں اتنی نسبت بھی نہیں۔ محض تقریب الی الفہم کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال دی ہے دنیا کو آخرت سے اس سے بھی زیادہ بعید نسبت ہے۔ کیونکہ دنیا محدود ہے اور آخرت غیر محدود اور محدود کو غیر محدود سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے اور اس مثال میں نسبت محدود کی محدود کے ساتھ ہے (انگلی کی تری بھی محدود اور سمندر بھی محدود ہے)۔ سو دو محدود شے کے اندر وہ تفاوت نہیں ہو سکتا جو کہ محدود اور غیر محدود کے اندر ہوتا ہے۔ پس یہ حقیقی مثال نہ ہوئی۔ مگر چونکہ اور کوئی مثال لوگوں کے فہم سے قریب نہ تھی اس لئے اس پر اکتفا فرمایا۔ سو دنیا آخرت کے مقابلہ میں یہ نسبت رکھتی ہے۔

توکل کی صورت

مگر پھر بھی ہم دنیا کے مقاصد میں لوگوں کی حالت دیکھتے ہیں کہ کبھی ان کو ایک حالت پر قناعت نہیں ہوتی جب تک درجہ کمال حاصل نہ کرلیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر چاہتے ہیں۔ چنانچہ رات دن لوگوں کا اس پر عمل ہو رہا ہے۔ پس جب دنیا کے مقاصد میں ہمارا یہ برتاؤ ہے باوجود اس کی حقارت کے تو آخرت کے مقاصد میں ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے۔ جو آخرت کے ساتھ ہمیں معاملہ کرنا چاہیے تھا وہ معاملہ دنیا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دنیا میں تو جو درجہ بھی کمال کا حاصل ہو اس سے اور آگے قدم بڑھانا چاہیں گے اور آخرت کے بارہ میں یہ معاملہ نہیں۔ بس اصل مذاق تو ہر شخص کا یہی ہے کہ جو شے اس کو محبوب ہوتی ہے اس کا اعلیٰ درجہ اس کو مقصود ہوتا ہے اور جو شے مقصود ہوتی ہے اس کی تحصیل میں پوری کوشش کرتا ہے۔ پس جب آخرت کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آخرت کی فلاح کامل درجہ پر مقصود ہے۔ کوئی شخص ایک شے کو حاصل کرنا چاہتا ہو مگر اس کے طرق سے گھبرائے تو اس کو اس شے کا طالب تھوڑا ہی کہیں گے۔

جیسے کوئی شخص کھیتی کرنا چاہے مگر نہ تو بیج ڈالے نہ پانی دے نہ اور شرائط کو پوری کرے بس اللہ کے فضل پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے تو اس کو کھیتی کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ رجا وہ ہے کہ اسباب جمع

کر کے امیدوار رہے۔

اس سے بھی ایک اور موٹی مثال ہے۔ایک شخص اولاد کا طالب ہے اور چاہتا ہے کہ صاحب اولاد ہو۔سوظاہر ہے کہ طریقہ اس کا یہی ہے کہ نکاح کرے اگر بیمار ہو تو علاج بھی کرے اور پھر اولاد کا امیدوار بنے۔یہ تو ہے رجا اور ایک شخص ہے کہ یہ تو چاہتا ہے کہ اولاد ہو مگر نکاح نہیں کرتا۔ بزرگوں کے پاس جاتا ہے کہ اولاد ہونے کی دعا کردیجئے۔وہ جواب یہ دیتے ہیں کہ اول نکاح کرو۔خدا کرے گا اولاد بھی ہوگی۔تو وہ کہتا ہے کہ اولاد تو چاہتا ہوں مگر نکاح کا بکھیڑا مجھ سے نہیں کیا جاتا تو اس کو یوں جواب دیا جائے گا کہ عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ اسباب کے جمع کرنے پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔اب وہ نظیر دیتا ہے کہ حوا علیہا السلام ویسے ہی پیدا ہوئی تھیں میں بھی چاہتا ہوں کہ اسی طرح اولاد ہو جائے یا کوئی عورت تمنا کرے کہ میرے اولاد پیدا ہو اور نکاح نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ بلا نکاح ہی ہو جائے اور کہتی ہے کہ عیسیٰؑ بلا باپ کے پیدا ہوئے تھے۔پس ضرورت کیا ہے نکاح کی تو ایسے شخصوں کو طالب نہیں کہہ سکتے۔

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ عادۃ مستمرہ کے موافق کام کرتے ہیں اور احیاناً اس کے خلاف بھی قدرت ظاہر کرنے کے لئے دکھا دیتے ہیں۔اگر وہ کہے کہ حق تعالیٰ قادر تو ہیں کہ بلا نکاح کے اولاد دے دیں۔تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ بیشک وہ قادر ہیں کہ بلا اسباب کے پیدا کر دیں مگر آپ کو انہوں نے اجازت نہیں دی ایسے اسباب کے ترک کرنے کی۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص نکاح تو نہ کرے اور اولاد کا خواہشمند ہو وہ اولاد کا طالب نہیں۔اسی طرح جو شخص فلاح کامل کے اسباب اختیار نہ کرے وہ فلاح کامل کا طالب نہیں اور اس کو توکل کا دعویٰ کر کے اس سے اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں۔

توکل اور کارِ عقبیٰ

جو لوگ توکل توکل کا سبق ورد زبان رکھتے ہیں ان صاحبوں نے آخرت ہی کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔دنیوی اسباب جمع کرنے میں توکل نہیں کرتے۔اس میں تو بڑے چست و چالاک ہیں۔ان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔باوجودیکہ حق تعالیٰ نے روزی کی ذمہ داری بھی کر لی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وما من دآبة فی الارض الاعلی الله رزقها (کہ زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر اللہ پر

اس کا رزق ہے) اور اس میں کوئی قید طلب وغیرہ کی نہیں لگائی اور جہاں آخرت کا ذکر کیا ہے وہاں مقید کیا ہے سعی کے ساتھ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

ومن ارادالآخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا

کہ جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لئے سعی کی۔ یعنی ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ سن لو جو نیک عمل کرے گا جنت میں جائے گا۔

تعجب ہے کہ جس میں ذمہ داری کی ہے اس میں توکل کو عیب سمجھتے ہیں اور جس کی ذمہ داری نہیں کی اس میں توکل اختیار کرتے ہیں۔

بس جی جو بات جس طرح اپنی سمجھ میں آئی اس طرح کر لی۔ انبیاء علیہم السلام بھی صرف امور دنیوی میں سے اسباب ظنیہ کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسباب قطعیہ کو وہ بھی ترک نہیں کرتے۔ کھانے کو ترک نہیں کرتے کیونکہ وہ تو اسباب قطعیہ سے ہے ہاں انہوں نے تدابیر معاش کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ اسباب ظنیہ سے ہے مولانا فرماتے ہیں۔

انبیاء در کار دنیا جبری اند   کافراں در کار عقبیٰ جبری اند
انبیاء را کار عقبیٰ اختیار   کافراں را کار دنیا اختیار

انبیاء تو جبری اس معنی کو ہیں کہ امور دنیویہ کے بارے میں حس وحرکت نہیں کرتے ان کو چھوڑ دیتے ہیں اور کافر کار عقبیٰ میں جبری ہیں کہ اس کے اندر حس وحرکت نہیں کرتے ان کو ترک کئے ہوئے ہیں۔ انبیاء کار عقبیٰ کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کو نہیں چھوڑتے اور کافر کار دنیا کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ سو انبیاء کے جبری ہونے کے یہ معنی ہیں۔ جب انبیاء کی یہ حالت ہے کہ وہ اسباب قطعیہ کو ترک نہیں کرتے گو دنیوی ہی ہوں اور اخروی گو بدرجہ اولیٰ، تو اور لوگوں سے بڑی حیرت ہے کہ انہوں نے آخرت کے بارہ میں توکل کیسے اختیار کر رکھا ہے کہ اس کی تحصیل میں حرکت ہی نہیں کرتے۔ مانا کہ اہل توکل تو یہ بھی ہیں مگر ایسی چیز میں توکل اختیار کیا ہے کہ اس میں توکل درست نہیں۔

قلب واعمال کا تعلق

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اسباب فلاح آخرت کو بیان کیا ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مطلق فلاح کے اسباب بیان کئے ہیں۔ (صرف آخرت ہی کے نہیں) کیونکہ فلاح

کے اندر کوئی قید نہیں لگائی پس وہ عام ہوگی فلاح دنیوی کو بھی۔ اور فلاح کو ذکر کر کے پھر اس کے طریقے بتلا دیئے ہیں جنکے اختیار کرنے سے اخروی دنیا کی فلاح بھی میسر ہوتی ہے۔ (چنانچہ ختم وعظ کے قریب یہ مضمون مفصلاً مذکور ہے)۔

پس ارشاد ہے **قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی**۔ یہاں تین اعمال بیان کئے ہیں۔ ایک تزکی ایک **ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ** ایک **صلّی**۔ یہاں پر تزکیہ سے عام بھی مراد لے سکتے ہیں۔ ذمائم باطنی سے بھی تزکیہ ہو اور معاصی جوارح سے بھی مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمائم باطنی سے پاکی مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ونفس وما سوھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا قد افلح من زکھا

(اور قسم ہے انسان (جان) کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں کا) اس کو القاء کیا یقیناً وہ مراد کو پہنچا جن نے اس (جان) کو پاک کرلیا)

زکھا میں مفعول کی ضمیر نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کرلیا۔ اس آیت میں تصریح ہے اس بات کی کہ مدار فلاح کا تزکیہ نفس پر ہے اور ظاہر ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اس کی پاکی ذمائم باطنی کے ازالہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ نفس بلا واسطہ انہیں کے ساتھ متصف ہے نہ کہ اعمال جوارح کے ساتھ۔ پس اس کا تزکیہ بھی انہی ذمائم سے ہوگا۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ یہاں بھی ذمائم باطنی ہی سے تزکیہ مراد ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگ آج کل کہتے ہیں۔ سو تزکیہ باطن کا حکم دینے سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود نہیں کہ تزکیہ ظاہر ضروری ہیں۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو آگے **وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی** کیوں فرماتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کا پاک کرنا اصل ہے اور ظاہر اس کی فرع ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر **یزکیھم** فرمایا ہے تو اس سے بھی اسی قرینہ سے تزکیہ نفس مراد ہے کیونکہ اصل چیز تو تزکیہ باطن ہی ہے۔ اگر تزکیہ باطن اصل چیز نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں یہ کیوں فرماتے۔

التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ[1]۔ کہ تقویٰ یہاں پر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند احمد ۲: ۲۷۷

الغنیٰ غنی النفس۔ کہ غنیٰ نفس کا غنا ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

غرض خوب سمجھ لیجئے کہ جب قلب کی اصلاح ہوجاتی ہے تو اعمال بھی درست ہوجاتے ہیں۔ سو اصل قلب ہی کی اصلاح ہوگی مگر اصلاح قلب سے درستی اعمال ہوجانے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد اصلاح ہوجانے کے اعمال کے قصد کی بھی ضرورت نہ ہوگی بلکہ معنی یہ ہیں کہ قلب کی اصلاح ہونے پر اعمال کا کرنا سہل ہوجائے گا یعنی قبل اصلاح کے جو اعمال مشکل تھے وہ بعد اصلاح کے آسان ہوجاویں گے۔ مگر قصد کی پھر بھی ضرورت رہے گی۔ اصلاح کا تو بس اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ اصلاح کے قبل بری باتوں کا چھوڑنا باوجود قصد کے بھی نہایت دشوار تھا۔ اصلاح کے بعد آسان ہوگیا۔ جو لوگ اصلاح شدہ ہوتے ہیں ان میں اور جو اصلاح شدہ نہیں ہوتے ان میں بس یہی فرق ہے کہ قصد تو سب کو کرنا پڑتا ہے۔

ریاضت نفس

مگر جن لوگوں کی اصلاح ہوچکتی ہے ان کا کام تو معمولی قصد اور اشارہ ہی سے چلتا ہے اور جنہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی ہوتی ان کو برے کاموں کے چھوڑنے میں سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور بڑی دشواری پیش آتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً ایک عورت سامنے کو نکلی۔ نفس کا تقاضا ہوا کہ اس کو دیکھ لو اگر قلب کی اصلاح ہوگئی ہے تب بھی نفس کو روکنے کے لیے ارادہ کی تو ضرورت ہوگی مگر تھوڑے قصد سے نفس کو روک سکتے ہیں۔ ذرا سا اشارہ کافی ہے اور اگر اصلاح نہیں ہوئی ہے تو باوجود قصد کرنے کے بھی نفس کے روکنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اصلاح ہوجانے کے بعد نفس میں گناہ کا تقاضا ہی نہیں رہتا سو یہ بالکل غلط ہے۔ ہاں وہ تقاضا ضعیف ضرور ہوجاتا ہے کہ اگر دبایا جائے تو نہایت آسانی سے دب جاتا ہے اور جس نے اصلاح

نہیں کی ہوتی اس کو تقاضا نہایت شدید ہوتا ہے اس کے روکنے میں نہایت دشواری پیش آتی ہے۔

اب یہ شبہ جاتا رہا کہ جب تقاضا اصلاح شدہ اور غیر اصلاح شدہ دونوں کو ہوتا ہے پھر دونوں میں فرق کیا ہوا اور جب دونوں برابر ہیں تو پھر ریاضت کی حاجت کیا ہے سو میں نے دونوں میں فرق بتلا دیا۔

ریاضت کردہ کی مثال ایسی ہے جیسے شائستہ گھوڑا اور جس نے مجاہدہ نہیں کیا اس کی مثال ایسی ہے جیسے شریر گھوڑا۔ سوار اگر ماہر ہو تو شائستہ گھوڑے کو اگر وہ شوخی کرے ذرا سا اشارہ کافی ہو جاتا ہے بخلاف شریر گھوڑے کے کہ اس کے درست کرنے میں ماہر کو بھی بڑی کلفت پیش آتی ہے شہسوار اپنے زور سے قابو میں لے آئے وہ اور بات ہے مگر دقت ضرور ہوگی بخلاف شائستہ گھوڑے کے کہ وہ آسانی سے قابو میں آجاتا ہے یہ فرق ہے نفس کی ریاضت اور عدم ریاضت میں۔

رہا میلان معاصی کی طرف سو وہ دونوں کو ہوتا ہے۔ ایسا کوئی شخص بھی نہیں کہ اس کو میلان نہ ہو ہاں قبل ریاضت داعیہ قوی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا روکنا مشکل ہے اگر طاقت سے باہر نہیں صرف دشواری ہے اور نفس اس دشواری کو گوارا نہیں کرتا مثلاً نگاہ کا نیچا کرنا کہ یہ طبیعت کو بہت گراں ہوتا ہے۔ نفس اس گرانی کا تحمل نہیں کرتا پس وہ اس کی طرف نگاہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ پھر توبہ کر لیں گے۔ بخلاف ریاضت کے کہ داعیہ تو ہوتا ہے مگر ہوتا ہے ضعیف۔ اور پھر ریاضت سے مدافعت کی قوت پیدا ہو جاتی ہے بہت زیادہ۔ اس لئے وہ بہت آسانی سے اس کی مدافعت کر سکتا ہے کہ داعیہ ضعیف ہے اور قوت دافعہ زبردست ہے۔ بس اس واسطے ریاضت مجاہدہ کرتے ہیں۔

سو تزکیہ نفس کا جو حکم کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اثر ہے کہ اس کی اعانت سے ظاہر اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے نفس کے متعلق فرمایا۔ **قد افلح من تزکی۔** (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا)

اصلاح ظاہر و باطن

باقی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف یہی کافی ہے ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ فقط قلب کا درست کر لینا کافی ہے۔ یہ لوگ شریعت کو منہدم بلکہ منعدم کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تمام شریعت بھری ہوئی ہے اصلاح ظاہر و باطن سے اور تصوف کی حقیقت بھی یہی ہے کہ

تعمیر الظاهر والباطن (ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہو)

اور دونوں ہی کی ضرورت بھی ہے۔ بعض وجوہ سے اصلاح باطن کی اور بعض وجوہ سے

اصلاح ظاہر کی۔ بہر حال صرف اصلاح باطن کافی نہیں کہ ظاہر ترک کر دیا جائے۔ اور باطن ہی پر اکتفا کیا جائے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محض باطن مقصود ہے مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ:

الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمه ۔ جب کوئی چیز پائی جائے گی تو اپنے لوازم کیساتھ پائی جائیگی یہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ مثلاً آفتاب کے لئے دھوپ لازم ہے جب آفتاب نکلے گا تو دھوپ ضرور ہوگی یا تین کے عدد کو فرد ہونا لازم ہے۔ جہاں تین کا عدد صادق آئے گا وہاں فرد بھی صادق آئے گا۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ جس وقت باطن میں کوئی کیفیت ہوتی ہے تو ظاہر میں اس کا ظہور ضروری ہے مثلاً کسی کے دل میں غصہ کی کیفیت ہو تو چہرہ پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں گردن کی پھول جاتی ہیں۔ یا کسی کے دل میں کسی کی محبت ہوتی ہے ،تو ظاہر میں اضطراب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دل میں تو محبت ہو اور محبوب کی طرف نہ ہاتھ بڑھے نہ اس کی طرف پاؤں چلے۔ ایسا نہ سنا اور نہ دیکھا جب دنیا کی محبت میں یہ حالت ہے جو کہ نہایت ضعیف ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی محبت میں جو کہ اقوی ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قلب میں تو حق تعالیٰ کی محبت ہو اور زبان پر کلمات مدح کے آتے نہ ہوں اور عجز و نیاز ظاہر نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے کہ ظاہر میں آثار نہیں پائے جاتے تو سمجھا جائے گا کہ اس کو خدا تعالیٰ کی محبت ہی نہیں ہے۔ ورنہ ممکن نہیں کہ قلب میں خدا کی محبت ہو اور اس کے سامنے جھکا نہ جائے اس سے ثابت ہو گیا کہ ظاہر لازم ہے باطن کے لئے۔ پس جب تزکیہ باطن ضروری ہوا تو تزکیہ ظاہر بھی بوجہ لازم ہونے کے ضروری ہوا۔ لہٰذا تزکیہ باطن و تزکیہ ظاہر دونوں ضروری ہوئے۔ اور گو ضروری دونوں تھے مگر چونکہ اصل تزکیہ نفس ہی تھا۔ اس لئے **قد افلح من تزکی** (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد و اخلاق سے) پاک ہو گیا) میں اس کو بیان کیا۔

درستی جوارح وقلب

آگے ہے **وذکر اسم ربه فصلی**۔ (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) پہلی آیت میں تو تزکیہ باطن کا ذکر تھا اور اس کے اندر ایک ظاہر۔ اور جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ان دونوں کے تزکیہ کا ذکر ہے۔ وہ اس طرح کہ عمل تین حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کا تعلق باطن سے ہے یا افعال جوارح سے اور یا زبان سے۔ اعمال جوارح تو ظاہر ہیں اور زبان برزخ ہے کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حساً بھی۔ چنانچہ اگر منہ بند رکھو تب تو زبان باطن میں داخل ہے اور جو منہ

کھول دو تو ظاہر۔ ایک تو یہ وجہ ہے زبان کے من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہونے کی۔ اور احکام میں بھی چنانچہ دیکھ لیجئے آب ودہن (تھوک) اگر حلق کے اندر چلا جاوے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باطن ہے اور اگر کوئی چیز چکھ کر تھوک دی جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظاہر ہے اور چونکہ زبان برزخ ہے اس لئے جداگانہ قسم قرار دی گئی۔

پس وذکر اسم ربہ فصلّٰی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) میں تزکیہ ظاہر اور تزکیہ ماھو بین الظاہر والباطن (یعنی برزخ) دونوں کا ذکر ہو گیا ہے۔ صلّٰی تو ظاہر کے متعلق ہے اور ذکر اسم ربہ۔ زبان کے متعلق جو کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے۔ غرض دونوں قسم کے تزکیہ کا ذکر اس آیت میں آ گیا۔

پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی اصلاح کرو اور ایسی چیز کی بھی اصلاح کرو جو من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حاصل یہ کہ تین فعل ہیں۔

۱۔ زبان کی درستی ۲۔ جوارح کی درستی ۳۔ قلب کی درستی

پس مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی درستی کرو اور چونکہ وہ امور جن کی درستی ہونا چاہیے اتنے ہیں کہ ہر وقت زبان سے انکی تفصیل یاد رکھنا مشکل تھا اور بدون استحضار درستی کا اہتمام مشکل۔ اس لئے اس کی سہولت کے لئے بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلّٰی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) فرما دیا۔

راز اس کا یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطہ بتلاتے ہیں کہ اگر اس کو اختیار کر لو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

برائیوں سے بچنے کا طریق

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اپنا اصل کام ذکر کو سمجھو گے تو خود بخود سب چیزوں سے رک جاؤ گے۔ غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم اصل کام ذکر کو نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ برائیوں میں کبھی مبتلا نہ ہوں۔ مشائخ برائیوں کے چھوڑنے کی تعلیم تفصیلاً بھی کرتے ہیں مگر سب سے سہل یہ طریقہ ہے کہ اپنے لئے ایک اصل کام تجویز کر لے پھر اس میں مشغول ہونے سے خود ہی سب برائیاں چھوٹ جائیں گی۔ وہ اصل کام ذکر ہے۔ تو جو چیزیں اس میں مخل ہوں گی خود بخود ان سے انقباض ہوگا تو بقدر ضرورت ہوگا اور ضرورت اسے کہتے ہیں کہ بدون اس کے ضرر ہونے لگے۔

مثلاً نوکر کو کوئی ایسا کام بتلاتا ہے کہ اگر نہ بتلائے گا تو ضرر ہوگا۔ یہ ضرورت ہے پس اس کو تو وہ اختیار کرے گا اور ایک ہے مشغلہ کے طور پر باتیں ہانکنا۔ سو یہ غیر ضروری ہیں جو شخص ذکر کو اصلی کام سمجھے گا وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ لوگوں کے وقت کا ایسے ہی قصوں میں صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ مجلسوں میں دوست آشنا بیٹھتے ہیں تو زیادہ وقت کا ہے میں صرف ہوتا ہے۔ صرف اسی میں کہ کہیں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ قصہ قضایا کا ذکر کرتے ہیں۔ کسی پر اعتراض کرتے ہیں۔ کسی کی برائی کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو لوگوں نے اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔

خاص کر اہل علم جو مبتلا ہوتے ہیں تو وہ اس میں عوام سے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ عوام الناس کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ معصیت ہے اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت ہے اور پھر کرتے ہیں۔ غرض بڑا شغل اہل علم کا غیبت ہے اور غیبت بھی کس کی ابرار کی کہ اکثر ان کے یہاں علماء اور صلحاء کی برائیاں ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں کی حالت افسوس کے قابل ہے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ اس طرف توجہ نہیں کرتے کہ ہمارا اصلی کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیا اچھی تدبیر بتلائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ذکر اسم ربہ فصلّٰی کہ ذکر کو اصلی کام سمجھ لو تمام برائیاں چھوٹ جائیں گی۔

اہل علم کی نازک حالت

یہاں ظاہراً یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ یوں فرماتے ذکر ربہ فصلی لفظ اسم کیوں بڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ذکر ربہ فرماتے تو اس میں بعض سالکین کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ خدا کو کیسے یاد کریں کیونکہ یاد کرنا موقوف ہے تصور پر اور تصور بڑا مشکل ہے کیونکہ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی کہاں ہوسکتی ہے ان کی تو یہ شان ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم   وز ہرچہ گفتہ ایم و شنید یم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبہ پایاں رسید عمر   ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(اے اللہ آپ ہمارے قیاس وخیال وگمان ووہم سے برتر ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ جو کچھ ہم نے پڑھا اور سنا ہے۔ دفتر تمام ہوگیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں)

اور یہ شان ہے

در تصور ذات اورا گنج کو   تا در آید در تصور مثل او

(اس کے ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے کہ اس کے مثل کا تصور آ سکے)

اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ جب حضرت حاجی صاحب ہجرت کر کے حرم شریف میں پہنچے تو وہاں ایک شیخ مثنوی کا درس دے رہے تھے۔ حضرت بھی شریک درس ہو کر سننے لگے۔ وہ شیخ اس شعر کا مطلب بیان کر رہے تھے مگر ان کے نسخہ میں کنج کو تھا۔ جیسا کہ اور نسخہ مطبوعہ ہے۔ اسی کے موافق وہ مطلب بیان کر رہے تھے مگر معنی نہیں بنتے تھے۔ وہ بتکلف اس کو بنا رہے تھے۔ حضرت نے اس تقریر پر اعتراض کیا تو وہ خفا ہو گئے اور فرمانے لگے کہ اگر یہ معنی غلط ہیں تو صحیح معنی آپ فرما دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم نہ تھا کہ یہاں یہ قاعدہ ہے کہ پوچھنے والے سے ناخوش ہو جاویں۔ ہمارے یہاں تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور پوچھنے پر برا نہیں مانتے۔ تب انہوں نے کہا کہ اصل بات تو یہی ہے کہ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ہمیں تو اساتذہ سے اسی طرح پہنچا ہے کہ یہ گنج کو ہے۔ بس یہ سن کر وہ پھڑک گئے کہ بیشک اسی طرح ہونا چاہیئے۔

نفس کی شرارت

غرض یہ کہ ذکر ربہ فرمانے سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ذات حق کا جب تصور نہیں ہو سکتا تو اس کی یاد کیسے ہو سکتی ہے۔ بعض سالکین کو اس قسم کے خطرات پیش آتے ہیں اور یہ سب شیطان کے حیلے بہانے ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے روکنا چاہتا ہے۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص میرے پاس کسی بات کے لئے تعویذ لینے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ دعا کرو میں بھی دعا کروں گا کہنے لگے کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں۔ آپ کی زبان کلمہ کے قابل تو ہے اور کلمات دعائیہ کے قابل نہیں۔ اور میں نے کہا کہ ایمان افضل ہے یا دعا۔ جب ناپاک زبان سے ایمان کا کلمہ پڑھ لیتے ہو تو پھر دعا میں کیوں عذر کرتے ہو۔ کلمہ میں کیوں نہیں عذر کیا کہ ہماری زبان اس قابل کہاں ہے۔

بس کچھ بھی نہیں شیطان نے راہ مارا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس آرام چاہتا ہے اور دعا میں ہے کلفت۔ اس لئے صرف تعویذ تو طلب کرتے ہیں کہ ایک بار لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور جو کچھ پڑھنے کو بتلاؤں تو اس کو نہیں کرتے ظاہر میں تو یہ بات واضح کی ہے کہ ہم اس قابل کہاں ہیں مگر واقع میں نفس کی شرارت ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ نفس آرام طلب ہے اور تعویذ میں کچھ

کرنا پڑتا نہیں لے کر بازو پر باندھ لیا بس چھٹی ہوئی۔ اور پڑھنے میں ہے مصیبت۔ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے پڑھنے سے اور دعا سے گھبراتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے لوگ ذاکر سالک جب ان پر خطرات ہجوم کرتے ہیں تو ان کے دل میں خیال جم جاتا ہے کہ ذکر سے فائدہ کیا ہوا کہ خطرات بھی قطع نہیں ہوتے شیطان ان کے اس قدر پیچھے پڑا رہتا ہے کہ اس کے وساوس کی وجہ سے ذکر چھوڑ دیتے ہیں کہ جب بغیر وساوس کے ذکر ہوتا ہے نہیں تو پھر ذکر کرنا ہی بیکار ہے جیسے لوگوں نے قرآن شریف کے ساتھ عمل کیا ہے اور خیال جمالیا ہے کہ جب معنی نہیں سمجھتے تو قرآن ہی کو چھوڑ دو۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ اگر کسی کی اولاد بدصورت ہو تو اس کا گلا گھونٹ دو۔ یہ کتنی بڑی غلطی ہے بیہودہ حرکت ہے۔

غرض کہ ذکر اللہ کو بعض لوگ اس لئے بیکار سمجھتے ہیں کہ خدا تک ہماری رسائی کیسے ہوسکتی ہے۔ پھر یاد کہاں۔ اہل سلوک تک اس میں مبتلا ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر مسمّی کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اور بعض جگہ قرآن شریف میں ذات کے ذکر کرنے کو بھی فرمایا ہے۔ جیسے **فاذکرونی** اور کہیں صفت کے ذکر کو لائے ہیں جیسے **واذکر ربک فی نفسک** مطلب یہ ہے کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ اسی لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

طلب صادق کا اثر

بعض کو شبہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھی مگر اثر نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ نماز سے قصد ہی نہیں کیا اثر ہونے کا اور جب قصد ہی نہ ہو تو اس کے بارہ میں یوں فرماتے ہیں۔

انلزمکموھا وانتم لھا کارھون کہ جب تم اعراض کرتے ہو تو ہم پیچھے نہیں لپٹتے پھرتے۔

حضرت طلب ہونی چاہیے۔ جب طلب ہوتی ہے تو ان کی یہ عنایت ہوتی ہے۔

من[1] تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا الحدیث

یعنی جب کوئی ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف جاتا ہوں اور جو

---

[1] مسند أحمد ۲:۴۱۳، الترغیب والترھیب للمنذری ۴:۱۰۴، کنز العمال: ۱۱۷۹

ایک ہاتھ آتا ہے تو میں ایک باع دو ہاتھ جاتا ہوں۔ اور جو پیادہ آتا ہے تو میں دوڑ کر آتا ہوں۔

یعنی انسان کے مسافت قطع کرنے سے کیا ہوسکتا مگر جب یہ قصد کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے نزدیک ہو کر اس کو مقرب بنا لیتے ہیں۔ بس انسان کو چاہیئے کہ جو کچھ اس سے ہو سکے وہ کرتا رہے۔

بعض لوگ ریا کے خوف سے ذکر نہیں کرتے کہ جب ذکر کرتے ہیں تو ریا کا خیال ہوتا ہے۔ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اول ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت چنانچہ مشاہدہ کر لیجئے کہ اول اول جب کسی کو نماز میں امام بناتے ہیں تو وہ خوب بنا بنا کر پڑھتا ہے کہ مقتدیوں کو اچھا معلوم ہو۔ مگر دو چار دن کے بعد اس طرف التفات بھی نہیں رہتا۔ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتی۔

دوسرے یہ کہ جو ریا بلا قصد کے ہو تو یہ اس کے دور کرنے کا مکلّف ہی نہیں پس ریا کے دو درجے ہیں۔ ایک صورت ریا دوسری حقیقت ریا۔ یہ صورت ریا کو حقیقت ریا سمجھ لیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب وہ تمہارے اختیار سے پیدا نہیں ہوئی ہے تو اس میں حرج کیا ہے۔

مجھ سے ایک شخص نے شکایت کی ریا کی۔ تو میں نے کہا کہ بلا قصد ہے یا بالقصد، اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ انہوں نے کہا کہ غیر اختیاری ہے اس پر میں نے کہا کہ بس یہ وسوسۂ ریا ہے ریا نہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

وسوسہ اور اس کا علاج

حتیٰ کہ اگر کفر کا بھی وسوسہ آئے اس میں بھی حرج نہیں۔ چنانچہ دیکھئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی تھی کہ ہمارے قلب میں ایسی باتیں آتی ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا گوارا ہے مگر ان کا زبان پر لانا گوارا نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کے وسوسے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: **الحمد[1] لله الذی رد امره الی الوسوسة** (کہ خدا کا شکر ہے کہ اس کی کوشش وسوسہ ہی کے اندر محدود کر دی)

پس جب کہ وسوسہ کفر بھی مضر نہیں تو وسوسہ ریا تو کسی درجہ میں بھی مضر نہیں ہوسکتا پس اس کا علاج یہ ہے کہ کام کئے جائے کچھ پرواہ نہ کرے شیطان کے وسوسہ ڈالنے کی طرف کچھ خیال نہ کرے۔

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن (اپنا کام کرو دوسرے کا کام مت کرو)

ذکر میں لگنا اپنا کام ہے۔ وسوسہ آنا نہ آنا اپنا کام نہیں۔ اپنے کام میں لگنا چاہیے۔ اور جو اپنا

[1] مسند أحمد ۱: ۳۴۰، مشکوٰة المصابیح: ۷۳

فعل نہیں ہے۔اس میں کیوں مشغول ہوئے کہ وہ مخل مقصود ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص بادشاہ کا طلبیدہ جارہا تھا۔کسی حاسد کو خبر ہوئی وہ راستہ میں جا کھڑا ہوا۔جب یہ وہاں سے گزرا تو اس نے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو۔اس نے کہا کہ بادشاہ کے دربار میں جارہا ہوں۔اس نے بادشاہ کی شان میں گستاخی شروع کردی اگر یہ بادشاہ کا عاشق ہے اور بادشاہ کی ملاقات کا طالب ہے تو گستاخی سننے اور اس کے جواب دینے میں مشغول نہ ہوگا بلکہ سیدھا چلا جائے گا۔حتیٰ کہ اگر وہ کان میں منہ لگا کر گالیاں دے گا تب بھی ادھر ملتفت نہ ہوگا۔کیونکہ حاسد کی غرض اس سے یہی ہے کہ اس مشغلہ میں اس کو لگالوں تاکہ دربار کی حاضری کا وقت جاتا رہے اور یہ بادشاہ کی عطایا سے محروم رہے۔سو اگر یہ شخص ہوش سے کام لے گا تو سمجھ لے گا کہ یہ اس لئے شرارت کررہا ہے کہ مجھ کو محروم کردے۔بس اس کو چاہیے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور سیدھا چلا جائے۔اس طریقہ سے یہ بادشاہ تک پہنچ جائے گا اور گستاخی کرنے والا اندر نہیں پہنچ سکتا پس اس کو مقصود بھی حاصل ہوجائے گا اور ان تکلیف دہ کلمات سے بھی نجات ہوجائے گی اور اگر یہ شخص اس کی باتوں کے جواب دینے میں لگ گیا اور تمام وقت اسی میں صرف ہوگیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بادشاہ کے قرب سے محروم رہے گا۔

اسی طرح شیطان وساوس ڈال کر قرب الٰہی سے محروم رکھتا ہے۔سو جو شخص وسوسہ کی فکر میں مشغول ہوجاتا ہے وہ ترقی سے رک جاتا ہے اور جو اس میں مشغول نہیں ہوتا ترقی کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ مقام قرب حاصل ہوجاتا ہے اور جب مقام قرب حاصل ہوتا ہے تو وساوس بھی منقطع ہوجاتے ہیں کیونکہ دربار میں شیطان کا دخل کہاں اور اسی لئے بزرگوں نے وساوس کا علاج تجویز کیا ہے عدم التفات یعنی وساوس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔اس کے سوا اس کی تدبیر نہیں۔

غرض کہ جیسے ریا کا وسوسہ ریا نہیں اسی طرح کفر کا وسوسہ کفر نہیں اور نہ مذموم ہی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہ قلب کے اندر نہیں گو معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے قلب کے اندر ہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آئینہ پر مکھی بیٹھی ہو اور اس کا عکس آئینہ میں پڑتا ہو۔اس لئے اندر مکھی نظر آتی ہے حالانکہ اندر نہیں ہوتی۔اسی طرح ایسے غیر اختیاری وساوس قلب کے اندر نہیں ہوتے۔قلب میں تو ذکر ومحبت خدا کی ہوتی ہے اور وسوسہ قلب کے باہر ہے۔اہل اللہ کے قلب میں اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے سالک کو قلب قوی رکھنا چاہیے اور کام میں لگے

رہنا چاہیے۔ اگر زیادہ خلجان ہو تو یوں دل کو سمجھائے کہ اور کچھ نہ ہو ذکر لفظی تو ہے نہ یہ کہ اس فکر میں پڑ جائے کہ یکسوئی کیوں نہیں ہوتی۔

ذکر و فکر

فکر دو ہیں۔ ایک تو اصلاح کی فکر سو یہ تو ہونا چاہیے اور ایک ہے یکسوئی اور کیفیات جس سے اصل کام ہی جاتا رہا مثلاً اس کا اہتمام کیا کہ قلب میں کوئی چیز نہ ہو اور اس میں کامیابی نہ ہونے سے یہ خیال کیا کہ میرا ذکر بیکار جا رہا ہے۔ بس ذکر ہی کو چھوڑ بیٹھے۔ اور غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ منشا اس کا کبر ہے۔ یعنی اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ میں اپنے عمل و ذکر میں موجودہ حالت سے زیادہ کا مستحق تھا مگر مجھ کو ملا نہیں۔ اتنے دنوں ذکر کیا مگر ہنوز روز اول ہے۔ پس یہ کبر ہے ورنہ اگر سچا عاشق ہو تو اس کو بھی غنیمت سمجھتا کہ اس کا نام لینا تو میسر ہو گیا اسی واسطے تو کہتے ہیں۔

ادائے حق محبت عنایت ست ز دوست وگرنہ عاشق مسکیں ہیچ خورسند است

(حق محبت کی ادائیگی سراسر دوست کی عنایت کے سبب ہے ورنہ عاشق بیچارہ یونہی خوش وخرم ہے)

اگر تمام عمر ذکر لفظی ہی کی پابندی ہو جائے تو یہ بھی غنیمت ہے ہم تو اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ غلو کرنا تواضع میں بعض اوقات کبر تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھو اس نے تواضع کی تھی کہ اپنی حالت کو حقیر سمجھا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ یہ خیال جمایا کہ میں کام تو اتنا کرتا ہوں مگر میری حالت ایسی بری ہے۔ بس کبر تک پہنچ گیا

صاحبو! ہماری نماز کیا ہمارا روزہ کیا۔ اس پر جو انعام بھی ہو جائے احسان سمجھنا چاہیے اب یہ خیال کرنا کہ مجھے زیادہ ملنا چاہیے تھا یہ ناقدری ہے۔ بہر حال لفظ اسم بڑھانے میں یہ نکتہ تھا۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ زبان سے اللہ اللہ کرنے کو غنیمت سمجھے حقیر نہ سمجھے۔ جب غنیمت سمجھے گا تو شکر کرے گا اور شکر پر یہ وعدہ ہے: **لئن شکرتم لازیدنکم** اس سے ترقی ہوگی۔ پس جس کی طلب ہے اس تک پہنچ جائے گا خلاصہ یہ کہ **ذکر اسم ربه** میں تمام برائیوں سے بچنے کی تدبیر بتلائی ہے کہ ذکر کرنے میں مشغول ہو جاؤ۔ سب برائیوں سے بچ جاؤ گے۔

فضیلت نماز

اس آیت میں ایک نکتہ اور ہے۔ وہ یہ کہ **فصلّی** میں تو فا لائے اور **ذکر اسم ربه** میں واؤ۔ حالانکہ ہے دونوں جگہ عطف۔ مگر اول میں واؤ کے ساتھ عطف کیا ہے اور دوسری جگہ فاء کے

ساتھ۔ سواس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز بعض وجوہ سے مقصود اعظم ہے کیونکہ ذکر پر نماز کی اس طور پر تفریع کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقدمہ ہے نماز کا اور اصل مقصود نماز ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اول ذکر سے نماز کی قابلیت پیدا کی اور پھر نماز پڑھی۔

اس سے نماز کی مقصودیت عظمٰی معلوم ہوئی۔ دوسرے قد افلح من تزکی (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد و اخلاق سے) پاک ہوگیا) کے ساتھ و ذکر اسم ربه فصلّٰی (اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) کی قید لگانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ گو تزکیہ بہت بڑا عمل ہے مگر بغیر نماز کے فلاح کے لئے کافی نہیں۔ ہاں جب کہ تزکیہ کے ساتھ نماز بھی پڑھی تو اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری فلاح ہوگئی۔ نماز سبب عظمٰی ہے فلاح کا۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اذان میں حی علی الفلاح کیوں فرمایا ہے بات یہ ہے کہ فلاح لقب رکھ دیا ہے نماز کا۔ نماز ہی کو فلاح کے نام سے تعبیر کیا ہے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ نماز فلاح کا ایسا سبب ہے کہ گویا عین فلاح ہے اور مسبب کے قائم مقام ہے۔ پس جس نے نماز پڑھی تو یوں کہیں گے کہ اس کو فلاح حاصل ہوگئی۔ اس سے نماز کا کیا رتبہ ثابت ہوتا ہے۔

نماز میں روزہ

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نماز ایسی چیز ہے کہ اس کو تمام اعمال سے امتیاز حاصل ہے یعنی اعمال فرعیہ سے کیونکہ ایک عمل تو ایسا ہے جو سب کی اصل ہے ایمان وہ تو نماز سے بھی افضل ہے۔ کیونکہ اگر ایمان نہ ہو تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ اور ایمان بلا نماز کے بھی مفید ہو جاتا ہے (مثلاً انسان خلود فی النار سے بچ جائے) اور نماز کا امتیاز دوسری عبادات سے یہ ہے کہ نماز میں تمام عبادات موجود ہیں۔

اس کی مثال اس مرکب نسخہ کی سی ہے جس میں تمام اجزائے مقیدہ کو جمع کر دیا گیا ہو۔ ایسا خمیرہ یا معجون ظاہر بات کہ مفرد دوا سے زیادہ مفید ہوتا ہے سو اعمال جو کہ بمنزلہ غذا یا دوا کے ہیں نماز ان سب کا مجموعہ ہے کیونکہ دوا تو وہ ہے جس سے مواد خبیثہ کا ازالہ ہو اور غذا وہ جس سے مواد صالحہ پیدا ہوں۔ چونکہ اعمال شرعیہ میں یہ دونوں شانیں ہیں۔ اس لئے وہ بمنزلہ دوا اور غذا کے ہوئے۔ پس جتنے اعمال مفرد تھے نماز میں ان سب کو جمع کر کے ایک مرکب بنا دیا ہے۔

دیکھئے ایک عمل روزہ ہے، ایک تلاوت کلام اللہ ہے ایک اعتکاف ہے۔ روزہ کے فضائل

اور تلاوت اور اعتکاف کے معلوم ہیں کہ کتنے کچھ ہیں سو جس عمل کے اندر یہ سب جمع ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کی کیا کچھ فضیلت ہوگی اور وہ نماز ہے کہ اس میں ان میں سے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں موجود ہیں۔ روزہ تو اس لئے کہ اس میں تین چیزیں ہیں کھانے اور پینے اور مقاربت کا ترک کرنا سو نماز میں یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا نماز میں روزہ کی شان ہوئی بلکہ نماز کے اندر روزہ کی شان روزہ کے اعتبار سے علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی ہے وہ یہ کہ نماز کے اندر بہت سے ایسے مباحات سے بھی روک دیا گیا ہے جن سے روزہ میں اس قدر روک نہیں کی گئی۔ اس میں تو صرف تین چیز سے روکا گیا ہے اور یہاں چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، کھانے پینے سب سے ممانعت ہے۔ بولنا بھی منع ہے حتیٰ کہ دعا بھی وہ درست ہے جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو۔

نماز فاسد

اگر اللہ سے باتیں کرو تو ایسی نہ ہوں جس کا سوال لوگوں سے کر سکتے ہو۔ اگر ایسی دعا کرو گے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ گو عربی میں ہو اور جو مشابہ کلام ناس کے نہ ہو وہ مفسد نہیں۔ گو اردو ہی میں ہو۔ تو ایسی دعا اردو میں ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو میں دعا کیا کرو بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اردو میں دعا کرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی جب کہ وہ کلام ناس کے مشابہ نہ ہو لیکن بجز عربی کے دوسری زبان میں ہونا ہے حرام اور جن صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے سو اس کا فساد بوجہ اس کے نہیں کہ اردو میں ہے بلکہ بوجہ مشابہت کلام ناس کے ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ہمارے ایک دوست کہتے تھے کہ ہم نے منیہ میں پڑھا تھا کہ کلام ناس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ آپ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ عربی کے سوا اردو وغیرہ بولنے سے نماز جاتی رہتی ہے اور عربی میں بولنے سے نہیں جاتی۔ اتفاق سے امام کو سہو ہوا کہ قعدہ اولیٰ کو قعدہ اخیر سمجھ گیا اس وجہ سے بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ سلام پھیرنے کے قریب ہوا تو آپ کہتے ہیں قُمْ۔ امام کو سن کر خود یاد آ گیا کہ یہ قعدہ اولیٰ ہے اس وجہ سے کھڑا ہوگا یہ دل میں کہنے لگے کہ عربی سے بڑا فائدہ ہے۔ نماز فاسد بھی نہ ہوئی اور کام بھی بن گیا۔ امام صاحب نے بعد نماز کہا کہ قم والا کون تھا یہ بولے میں تھا۔ امام صاحب نے کہا کہ بھائی اس طرح نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کلام ناس کے ساتھ تکلم تھوڑا ہی کیا ہے۔ آپ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جو بات عربی میں ہو وہ کلام ناس نہیں ہوتی۔ کلام ناس وہ بات ہوتی ہے جو کہ غیر عربی اردو وغیرہ میں ہو۔

عربی پر دوسری حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس لغت بہت بولتے تھے ان کی اسامیوں میں سے کچھ گنواران کے پاس آئے۔ رئیس صاحب نے پوچھا امسال تمہارے زار گندم پر تقاطر امطار ہوایا نہیں۔ گنوار لوگ اس کو سن کر متحیر تھے کہ جانے میاں کیا کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ لغات کہاں سنے تھے ایک گنواران میں ہوشیار تھے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں پھر آئیو جب آدمیوں کی بولی بولیں گے۔

خلاصہ یہ کہ کلام ناس سے خواہ عربی میں ہو یا غیر عربی میں نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ سو نماز وہ چیز ہے کہ کھانا پینا تو درکنار کلام کرنے تک سے بھی وہ فاسد ہو جاتی ہے۔ جب کہ وہ کلام ناس سے ہو۔ اور کسی مخلوق سے کلام کرنا تو کہاں خود حق تعالیٰ سے ایسا کلام کرنا جو آدمیوں سے ہو سکتا ہے اس سے بھی تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ہاں جو چیز بندوں سے نہیں مانگی جاتی جیسے مغفرت اس سے نماز نہیں جاتی خیال کیجئے کہ نماز میں کتنا بڑا روزہ ہے۔

نماز میں ہنسنا اور رونا

چنانچہ نماز میں ہنسی کی بھی ممانعت ہے ہنسی کے تین درجے ہیں۔ قہقہہ، ضحک، تبسم۔ قہقہہ میں نماز تو سب کے نزدیک فاسد ہو جاتی ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک وضو بھی جاتا رہتا ہے۔ اور ضحک سے نماز جاتی ہے وضو نہیں جاتا۔ اور تبسم بے ادبی تو ہے مگر اس سے نماز نہیں جاتی۔ کیونکہ شرعاً تبسم کو ہنسی قرار نہیں دیا گیا۔ گویا وہ ملحقات کلام ہی سے نہیں غرض ہیں یہ سب نماز کے خلاف گو تبسم سے نماز نہ فاسد ہو پس نماز میں ہنسنے کا بھی روزہ ہوا۔

اب رونے کا حکم سنئے کہ نماز میں اس کی بھی ممانعت ہے۔ ہنسنے کا تو اس لئے روزہ ہوا تھا کہ وہ شان نماز کے مناسب ہی نہ تھا۔ مگر اس میں رونے کا بھی روزہ ہے۔ ہاں جنت اور دوزخ کے ذکر سے ہو تو اور بات ہے۔ حالانکہ رونا فی نفسہٖ وہ چیز ہے کہ اس میں پوری نیازمندی کی شان ہے۔ اور نیازمندی کی شان ہر حال میں محمود ہی ہے۔ اگر رونا آخرت کے لئے ہو وہ تو محمود ہی ہے لیکن اگر دنیا کے لئے بھی ہو اس کو بھی دخل ہے قرب میں۔ کیونکہ رونا حزن وغم کی وجہ سے ہوتا ہے اور حزن وغم کی نسبت صوفیا کرام کہتے ہیں کہ بہت بڑی ریاضت ہے۔

ایک بزرگ رو رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیوں رو رہے ہو۔ جواب دیا کہ بھوک لگی ہے واقعی ان حضرات کو اپنی ہستی پر بالکل نظر نہیں ہوتی۔ اگر اپنی کچھ شان سمجھتے تو روٹی کے لئے ہرگز نہ روتے

کیونکہ یہ خیال ہوتا کہ روٹی کے لئے رونا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہوگا تو کیا کہے گا۔ غرض کہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ بھوک کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ کہنے والے نے کہا کہ شرم نہیں آتی بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے تو بھوک اس لئے لگائی ہے کہ میرا رونا دیکھیں جب وہ ہی ہمارا رونا دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ روئیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

حقیقت کمال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے آپ نے فرمایا طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ کلمہ شان استقلال کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ مگر　　در نیابد حال پختہ ہیچ خام

عوام عارفین کی حالت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ عوام تو عارفین کی اس حالت کو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شان استقلال کے خلاف ہے کیونکہ وہ بزرگی اسے سمجھتے ہیں کہ آدمی پتھر ہو جائے کچھ حس ہی نہ رہے بلکہ فطرت کے خلاف اس کے افعال صادر ہوں۔ بعض کی حالت یہ ہوئی ہے کہ ان کا بچہ مرگیا اور وہ ہنس پڑے۔ عوام ایسی حکایت کو بہت وقعت سے دیکھتے ہیں اور کمال سمجھتے ہیں حالانکہ کامل حالت وہ ہے جو مشابہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم روئے۔ پس معلوم ہو گیا کہ مصیبت میں غم نہ ہونا کمال کی بات نہیں۔

پھر آج کل لوگ جو اس کو کمال اور بزرگی سمجھتے ہیں تو کیا بزرگی کے یہ معنی ہیں کہ کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ حالانکہ بزرگوں پر تو ہر شے کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ہاں حدود سے باہر اس کے مقتضا پر عمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ نامناسب بات سے بزرگوں کو غصہ آتا ہے اور تغیر ہوتا ہے مگر پھر بھی مقتضا پر عمل کرنے میں اعتدال ہوتا ہے۔ حد سے تجاوز نہیں کرتے اور ان حضرات پر اثر کیسے نہ ہو۔ بادشاہوں کے حواس اتنے سلیم نہیں ہوتے جتنے ان حضرات کے ہوتے ہیں۔ ان کا ادراک بہت صحیح ہوتا ہے۔ اسی واسطے ان کو اولاد کی محبت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؓ اور حضرت امام حسنؓ کھیلتے ہوئے آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرط محبت سے خطبہ پڑھ کر منبر سے اتر آئے اور پیار کیا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیار کرتے دیکھ کر ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے دس بیٹے ہیں۔ میں نے ان کو کبھی پیار نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ ہی تمہارے دل سے محبت نکال لیں تو میں کیا کرلوں گا۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمر ؓ بیماری میں کراہ رہے تھے جو بزرگ عیادت کو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ ؓ کا مزاج کیسا ہے۔ آپ ؓ نے فرمایا اچھا نہیں۔ وہ بولے آپ ؓ بے استقلالی کی بات فرماتے ہیں حضرت عمر ؓ نے فرمایا کیا میں خدا کے روبرو پہلوان بنوں۔ وہ ضعیف بنائیں اور میں قوی بنوں۔ جب خدا نے عجز کے لئے بیمار کیا ہے تو میں کس لئے قوی بنوں۔ یہ ہیں عارفین۔

یہ حضرات گویا مزاج شناس ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی رضا دیکھتے ہیں اس کے موافق عمل کرتے ہیں کہ اس وقت یہ مناسب ہے اور اس وقت یہ مناسب ہے یہ حکایت اس مناسبت سے بیان ہوئی تھی کہ حزن وغم بڑی ریاضت ہے۔

رونے کی اہمیت

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ عادت یہ تھی کہ ضرورت میں قرض لے لیا۔ جب فتوحات ہوئی ادا کردیا۔ ساری عمر قرضہ میں گزری۔ حتیٰ کہ خاتمہ کے وقت بھی مقروض تھے اور یہ کوئی بزرگی کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ جو قرضہ اللہ کے واسطے ہو وہ گناہ نہیں۔ سو یہ بھی اللہ ہی کے واسطے قرضہ لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ بزرگوں کے یہاں مہمان آتے ہیں۔ جب ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا ہے تو قرض لے کر ان کی مہمانی کرتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس حالت میں آ کر تقاضا کرنا شروع کیا کہ ہم نے آپ کو بزرگ سمجھ کر قرضہ دے دیا تھا اب ادا کیوں نہیں کرتے ہو۔ وہ بزرگ روکھے روکھے جواب دیتے تھے ۔ جب قرض خواہوں نے بہت تنگ کیا تو منہ ڈھانک کر پڑ رہے۔

اتنے میں ایک لڑکا حلوہ بیچتا ہوا نکلا اور اس نے آواز دی۔ انہوں نے اس کو بلوایا اور پوچھا کہ تیرے پاس کتنا حلوہ ہے۔ غرض وہ دو روپیہ کا اترا۔ آپ نے سب خرید لیا اور جتنے لوگ تقاضے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے ان سب کو کھلا دیا حلوا فروش نے دام طلب کئے تو یہ جواب دیا کہ دام ہوتے تو میرے پاس یہ برأت کیوں نظر آتی۔ تو بھی ان ہی میں بیٹھ جا۔ لوگوں نے اور بھی لتاڑا کہ اس بچہ پر بھی آپ نے ظلم کیا۔ اگر ہمیں پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی ہرگز اس کا حلوا نہ کھاتے۔ ان کا یہ فعل لوگوں کو برا معلوم ہوا مگر

ورنیا یدحال پختہ ہیچ خام

اس لڑکے نے یہ حال دیکھ کر رونا شروع کیا کہ میرا استاد مجھے مارڈالے گا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک شخص سینی میں کچھ روپے اور حلوہ والے کے دام علیحدہ ایک کاغذ میں لپیٹے ہوئے لے کر حاضر ہوا۔ وہ روپے سب قرض خواہوں کو تقسیم کئے تو اسی قدر تھے۔ جس میں قرضہ ادا ہو جائے۔ غرض سب کو بیباق کر دیا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت کیا بات تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ جب لوگ قرض طلب کرنے آئے اور مجھ کو تنگ کیا تو میں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ ان کا قرضہ ادا کرا دیجئے میں نے آپ ہی کے واسطے قرض لیا تھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہمارے خزانہ میں تو کچھ کمی نہیں۔ مگر تمہارے یہاں کوئی رونے والا نہیں۔ بس میں نے سوچا کہ کسی کو رلاؤ۔ بس میں نے اس حلوہ والے کو منتخب کیا۔ اسی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

تانہ گرید کودک حلوا فروش بحر بخشائش نے آید بجوش

تانہ گرید طفل کے جوشد لبن تانہ گرید ابر کے خند وچمن

(جب تک حلوا بیچنے والا بچہ روتا نہیں، بخشش کے سمندر کو اس وقت تک جوش نہیں آتا۔ بچہ جب تک روئے نہیں ماں کو بھی دودھ پلانے کا خیال نہیں آتا۔ جب تک بارش نہ برسے چمن میں بہار نہیں آتی)

غرض رونا خواہ دنیا کی وجہ سے ہو اس پر بھی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ پس باوجودیکہ دنیا کی وجہ سے بھی رونا اقرب الی الخشوع اور مفتاح رحمت حق ہے مگر نماز میں اس کی بھی تو بندش ہے۔ ہاں اگر دین کے خوف سے آنکھ سے روئے مگر چلائے نہیں تو جائز ہے۔ دیکھا آپ نے کتنی بڑی شان ہے نماز کی۔

نماز میں چلنا

نیز نماز میں چلنے کا بھی روزہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر متصل چلا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا پھر ایک قدم چلا اور ٹھہر گیا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

ایک صحابیؓ کا قصہ ہے کہ وہ سفر میں تھے۔ نماز پڑھنے گھوڑے پر سے اترے گھوڑے کو چرنے چھوڑ دیا اور باگ کی رسی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نماز پڑھنے لگے گھوڑا چرتا ہوا آگے سرکتا تو یہ بھی ایک ایک قدم سرک جاتے۔ ایک خارجی نے دیکھا تو کہا سبحان اللہ! یہ صحابی ہیں۔ کیا خوب صورت نماز ہو رہی ہے۔ سلام کے بعد آپؓ نے فرمایا کہ یہ کون سی اعتراض کی بات ہے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آسانی کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ سہولت پسند تھے۔ قدم بڑھانے کو دیکھا کہ گھوڑے

کے ساتھ میں قدم بڑھاتا ہوں۔ اس پر اعتراض کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا (یعنی باگ نہ پکڑے رہتا) تو گھوڑا بھاگ جاتا۔ میں پیادہ چلنے پر قادر نہیں۔ مجھ کو کتنی تکلیف ہوتی۔

اگر کوئی کہے کہ اگر تکلیف ہوتی بھی تو اس سے دین کا کیا ضرر تھا۔ سو جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ اللہ والے پریشان نہیں ہوتے۔ اللہ والوں کو پریشان اور مضطرب کسی بات میں نہ دیکھو گے۔ ہاں کمر میں درد ہو گیا۔ بیماری ہو گئی یہ تو دیکھو گے مگر پریشانی حقیقت میں جس کا نام ہے وہ ان کو نہیں ہوتی کیونکہ ایک حقیقت ہے پریشانی کی ایک اور صورت ہے اس کی۔ پس اہل اللہ میں پریشانی کی صورت تو ہوتی ہے کہ تکالیف وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں مگر حقیقت پریشانی کی نہیں ہوتی۔

اگر کوئی کہے کہ ایک شخص مر رہا ہے اور پھر بھی کہو کہ مر نہیں رہا۔ یہ تو زبردستی کی بات ہے ہم بزرگوں کو بڑی بڑی پریشانیوں میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ کوئی بیماری کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کوئی فقر و فاقہ میں۔ پھر پریشانی کیسے نہ ہوتی ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعات کو دیکھ لیجئے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا ان کے پاس رہ کر دیکھ لیجئے کہ ان میں پریشانی کے آثار ہیں یا نہیں۔ پریشانی میں آدمی بدحواس ہوتا ہے۔ واللہ وہ حضرات ہر حالت میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی کا محبوب ہو جس کے فراق میں یہ شخص مر رہا ہو کھانا تک چھوٹ گیا ہو۔ ناک پکڑنے سے دم نکلتا ہو اور وہ اتفاق سے مل جائے اور عنایت و مہربانی سے اس کی حالت پر ترس کھا کر بغل میں لے لے اور ایسا دبائے کہ آنکھیں نکلنے لگیں اور وہ یہ دیکھ کر کہ میرے دبانے سے اس کو تکلیف ہے امتحاناً یوں کہے کہ اگر تم کو تکلیف ہو تو میں چھوڑ دوں اور ایک تمہارا رقیب ہے بجائے تمہارے اس کو بغل میں لے لوں۔ اتنا ذوق تو سب کو ہے بتلایئے وہ کیا کہے گا وہ تو یہی کہے گا ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو آپ کی خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت رہے)

کوئی شخص اس عاشق کو پریشان کہہ سکتا ہے؟ کیا اس کو دبانے سے تکلیف ہوگی ہرگز نہیں بلکہ عین راحت ہوگی۔ ہاں تکلیف جسم کو ہوگی مگر روح کو نہ ہوگی اور جمعیت و اطمینان روح کے متعلق ہے۔ کیا آپ نے کبھی آپریشن پچاس روپے دے کر نہیں کرایا۔ اس میں آہ بھی نکلتی ہے آنسو بھی نکلتے

ہیں۔ اس پر کوئی کہے کہ آپریشن کیوں کرایا اور پھر یہ کہ پچاس روپے بھی دیئے تو یہی کہو گے کہ میری رگ رگ میں راحت سما گئی۔ معلوم ہوا کہ جسمانی تکلیف پر مدار نہیں پریشانی کا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسمانی تکلیف ہوتی ہے اور روح کو پریشانی نہیں ہوتی سو اہل اللہ صورۃً پریشان ہیں حقیقۃً نہیں۔ اہل دنیا حقیقۃً پریشان ہیں ہاں صورت تنعم کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی۔

غرض یہ کہ اگر وہ نماز میں گھوڑے کی باگ نہ پکڑتے تو وہ بھاگ جاتا اور مضرت آخرت کا بھی احتمال تھا کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب عبادت کی بدولت اس میں پریشانی ہوتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ میں یہ عبادت نہ کرتا تو اچھا ہوتا عبادت ہی کی بدولت مبتلا ہوا۔ اسی واسطے شریعت نے یہ آسانی کر دی کہ اگر چلنا متصل نہ ہو تو نماز نہ جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں کس قدر راحت کے احکام ہیں۔

نماز کا توڑنا

اگر کوئی کہے کہ ایسی صورت میں اگر گھوڑا دوڑنے لگے تو پھر کیا کریں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ایسے وقت میں نماز توڑنے کی اجازت دے دی ہے۔ یہاں تک کہ ایک درم یعنی چار آنے نقصان پر بھی نماز کے توڑ دینے کی اجازت ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص جوتا چراتا ہو تو نیت توڑ کر اس کو پکڑ لینے کی اجازت ہے یا چار آنے کی ہانڈی جاتی ہو یا خراب ہوتی ہو تو اس وقت بھی نماز توڑ دینے کی اجازت ہے کون کہتا ہے کہ شریعت میں تشدد ہے۔ شریعت میں تو رائی برابر بھی تشدد نہیں بلکہ اور تشدد کی ممانعت ہے۔ دیکھئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لاینبغی للمومن ان یذل نفسه[1] (یعنی مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے)

صحابہؓ نے عرض کیا:

قالو ایارسول الله کیف یذل نفسه (یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا سے کس طرح مراد ہے)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یتحمل من البلاء لما لایطیقه. یعنی ایسی بلا میں اپنے آپ کو پھنسائے جس کی برداشت نہ کر سکے۔

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشدد سے کس طرح منع فرماتے ہیں اور کیسی آسانی سکھاتے ہیں

---

[1] سنن الترمذی: ۲۲۵۴، سنن ابن ماجه ۴۰۱۶، مجمع الزوائد: ۷: ۲۷۴

اور شریعت کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ نماز ہی میں دیکھ لیجئے کتنی سہولت کے احکام میں کھڑے نہ ہوسکو تو بیٹھ کر اور بیٹھ نہ سکو تو لیٹ کر ادا کرلو۔ سفر میں ہو قصر کرو۔ دنیا کے واقعات میں غور کیجئے کہ ہر واقعہ میں سہولت کی کیسی تدابیر تعلیم فرمائی۔

جذبات طبیعہ کی رعایت

مرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔ اس سے زیادہ کوئی امر پریشان کن نہ تھا۔ پھر اس کے بارہ میں کیسی عمدہ تعلیم فرمائی ہے قرآن شریف میں ہے۔

اذا اصابتهم مصيبة قالو اانا لله وانا اليه راجعون

کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اس کے اندر ہم کو تسلی کا طریقہ بتلایا ہے کہ مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے سے تسلی ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو مصیبت میں اس کو پڑھا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا تو جواب یہ ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھنے کو کس نے کہا تھا بلکہ ساتھ میں اس کی حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے وہ یہ کہ مصیبت آنے پر دو باتوں کا لحاظ رہے۔

ایک تو یہ کہ ہم خدا کی ملک ہیں۔ ہم اپنے نہیں۔ جب خدا کے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جیسے چاہیں ہم میں تصرف کریں۔ یہاں رکھیں یا اٹھالیں۔ اس میں تو عقل کی تسلی ہوگئی۔

دوسرے یہ کہ جہاں ہمارے عزیز چلے گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے اس میں طبع کی رعایت ہے۔ ایک عقل اور ایک طبیعت۔ عقل تو انا للہ سے راضی ہوگئی تھی۔ کیونکہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو پھر ہم کو ان کے کسی تصرف پر رنج کرنے کا کیا حق ہے۔ ان کو اختیار ہے جیسا چاہیں کریں مگر طبع ابھی راضی نہ ہوئی تھی کہ باپ مرگیا اس کے مرنے کا کیسے رنج نہ ہو۔ تعلق ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ اس لئے دوسرا جملہ طبع کے سنبھالنے کو بتلایا کہ جس عشرت کدہ میں وہ گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی ہی ملاقات ہوجائے گی۔

اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو حیدرآباد کی وزارت کا عہدہ مل گیا اور وہ وہاں چلا گیا اس کے بیٹے کو اس کے چلے جانے سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ تم کیوں گھبراتے ہو وہ تو بڑے عیش میں ہے وزارت کے عہدہ پر ہے اور تم بھی عنقریب وہیں بلا لئے جاؤ گے کیا کوئی کہہ سکتا ہے

کہ اس کا صدمہ اس کو سن کر باقی رہے گا یہ دوسرا جملہ طبع کی تسلی کے لئے بڑھایا ہے۔

غرض انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم سب اللہ کیلئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں عقل وطبع دونوں کی تسلی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جذبات طبیعہ کی کتنی بڑی رعایت کی ہے ساری دنیا کے عقلاء وحکماء جمع ہو جائیں تو بھی تسلی کا ایسا ذریعہ نہیں لا سکتے۔ دیکھئے جب انا للہ کی حقیت ملحوظ ہوگی کہ ہم سب خدا کی ملک ہیں۔ تو کسی عزیز کے مرنے سے خدا تعالیٰ کی شکایت عقلاً تو اس کے لحاظ کرنے ہی سے پیدا نہ ہوگی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کی مِلک میں دو گھوڑے ہوں۔ ایک کو یہاں باندھ دے اور ایک کو دوسری جگہ باندھ دے انکو کیا منصب ہے اعتراض کا کہ ایسا کیوں کیا یا الماری میں کسی کی دو بوتلیں رکھی ہوں۔ ایک کو نیچے کے تختہ پر رہنے دے اور ایک کو اوپر کے تختہ پر رکھ دے کسی کو کوئی اعتراض کا حق نہیں کہ ایک کو نیچے کیوں رکھا اور دوسری کو اوپر کس واسطے رکھ دیا۔ اس کی ملک ہے جو چاہے کرے۔

اسی طرح ہم سب اللہ کی چیزیں ہیں جس کو چاہیں یہاں رکھیں اور جس کو چاہیں وہاں اٹھالیں۔ کسی کو قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ باقی جذبات طبیعت اپنا اثر ضرور کرتے ہیں تو دوسرے جملہ میں اس کی کتنی رعایت کی ہے۔ یہ نہیں کہ اس امر طبعی پر مواخذہ فرماتے بلکہ اسی اثر کو جائز رکھ کر اس کا تدارک کیا۔

عقل اور شریعت

اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر قانون بنانے والا خدا کے سوا اور کوئی ہوتا تو اس کے بعد کسی کے مرنے پر رونے کی بھی گنجائش نہ ہوتی کیونکہ اور جو شخص قانون مقرر کرتا وہ حکم عقل کا اتباع کرتا اور عقل یہاں کہتی ہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں تو وہ جو چاہے سو کرے ہم کو کیا حق ہے ان کے کسی تصرف پر حزن کرنے کا چہ جائیکہ رونا۔ مگر قربان جایئے شریعت کے کہ رونے کی بھی اجازت دے دی بلکہ ایک قسم کی اس میں فضیلت بھی رکھ دی کہ ھو رحمۃ یعنی آنسو بہانا خدا تعالیٰ کی رحمت ہے حالانکہ عقل اس کو جائز بھی نہیں کہتی۔ دیکھ لیجئے کہ وہ رونا جس کو عقل حرام کہتی ہے۔ خدا کے قانون میں فضیلت قرار دیا جارہا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل کے عقلا دین کے اندر اپنی عقل کو متبوع بناتے ہیں۔ بعض مسائل میں علماء سے مزاحمت کرتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہیں۔ اس مقام پر وہ لوگ اپنی عقل سے استفتاء کریں اور بتلائیں کہ عقل زیادہ خیر خواہ ہے یا شریعت۔ عقل تو رونے کو جرم بتلاتی ہے اور شریعت اس کو اچھا شمار کرتی ہے۔ کس کے حکم میں آسانی ہے شریعت کے

یا عقل کے ظاہر بات ہے کہ شریعت کا فتویٰ زیادہ رحم پرمبنی ہے۔اب جو خیر خواہ ہے اس کے عوض عقل کو امام بنانا چاہتے ہیں۔مولانا فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعدازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دوراندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

شریعت اور راحت

اب سمجھ لیجئے کہ جب شریعت نے موت میں جو کہ اتنی بڑی پریشانی کا واقعہ ہے اس درجہ سہولت کی رعایت کی ہے اور اس قدر راحت پہنچائی ہے تو اور واقعات میں کیوں راحت کا سامان نہ کیا ہوگا۔اسی طرح شریعت نے ہم کو ہر امر میں ایسا طریقہ بتلایا ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں راحت ہی راحت ہے۔اسی واسطے احکام شریعت کے بارہ میں دعویٰ کیا گیا ہے۔

الابذکر الله تطمئن القلوب کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔

اور ہر عمل صالح ذکر اللہ ہے۔پس مطلب یہ ہوا کہ جن اعمال کی تعلیم شریعت نے کی صرف انہی سے قلوب کو راحت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ **بذکر الله** کو جو **تطمئن** سے مقدم لائے ہیں۔اس میں اشارہ ہے حصر کی طرف کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے کے سوا اطمینان اور راحت کا کوئی طریقہ نہیں۔یہ ہے شریعت کی راحت رساں تعلیم جس کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔

بہرحال ذکر اس پر تھا کہ شریعت نے روزہ میں بعض مباحات کی اجازت دی ہے مگر نماز میں نہیں دی۔تو نماز میں روزہ کی شان روزہ سے بھی بڑھ کر ہوئی۔

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا

روزہ میں اِدھر اُدھر دیکھنا جائز ہے نماز میں وہ بھی نہیں گو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔مگر ادب صلوٰۃ کے خلاف ہے۔ہاں ادب نہ ہو نرا ضابطہ ہی ہو تو اور بات ہے۔میرٹھ میں ایک مولوی صاحب تھے۔نماز کے اندر ادھر ادھر دیکھنے کا مرض تھا۔اتفاق سے ایک شخص جماعت میں ان کے پاس کھڑے ہو گئے۔وہ مولوی کھڑے ہوئے اور حسب عادت حالت ان کی یہ تھی کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔نماز کے بعد اس شخص نے کہا کہ آپ نماز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے آپ کی نماز ہی کیا ہوئی۔بجائے اس کے کہ وہ مولوی ان کے ممنون ہوتے کہتے ہیں کہ میرے ادھر ادھر

دیکھنے کی تمہیں جب ہی تو خبر ہوئی جب کہ تم نے مجھے دیکھا پس تمہاری نماز بھی نہیں ہوئی۔بس وہ یہ کہہ کر سرخرو ہو گئے مگر کس کے سامنے مخلوق کے سامنے۔اللہ کے سامنے تو سرخرو نہ ہوئے۔مخلوق کے سامنے سرخرو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

کارہا باخلق آری جملہ راست　　　باخدا تزوید وحیلہ کے رواست
کار بادراست باید داشتن　　　رایت اخلاص وصدق افراشتن

(مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں۔خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے۔حق تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئیں،اخلاص اور صدق کا علم بلند کرنا چاہیے)

اے صاحبو! حکام کے سامنے جتنا ادب ملحوظ رکھتے ہو کم از کم حق تعالیٰ کے سامنے اتنا تو رکھو۔ جب حکام کی ہیبت دنیا میں مانع ہے نگاہ اٹھانے سے تو حق تعالیٰ میں تو علاوہ ہیبت کے اور بہت سے امور بھی اس کے مقتضی موجود ہیں۔مثلاً منجملہ ان کے ایک محبت بھی ہے۔کیا ادھر ادھر دیکھنے کیلئے محبوب سے نگاہ ہٹاؤ گے۔عشاق سے پوچھئے کہ محبوب کے سامنے موجود ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنا کیسا ہے۔عشاق کو تو محبوب سے ایک دم بھی غفلت گوارا نہیں ہوتی ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(محبوب حقیقی سے تھوڑی دیر بھی غفلت میں نہ گزار،شاید وہ کسی وقت کرم کردے اور تجھے اس کی خبر نہ ہو)

نماز میں تو غفلت کیسی غیر نماز میں بھی غفلت نہ چاہیے۔حاکم کے سامنے تو ادھر ادھر دیکھتے ہی نہیں۔اس خیال سے کہ شاید ہمیں نگاہ ہٹاتے ہوئے دیکھ لے۔پس اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہمیں دیکھتے ہیں اور کسی وقت ہم سے توجہ نہیں ہٹاتے۔پھر ان کے سامنے ادھر ادھر دیکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ قلب بھی دوسری طرف متوجہ نہ ہوتا۔خیر اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس پر قدرت نہیں تو نگاہ پر تو قدرت ہے۔نگاہ پر قدرت ہونے کا تو انکار نہیں کرسکتے۔پس اس کو دوسری طرف کیوں متوجہ کرتے ہو۔دوسرے اس میں کچھ فائدہ بھی تو نہیں ہے کیونکہ جن چیزوں کو دیکھتے ہو ان کو نماز کے اندر لے تو سکتے نہیں پس فعل عبث ہونے کی وجہ سے اس سے بچاؤ ہونا چاہیے۔دیکھنے سے جب کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی تو پھر کیوں دیکھتے ہو۔

غرض یہ کہ نماز میں نگاہ کا بھی روزہ ہے اور چونکہ نماز میں قیود بہت ہیں کہ ہنسے بولنے چلنے

پھرنے ، دیکھنے بھالنے اوراس کے علاوہ اور بہت سی باتوں سے ممانعت ہے اسی وجہ سے اس کی شان میں کہا گیا ہے۔

انها لکبیرة ۔ کہ نماز بہت گراں ہے۔

کیوں جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ہمارے اندران کے تقاضے موجود ہیں۔

آج کل کی آزادی

ہمارا جی چاہتا ہے کہ بولیں بھی کھائیں پیئں بھی چلیں پھریں بھی بس ہر طرح سے آزاد رہنے کو طبیعت چاہتی ہے اسی لئے یہ نفس پر بہت شاق ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی تمام خواہشات سے رک جانا پڑتا ہے۔ مثلاً خوشی سے بیٹھے ہوئے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، چلتے پھرتے ہیں مزے اڑا رہے ہیں۔ بس نماز کا وقت آیا اور خدا کی جانب سے حکم ہوا کہ ایک گھنٹہ کے لئے ہمارے دربار میں آؤ اور اپنی خواہشات کو چھوڑو۔ بس مصیبت آ گئی۔

بات یہ ہے کہ انسان مقید ہونا نہیں چاہتا اور شریعت نے مقید کیا ہے۔ دونوں کی مرضی اللہ کی مرضی اور بندہ کی مرضی۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے نماز لوگوں پر بھاری ہے۔ اسی لئے اس کے حق میں فرمایا کہ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ کہ اس سے آزادی کا خون ہوتا ہے۔ جس کا آج کل ہر وقت سبق گایا جاتا ہے۔ مگر یہ آج کل کی آزادی ہے عجیب کہ لوگ صرف شرعیات میں آزاد رہنا چاہتے ہیں کہ کوئی قید شرعی ہمارے اوپر نہ رہے ہم تو جب جانیں کہ تکوینیات میں بھی آزادی اختیار کرلو کہ خدا مارنا چاہے اور نہ مریں۔ طاعون میں مبتلا کرنا چاہے اور مبتلا نہ ہوں۔ بس جیسے تکوینیات میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شرعیات کو سمجھ لو کہ اس میں بھی آزاد نہیں ہونا چاہیے حق تعالیٰ نے جو امر بھی فرمایا ہے اس میں اپنے آپ کو مجبور خیال کرو۔

خشوع کی حقیقت

اب جہاں حق تعالیٰ نے ہمارے مرض کا بیان کیا ہے (کہ نماز بھاری ہے) وہاں اس کا علاج بھی بتلا دیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

انها لکبیرة الاعلیٰ الخاشعین الذین یظنون انهم ملقوا ربهم و انهم الیه راجعون.

یعنی نماز سب پر بھاری ہے مگر خشوع کرنے والوں پر بھاری نہیں جن کو یقین ہے اس بات کا کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نماز بھاری ضرور ہے بوجہ قیود کے مگر جو لوگ اپنے اندر خشوع پیدا کر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ سے ملنے اور ان کے پاس جانے کا خیال جما لیتے ہیں۔ ان پر بھاری نہیں رہتی۔ سو اس کے اندر ہمارے مرض کا پورا علاج بتلا دیا کہ طریقہ خشوع سے نماز پڑھو تو کچھ گرانی نہیں رہے گی۔

اب خشوع کو لوگ جانے کیا سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اس کو اختیاری بھی نہیں سمجھتے سو خشوع کی حقیقت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے حق کے کسی قسم کا خطرہ نہ آئے یہ غلط ہے۔ خشوع کی حقیقت یہ ہے کہ خطرہ خود نہ لادے گو از خود آ جائے اور یہ نہ آنا تو غیر اختیاری ہے لیکن نہ لانا اختیار میں ہے۔ آورد خطرات منافی خشوع ہے۔ آمد خطرات منافی نہیں۔ آمد و آورد میں فرق ظاہر ہے۔ ہاں البتہ یہ بھی کرنا چاہیے کہ جب وسوسہ بلا قصد آئے تو اس میں بقصد مشغول نہ ہو جائے۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ وسوسہ خود لاتے تو نہیں لیکن جب آتا ہے تو اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی غلطی ہے نہ قصد سے لانا ہو نہ قصد سے ابقاء ہو۔ کیونکہ بقصد باقی رکھنا بھی منافی خشوع ہے۔ بس جب وسوسہ آئے تو اس کو رکھے نہیں دفع کر دے۔

دفع وساوس کے طریق

ایک بات دقیق ہے قابل یاد رکھنے کے وہ یہ کہ عارفین کے نزدیک دفع کا مطلوب ہونا تو سب کو معلوم ہے۔ اب اس میں گفتگو ہے کہ کس طریقہ سے دفع کرنا چاہیے۔ سو اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ صورت ہے کہ براہ راست وساوس کو ہٹا دے کہ جب کوئی وسوسہ آئے کوشش کر کے اس کو اپنے خیال سے دور کر دے۔ اس میں تو بہت دقت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کہ دفع کرتے ہیں مگر دفع نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بواسطہ ہٹائے یہ عمدہ تدبیر ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مقدمہ سن لو۔ وہ یہ کہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد. کہ نفس کی توجہ ایک وقت میں دو چیز کی طرف نہیں ہوتی

اب سنئے بواسطہ دفع یہ ہے کہ قلب میں کسی دوسری چیز کو لے آؤ۔ دوسری چیز کے لانے سے اس کی طرف توجہ ہو جائے گی۔ اور وسوسہ کی طرف توجہ نہ رہے گی۔ اب بعض مشائخ دفع بلا واسطہ

بتلاتے ہیں۔اس میں نہایت دقت واقع ہوتی ہے کیونکہ بلا واسطہ ہٹانے میں یہ تو ہوتا نہیں کہ دوسری طرف توجہ ہو اور اس توجہ کی وجہ سے وسوسہ کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔اس میں خود وسوسہ کی طرف توجہ ہو جاتی ہے گو مقصد دفع سہی مگر استحضار تو ہوا۔اس لئے اس کا دفع ہونا مشکل ہو جاتا ہے اس وسوسہ کی مثال تار بجلی کی سی ہے کہ وہ تمہیں لگے جب لپٹے۔اور جو تم اس کو لگو ہٹانے ہی کے لئے سہی جب لپٹے۔بس وسوسہ ہٹانے کی تدبیر یہ ہے کہ بواسطہ ہٹاؤ۔وہ یہ کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی طرف متوجہ ہو آیا پتھر کی طرف یا اور کسی چیز کی طرف ہو اس کی تعیین میں ضرورت ہے دلیل شرعی کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مقبلا علیهما بقلبه کہ قلب کو متوجہ کرے دونوں رکعت یعنی نماز کی طرف۔

اب نماز کی طرف متوجہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ پوری نماز کی طرف ایک دم سے متوجہ ہو کیونکہ نماز مرکب ہے مختلف اجزا سے۔پس اس کی طرف توجہ اس طرح ہوگی کہ اس کے تمام اجزا کی طرف توجہ ہو مگر اس میں یہ خرابی ہے کہ بہت سے اجزا کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں تشویش ہوگی۔اس لئے یہ صورت تو ٹھیک نہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جس جزو میں مشغول ہو اسی کی طرف توجہ رکھے۔اس کا طریقہ ایک بزرگ نے بتلایا ہے۔وہ یہ ہے کہ مثلاً **سبحانک اللھم** یاد سے مت پڑھو کہ رٹا ہوا ہونے کی وجہ سے زبان سے خود نکلتا چلا جائے۔بلکہ ہر ہر جزو سوچ کر پڑھو کہ اب **سبحانک اللھم** کہہ رہا ہوں اب **تبارک اسمک** پڑھتا ہوں۔اب **لا الہ غیرک** نکالتا ہوں۔اب **بسم اللہ** اب **الحمدللہ** علیٰ ہذا۔ہر ہر لفظ کو ارادہ سے ادا کرو۔جب قلب افکار کی طرف متوجہ رہے گا تو وساوس کی طرف توجہ نہ رہے گی۔کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے۔ **النفس لاتتوجہ الی شیئین فی ان واحد**۔اس طریقہ سے اول ہی دن خشوع ہو جائے گا۔مگر یہ ضرور ہے کہ اول اول نماز میں تنگی ہوگی۔کیونکہ خیالات پریشان ہوں گے ان سے توجہ ہٹا کر ذکر کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اس وجہ سے حقیقت کو گرانی ہوگی۔اور بعض کو بآسانی بھی خشوع میسر ہو جائے گا۔

جب یہ تدبیر وساوس سے نجات کی ملی تو اب ایک اور آفت میں مبتلا ہوگا وہ یہ کہ یوں خیال کرے گا کہ طریقہ تو مل ہی گیا۔بس جب چاہیں گے کرلیں گے اس لئے اول تو کرتے نہیں اور اگر کرتے ہیں تو ہمیشہ نہیں کرتے۔مشائخ تک اس میں مبتلا ہیں اور یہ حالت ہے۔

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر می کنند　　چوں بخلوت می رسند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم زدانش مند مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چراخودتوبہ کمتر می کنند

(واعظین محراب و منبر پر جلوہ کرتے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو وہ دوسرے کام کرتے ہیں۔ مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ مجلس کے دانشمندان یہ سوال کرتے ہیں کہ دوسروں کو توبہ کی تلقین کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے)

اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی طبیب ناز کرے کہ مجھ کو خارش کا نسخہ بڑا مجرب معلوم ہے مگر ساری عمر خارش میں مبتلا رہ کر مرجائے اور اس کا استعمال نہ کرے۔ سو اس کو نسخہ سے کیا فائدہ ہو۔ کوئی انجان کسی بات سے محروم رہے تو ایسی مصیبت نہیں جیسے کوئی جان بوجھ کر محروم رہے اسی کے بارے میں کہتے ہیں ۔

فان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ　　وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

(اگر تجھے اس کا علم نہیں تو یہ مصیبت ہے اور اگر تجھے اس کا علم ہے تو یہ بڑی مصیبت ہے)

اس تدبیر کے ملنے کے بعد شیطان دو طریقہ سے دھوکا دے گا۔ ایک تو یہ کہ ہر ہر لفظ پر توجہ کرنے سے شروع میں دل تنگ ہوگا۔ پس شیطان بہکائے گا کہ یہ تدبیر تو بہت مشکل ہے۔ تیرے بس کی نہیں ہے۔ اور ایک اس طرح کہ یہ سمجھائے گا کہ طریقہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے جب جی چاہے گا اس سے علاج کرلیں گے۔ مگر خوب سمجھ لو کہ کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ دو چار دن اس طریقہ سے نماز پڑھنے میں طبیعت زچ بچ رہے گی مگر پھر یہی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کی لذت وراحت میسر ہوگی۔ اس کا ترک برا معلوم ہوگا۔

حاصل یہ کہ خشوع کے حاصل کرنے کی یہ صورت ہے۔ پس جب خشوع حاصل ہوجائے گا تو پھر نماز میں کچھ گرانی نہ رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ کہ نماز بھاری ہے مگر خاشعین پر بھاری نہیں۔ پھر اس کی نماز ایسی ہوگی جس کے بارہ میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ نیچے کو گرو (یعنی سجدہ کرو) اور قریب ہوجاؤ (آیت سجدہ)۔

سجدہ کی حقیقت

بلندی والوں سے تو قرب ہوتا ہے ترفع سے اور یہاں قرب ہوتا ہے پستی سے ۔

قرب ترپستی بہ بالا اختن است　　قرب حق ازقید ہستی رستن است

(قرب اس کا نام نہیں کہ نیچے سے اوپر چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ ہستی سے چھوٹ جاؤ)

بس ان کے قرب کا یہی طریقہ ہے کہ پستی فنا حاصل کرلو اور سجدہ کی حقیقت یہی فنا اور نیاز مندی ہے۔ اس لئے وہ سبب ہے قرب کا۔ خلاصہ یہ کہ اول اول تو قیدیں بری معلوم ہوں گی۔ مگر پھر یہ قیدیں ایسی ہوں گی جیسا کہ شیخ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　　شکارش نجوید خلاص ازکمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی حاصل کرنا نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں چاہتا)

چندروز ایسا کر کے اس کا مشاہدہ کرلو۔ اویس قرنی ہیں یا اور کوئی بزرگ ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ساری رات دو رکعت میں ختم کر دیتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہر رات کو ایک ایک رکن کے لئے مقرر کر لیتے۔ ایک دن فرماتے ہیں لیلة القیام دوسرے دن فرماتے ہیں لیلة الرکوع اور اس رات کے اکثر حصہ میں اسی رکن کے اندر مشغول رہتے اور جب تھوڑی رات رہ جاتی تو بقیہ ارکان پورا کر لیتے اور کہتے افسوس کہ مجھے دل بھر کر نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ کاش کہ ایک رات ایسی ہوتی کہ اس کا ایک سرا ازل سے ملا ہوا ہوتا اور دوسرا ابد سے اور اس میں ارمان پورا کرتا آپ کو اس پر تعجب ہوگا مگر عشاق کی شان ہی جدا ہے۔ ان کا تو کبھی دل ہی نہیں بھرتا ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

نگویم کہ برآب قادرنیند　　　کہ بر ساحل نیل مستقی اند

(میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں، لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح پیاسے ہیں)

اور یہ حالت ہوتی ہے

دلآرام دربر دلآرام جو　　　لب از تشنگی خشک و برطرف جو

(محبوب سے ہم کنار اور محبوب کی تلاش، پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار)

اس وقت یہ قیود زلف یار کی قیود ہو جائیں گے جس کی یہ حالت ہے۔

گرد و صد زنجیر آری بگسلم　　　غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیریں ہوں تو توڑ دوں، سوائے اپنے محبوب کی زلف کے بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کا گرفتار ہونا برداشت نہیں)

اب تو قیدیں نظر آتی ہیں مگر پھر یہ قیود زلف یار کی قیدیں ہوں گی کہ کبھی ان سے نکلنا نہ چاہے گا۔

خلوت با محبوب

سچ کہتا ہوں کہ جو محب ہوگا وہ تو یہ چاہے گا کہ خلوت ہو اور محبوب کے ساتھ بے تکلف باتیں

کرنا شروع کردے گو ساری رات کیوں نہ گزر جائے۔ سو وہ خلوت یہی نماز ہے۔ واقعی اگر نماز نہ ہوتی تو جن کے واقعات بڑھے ہوئے ہیں ان کے لئے کوئی خلوت کی صورت نہ تھی۔ کیونکہ اور تمام عبادات میں بولنا تو ضروری جائز ہے اس لئے ان میں لوگ اس سے بولنے چالنے سے بند نہ ہوتے اور نماز میں ہے اس کی ممانعت۔ اس لئے جہاں نماز شروع کی اور تمام لوگ اس سے بات چیت کرنے سے بند۔ لیجئے نماز میں حق تعالٰی کے ساتھ خلوت میسر ہوگئی اور یہ خلوت وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست　　　جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق (کہیں) آرام نہیں ہے)

نماز ہی کیا پاکیزہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے خلوت میسر ہوگئی اور جو قیود گراں تھیں انہی کی بدولت آسان ہوگئی اور خلوت بھی ایسی کہ اس کے اندر کوئی بھی حارج ہی نہیں ہوسکتا۔ جب نماز شروع کردی پھر بادشاہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر سورۂ بقر بھی پڑھو تب بھی کوئی تقاضا نہیں کرسکتا۔ جب نیت باندھ لی اور سب کو ہرادیا۔ ہاں کوئی ظالم ظلم ہی کرنے لگے تو جدا بات ہے۔ ایسی آسان صورت ہے خلوت کی کہ جب کسی سے جی گھبرائے بس اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لو۔ نمازی کا کوئی کیا کرے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دوست مذاق میں گدگدی اٹھاتے ہیں مگر جب نماز شروع کردی تو سب الگ بیٹھ جاتے ہیں یہ کاہے کی بدولت ہوا۔ قیود کی بدولت۔ اگر قیود نہ ہوتیں تو لوگ کہتے کہ میاں نماز بھی پڑھو اور باتیں بھی کرو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ قیود کیسی قدر کی چیز ہیں اس لئے اہل محبت اس قید کو زلف یار کی قید سمجھتے ہیں کیونکہ یہ خلوت بالمحبوب قیود ہی سے تو میسر ہوئی ہے۔

کیرانہ میں میرے عزیزوں میں ایک درویش تھے۔ وہ خلوت کے لئے دروازہ پر پہرہ چوکی رکھتے نہ تھے کہ یہ لوگوں کا ناگوار ہوتا ہے بلکہ تخلیہ کی یہ صورت اختیار کی تھی کہ بیٹھک میں عام منظر پر بیٹھتے مگر ہر وقت نفل پڑھتے تھے۔ اگر کوئی ملنے آیا تو سلام پھیر کر اس کا مزاج پوچھا اور پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ پھر سلام پھیر کر دو چار باتیں کیں اور پھر اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی خلوت اور انجمن اسی کو کہتے ہیں۔ غرض کہ خلوت کی خلوت تھی اور کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا۔

سو یہ نماز ایسی چیز ہے کہ جس وقت خلوت چاہو نماز شروع کردو بس خلوت ہوجائے گی۔ تو گویا نماز خلوت گاہ حق ہے۔ سو یہ کس وجہ سے خلوت گاہ حق بنی، قیود ہی کی بدولت تو بنی۔ ان قیود

سے معلوم ہوگیا کہ نماز میں بہت بڑا روزہ ہے غرض نماز میں روزہ بھی پایا گیا۔

نماز میں حج

اسی طرح نماز میں حج بھی موجود ہے۔ کیونکہ حج کی حقیقت ہے تعلق بالبیت۔ سو نماز میں وہ موجود ہے۔ چنانچہ حکم ہے: **فول وجھک شطرا لمسجدالحرام** کہ نماز کے وقت، بیت الحرام کی جانب قصد کر کے رخ کرلیا کرو۔

سو تعلق بالبیت نماز کے اندر قلب میں بھی ہے اور ظاہر میں بھی ظاہر میں تو یہ کہ نماز کی حالت میں اسی کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کو فرض کر دیا گیا ہے۔ اور قلب میں یہ کہ استقبال کعبہ کی نیت کی جاتی ہے۔ پس جو نماز پڑھے گا اسے برکات حج بھی میسر ہوں گے۔

اسی طرح نماز میں اعتکاف بھی ہے کیونکہ اعتکاف کی روح و حقیقت ہے گناہوں سے رکنا **المعتکف یعتکف الذنوب کلها**[۱] حدیث ہے اور یہ (خصوصیت) نماز کے اندر موجود ہے۔ چنانچہ نماز کے اندر تمام گناہوں سے رکتا ہے۔ نماز میں کون گناہ کرسکتا ہے **ان الصلوٰة تنھٰی** کی بعض نے یہی تفسیر کی ہے کہ نمازی جب تک نماز میں رہتا ہے اس وقت تک وہ اس کو گناہوں سے روکتی ہے۔ گو اس کی اور تفسیریں بھی ہیں مگر یہ بھی ایک لطیف تفسیر ہے۔ تلاوت قرآن بھی نماز میں موجود ہے جس کے حدیث میں بہت فضائل آئے۔ چنانچہ قرأت نماز میں فرض ہے بدون قرأت نماز ہی نہیں ہوتی۔

نماز کی جامعیت

پس جو شخص نماز پڑھے گا اس کو تلاوت قرآن کے فضائل بھی حاصل ہوں گے۔ خیال تو کیجئے کہ ذرا سی مختصر چیز میں کیا کیا فضائل مل گئے۔ حج بھی مل گیا، روزہ بھی مل گیا۔ تلاوت قرآن بھی اور اعتکاف بھی۔

بعض اذکار کی فضیلت احادیث میں آئی ہے جیسے **سبحان الله** کہ اس کے بارہ میں آیا ہے کہ سبحان اللہ نصف میزان ہے نماز میں وہ بھی موجود ہے چنانچہ رکوع میں پڑھتے ہیں۔ **سبحان ربی العظیم** اور سجدہ میں **سبحان ربی الاعلیٰ** احادیث میں دعا کے بہت فضائل وارد ہیں اور قرآن میں کہیں کہیں اور خصوص فاتحہ میں تو ہر رکعت میں دعا بھی موجود ہے اور وہ نماز میں پڑھا

---

[۱] لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث"

ہی جاتا ہے۔ نیز درود شریف کے بعد بھی دعا کی جاتی ہے۔ پس نماز میں دعا کے فضائل بھی آ گئے۔ درود شریف کے کتنے فضائل ہیں وہ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ نمازی کسی برکت سے خالی نہیں۔ دعا ہے وہ اس میں موجود ثنا ہے وہ اس میں موجود، ذکر مبارک ہے وہ اس میں موجود۔ بعض لوگ اولیاء اللہ کا دم بھرتے ہیں اور ان کے تذکرے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ سوان کا تذکرہ بھی نماز میں موجود ہے۔ چنانچہ ہر رکعت میں پڑھتے ہیں۔ اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ اس میں اولیاء اللہ بھی تو آ گئے۔

اب زکوٰۃ رہ گئی۔ شاید کوئی کہے کہ نماز میں زکوٰۃ کہاں ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ زکوٰۃ کی روح ہے انفاق فی سبیل اللہ۔ ظاہر ہے کہ نماز ننگے تو پڑھو گے نہیں۔ کپڑا تو پہنو ہی گے اور اس میں خرچ بھی ہو ہی گا (خصوصاً اس زمانہ میں کہ کپڑے کی بہت زیادہ قیمت ہوگئی ہے) لہٰذا انفاق بھی ہو گیا۔ اب کون سی عبادت رہ گئی جو نماز میں نہیں۔

شاید کوئی کہنے لگے کہ نماز میں قربانی نہیں تو سمجھ لیجئے کہ قربانی کی حقیقت باطنی ہے۔ اپنے کو فنا کر دینا اور اپنی خواہشات کو مٹا دینا۔ سو وہ نماز میں ایسی ہے کہ اپنے نفس سے پوچھو کہ قیود کے اندر مقید ہو کر اپنی خواہشات کو چھوڑنا پڑتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

معنی تکبیر ایں است اے ایم — کاے خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر مے کنی — ہم چنیں درذبح نفس کشتنی
گوئی اللہ اکبر وایں شوم را — سر ببر تا وارہد اجاں ازغنا
تن چوں اسمعیلؑ جاں ہمچو خلیلؑ — کرد جاں تکبیر برجسم نبیل

(تکبیر کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ ہم تمہارے سامنے قربان ہوتے ہیں.... ذبح کے وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس کے وقت جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر ہو.... اور اس منحوس کا سر کاٹ مارو اور جان کو تکلیف سے رہائی دو.... مثل تن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اور جان مانند خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تکبیر بزرگِ جسم مانند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اس کی تلوار کے سامنے جان دے اور اللہ کی بڑائی بیان کر)

غرض کون سی عبادت ہے جو نماز میں نہیں۔

نماز کا وقفہ

پھر یہ کہ چار منٹ میں سب باتیں ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ تخمیناً چار منٹ میں نماز ہوجاتی ہے۔ اول تو نماز ویسے ہی تھوڑی دیر میں ہوجاتی ہے اور اس پر لوگ اور زیادتی کرتے ہیں کہ جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ کچہری میں دو ملازم تھے ایک انگریز کی ماتحتی میں۔ ایک تو سر رشتہ دار تھے اور دوسرا نائب سر رشتہ دار۔ دونوں مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ نائب سر رشتہ دار کو نماز میں بہت دیر لگتی وظیفہ وظائف سے فارغ ہوکر آتے اور سر رشتہ دار صاحب الٹی سیدھی ٹکریں مار کر اور کبھی بے پڑھے ہی فوراً چلے آتے۔ ایک روز انگریز نے کہا کہ سر رشتہ دار صاحب تم بہت ہی جلد واپس آجاتے ہو۔ نائب دیر میں آتا ہے۔ یہ کیا بات ہے اس نے جواب دیا، حضور بات یہ ہے کہ نائب سر رشتہ دار صاحب نے تو نماز خود اپنی ذات سے سیکھی ہے۔ اس لئے ان کو اچھی طرح یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر پڑھتے ہیں اور میرے بڑوں سے نماز چلی آئی ہے۔ مجھ کو خوب مشق ہے اور خوب یاد ہے اس لئے میں جلد پڑھ کر آجاتا ہوں اور وہ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں اس لئے دیر لگتی ہے۔

غرض بعض کو نماز کی مشق ہوتی ہے کہ انہیں نماز کے شروع کرنے کی تو ضرورت ہوتی ہے پھر انہیں کسی بات کے قصد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ زبان خود بخود چلتی رہتی ہے جیسے کہ گھڑی کہ اسے کوک (چابی) دینے کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ اکبر پر تو کوک شروع ہوئی اور سلام پر ختم۔ اگر نماز اس طرح پڑھی جائے تو چار منٹ سے بھی کم لگتے ہیں۔

ایک آقا اور نوکر تھے۔ وہ نماز پڑھنے آتے تو آپس میں بحث ہوتی کہ پہلے کون فارغ ہو۔ نماز شروع کرتے اور ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی کہ پہلے میں فارغ ہوں۔ بس ادھر اللہ اکبر کہتے اور ادھر نماز ختم ہوجاتی۔ ایک شخص نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اذکار تو گھر کر آتے ہو اور اٹھک بیٹھک کرنا باقی رہ جاتا ہے وہ یہاں آکر بولتے ہو۔

اس پہلے فارغ ہونے پر ایک قصہ ایک ہوشیاروں کے قصبہ کا یاد آیا۔ عید کی امامت میں دو شخصوں میں تنازعہ ہوا۔ اس نے کہا کہ نماز میں پڑھاؤں گا اس نے کہا میں پڑھاؤں گا۔ آخر عین وقت پر دونوں نے ایک دم سے امامت شروع کردی۔ کچھ ان کے مقتدی ہوگئے کچھ ان کے۔ ایک پہلے الحمد پڑھ چکے اور ابھی دوسرے نے ختم نہیں کی تھی۔ جس نے پہلے ختم کی تھی وہ ٹھہر گئے۔ اس خیال سے کہ جونسی سورۃ یہ پڑھے گا میں اس سے چھوٹی سورۃ پڑھ کر پہلے ختم کردوں گا اور میری

بنوں گا۔ لہٰذا اس نے جو سورۃ پڑھی اس نے اس سے چھوٹی سورۃ پڑھ کر اللہ اکبر کہہ کر رکوع کر دیا مقتدی دوسرے امام کے بھی رکوع میں گئے۔ بس اس جماعت کے ایک مقتدی نے اپنے پاس والے کے کہنی ماری اور کہا اونہہ۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا امام نہیں تو رکوع میں کیوں جاتا ہے۔

اس قسم کی حکایات پر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر ہم خود اس کے عامل ہیں۔ یہی چاہتے ہیں کہ نماز جلدی ختم ہو۔ سوائے اِنَّآ اَعْطَیْنَا اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ کے ہمیں اور کوئی سورۃ ہی یاد نہیں۔ ہاں اگر سلطنت مل جائے یعنی امامت تو پھر دیکھو کیسی کیسی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہ مقتدی بھی کھڑے کھڑے وبال میں آجائیں۔

کانپور کا واقعہ ہے ایک صاحب امام ہوئے۔ خوب گرمی کا زمانہ تھا۔ جمعہ کا روز۔ انہوں نے سورۃ ق پڑھی۔ کھڑے کھڑے ایک نمازی کو تو تے ہوگئی۔ ایک بیچارہ نے اسی روز نماز شروع کی تھی۔ لوگ اسے کہہ سن کر نماز کے لئے لائے تھے جب انہوں نے لمبی لمبی سورتیں پڑھنی شروع کیں تو وہ نیت توڑ کر یہ کہتے ہوئے چلتا بنا اور کہا کہ ہم اسی واسطے تو نماز نہیں پڑھتے۔ اس قسم کے لوگ مناع خیر ہیں۔ حدیث میں مقتدیوں کی بڑی رعایت آئی ہے۔ غرض کہ جب امام ہوتے ہیں تو اس وقت تو ایسی نماز پڑھتے ہیں اور جب تنہا پڑھتے ہیں تو ایسی کہ قفّال مَرْوَزِی نے پڑھی تھی۔

قصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کو حنفیہ سے بدگمان کرنے کے لئے کہا کہ میں آپ کو حنفیوں کی نماز پڑھ کر دکھلاؤں گا۔ پس اس نے چھوٹی سی تہمد باندھی کہ ناف تو کھلی رہی اور گھٹنے ڈھک گئے اور اللہ بزرگ است کہہ کر نماز شروع کی اور برگ سبز کہہ کر رکوع کر دیا اور رکوع میں جاتے ہی بلا تسبیح کہے سیدھے سجدہ میں چلے گئے۔ اسی طرح تمام نماز پڑھی اور قعدہ اخیرہ تشہد پڑھ چکے تو بجائے سلام کے زور سے ایک گوز رسید کیا۔

اس نے تو تمسخر سے نقل کی تھی باقی ہماری اصل نماز بھی ایسی ہی ہے نہ تعدیل ارکان کرتے ہیں نہ اس کا اور کوئی حق ادا کرتے ہیں۔ بس جلدی اتنی ہوتی ہے کہ کچھ ٹھیک نہیں۔ ادھر اللہ اکبر کہا ادھر ختم۔ میں کہتا ہوں کہ اگر سنبھال کر پڑھیں تو بھی چار منٹ صرف ہوتے ہیں۔ پھر اور جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چار منٹ کی تو بات ہے۔ اتنی دیر میں ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر لے کر چلے آؤ گے ؎

خود کہ یابی ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاندہ وصد جاں دہد   آنچہ دردہمت نیاید آں دہد

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلے میں چمن ہی خرید لے۔ حقیر وفانی جان لیتے ہیں اور باقی جان عطا فرماتے ہیں۔ تمہارے وہم وگمان میں نہیں آسکتا جو کچھ عطا فرماتے ہیں)

چار منٹ میں اتنی دولت! افسوس ہے کہ اس پر بھی ہمارے بھائی نماز پڑھنے میں پس وپیش کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ چوپالوں میں باتیں گھڑتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ مسجد میں باتوں ہی کے واسطے چلے آیا کرو۔ پھر اس کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔ آؤ تو سہی۔

بہرحال نماز کی ہیئت بتلا رہی ہے کہ نماز تمام عبادات میں ممتاز ہے۔ اپنے باطن سے بھی کہ اس کے اندر تمام عبادات موجود ہیں اور اپنے ظاہر سے بھی کہ جیسے نماز کی ہیئت خشوع وخضوع کی ہے اور کسی عبادت کی نہیں۔ اسی طرح ذکر میں۔

نماز کی صورت

ذکر میں جتنے منافع ہیں وہ بھی نماز میں ہیں۔ کیونکہ ہر عمل کی ایک ہیت ہوتی ہے اور ایک روح اور ضروری دونوں ہی ہوتی ہیں۔ سو نماز کی روح ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اقم الصلوٰۃ لذکری . کہ میری یاد کرنے کے لئے نماز پڑھا کیجئے۔

پس جو منافع ذکر کے ہوں گے۔ نماز میں وہ بھی ہوں گے۔ بس نماز تمام فضائل کی جامع ہوئی اپنے ان اسرار کے بیان کرنے پر اس وقت کے مناسب ایک کام کی بات یاد آئی۔ وہ یہ کہ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے ہر چیز کے اسرار ایسے طور پر بیان کرنے شروع کئے ہیں کہ گویا اس عمل سے مقصود ہی سر اور راز ہے۔ سمجھ لیجئے کہ اگر یہی طرز رہا تو شاید چندروز میں الحاد تک نوبت آجائے۔ کیونکہ جب ہر عمل کے اسرار اور ارواح بطور مقصود کے بیان کئے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف ارواح کو ضروری سمجھیں گے اور صورت کی طرف سے بے اعتنائی ہو جائے گی اور اس سے اندیشہ ہے کہ عبادت کی صورت نہ چھوٹ جائے۔ کیونکہ جب کہ ان کے نزدیک عبادت کی روح تو ضروری ہوگی اور اس کی صورت ضروری نہ ہوگی تو اس صورت کی قید کو حذف کردیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے مثلاً نماز کہ اس کی ہیئت کو چھوڑ دیں گے اور مطلق ذکر پر اکتفا کریں گے۔

چنانچہ آج کل ایک راز اور برکت نماز کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جماعت کی نماز سے اتفاق ہوتا ہے اور اس کی یہ ترتیب بتلائی جاتی ہے کہ پانچوں نمازوں میں تو محلّہ کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پھر جمعہ میں شہر کے لوگ۔ پھر اس کی ضرورت ہے کہ دیہات کے لوگ جمع ہوں اس

کیلئے عید ہے۔ پھر ضرورت ہے کہ مختلف ولایتوں کے لوگ جمع ہوں اس کیلئے حج تجویز کیا۔ پس یہ عبادات ایسی چیز ہیں کہ ان میں اتفاق کی رعایت رکھی گئی ہے۔

یہ عنوان تو بہت اچھا ہے اور بہت خوب صورت ہے مگر اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ عبادات بنفسہا مقصود نہیں بلکہ بمصالحہا مقصود ہیں۔ اس کا مآل کسی وقت میں یہ ہوگا کہ اگر اغراض بدون ذرائع کے حاصل ہو جائیں گی تو نفس کہے گا کہ مقصود تو حاصل ہو ہی گیا۔ اب ان اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے الحاد کا باب کھلتا ہے۔ یہ باتیں عوام الناس کے سامنے ہرگز نہ بیان کی جائیں اور اگر بیان کریں بھی تو کہہ دیں کہ عبادات تو بنفسہا ہی مقصود ہیں۔ ہاں ان سے یہ مصالح بھی حاصل ہوتے ہیں جیسے کوئی حج کی ترغیب دے اور کہے کہ حج کرنے سے ایسے ایسے منافع حاصل ہوتے ہیں کہ مکہ کی سیر ہوتی ہے۔ دریا پہاڑ، شہر دیکھنے میں آتے ہیں مگر یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں۔ مقصود اصلی رضا حق ہے۔ ہاں اس سے یہ منافع بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اعمال پر جو مصالح مرتب ہوتے ہیں وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بنفسہا یہی اعمال ہیں خواہ یہ مصالح نہ بھی مرتب ہوں۔

نماز کی روح

بیان یہ ہو رہا تھا کہ ذکر نماز کی روح ہے۔ درمیان میں ایک کام کی بات بھی بیان کر دی اور چونکہ ذکر نماز کی روح ہے اسی واسطے نماز کی فضیلت کے موکد کے لئے فرماتے ہیں۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ ۔ کہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے

اس لئے نماز میں اگر یہ خاصیت ہو کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ (برائیوں سے روکتی ہے) تو تعجب کی بات نہیں ہے بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ذکر بڑھ کر ہے یعنی نماز سے بھی۔ پس ذکر ہی کر لیا کریں نماز نہ پڑھیں۔

اس کا ایک لطیف جواب میرے عرض سابق سے نکل آیا یعنی وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے) کا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر اللہ نماز سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ علت ہے ماقبل کی۔ پہلے نماز کی ایک خوبی بیان کی ہے اب آگے اس کی علت بتلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز کی یہ خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے۔ مگر یہ خاصیت اس کی کیوں ہوئی اس لئے ہوئی کہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اس کی روح ہے ذکر اللہ اور) اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور ہر پہلو سے مفید ہے طبع سے، عقل سے، عشق سے۔ عشاق کی نظر تو بس اس خاصیت پر ہے۔

ان ذکر نی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکر نی فی ملاء ذکرته فی ملا خیر منهم

یعنی جو دل میں یاد کرتا ہے تو خدا اس کو دل میں یاد کرتے ہیں (خدا دل سے پاک ہے مگر صرف شاکلۃً ایسا فرمادیا) جو مجمع میں یاد کرے تو حق تعالیٰ اس کو مجمع میں یاد کرتے ہیں۔

گویا ذکر کرنے سے حق تعالیٰ کے مذکور بنے۔ عاشق کے لئے کون سی دولت اس سے زیادہ ہوگی کہ اس کا محبوب اس کو یاد کرے۔ اول تو عاشق کو محبوب کا نام لینا ہی نہایت پیارا معلوم ہوتا ہے اور پھر اس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ محبوب اس کا نام لے۔

یہاں سے ایک بڑی بشارت معلوم ہوئی کہ جیسے ہم خدا تعالیٰ کو چاہتے ہیں ایسے ہی وہ بھی ہم کو چاہتے ہیں۔ مگر ان کے چاہنے کا بظاہر اعلان نہیں ہوتا۔ اخبار وآثار سے معلوم ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است وستیز   عشق عاشق بادوصد طبل ونفیر
لیک عشق عاشقاں تن زہ کند   عشق معشوقاں خوش وفربہ کند

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے، عاشق کا عشق دوسو طبل اور شہنائیوں کے ساتھ ظاہر و باہر ہے لیکن عاشقوں کا عشق دبلا کر دیتا ہے اور معشوق کا عشق موٹا اور فربہ کر دیتا ہے۔)

سو جیسے عاشق معشوق کا طالب ہوتا ہے اسی طرح معشوق عاشق کا طالب ہوتا ہے ؎

تشنگاں گرآب جوئند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے اگر پانی کے متلاشی ہیں تو پانی بھی ان کا طالب ہے)

قرب خداوندی

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ جیسی معرفت بندہ کی خدا کو ہے بندہ کو خدا کی نہیں۔ اور یہی معنی ہیں آیت **ونحن اقرب الیه من حبل الورید** (ہم اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) کے کہ علماً ومعرفتاً بندے ہم سے قریب ہیں **ونعلم ماتوسوس به نفسه** (تمہارے جی میں جو وسوسہ آتا ہے ہم اس کو (بھی) جانتے ہیں)۔ اسی وجہ سے **نحن اقرب** فرمایا کہ ہم قریب ہیں **انتم اقرب الینا** نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب

ہو۔سو اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب نسب متکررہ سے ہے۔اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا۔

رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو۔تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے۔اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں کیونکہ بندہ ہے غافل۔پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب۔غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے اور معرفت ہی پر مدار ہے محبت کا۔اس لئے ان کو پوری محبت ہوگی ہم سے۔

اگر کوئی کہے کہ حق تعالیٰ کو بندہ کی معرفت تو ہے مگر عیوب کے ساتھ کیونکہ بندہ میں ہزاروں عیب ہیں۔پس جب اس کی معرفت ہوئی تو اس کے ساتھ اس کے تمام عیوب کی بھی معرفت ہوئی۔سو جس معرفت کے ساتھ عیوب کی بھی معرفت ہو تو وہ محبت کا سبب نہیں ہوسکتی۔تو میں کہوں گا کہ یہ اس سے کہو جو صورت پر مرتا ہو۔جو صورت کا عاشق ہوتا ہے عیوب پر مطلع ہونے سے اس کو محبت نہیں رہتی۔

اللہ کی محبت

حق تعالیٰ کو جو ہم سے محبت ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ ہمارے اندر کوئی خوبی ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہم ان کے بنائے ہوئے ہیں۔حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے اپنی قوم پر بددعا کی۔قوم ہلاک ہوگئی۔سب کچھ ہو جانے کے بعد حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ فلاں جگہ جا کر چالیس برس تک مٹی کے برتن بناؤ۔چنانچہ ایسا ہی کیا۔اس کے بعد حکم ہوا کہ سب کو ایک طرف سے توڑ ڈالو۔چنانچہ انہوں نے توڑنا شروع کیا مگر دل پر بہت صدمہ تھا۔حق تعالیٰ نے فرمایا کہ توڑنے سے کچھ دل بھی دکھا۔عرض کیا کہ دل تو بہت دکھا۔ارشاد ہوا کہ بس ایسے ہی اپنی مخلوق کو ہلاک کرنا ہم کو ناگوار ہوگا جیسے برتن تمہارے بنائے ہوئے تھے اسی طرح بندے ہمارے بنائے ہوئے تھے۔

قارون کے قصہ میں دیکھئے کہ وہ تو کہہ رہا تھا کہ اے موسیٰ مجھ کو بچاؤ اور آپ فرماتے تھے خذ یا ارض کہ اے زمین اسکو پکڑ۔یہاں تک کہ بالکل زمین میں دھنس گیا۔حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اگر ہمیں ایک دفعہ بھی پکارتا تو ہم فوراً بچا لیتے۔

عتاب میں عنایت

سیر میں ہے کہ جب بندے گناہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں حکم دے کہ ہم ان پر ٹوٹ پڑیں۔اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو تم نے تھوڑا ہی بنایا

ہے۔ سوحق تعالیٰ کی بندوں سے اس قدر محبت ہے۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے عتاب تک میں بھی عنایت ہوتی ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

ولو یؤا خذاللہ الناس بما کسبوا ماترک علیٰ ظھرھا من دآبۃ .

اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی جاندار کو زمین پر نہ چھوڑتے۔

بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے:

ولو یؤا خذاللہ الناس بما کسبوا ماترک علیھما من بشر.

کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے۔

نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کردیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ سوبات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور رنرے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جارہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جوتیاں لگائیں مگر قدر ومنزلت نہیں گھٹائی بھلا ایسا آقا مل سکتا ہے۔ ایسے آقا کا یہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کررہے ہیں۔

حق تعالیٰ کی رحمت

حق تعالیٰ کو محبت ہم سے اس حیثیت سے ہے کہ ہم اس کے بنائے ہوئے ہیں گو مطیع نہ ہوں اور جو اطاعت کرے اس کو پوچھنا ہی نہیں ان پر تو لحہ برلحہ فخر کرتے ہیں۔

اگر کوئی ذکر کا جلسہ ہوتا ہے مثل وعظ وغیرہ کے تو جب فرشتے یہاں سے لوٹ کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کررہے ہیں وہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح اور تحمید کررہے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں جنت کو طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو میں نے سب کو بخش دیا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ان میں ایک شخص آپ کے ذکر کیلئے نہیں آیا تھا بلکہ کسی کام کے لئے

آیا تھا۔ اس کا مقصود اس جلسہ میں شرکت نہ تھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو بخش دیا۔ اس لئے کہ **هم قوم لا يشقى جليسهم** (یہ ایسے لوگ ہیں جنکے ساتھ بیٹھنے والے محروم نہیں)

اب رہی یہ بات کہ بندوں کی حالت فرشتوں سے کیوں پوچھتے ہیں۔ انہیں تو ویسے ہی بدوں فرشتوں کے تمام باتوں کا علم ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہہ دی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ سو ان سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارہ میں تم نے ایسا کہا تھا۔ فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ فرشتوں نے کہا تھا:

اتجعل فيها من يفسد فيها کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے۔ من سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے۔ سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے پس سالبۂ جزئیہ ان کے مقابلہ میں کافی ہو گیا (یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو ان کی موجبہ کلیہ توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ سارے مطیع ہوں تب ہی ان کا جواب ہو سکے، سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے۔ آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ جب کوئی موقعہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتلا دیتے ہیں۔

اسی طرح فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے عصر اور صبح میں۔ جو فرشتے عصر کے وقت آئے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان کی بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں۔ اور دوسرے آجاتے ہیں۔ جب واپس ہو کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ یاالٰہی جب ہم گئے تھے جب بھی نماز پڑھ رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بدلی بھی خاص اس وقت میں کرتے ہیں۔ جو ہنر کا وقت ہے۔ اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے۔ حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو کچھ بھی بندے کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شان ہے **يعلمون ما تفعلون** (جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں) مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں۔ بلا پوچھے وہ خود کہہ نہیں سکتے۔ سو مطلب یہ ہوا کہ دیکھو سب کچھ مگر خوبی کے سوا اور کچھ مت کہو۔ صرف خوبی کی بات کہو برائی کی بات مت کہو

صاحبو۔ حق تعالیٰ کو اتنی محبت ہے بندوں سے اور بندے بیچارے کیا محبت کریں گے۔ اگر تم کو حق تعالیٰ سے محبت ہے تو یوں سمجھو کہ ادھر اس سے زیادہ محبت ہے۔ غرض کہ عشاق کے نزدیک

تو ذکر کا یہی نفع ہی سب کچھ ہے کہ خدا تعالیٰ ہم کو یاد کریں۔ اور اگر سچ پوچھو ہم تو یاد کرنے کے قابل نہیں کیونکہ ان کا ذکر جتنے ادب سے ہونا چاہیے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ بھلا حاکم دنیا کا نرا نام تو لو۔ کیا کچھ عتاب ہو کہ ہمارا نام لیتا ہے اور وہاں سے حکم ہے نام لینے کا۔ یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ ہماری تو زبان بھی نام لینے کے قابل نہیں۔ ہماری زبان کیسی ہے ۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ہم تو مشک وگلاب سے منہ کو صاف کریں تب بھی نام لینے کے قابل نہ ہوں مگر رحمت دیکھئے کہ پھر بھی ہمارے یاد کرنے پر وہ ہم کو یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے **فاذکرونی اذکرکم** (پس تم مجھے یاد کرو۔ میں (اپنی عنایت سے) تمہیں یاد کروں گا)۔ اے صاحبو! محبوب کا محبّ کو یاد کرنا تھوڑی بات ہے ہمیں اس کی قدر نہیں۔

صحابہؓ کی حالت دیکھئے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی ابن کعبؓ سے فرمایا کہ مجھ کو اللہ نے حکم کیا ہے تمہارے سامنے قرآن پڑھنے کا۔ اس پر ابی کعبؓ نے کہا۔ اللہ سمانی۔ کیا اللہ نے میرا نام لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نعم! ہاں! انہوں نے تمہارا نام لیا ہے۔ اس پر ابی ابن کعبؓ رونے لگے۔ محبوب کے نام لینے کی قدر ان حضرات کو تھی۔

کوئی کہے کہ یہ تو خوشی کا موقع تھا اس وقت رونا کیسا تو سمجھ لو کہ رونا ہمیشہ غم ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک رونا خوشی کا ہے اور ایک غم کا اور ایک رونا ہے گرم بازاری عشق کا تو یہ رونا عشق تھا۔ بہر حال نماز کی روح ہے ذکر اور ذکر کی خاصیت یہ ہے تو نماز کی بھی یہ خاصیت ہوئی۔

ذکر کی خاصیت

اس کے علاوہ ذکر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ذاکر کو کوئی خطرہ اور پریشانی نہیں رہتی اور یہ بات عقل اور طبع دونوں اعتبار سے ہے۔ عقلاً تو اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

فاذکرونی اذکرکم ۔ کہ تم اللہ کو یاد کرو وہ تمہیں یاد کریں گے۔

پس جب کوئی شخص خدا کی یاد کرے گا اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے گا کہ خدا تعالیٰ مجھ کو یاد کرتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ جب کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم ہمارا خیال رکھتا ہے تو پھر اس کو کچھ خطرہ نہیں رہتا۔ پس حق تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے گا۔

اور طبعاً اس لئے کہ یہ امر طبعی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو یاد کرتا ہے تو اس کو اور ہر طرف سے یکسوئی ہو جاتی ہے۔ یعنی جس کو یاد کرتا ہے اسکے ساتھ کوئی چیز قلب میں جمع نہیں ہوتی۔ پس جب خدا تعالیٰ کو یاد کریں گے تو ان کے ساتھ یکسوئی ہوگی۔ یکسوئی ہو جانے سے پھر کسی (اور) طرف التفات نہیں ہوتا۔ اور پریشانی مختلف پہلوؤں پر التفات کرنے سے ہوتی ہے اس لئے ذکر سے کسی قسم کی پریشانی نہیں رہ سکتی اور میں اس پر قسم کھاتا ہوں اور گو یہ بات اپنے بزرگوں کی تقلید سے کہہ رہا ہوں کہ خدا کے یاد کرنے والے کے پاس دنیا کی نہ پریشانی ہے، نہ برزخ کی نہ آخرت کی، نہ پل صراط کی۔ مگر میں اس کو سائنس کی رو سے سمجھائے دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی چیز (ذہن میں) پائی جاتی ہے تو اس کا مقابل نہیں رہتا اور پریشانی مقابل ہے یکسوئی کی۔ پس جب یکسوئی آئی تو اس کا مقابل کہاں۔ پس جو شخص حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوگا وہ ہرگز پریشان نہیں ہو سکتا۔

مولانا فرماتے ہیں ۔

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ و دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے، سوائے خلوت گاہ حق کے (کہیں) آرام نہیں ہے)

باقی اللہ کے سوائے جہاں بھی پناہ لوگے آفت سے چھٹکارہ نہ ہوگا ۔

گرگریزی برامید راحتے ہم ازا آنجا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی جگہ پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

پس جب سارے ٹھکانے ایسے اور ایک ٹھکانا ایسا تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور ذکر کی اس خاصیت کا رات دن مشاہدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل اللہ کی حالت دیکھ لیجئے وہ فقر و فاقہ میں اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں واللہ تکلیف ان کے جسم تک محدود رہتی ہے۔ پریشانی جس کا نام ہے وہ کبھی نہیں ہوتی، اور وہ برزبان حال یہ کہتے ہیں۔ ۔

کوئے نومیدی مرد کارمید ہاست سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ، بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں)

ایک راز اس کا کہ اہل اللہ کو پریشانی نہیں ہوتی یہ بھی ہے کہ یہ ہر واقعہ اللہ کی طرف سے سمجھتے

ہیں اور اللہ سے ہے ان کی محبت۔اس لئے جو بات بھی ان کو پیش آئے گی وہ اس کو محبوب کی طرف سے سمجھیں گے۔ جب یہ ہے تو پھر پریشانی کہاں۔محبوب کی تو مار بھی نا گوار نہیں ہوتی۔

دیکھئے اگر کوئی عاشق چلا جارہا ہو اور محبوب پیچھے سے آ کر اس کے زور سے دھول لگائے اور یہ پیچھے پھر کر دیکھے کہ میرا محبوب ہے تو خوشی میں آ کر کہے گا او ہو آپ ہیں!

اب تمنا ہوگی کہ ایک اور مارے۔اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس تکلیف کو راحت سے کس چیز نے مبدل کر دیا۔بس انتساب الی المحبوب نے کہ وہ دھول چونکہ محبوب کا مارا ہوا ہے۔اس لئے وہ راحت ہوگئی۔اسی طرح مصائب میں اہل اللہ کی حالت ہوتی ہے چونکہ وہ محبوب کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اور مصائب کو محبوب کی طرف سے سمجھتے ہیں۔اس لئے ان کو اس سے عین راحت ہوتی ہے وہ تو برزبان حال یہ کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجان من　　　دل فدائے یاردل رنجان من

صبر کا طریقہ

یہی راز ہے اس کا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے بہت صدمہ ہوا کہ خدا آسمان پیدا کر کے تھک گیا تو اس نے یوم السبت میں آرام کیا۔تو اس پر حق تعالیٰ نے پہلے ان کے قول کی تردید میں یہ آیت نازل کی:

ولقد خلقنا السموت والارض وما بينهما في ستة ايام وما مسنا من لغوب.

(اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان میں ہیں ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تھکان نے چھوا تک نہیں)

اس کے بعد ارشاد ہوا **فاصبر علىٰ مايقولون** (پس ان کی باتوں پر صبر کیجئے)۔مگر صبر کیسے کریں اتنے بڑے صدمہ پر تو آگے اس کی ترکیب بتلائی **وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب** (اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے (اس میں نماز بھی داخل ہے) سورج نکلنے سے پہلے (نماز فجر) اور چھپنے سے پہلے (ظہر وعصر)۔طریقہ صبر کا کیا ہے۔وہ یہ کہ آؤ ہم سے باتیں کرنے کھڑے ہو جاؤ بس سب رنج وصدمہ جاتا رہے گا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے رنج پہنچایا اور محبوب کہے کس جھگڑے میں پڑے ہو آؤ ہم سے باتیں کرلو۔کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کو صدمہ رہے گا۔

ایک اور جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے **واصبر لکم ربک فانک باعیننا** ۔کہ آپ صبر کیجئے۔آپ تو ہماری نگاہ کے سامنے ہیں۔یہ عاشقانہ لم اور تدبیر ہے رنج کے دور کرنے کی۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اس سے اس کی تفسیر سمجھ میں آجائے گی وہ یہ کہ کسی پر ایک شخص عاشق تھا۔اس کے سو درے مارے گئے ،ننانوے درہ تک آہ بھی منہ سے نہ نکلی ،اخیر میں ایک درہ لگا تو منہ سے آہ نکلی کسی نے پوچھا کہ ننانوے تک تو تیرے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا اور ایک درہ میں یہ حال ہوا۔عاشق نے کہا کہ ننانوے درہ تک تو میرا محبوب کھڑا ہوا مجھ کو دیکھ رہا تھا۔اس وجہ سے کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوئی اور اخیر درہ میں وہ چلا گیا تھا۔دیکھتا نہ تھا اس لئے آہ نکلی اسی واسطے ایک عاشق کہتا ہے ۔

بہنم بس کہ داند ماہر دیم   کہ من نیز از خریدا رام اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں)

اس کا بڑا حظ ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔بس بڑی تسلی اہل اللہ کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔اس سے بڑھ کر تسلی کا اور کوئی درجہ ہی نہیں۔اور دنیا میں بھی اس قسم کے سینکڑوں واقعات موجود ہیں کہ محبوب مجازی کے دیکھنے سے تمام تکالیف راحت ہوگئی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل اللہ چونکہ حق تعالیٰ میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر مصیبت انہی کی طرف سے سمجھتے ہیں اس وجہ سے انہیں کسی بات سے پریشانی نہیں ہوتی اور چونکہ یہ رنگ ان کا مرنے کے وقت بھی موجود رہتا ہے ،زائل نہیں ہوتا ،اس لئے جیسے زندگی کے واقعات میں انہیں پریشانی نہیں ہوتی اسی طرح مرنے کے وقت بھی پریشانی نہیں آتی۔

موت کی پریشانی

پھر اوپر سے اہل اللہ کو موت کے وقت یہ بشارت بھی دی جاتی ہے **وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون نحن اولیاء کم فی الحیوة الدنیا وفی الآخرة** موت کے وقت کہا جاتا ہے کہ گھبرانا مت۔بعضے لوگوں نے بیان کیا کہ بعض لوگوں کو طاعون کے زمانے میں مرتے دیکھا کہ وہ اپنے باپ اور استاد کا نام لے رہے تھے کہ وہ کھڑے ہیں اور ہم کو بلا رہے ہیں۔وہ مانوس شکل میں فرشتے تھے تاکہ یہ گھبرائیں نہیں۔سو اہل اللہ مرنے کے وقت بھی خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کے مرنے کا وقت قریب تھا اور وہ خوشی میں آکر کہہ رہے تھے ۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آ گیا کہ میں عریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان ہو جاؤں)

کیا یہ لوگ بیہودہ تھے جو ایسا کرتے تھے۔ واقع یہ ہے کہ ان کو اس وقت نہایت خوشی کا عالم ہوتا ہے پھر قبر میں دیکھئے ان کے لئے کیا خطاب ہوتا ہے۔ جس وقت منکر نکیر آتے ہیں اور سوال کرتے ہیں اور یہ جواب دیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے:

ان صدق عبدی. کہ میرے بندہ نے سچ کہا

اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ غرض سب راحت کا سامان کر دیا جاتا ہے۔

پھر قیامت میں دیکھئے جو کہ بڑی گھبراہٹ کا وقت ہے کہ انہیں اس وقت بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

لایحزنهم الفزع الاکبر. کہ ان کو فزع اکبر بھی گھبراہٹ میں نہ ڈالے گی۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو میں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔ گویا وہ اس کا ترجمہ ہے۔ فرماتے تھے۔

عاشقاں را روز محشر با قیامت کار نیست　　　　عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

رہا دوزخ، سو اس میں اول تو جائیں گے کیوں! وہ تو ان سے الگ رہنا چاہے گا چنانچہ حدیث میں ہے کہ دوزخ کہے گا۔ **جزیا مومن فان نورک قداطفانار ی**[1] کہ اے مومن جلدی سے گزر جا تیرا نور تو میری آگ کو بجھائے دیتا ہے۔

جب دوزخ خود ان سے پریشان ہوگی تو وہ انہیں کیا جلائے گی۔ یہی اسے ٹھنڈی کر دیں گے پھر ایسے لوگوں کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔

میں اہل اللہ کی راحت کا ایک فوری درجہ ادراک بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ والوں کے پاس دس منٹ کے لئے بیٹھ جایئے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کے قلب میں بھی اطمینان ہو جائے گا۔ پس جب پاس بیٹھنے والے کو اطمینان ہو جاتا ہے تو ان کے اطمینان کو کیا پوچھتے ہو۔ بس اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنا چاہیے جس سے ہر موقع پر اطمینان ہو کہیں بھی پریشانی نہ ہو۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دیکھی ذکر کی برکت۔

نماز کی برکت

سو یہ تمام برکت نماز کی بھی ہے کیونکہ وہ بھی ذکر ہے اسی واسطے فرماتے ہیں **قدافلح من**

---

[1] لم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث"

تز کی و ذکر اسم ربه فصلی (بامراد ہوا جو شخص (خبائث عقائد واخلاق سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور نماز پڑھتا رہا) مگر یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ نماز کی تکمیل کرے، وقت پر پڑھے، جماعت کے ساتھ ادا کرے، قرآن کی تصحیح کرے، قلب کے متوجہ کرنے کی کوشش کرے اگر متوجہ نہ ہوتو کسی شیخ سے پوچھے۔ اور خود تو کرے ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دلائے۔ جو اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس کو دوسروں کو بھی بتلاتے ہیں۔ اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وتواصوا بالحق (اور ایک دوسرے کو (اعتقاد) حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے)۔ جہاں توقع ہو راہ پر آنے کی وہاں ضرور کہو مگر نرمی سے کہو دوسرے کو ذلیل مت سمجھو۔ ممکن ہے کہ کوئی چیز اس میں ایسی ہو کہ وہ اس کی وجہ سے ہم سے بڑھ جائے۔ اگر کسی کو سیاست کرنی پڑے تب بھی حقیر مت سمجھو اگر کوئی کہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سیاست کی جائے اور اس کو حقیر نہ سمجھا جائے۔

امام غزالیؒ نے اس کی مثال لکھی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی بھنگی بادشاہ کے حکم سے شہزادے کے بید لگائے تو وہ سیاست تو کر رہا ہے مگر شہزادہ کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اس کو ویسے ہی معزز مکرم سمجھ رہا ہے مگر بادشاہ کے حکم سے مجبور ہے۔ لہٰذا سیاست اور حقیر نہ سمجھنا دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔ امر بالمعروف اس طرح نہ ہونا چاہیے کہ کسی کو ذرہ برابر حقیر جانو۔ اگر خفگی کی ضرورت ہے تو اس طرح سے خفگی ظاہر کرو جیسے بچہ دوا پینے میں مچلتا ہے اور آپ اس پر غصے ہوتے ہیں۔ غصہ تو ہے مگر جوش محبت کے ساتھ۔ کیا غصہ قطع تعلق کرنے کے ارادہ سے کرتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ چاہتے ہو کہ کسی طرح دوا پی لے۔ جو نماز نہ پڑھے، تو یہ نہیں کہ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دو بلکہ یہ دیکھو کہ کس طرح سے ہمارا بھائی مسلمان نمازی ہو جائے گا۔ بس ویسے ہی کرو۔ نرمی سے سختی سے، کچھ دینے سے غرض جیسے بھی راہ پر آنے کی امید ہو اس طرح کرو۔ البتہ مداہنت نہ ہو سو امر بالمعروف اس طرح ہونا چاہیے اور اس طرح اپنے ساتھ دوسروں کو بھی فلاح میں لاؤ۔ اب میں بیان ختم کرتا ہوں۔

دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ آمین

فقط بفضل اللہ وبرحمۃ۔ اشرف علی

ندا رمضان

ماہ رمضان کے متعلق یہ وعظ ۹ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ کو
جامع مسجد تھانہ بھون میں فرمایا،
جسے حکیم محمد یوسف نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ينادى الملك ياباغى الخير اقبل وياباغى الشر اقصر ولله عتقاء من النار[1]

(ارشادفرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ فرشتہ منادی کرتا ہے کہ اے خیر کے طلب گار آگے بڑھ اور اے برائی چاہنے والے رک جا اور اللہ کے لئے بہت سے لوگ آزاد کئے جاتے ہیں)

متاع مسلمان

صاحبو! کلام اللہ اس لئے سنایا گیا تا کہ لوگوں کو اس طرف رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ لوگ فی زماننا (ہمارے زمانہ میں) اس طرف سے بے رغبت ہو رہے ہیں۔ اور اس کو بیکار سمجھتے ہیں۔ بعض کہہ دیتے ہیں کہ اس میں عمر ضائع جاتی ہے اس کی بجائے دوسری طرف بچہ کو مشغول کیا جائے تو کیسا ہو۔ بعض جگہ اس کی تعلیم موقوف کرنے پر کمیٹیاں ہوتی ہیں اور اس میں مشغول ہونے کو تضیع اوقات خیال کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس کو مع مطالب پڑھایا جائے تو وقت بہت ضائع ہوتا ہے اور طوطے کی طرح پڑھانے سے (جس میں وقت کم صرف ہوتا ہے) کیا فائدہ وقت بھی ضائع ہوا

[1] سنن الترمذی: ۶۸۲ ، بلفظ: ینادی مناد الخ

اور کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو بھی مفید بتاتے ہیں کہ اس پر وعدہ ثواب فرماتے ہیں (اگرچہ مع مطالب پڑھنے کے برابر مفید نہ ہو) اور تم بے فائدہ کہتے ہو بتاؤ کس کو صحیح مانیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ جس سے روٹیاں ملیں یہ واقعی ٹھیک ہے ہماری بھی غرض اس قرآن سے یہی ہے کہ آخرت کی روٹیاں ملیں جہاں سخت محتاجی ہوگی کہ انسان ایک ایک نیکی کے لئے ٹکریں مارتا پھرے گا اور اس کا نصیب ہونا بھی دشوار ہوگا۔

صاحبو! مسلمانوں میں اس وقت صرف کلام اللہ باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہیں رہا اس کو بھی ترک کردو گے تو کیا رہے گا۔ اس کے الفاظ بھی غنیمت سمجھو۔ گو ان میں مطالب سے واقف ہونے کے برابر فائدہ نہ ہو۔

تلاوت کا ثواب

چنانچہ اس فائدہ کی نسبت ارشاد ہوا کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں الف لام میم کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ الف ایک حرف ہے۔ لام ایک حرف ہے۔ میم ایک حرف ہے۔ سو صرف الٓمّ کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور بقول بعض کے نوے نیکیاں ملتی ہیں۔ اس طرح کہ الٓمّ میں جو الف ہے اس کو تعبیر کرنے میں جو تین حرف ہوتے ہیں (ا۔ل۔ف) ہر ایک کے عوض میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ دس الف پر اور دس لام پر اور دس فاء پر سب تیس ہوئیں اسی طرح لام کی تعبیر میں تین حرف (ل۔ا۔م) ہوئے جس کی تیس نیکیاں ہوئیں اسی طرح سے میم کی تعبیر میں تین حروف (یعنی م۔ی۔م) پر تیس نیکیاں ملیں۔ سب کا مجموعہ ۹۰ ہوگیا۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل مے خرد گلزار را

ایسا بازار کس کو ملے گا کہ ایک پھول کے بدلہ ہی میں سارے چمن کا ملک ہو جائے۔
(تعجب یہ کہ وہ پھول بھی اسی چمن کا ہو)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   آنچہ دردہمت نیاید آں دہد

نیم جاں یعنی حقیر و فانی لیتے ہیں اور صد جان یعنی باقی جان اور حیات ابدی عنایت کرتے ہیں۔ وہ کچھ عطا فرماتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔

خیر اس تفسیر غیر مشہور کو مت لو۔ پہلی ہی صورت تیس والی لے لو۔ مگر ان تیس کو خیال کرو کہ فی الحال تو تیس نیکیاں لکھی گئیں مگر آخرت میں ان میں ترقی ہو کر کہاں تک پہنچیں گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ صدقہ کے ایک خرما کو اس طرح پالتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچھیرے کو دنیا

میں پرورش کرتا ہے۔ پس بعض لوگوں نے دنیا میں تھوڑے اعمال کئے ہوں گے اور ثواب ان کا پہاڑوں کے برابر دیکھیں گے عرض کریں گے کہ اس قدر کام تو ہم نے کیا نہیں۔ جواب مرحمت ہوگا کہ ہماری شان مربی ہونے کی ہے کہ جب سے تم نے عمل کر کے چھوڑا تو ہم اس کو پالتے رہے جس کی نوبت یہاں تک پہنچی۔ اور یہاں تو عمل بھی ہوا ہے جس میں ترقی ہوگئی وہاں تو بعض احوال میں صرف آرزو ہی کرنے سے اس میں بھی ترقی ہو جائے گی جہاں عمل بھی نہیں ہوا۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص آخیر تک دوزخ میں رہ جائے گا اور فریاد کرے گا کہ یا اللہ مجھ کو نکال کر جہنم کے دروازہ کی چوکھٹ پر بٹھا دیجئے وہیں بیٹھا رہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہو جائے گا۔ آرزو کرے گا کہ میرا منہ دوزخ سے پھیر دیجئے یہ بھی منظور ہوگا پھر ادھر سے رخ پھیرنے سے جنت کے درخت نظر آنے لگیں گے جس سے صبر نہ ہوگا اور عرض کرے گا کہ مجھ کو اس درخت تک پہنچا دے وہاں سے آگے نہ بڑھوں گا۔ چنانچہ ایسا بھی کر دیا جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کو جنت میں داخل ہو جانے کا حکم ہو جائے گا۔ پھر اس سے آرزو کرنے کو کہا جائے گا اور اس کی آرزو سے دس گنا مرحمت ہوگا۔

سو اگر تمیں نیکیاں مل جائیں اور وہاں ضرب کا بہت زیادہ قاعدہ ہو تو کہاں تک نوبت پہنچے گی۔ اور جب تین حروف پر اس قدر ملتا ہو تو کل کلام اللہ پر کتنا ملے گا اور ضرب در ضرب دینے سے کس قدر ہوگا۔

فضیلت رمضان

حدیث جو تلاوت کی گئی ہے۔ ترمذی شریف کی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان شریف کی فضیلت ارشاد فرمائی ہے کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ یاباغی الخیر اقبل۔ الخ ۔یعنی اے خیر کے طلب کرنے والے چل متوجہ ہو اور اے شر کے طلب کرنے والے اب تو رک جا۔ تیسرا جملہ وللہ عتقا من النار اللہ تعالیٰ بہت سے بندوں کو اس راہ کی برکت سے آزاد کر دیتے ہیں۔ محتمل ہے یعنی یا تو وہ بھی فرشتہ کی ندا ہو۔ یعنی فرشتہ کہتا ہے کہ اس وقت خدائے تعالیٰ کے یہاں عام رہائی ہو رہی ہے۔ اے شخص تو بھی مستحق رہائی ہو جا۔

دیکھو جب کوئی شاہی خوشی ہوتی ہے تو ہر قیدی کوشش کرتا ہے چھوٹنے کی، تو اس وقت رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ خدائے تعالیٰ کا فضل عام ہو رہا ہے۔ قیدی چھوٹ رہے ہیں۔ تم پر بھی تعزیرات آخرت کی بہت سی دفعات لگ چکی ہیں۔ اس لئے تم بھی انہی قیدیوں میں ہو۔ پس تم بھی سعی کرو کہ تمہاری رہائی ہو جائے۔ اور یا یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے

فرمایا ہو۔ دونوں کا حاصل ایک ہوگا اس کے متعلق جو کچھ کہنا ہے اس کو ان شاء اللہ بیان کروں گا۔

مگر اول یہ سمجھے کہ اس وقت اس حدیث کو کیوں اختیار کیا گیا۔ وجہ یہ کہ پہلے جمعہ کو حدیث بیان کی تھی الصیام جنۃ[1] یعنی روزہ ڈھال ہے گناہوں کے لئے۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ روزہ گناہوں کے لئے ڈھال ہے کہ اس کو اختیار کر کے معاصی سے مجتنب ہو سکتا ہے۔

ترک معاصی کی ترکیب

اب اس امر کی ضرورت ہے کہ بعد معاصی ترک کرنے کے کیا ہونا چاہیے۔ تو اس کے بارہ میں یہ عرض ہے کہ تکمیل کے دو درجے ہیں۔

ایک تخلیہ (اخلاق رذیلہ کو دور کرنا) ایک تحلیہ (اخلاق حمیدہ پیدا کرنا)

یا ایک تجلیہ اور ایک تحلیہ میں بھی تخلیہ ہی ہوتا ہے۔ جیسے برتن کی جب تکمیل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کو میل کچیل سے صاف کرتے ہیں جس کا نام تجلیہ ہے۔ پھر اس پر قلعی یا اور دوسرا کام کرتے ہیں۔ یا مریض کی مثال سمجھئے کہ جب کسی کا علاج طبیب کرتا ہے تو پہلے مادہ فاسد کو نکالتا ہے۔ اس کے بعد ایسی دوائیں استعمال کراتا ہے جس سے طاقت پیدا ہو۔ جسم میں رونق و تازگی آجائے یا کسی مکان میں فرش اور جھاڑ فانوس وغیرہ سے زیبائش کرتے ہیں تو پہلے اس کو خس و خاشاک سے پاک کر لیا جاتا ہے یا کسی کو عمدہ لباس اس وقت پہناتے ہیں جب کہ اس کے جسم سے غسل کرا کر میل کچیل دور کر دیا جائے۔

غرض یہ کہ سب چیزوں میں تکمیل دو ہی طریقہ سے ہوتی ہے تجلیہ اور تحلیہ سے اور عادۃً تجلیہ مقدم ہوتا ہے تحلیہ سے کیونکہ بدون تجلیہ کئے ہوئے تحلیہ ناقص رہتا ہے جیسے کوئی بدون برتن کا میل صاف کئے ہوئے اس پر قلعی کر دے۔ ظاہر ہے کہ پوری صفائی اس میں نہ آئے گی۔ ہاں بعض اوقات بوجہ بعض مصالح کے تحلیہ مقدم ہوتا ہے تجلیہ پر۔ جیسے کسی مکان کی آرائش مدنظر ہو اور مہارت اس قدر نہ ہو کہ پہلے پوری صفائی کر کے پھر آرائش کریں۔ تو یہ کرتے ہیں کہ پہلے سامان آرائش کر کے تدریجاً صفائی کرتے رہتے ہیں۔ سو یہ تو عارض کی وجہ سے ہوتا ہے اور عام قاعدہ پہلا ہی ہے۔

اسی طرح صوفیا کرام تجلیہ اور تحلیہ مریدین کا کرتے ہیں کہ پہلے ان سے اخلاق رذیلہ دور کر کے پھر اخلاق حسنہ کا رنگ ان پر چڑھاتے ہیں۔ بالکل طبیب جیسی حالت ہے کہ پہلے

---

[1] الصحیح للبخاری ۳: ۳۱، الصحیح لمسلم کتاب الصیام باب: ۳۰، سنن النسائی ۴: ۱۶۶

مسہلات سے تخلیہ کرے اور پھر قوت وغیرہ کی دوائیں استعمال کرائے۔ متقدمین شیوخ کا یہی طریقہ تھا کہ پہلے تجلیہ کر کے پھر تحلیہ کرتے تھے۔

حکایت شیخ ابوسعید رحمہ اللہ

اس مثال میں حکایت شیخ ابوسعید گنگوہی کی سنیئے کہ یہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ہیں۔ ابتدائے شباب میں کچھ عرصہ تک لاابالی پھرتے تھے۔ ایک روز ایک جولاہے نے بطور طعن کے یہ کہا کہ بڑا افسوس ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد ایسے تھے اور آپ کی حالت ایسی ہے۔ یہ بات ان کے دل کو کھا گئی۔ اور لوگوں سے دریافت کر کے بلخ حضرت نظام الدینؒ کی تلاش میں پہنچے کہ وہ ان کے دادا سے فیض پائے ہوئے تھے۔ حضرت نظام الدینؒ کو آنے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ مع بادشاہ وقت کے (جو حضرتؒ کے معتقدین میں سے تھا) استقبال کو آئے اور اپنے ہمراہ لے گئے کچھ عرصہ عیش وعشرت میں رہ کر اپنی اصلی غرض کو ظاہر کیا۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ اس حالت کو ترک کردو تو وہ حاصل ہو۔ انہوں نے اپنی رضا ظاہر کی تو حضرت نے باتکلف سامان بدن سے اتروا کر گاڑھے کے پہنوائے اور فرمایا کہ ہمارا حمام جھونکا کرو اور ہمارے سامنے آنے کی کوئی حاجت نہیں۔ جب ہم بلائیں گے تو آنا۔ غرض اس حالت میں ایک طویل مدت گزر گئی۔

شیخ نے ایک روز بھنگن سے پوشیدہ کہا کہ ان پر کل کوکوڑا ڈال دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی زبان سے نکلا کہ گنگوہ نہ ہوئی جو میں بتاتا۔ خبر پہنچنے پر شیخ نے فرمایا کہ ابھی قابلیت نہیں ہوئی۔ وہی خدمت سپرد رہی۔

ایک عرصہ کے بعد یہ ہوا کہ شیخ کی لڑکی نے کبوتر پال رکھے تھے ان کو بلی کھا جایا کرتی تھی۔ شیخ نے اک روز بلی سے حفاظت کرنے کی خدمت ان کے سپرد کردی۔ یہ رات بھر جاگ کر مکان کے آس پاس حفاظت کرتے۔ پھر بھی شکایت ہوئی کہ بلی کبوتر کھا گئی۔ اور رات کا وقت تھا انہوں نے اس کی جستجو کی کہ بلی کہاں کو جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ پانی آنے کا جو راستہ ہے اس میں سے جاتی ہے۔ اس وقت وہاں کوئی چیز اس میں بند کرنے کو نہ ملی۔ انہوں نے اس میں اپنا سر دے دیا۔ کئی روز جاگتے ہوگئے تھے وہیں نیند آ گئی۔ اتفاق سے بارش ہوئی اور پانی رکا۔ گھر کی ماما نے بانس ڈال کر صاف کرنا چاہا اور اس نے اس زور سے بانس مارا کہ سر میں لگ کر پانی خون آلود ہوگیا اور ان کے منہ سے یہ آواز نکلی کہ بلی تو نہیں آئی۔ وہ ماما ڈر گئی کہ قصہ کیا ہے۔ شیخ نے خبر ہونے پر فرمایا کہ کہیں وہ باولا نہ ہو۔

چنانچہ لوگ ان کو اٹھا کر لائے۔ شیخ نے دیکھا کہ صفائی ہو چکی ہے۔ اس وقت ذکر و شغل میں لگایا۔

قرب خداوندی کی صورت

میری غرض اس حکایت سے یہ تھی کہ شیوخ پہلے تجلیہ کرتے تھے اور پھر تحلیہ اور غایت اس تجلیہ و ریاضت کی یہی دفعہ اخلاق رذیلہ ہے اور ریاضت ایسا ہی تذلل ہے نہ کہ کم کھانا کم سونا۔ بلکہ یہ تو ریاضت کا ادنیٰ درجہ ہے اور یہی شرط ہے پسندیدگی عنداللہ کا۔

پس جب انسان اپنے کو اچھا لگے اور اس میں تذلل نہ ہو تو خدا کو اچھا نہیں لگتا۔ یاد رکھو کہ جب اپنے کو ذلیل جانو گے تب ہی خدا کے مقرب بن جاؤ گے یہ عجب بری بلا ہے۔ صوفیا کرام اس کے علاج کے لئے بہت سہولت سے تربیت کرتے ہیں۔

مثلاً کسی مرید کو دیکھا کہ بنا ٹھنا رہتا ہے اس کو حکم دیا کہ مسجد میں جھاڑو دیا کرو۔ ظاہر ہے کہ اس خدمت سے انسان اچھی ہیئت میں نہیں رہ سکتا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا عجب ٹوٹ جائے گا۔ یا کسی میں کبر زیادہ ہے تو یوں تربیت کرتے ہیں کہ نمازیوں کی خدمت کیا کرو پانی بھر کر رکھا کرو کہ اس سے کبر جاتا رہتا ہے۔ یہ طریقہ پہلے خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ اب نہیں ہوتا اس طرح تو لوگ آج کل بھاگ جائیں۔ غالباً ایک بھی فیضیاب نہ ہو۔ پہلے فرصتیں بہت تھیں۔ اور ذی ہمت بھی ہوتے تھے عورتوں تک کی یہ حالت تھی کہ شادی کرنے میں اللہ والوں کو دیکھتی تھیں۔ ایسے قصے ہیں کہ مستورات نے اپنی لڑکیاں بزرگوں کو دے دیں۔ بادشاہوں سے باوجود ان کی خواہش کے قطع نظر کر لی۔

چنانچہ حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کی بی بی ان کے پیر کی لڑکی تھیں۔ ان کی ساس کو کتنا ہی لوگوں نے کہا کہ باؤلے سے نکاح کرتی ہو۔ انہوں نے یہی کہا کہ مجھ کو باؤلا ہی پسند ہے۔ سلاطین اور امراء خواستگار تھے ان سے شادی نہیں کی۔

اب تو نہ ایسی ہمت نہ اس قدر عمر۔ بلکہ یہاں تک نوبت ہے کہ مرید ہوتے ہی خلافت کے طالب ہو جاتے ہیں اور مختلف پیرایوں سے شیخ کی اجازت طلب کرتے ہیں کہ حضرت کوئی آئے تو توبہ کرا دوں یا کلمہ پڑھا دوں۔ بوجہ اس عذر کے متاخرین شیوخ نے یہ کیا کہ تجلیہ اور تحلیہ دونوں ایک ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے بھی کام چل جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر چیز میں تجلیہ اور تحلیہ کی ضرورت ہے۔ پہلے وعظ کا حاصل تجلیہ تھا اور اس وقت میں تحلیہ مقصود ہے۔

افعال کی قسمیں

تو یہ سمجھئے کہ افعال کی دو قسمیں ہیں۔ وجودی اور عدمی وجودی جیسے افعال وجودیہ نماز وغیرہ، عدمی جیسے ترک ریا وغیرہ، عدم سے مراد عدم محض نہیں بلکہ وہ افعال جو ترک اختیاری ہوں افعال وجودیہ کا۔ سو بعض عبادات تو ایسی ہیں جس میں افعال وجودیہ کم ہیں اور افعال عدمی زیادہ جیسے روزہ۔ کیوں کہ اس میں تین جزو عدمی ہیں۔ ایک ترک کھانے کا، دوسرے ترک پینے کا۔ تیسرے ترک جماع کا۔ اور ایک جزو ہے وجودی اور وہ ان تینوں چیزوں کا عزم اور نیت ہے اور بعض عبادات میں تو یا وجو یکہ وہ مرکب ہیں وجودیات اور عدمیات سے مگر غلبہ وجودیات کو ہوتا ہے۔ جیسے نماز وغیرہ۔ اور جو افعال عدمیات کی قبیل سے ہیں۔ ان کے کرنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ ایک شئے کو عدم اصلی پر باقی رکھا جاتا ہے۔ اور افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے کیوں کہ ایک شے کو وجود کی طرف لانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں جو فرمایا گیا ہے۔

واستعینوا بالصبرو الصلوٰۃ وانھا لکبیرۃ الاعلیٰ الخشعین الذین یظنون انھم ملقوا ربھم وانھم الیہ راجعون.

یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔ وہ خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیشک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

اکثر مفسرین نے صبر سے مراد صوم لیا ہے اس کو آیت میں نہیں فرمایا بلکہ صرف نماز کے ساتھ اس حکم کو مخصوص کیا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں روزہ رکھنے میں بڑی مستعدی کرتی ہیں اور نماز پڑھنا ان پر قیامت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے اور نہ کھانے میں عورتوں کا کچھ کمال بھی نہیں۔ اس لئے کہ اول تو مزاج بارد جس میں تحلیل رطوبات کم ہوتی ہے دوسرے کھانے پکانے سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور مردوں میں یہ امور متحقق نہیں ہیں۔

خشوع کی ضرورت

نماز کو جو آیت میں دشوار کہا گیا ہے اس سے خاشعین کو مستثنٰی بھی فرمایا ہے کہ وہ خاشعین پر

مشکل نہیں اس لئے خشوع کی بھی ضرورت ہے تا کہ اس سے نماز آسان ہو۔اس واسطے خشوع پیدا کرنے کی ترکیب بھی الذین یظنون الخ میں ارشاد فرمائی۔یعنی وہ یوں خیال کرتے ہیں کہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں بخدا یہ خشوع پیدا کرنے کے لئے عجیب علاج ہے آدمی ہر عبادت میں یہی خیال کرلے کہ یہ میرا خدا سے ملنے کا آخری وقت ہے تو بڑا خشوع ہوگا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

صلوۃ مودع ۔ مودع یعنی رخصت کئے گئے شخص جیسی نماز پڑھو۔

اور برے اعمال چھوڑنے کی عمدہ ترکیب یہی ہے کہ جو کام کرو یہ خیال کرلو کہ آخری وقت یہی ہے۔ یہ مراقبہ ہر دشواری کو آسان کرے گا۔اس مراقبہ کی یہ بھی خاصیت ہوگی کہ موت سے وحشت جاتی رہے گی اور اس کے معنی ظاہر ہو جائیں گے۔

الموت تحفة المؤمن. (یعنی موت مؤمن کے لئے تحفہ ہے)

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　　راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

یعنی وہ دن بڑی خوشی کا دن ہے کہ اس عالم فانی سے کوچ کروں۔راحت جاں طلب کروں اور محبوب کے پاس جاؤں۔

پہلے یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود یاد دائمی موت کے کس طرح ضروری دنیوی امور میں مشغول ہوتے تھے کیوں کہ اس کے ساتھ ظاہراً یہ ممکن نہیں۔ پھر سمجھ میں آیا کہ موت سے جب تک وحشت ہوتی ہے اس وقت تک یہ قصہ ہوتا ہے اور جب موت سے انس ہو گیا پھر وہ ضروری مشاغل سے مانع نہ ہوگی۔یہ تقریر متعلق خشوع کے تبعاً تھی۔

روزہ کی عدمیت

بیان اس کا ہو رہا تھا کہ روزہ میں عدمیت غالب ہے اور نماز میں وجودیت۔اس پر مجھ کو اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔میں نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا کہ ایک سائل یوں سوال کرتا ہے کہ اس کے کیا معنی کہ روزہ تو اللہ کا اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے جواب میں میں نے کہا کہ نماز میں جو کام کرنے پڑتے ہیں ان میں چونکہ شان عبدیت بڑھی ہوئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی عبد ہیں اس لئے نماز کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی اور روزہ کی حقیقت اکل

---

[1] کنز العمال: ۴۲۱۳۸، کشف الخفاء للعجلونی ۲: ۴۰۲

وشرب وغیرہ کا ترک کرنا ہے جس میں ایک صمدیت واستغناء کی شان ہے اس لئے اس کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف زیادہ مناسب ہے کہ وہ بھی مستغنی ہیں۔

تو اس جواب کا حاصل بھی وہی وجودیت وعدمیت کا تفاوت ہے اور چونکہ روزہ میں صرف گناہوں کا چھوڑنا کمال نہیں۔روزہ میں وجودیت بھی مطلوب ہے، اسی کو حدیث:

یا باغی الخیر اقبل ویاباغی الشر اقصر (سنن الترمذی:۶۸۲)

یعنی اے خیر کے طالب متوجہ ہواور اے شر کے طالب رک جا

میں جمع کر دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس میں بھی تجلیہ اور تحلیہ دونوں مطلوب ہیں کیونکہ پہلے جملہ سے اعمال خیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسرے میں معاصی سے بچنے کو کہا گیا ہے اور اسی کا نام تجلیہ ہے۔

ندائے فرشتہ

گزشتہ جمعہ کو تجلیہ کے متعلق ضرورت کی قدر بیان ہو چکا ہے اب تحلیہ کی صورت بتاتا ہوں۔مگر پہلے طلباء کا ایک اشکال دفع کئے دیتا ہوں۔

وہ یہ کہ حدیث یاباغی الخیر، الخ میں ندائے فرشتہ کا ذکر ہے اور ذکر بھی اس طرح کہ روزمرہ ندا ہوتی ہے مگر کوئی اس کو سنتا نہیں۔پھر ندا پر عمل کی کیا صورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ جیسے خود سننا قابل عمل ہے دوسرے کا خبر دینا بھی قابل عمل ہے پس ہم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی خبر معلوم کر کے عمل کر سکتے ہیں۔اگر ہمارے حواس اس قابل نہیں کہ فرشتہ کی ندا کو سن سکیں تو یہ ہماری کمی ہے۔ندا اور منادیٰ پر کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اس کے متعلق شملہ کا قصہ عرض کرتا ہوں جو مجھ کو بالفعل سفر میں پیش آیا۔

وہ یہ کہ اس سفر میں مولوی انور شاہ صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔وعظ کے ایک جلسہ میں مولوی انور شاہ صاحب نے اعجاز قرآن کے متعلق تقریر فرمائی جو مشکل تھی سمجھ میں نہ آنے سے لوگ بددل ہوئے اور عموماً وہاں لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس تقریر سے کیا فائدہ ہوا۔بعد میں میں نے اپنے وعظ میں اس کے متعلق لوگوں سے کہا کہ مولوی صاحب کی تقریر سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بعضے مضامین علماء کے ایسے ہوتے ہیں جن کو آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس تقریر میں کوئی نقص ہے بلکہ آپ صاحبوں میں اس کے سمجھنے کی قابلیت نہیں تو یہ نقص آپ صاحبوں کا ہے نہ کہ علماء کا۔اسی

طرح فرشتہ کی ندا کو خیال کیجئے کہ اس کا مسموع نہ ہونا ہمارا نقص ہے نہ کہ نداو منادی کا۔

اتباع سنت

دوسرے اس مسموع نہ ہونے میں ایک حکمت بھی ہے وہ یہ کہ معلوم ہو جائے اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم بھی ہے کہ اس کی کائنات کی دوسری شان ہے۔ البتہ اس نداء کو قلب ادراک کرتا ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ رمضان المبارک آتے ہی قریب قریب ہر ایک کو یہ شوق ہوتا ہے کہ آؤ نیک کام کرلیں۔ یہ اسی آواز کا اثر ہے جو قلب نے سنی ہے۔

اب بعد دفعہ اشکال کے تجلیہ کی صورت عرض کرتا ہوں۔ پس رمضان کے متعلق اس کے دو طریقے وارد ہیں۔ ایک خاص، دوسرے عام۔ خاص سے مراد خاص اعمال سے تحلیہ اور عام سے مراد مطلق حسنہ سے تحلیہ۔ سو اس مجموعہ کے لئے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں۔

ایک حدیث بیہقی میں ہے کہ قرآن اور روزہ دونوں سفارش کریں گے۔ قرآن کہے گا کہ میں نے اس کو سونے نہیں دیا۔ اس لئے میری سفارش قبول فرما کر اس کو بخش دیجئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام تمام رات بیدار رہے کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت نہ تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہ نسبت اور دنوں کے کم سونے دیا۔ چنانچہ کلام اللہ میں ہے۔

قلیلاً من اللیل مایھجعون. یعنی رات کو بہت کم سوتے تھے۔

بزہد وورع کوش وصدق وصفا ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

یعنی زہد وتقویٰ میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ بڑھو۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ یہی کمال ہے۔ پس ساری رات جاگنا ضرور نہیں۔ مقبولیت قدم بقدم رسول صلی اللہ علیہ وسلم چلنے سے ہی ملتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں قصہ ہے کہ تین شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی تحقیق دریافت کر کے آپس میں کچھ کہنے لگے ایک نے کہا کہ میں صائم الدہر رہوں گا کبھی افطار نہ کروں گا۔ دوسرا بولا کہ میں سونا چھوڑ دوں گا تمام رات نوافل پڑھا کروں گا۔ تیسرا بولا کہ میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اما انا فاصلی وارقد واصوم وافطر واتزوج[1].

میں تو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ جس سے یہ غرض تھی کہ میرا اتباع کئے بدون چارہ نہیں۔

[1] مشکل الآثار للطحاوی ۲: ۸۸، مجمع الزوائد للهیثمی ۲: ۲۵۹

حقیقی شہرت

اس میں یہ بھی راز ہے کہ اتباع سنت کے علاوہ دوسرے امور صورۃ موجب امتیاز ہونے سے سبب عجب وشہرت کا ہوجاتے ہیں جو سم قاتل ہے۔

خویش را بخور ساز وزار زار　　　تاترا بیروں کنند ازاشتہار

یعنی اپنے کو پست اور شکستہ بنالو تاکہ عوام الناس تم کو شہرت وجاہ سے خارج کردیں۔

اشتہار خلق بند محکم است　　　بندایں از بند آہن کے کم است

خلائق میں مشہور اور ذی جاہ بن جانا ایک سخت حجاب ہے۔ راہ خداوندی میں یہ حجاب قید آہنی سے کم نہیں ہے۔

اور یہ جدا بات ہے کہ ازخود شہرت ہوجائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب اللہ میاں کسی کو محبوب بناتے ہیں تو آسمان وزمین میں بواسطہ ملائکہ ندا فرمادیتے ہیں کہ اللہ نے فلاں کو محبوب کرلیا ہے تم بھی محبوب رکھو۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس کو سب محبوب کہنے لگتے ہیں۔ مگر اپنی طرف سے قصد شہرت نہ چاہیے۔ اور جو شہرت منجانب اللہ ہوجائے اس میں کچھ خرابی نہیں جیسا کہ مقبولین کی شہرت ہوجاتی ہے بلکہ بعد موت بھی باقی رہتی ہے۔

ہرگز نہ بمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقعہ میں بوجہ اس کے کہ اس کو لذت قرب کامل طور سے حاصل ہوجاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیے۔

یہ تو قرآن کی سفارش کے متعلق مضمون تھا۔

روزہ کی سفارش

روزہ کہے گا میں نے دن میں کھانے پینے سے روکا اس طرح دونوں شفاعت کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں صرف روزہ کافی نہیں بلکہ قرآن بھی پڑھا کرو۔ جس کا سہل طریقہ اس ماہ میں تراویح ہے مگر دشواری یہ ہے کہ تراویح بھی باقاعدہ بہت کم پڑھتے ہیں۔ یہ کمال میں شمار ہوتا ہے کہ فلاں حافظ نے ایک گھنٹہ میں اس قدر پارے پڑھے حالانکہ کلام اللہ کے الفاظ تک درست نہیں ہوتے۔ نہ رکوع نہ سجود وغیرہ ٹھیک ہوتا ہے۔

گرتو قرآں بدیں نمط خوانی ـ بہ بری رونق مسلمانی

اگر اس طور سے قرآن پڑھتا ہے تو رونق مسلمانی کو زائل کرتا ہے۔

ادھر تو مقتدیوں کو نہایت اضطراب ہوتا ہے کہ کوئی باقاعدہ پڑھنا چاہے تو وہ چین نہیں لینے دیتے۔ غرض جب فارغ ہو کر واپس ہوتے ہیں تو بجائے ثواب کے مواخذہ سر پر ہوتا ہے۔

ازدردوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم ـ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

محبوب کے دروازے سے کیا کہوں کس طور سے میں گیا۔ پورے شوق سے آیا تھا۔ بالکل محروم ہو کر چلا۔

بعض شائقین تلاوت کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم پورے طور سے کلام اللہ پڑھنے پر قادر نہیں بلکہ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔ پس وہ یہ سمجھ کر تلاوت سے بیٹھ رہتے ہیں کہ ایسے پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ باوجود اٹک اٹک کر بہ دشواری تلاوت کرنے سے بھی دوہرا اجر ہوگا مگر اس سے یہ نہ سمجھیں کہ صاف پڑھنے والے سے یہ بڑھ گیا۔ ممکن ہے کہ اس کا، اکہرا اس کے دوہرے سے بڑھ جائے۔ جیسے اشرفی اور دو روپے کہ کمیت میں تو دو روپے زیادہ ہیں اور کیفیت میں ایک اشرفی بڑھی ہوئی ہے۔ اور جن کو پڑھنا نہ آئے ان کے لئے صرف سننے پر بھی ثواب مرتب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی محروم نہیں ہیں۔ چنانچہ کلام اللہ میں:

واذا قرئ القرآن فاستمعو اله وانصتوا .

یعنی جب قرآن پاک پڑھا جائے تو خاموش ہو جاؤ اور اس کو سنو۔

موجود ہے۔ اگرچہ تالی و تلاوت کرنے والا، کے مثل ثواب نہ ہو۔ لیکن ؎

مرا از زلف تو موئے بسند است ـ ہوس راہ رہ مدہ بوئے بسند است

یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی بہت ہے۔ اگر بال نہ ملے تو خوشبو ہی سہی۔

جیسے قرآن کو نزول سے اس ماہ کے ساتھ مناسبت تھی ویسا ہی اس ماہ میں اس کی تلاوت وسماع کا بھی سامان کر دیا کہ تراویح کا امر فرمایا تاکہ کوئی ثواب سے محروم نہ رہے۔

ہماری حالت

یہ تو بیان تھا تحلیہ کے طریق خاص کا اور اس کا طریقہ عام یہ ہے کہ اس ماہ میں فضیلت رکھی گئی ہے کہ نفل کا ادا کرنا فرض کے برابر رکھا گیا ہے اور فرض کا ادا کرنا برابر ستر فرض کے چنانچہ حدیث میں ہے۔

من تقرب فيه نجصلة كمن اوى فريضة فى غيرة[1] .الخ
یعنی جس شخص نے اس ماہ میں نزدیکی ڈھونڈی اللہ تعالیٰ کی کسی خصلت کے ساتھ انواع نفل سے تو وہ مثل اس شخص کے ہے کہ جس نے ادا کیا فریضہ اس ماہ مبارک کے غیر میں۔ اس ماہ میں نفل کا ایسا ثواب ہوتا ہے جیسا کہ دوسرے مہینوں میں فرض کا۔

جس میں ہر نیک کام داخل ہوگیا۔ پس یہ مطلق خیر سے تحلیہ ہوا اور یہ تو اس تحلیہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال تھے۔ اب اس ماہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل دیکھئے کہ کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ اذا جاء رمضان شد میز رہ کان اجود بالخير من الريح المرسلة[2] آپ اس ماہ میں نہایت سخی اور عبادت کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے بھی اور فعل سے بھی دونوں طریقہ سے کام کر کے دکھا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کیا اور دوسروں کو امر بھی فرمایا کہ اس قسم کا عملدرآمد کرو۔

اب اس باب میں لوگوں کی چار حالتیں ہیں۔ بعض کی تو یہ حالت ہے کہ نہ نیک کام کریں نہ برا چھوڑیں۔ بعض کی یہ ہے کہ برے کام تو ترک کردیں مگر نیکی نہ کریں، بعضے نیک کام تو کریں مگر اپنے اوقات کو بیہودہ معاصی میں گزاریں۔ بعضے فعل نیک اور ترک بدی دونوں کو جمع کرلیں۔ اگر کسی میں کامل ہمت نہ ہو تو وہ کم از کم حسنات واجبہ ومؤکدہ پر اکتفا کر کے برائیاں تو چھوڑ دے۔ یہ ہے تجلیہ اور تحلیہ۔ اے اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرما۔ آمین

---

[1] مسند أحمد ۲: ۲۱۳، ۳: ۴۰، الترغيب والترهيب للمنذرى ۴: ۱۰۴، كنزالعمال ۱۱۷۹، مجمع الزوائد ۱۰: ۱۹۶، ۱۹۷
[2] مسند أحمد ۱: ۳۶۳، ۶: ۱۳۰، السنن الكبرى للبيهقى ۴: ۳۰۵، إتحاف السادة المتقين ۷: ۱۳۸

الصَّوم

روزہ کی فضیلت کے متعلق یہ وعظ ۱۴ شعبان ۱۳۳۸ھ کو
برمکان تحصیلدار صاحب نکرڑ ضلع سہارنپور بیٹھ کر فرمایا
جو ۲ گھنٹہ ۲۰ منٹ میں ختم ہوا مجمع دو ہزار افراد کا تھا۔
محمد عبداللہ صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔ اَمَّابَعْدُ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ کل حسنۃ تضاعف بعشر الی سبع مائۃ ضعف الاالصوم فانہ لی وانا اجزی بہ[1]۔

ترجمہ: ارشادفرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے سوائے روزہ کے کہ وہ خاص میرے لئے ہے اور میں (خود) اس کی جزا دوں گا۔

تمہید: یہ ایک حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی جناب باری عزاسمہٗ کا وہ ارشاد ہے جس کی تلاوت کبھی نہ کی گئی ہو۔ یہ حدیث جس کو اس وقت میں نے پیش کیا ہے اس میں حق تعالیٰ نے روزہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اس وقت یہ مضمون اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس وقت دوقسم کے روزہ کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ایک تو روزہ مستحب کا وقت قریب ہے۔ تو وہ کل یا پرسوں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بحساب خانگی رویت کے پرسوں کو پندرہ شعبان ہے اور بعض تحریرات سے کل پندرہ شعبان ہے اگر کسی کو تحقیق ہو جائے اور پندرہ شعبان کا روزہ رکھنا مستحب ہے۔

دوسرے روزہ فرض کا وقت بھی قریب ہے کہ پورے ماہ کا روزہ فرض ہے چونکہ دونوں قسم کے روزہ

---

[1] مسند أحمد ۲: ۴۷۹، الدر المنثور للسیوطی ۲: ۸۱، اتحاف السادۃ المتقین ۴: ۱۸۸

کا وقت قریب تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ روزہ کی فضیلت اور کچھ احکام بیان کر دیئے جائیں۔

ہر چند کہ روزہ کے فضائل ایسے نہیں ہیں کہ کسی نے نہ سنے ہوں۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہمیشہ علماء کے مواعظ سنے ہیں۔ کم وبیش خود بھی لوگ واقف ہیں۔ تو اس حیثیت سے احتیاج بیان نہ تھی۔ لیکن میں روزہ کی ایک فضیلت خاصہ بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ فضیلت من حیث ہی (اس اعتبار سے کہ وہ فضیلت فضیلت ہے) میرا مقصود بھی نہیں بلکہ اس سے میں ایک خاص طرز سے روزہ کے چند احکام مستنبط کروں گا اور احکام بھی لوگوں کے سنے ہوئے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ سن کر ان کو یاد نہیں رکھتے ہیں اور اگر یاد بھی رکھتے ہیں تو ان کی عظمت نہیں۔ میں ایسے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ان احکام کی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وسعت ثواب

حاصل یہ ہے کہ جتنی نیکیاں ہیں سب کا ثواب کئی گنا کر کے ملتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت چونکہ واسعہ ہے اور منظور یہ ہے کہ بندوں کو کچھ مل جائے۔ اس لئے نیکی کا بدلہ برابر سرابر نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس میں اضافہ کا قانون ہے بخلاف گناہ کے کہ برابر لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: **من جاء بالحسنة فله خير منها** یعنی جو شخص نیکی لائے گا اس کے لئے اس سے بہتر ملے گا۔

مطلق مضاعفت تو اس آیت سے ثابت ہے اور دوسرے مقام پر اس کی تعیین بھی فرما دی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

من جاء بالحسنة فله عشر امثالها . الآیه

یعنی جو شخص نیکی لائے اس کے لئے اس کی دس مثل اور جو برائی کرے تو اس کے برابر جزا ملے گی۔

اس سے مضاعفت اور خیریت مذکور آیت سابقہ کی تعیین ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانون عام ہے۔ اس لئے لفظ من عام ہے کوئی اس سے مخصوص نہیں۔ پس مضاعفت دس سے کم تو کسی حال میں نہ ہوگی اور جو حدیث میں نے اول پڑھی تھی اس سے منتہائے اکثری بھی اس مضاعفت کا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کے تفاوت سے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے یعنی اگر کوئی ایک پیسہ دے تو سات سو پیسوں کا اگر ایک روزہ رکھے تو سات سو روزوں کا ثواب لگتا ہے۔ علیٰ ہذا ایک آیت پڑھے تو سات سو آیت کا۔ ایک قرآن ختم کرے تو سات سو قرآن کا ثواب ملتا ہے۔

اس منتہا کو جو میں نے اکثری کہا تو وجہ اس کی یہ ہے لیکن یہ کثرت اضافی نہیں بلکہ فی نفسہٖ

کثرت مراد ہے کہ قرآن وحدیث میں غور کرنے سے سات سو کی تحدید معلوم نہیں ہوتی بلکہ غیر متناہی مضاعفت ہوتی ہے ۔ اور متناہی سے مراد غیر متناہی بالفعل مراد نہیں بلکہ بمعنی **لا تقف عند حد** (یعنی کسی حد پر موقوف نہیں) مراد ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی ایک مثال ارشاد فرمائی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضاعفت کا انتہا نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: **مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ.**

یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک دانہ ہو وہ سات بالیں اگادے اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔

اس کے آخر میں ارشاد ہے: **واللہ یضاعف لمن یشآء واللہ واسع علیم**

یعنی اللہ جس کے واسطے چاہیں اس سے بھی زیادہ بڑھادیں اللہ تعالیٰ وسعت والے علم والے ہیں

یہ جملہ ماسبق کی علت ہے کہ اس مضاعفت سے حیرت اور تعجب نہ کرو اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہیں۔ ان کے یہاں تنگی نہیں اور اس کے ساتھ ہی دھوکا میں پڑنے والے کا علاج بھی ارشاد فرمادیا کہ وسعت پر مغرور مت ہو جاؤ اور یہ مت سمجھو کہ ہماری نیکی قابل مضاعفت ہے۔ اس لئے کہ وہ علیم بھی ہیں۔ یعنی یہ بھی جانتے ہیں کہ کس کی نیکی مضاعفت کے قابل ہے اور کس کی نہیں۔ جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر مضاعفت ہوتی جائے گی اور چونکہ اخلاص کی کوئی حد نہیں لہٰذا اس مضاعفت کی بھی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔

نیکی کا قانون

الحاصل نیکی کا قانون عام کہ جس سے کوئی مومن مخصوص و مستثنیٰ نہیں یہ ہوا کہ ایک نیکی کے بدلے دس ملتی ہیں اور باعتبار اکثر کے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے اور سات سو سے آگے (غیر حد تک) مضاعفت ہوسکتی ہے یہ تو آیت سے مضاعفت کا غیر محدود ہونا معلوم ہوا۔

اب حدیث لیجئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص ایک چھوہارا صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دست مبارک میں لیتے ہیں اور اس کی پرورش فرماتے ہیں **کما یربی احد کم فلوہ**۔ یعنی ایسے پرورش فرماتے ہیں یعنی اس کو بڑھاتے ہیں۔ جیسے ایک تمہارا اپنے بچھیرے کو پرورش کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔

بچھیرے کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ عرب کے لوگ گھوڑوں کو بہت محبوب رکھتے تھے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ ایک جنگ جو اور بہادر قوم ہے اور گھوڑا جنگ میں بڑا کام آنے والا ہے۔ قرار میں بھی اور فرار میں بھی۔ اگر میدان میں قائم رہ کر حرب میں مشغول رہیں تو اس میں بھی گھوڑا کام دینے والا ہے اور اگر مغلوب ہونے کی حالت میں بھاگنے کی ضرورت ہو تو اس موقع پر بھی گھوڑے سے زیادہ کوئی جانور کام کا نہیں اور حرب میں یہی دو موقع ہوتے ہیں۔ کبھی قرار ہوتا ہے اور کبھی فرار۔ اور جیسے قرار فی الحرب (لڑائی میں برقرار رہنا) شجاعت شمار ہوتی ہے اس لئے موقع سے اپنی جان بچا کر نکل بھاگنا یہ بھی درستی حواس سے ہوتا ہے اور درستی حواس جب ہی ہوگی جب کہ قلب ضعیف نہ ہو۔ آدمی دلیر اور بہادر ہو۔ چنانچہ عرب جہاں اشعار میں قرار پر یعنی جمے رہنے پر فخر کرتے ہیں۔ اسی طرح فرار یعنی میدان سے بھاگ جانے پر بھی فخر و ناز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ عرب کی شاعری نہایت سادہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ عجم کے تکلفات وہاں نہیں ہیں۔ غرض گھوڑا قرار اور فرار دونوں وقت میں چونکہ کام آتا ہے۔ اس لئے وہ عرب کو بہت محبوب تھا اور ظاہر ہے کہ بچہ تو ہر شے کا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر محبوب کا بچہ تو اور بھی زیادہ محبوب ہوگا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جیسے تم بچھیرے کو پالا کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

حتی یکون اعظم من احد ۔ یعنی اس چھوارہ کی اتنی تربیت فرماتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے اندر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سات سو کی تخصیص تحدید کیلئے نہیں۔ اس لئے کہ چھوہارہ کے برابر احد پہاڑ کے ٹکڑے کئے جائیں تو سات سو کیا سنکھوں مہا سنکھوں سے بھی زیادہ پر نوبت پہنچے گی اور وزن کے اعتبار سے اگر چھوارہ کے برابر حصے کئے جائیں تو اور بھی زیادہ ہو جائیں گے مولانا فرماتے ہیں ۔

خود یابد ایں چنیں بازار را ۔۔۔۔ کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاند وصد جان دہد ۔۔۔۔ ہرچہ دروہمت نیاید آں دہد

ایسا بازار کہاں نصیب ہوگا کہ ایک پھول کے بدلے تمام چمن کے مالک بن جاؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ جان فانی لیتے ہیں اور باقی جان عنایت فرماتے ہیں۔ جو کچھ وہم وگمان میں نہیں آسکتا وہ عطا کرتے ہیں۔

ثواب کا مدار

بڑھنا باعتبار اخلاص کے ہے جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا۔ اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر نصف مدیعنی آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے احد کی برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ تو ہے نہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ سے (توبہ توبہ) رشتہ داری ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھا کہ اوروں کے اندر اتنا نہیں اسی واسطے ان کے صدقات وحسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں دنیا میں بھی ہم اس کی نظیر دیکھتے ہیں کہ ایک ہی کام ہے۔ ایک آدمی اس کو ضابطہ کے موافق کرتا ہے اور دل سے نہیں کرتا۔ اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ضابطہ ہی کا برتاؤ بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرا شخص اسی کام کو محبت سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔ اس کے دل میں قدر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قانونی معاملہ نہیں کیا جاتا بلکہ جی چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ نفع پہنچایا جائے۔

یہ بحث تو مضاعفت کے متعلق تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اور جناب باری تعالیٰ کے کلام پاک سے۔ آگے استثنا فرماتے ہیں۔

الا الصوم فانه لی وانا اجزی به[1] لیکن روزہ اس لئے کہ وہ میرے لئے خاص ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا یعنی ہر حسنہ میں مضاعفت ہوتی ہے۔

روزہ کا خصوصی ثواب

لیکن روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے اس کے لئے دوسرا قانون ہے **فانه لی**۔ یہ وجہ ہے دوسرا قانون ہونے کی۔ یعنی وہ میرا ہے۔ میرے لئے خاص ہے اس لئے ہم اس کو قانون اور حسنات سے جدا قرار دیتے ہیں **وانا اجزی** (میں خود اس کی جزا دوں گا) یعنی وہ قانون دوسرا اس اس کے لئے یہ ہے کہ اس کی جزا بلا واسطہ ملائکہ کے ہم خود دینگے۔ ذرا بھی کسی کو عقل ہو تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس عمل کی نسبت جناب باری تعالیٰ یہ فرمادیں کہ ہم خود اس کا بدلہ دیں گے تو وہ جزا بڑی عظیم الشان ہوگی جیسے حاکم یہ کہے کہ فلاں کارگزاری کا انعام ہم خود دیں گے۔ ہر شخص سمجھے گا کہ خدا جانے کیا عنایت ہوگی اور جب احکم الحاکمین یہ فرمادے تو وہ جزا تو بے حد ہوگی۔

---

[1] السنن الکبری للبیہقی ۴: ۲۷۰، ۲۷۳، ۳۰۵، الدر المنثور ۱: ۷۹، ۲: ۷۹

بے حد کے یہ معنی نہیں کہ غیر متناہی بالفعل ہوگی کہ اس پر محال ہونیکا اشکال ہو بلکہ بے حد ہونے کی صورت یہ ہے کہ غیر متناہی بامعنی لاتقف عند حد ہے یعنی وہ جزا کسی وقت ختم نہ ہوگی۔ یہ امتیاز تو باعتبار کمیت کے ہے اور ہوسکتا ہے کہ کیفیت کے اعتبار سے اس میں اور اجزیہ سے کچھ امتیاز ہو کہ روزہ کی جزا کیفا اور اعمال کے اجزیہ سے ممتاز ہو غرض روزہ کے درمیان میں خواہ مقدار کے اعتبار سے ہو یا کیف کی رو سے ہو اور حسنات سے اس اجزاء کی نوع علیحدہ ہوگی حدیث میں اس سے بحث نہیں کہ وہ جزاء کیا ہے اور اس کو کیا مناسبت ہے اس لئے کہ حاکم کو یہ ضرور نہیں کہ رعایا سے وہ یہ بھی بیان کردیا کرے کہ کیا جزادیں گے اور اس کو کیا مناسبت ہے اور نیز مقصود تو امتثال کا امر کی ترغیب ہے اور جزاء کا بیان کرنا اس کا مدار نہیں مدار ترغیب امتثال کا تو اہل اطاعت کے نزدیک اتنا بھی کافی ہے کہ حاکم کا حکم ہے اور خیر ایک درجہ میں انتظار تو اسکا اجمالاً بھی ہو تو مضائقہ نہیں مگر یہ کہ اس کی تعیین بھی ہو اور اسکے وجوہ مناسبت بھی معلوم ہوں یہ کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں۔

بلاضرر لغزش

اس باب میں دو لغزشیں ہوجاتی ہیں۔ ایک لغزش تو دین میں مضر نہیں گو ایک درجہ میں لغزش ہے۔ مگر دوسری مضر ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فضائل وثواب کا جو وعدہ ہے اس پر امتثال کو مبنی کرنا کہ ان فضائل اور ثواب کے سبب تو عمل کرتا ہے۔ یہ لغزش تو ہے مگر مضر نہیں اس لئے کہ وعدہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اس کا وجود تو متیقن ہے تو اس نے عمل کو ایسی شے پر مبنی کیا ہے کہ اس کا وجود یقینی ہے۔ ثابت بالنص ہے۔ تو اس میں ضرر کچھ نہیں لیکن یہ دلیل قلت محبت کی ہے اور یہی سبب ہے اس کے لغزش ہونے کا۔ اپنے مطلب کی محبت ہے، ذات محبوب اس کو محبوب نہیں۔ اگر ذات محبوب اس کو مطلوب ہوتی تو فضائل تو کیا، اگر امتثال امر میں کوئی تکلیف ہونا بھی معلوم ہوتا تب بھی امتثال ترک نہ کرتا۔

دیکھو دنیا میں اگر کسی سے محبت ہوجاتی ہے تو اس سے ملنے میں کتنی کتنی مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ گوارا اور نا گوارا سب ہی کچھ برداشت کرتے ہیں۔ واللہ اگر محبت صادق ہے تو اس کا مشرب تو یہ ہے کہ جس میں محبوب خوش ہو وہ کام کرنا چاہیے۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

فراق اور وصل کی کچھ حقیقت نہیں۔ محبوب کی رضا طلب کرنا چاہیے اگر محبوب فراق کو پسند فرمائیں تو تم وصال کے طالب مت بنو۔ اس لئے محبوب کی مرضی کے خلاف کی تمنا کرنا افسوس کی بات ہے۔

صرف اس کی خوشنودی کے لیے کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ یہ کہنا کہ آپ مل جائیں یہ بھی نہ چاہیے لیکن چونکہ ایسی طبعیتیں بہت کم ہیں زیادہ طبعیتیں ایسی ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعیدوں کو سن کر عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اعمال پر وعدہ فرمایا ہے ایک بنا تو عمل کی یہ تھی جو کہ مضر نہیں۔

فہم حکمت

ایک بنا دوسری ہے۔ وہ نہایت خطرناک ہے وہ کیا ہے فہم حکمت یعنی عمل جب کریں گے جب اس عمل کی حکمت اور وجہ مناسبت عمل و جزا بھی ہماری سمجھ میں آ جائے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر تعلیم بڑھتی جا رہی ہے اسی قدر اس بنا فاسد کا شیوہ ہوتا جاتا ہے جس کو دیکھئے کیا علماء کیا جہلا سب اس میں مبتلا ہیں۔

ماشاء اللہ میرے جاہل کہنے پر شاید بعض تعلیم یافتوں کو شبہ ہوا ہو کہ ہم تو خاصے لکھے پڑھے ہیں۔ چنانچہ خواندہ لکھے جاتے ہیں۔ ہم کو جاہل کیوں کہا۔ بات یہ ہے کہ جاہل کے معنی یہ نہیں کہ لکھنا یا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ بلکہ جس فن کو کوئی نہ جانے وہ اس فن کا جاہل ہے اگر میں ڈاکٹر نہیں ہوں تو اگر اس فن میں دخل دوں تو میری حماقت ہے۔ اس فن کے اعتبار سے میں جاہل ہوں۔ جس شخص نے جو فن حاصل نہ کیا ہو وہ اگر اس میں محقق ہونے کی حیثیت سے گفتگو کرے یہ اس کی غلطی ہے اور اگر سائلانہ گفتگو کرے تو اگر وہ سوال غیر ضروری ہے تو یہ بھی حماقت ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی طبیب کے پاس دو مریض جو کہ فن طب سے بالکل ناآشنا ہیں آئیں۔ تو ایک نے نبض و قارورہ کو دکھلا کر نسخہ لکھوالیا اور دوائی ترکیب وغیرہ دریافت کر کے دوا پینا شروع کر دیا۔ اور دوسرے نے بھی نسخہ تو لکھوایا مگر نسخہ کو دیکھ کر آپ نے طبیب سے قیل و قال شروع کی۔ کیوں حکیم صاحب آپ نے گل بنفشہ کیوں لکھا ہے۔ بجائے اس کے فلاں دوا کیوں نہ تجویز فرمائی اور گل بنفشہ پانچ ہی ماشہ کیوں لکھا۔ چھ ماشہ کیوں نہ لکھا ظاہر ہے کہ طبیب کو یہ گفتگو اس مریض کی ضرور ناگوار گزرے گی۔ اس کو تو اس قدر سوال کافی ہے کہ میرا مرض کیا ہے۔ اور دوا کیا ہے اور بلا حجت دوا پینا شروع کر دیتا۔ اس پر طبیب عتاب بھی کرے گا لیکن اسی عتاب کی حالت میں اگر کوئی طالب علم (جو اس طبیب سے فن حاصل کرنے کے لئے رہتا ہے) آجاوے اور وہ بعینہ یہی سوالات کرے کہ شیخ نے اس دوا کی مقدار کی کیوں لکھی ہے اور بجائے اس کے فلاں دوا کیوں نہیں لکھی تو طبیب برابر جواب دینے لگے گا۔ اس پر وہ مریض سائل بگڑ جائے کہ

کیا وجہ ہے کہ ہم نے یہی سوال کیا تھا تو ہم پر تو عتاب ہوا۔ اور اس نے پوچھا تو آپ نے جواب دیا وہ طبیب ظاہر ہے کہ یہ کہے گا کہ یہ فن حاصل کرنے آیا ہے اس کو سوال کا حق حاصل ہے اور اس کا مقصود ہی ہے اور آپ کا مقصد یہ نہیں۔ آپ کو تو شفا مطلوب ہے۔

صاحبو! یہ مثال جب سمجھ میں آ گئی تو اب اس سے صاف واضح ہو گیا کہ آپ صاحبوں کا حکمت سے سوال کرنا بالکل بے موقع ہے۔ تعجب ہے کہ شب وروز گراموفون اور فوٹو گراف اور کمروں و بنگلوں میں رہنے کا شغل ہو اور سوال یہ کریں کہ نماز کی فلاسفی کیا ہے اور روزہ کی حکمت کیا ہے۔ آپ اپنے امراض کا علاج کیجئے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ ایک مرتبہ قصبہ رام پور جاتے ہوئے موضع اسلام نگر میں تشریف لائے۔ ایک خان صاحب ایک جگہ کے رئیس اس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کو خیال ہوا کہ مولوی صاحب تنہا ہیں۔ ان سے باتیں کرنا چاہیں۔ اب باتیں کریں تو کیا کریں۔ اس لئے کہ ہر شخص سے وہی باتیں کی جاتی ہیں جو اس کے مذاق کے موافق ہوں۔ سوچ بچار کر آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کون سی ہیں جن سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ چھوٹی باتوں سے ہمارے یہاں نکاح نہیں ٹوٹتا۔ یعنی آپ کی مراد کن چھوٹی باتوں سے ہے؟ خان صاحب کہنے لگے کہ حضرت یہی کفر شرک کی باتیں۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ خان صاحب جب کفر شرک چھوٹی باتیں ہیں تو آپ کے نزدیک بڑی باتیں کون سی ہیں خان صاحب چپ رہ گئے۔ حقیقت میں اپنے مرتبہ سے زیادہ سوال کرنا خود ذلیل ہونا ہے۔

ایسے ہی ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں۔ ان کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے ایک شخص پر فوجداری کا مقدمہ ہو گیا ہے اور وہ دریافت کرتا پھرتا ہے کہ فلاں دفعہ جو تعزیرات ہند میں ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کے ذمہ تو ضروری ہے کہ اس کو فکر ہو جائے اور وکلا سے مشورہ کرے اور اپنی مرضی کی کوئی صورت تجویز کرے افسوس ہے کہ ہمارے اوپر ہزاروں مقدمے فوجداری کے قائم ہیں۔ لیکن ہم کو تنبیہ نہیں۔ ہم کو تو یہ ضروری تھا کہ قوانین دریافت کرتے اور اپنی گلوخلاصی کی کوئی تدبیر نکالتے۔ ہم اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کی کیا وجہ ہے اور اس کی کیا وجہ ہے۔

احکام الٰہی کی عظمت

سو یہ سخت مضر ہے اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو حکم وعلل کچھ سمجھ میں آ گئے یا نہیں۔

اگر سمجھ میں نہ آئے تب تو یہ ضرر ہوگا کہ امتثال کو مبنی کیا تھا فہم پر اور فہم ہوا نہیں ۔ اس لئے احکام پر عمل ہی نہ کرے گا اور ان کو لغو سمجھے گا جیسا کہ آج کل بہت سے ہمارے نوجوان مذہب کی پابندی صرف قومیت کے لحاظ سے کرتے ہیں احکام الٰہیہ کی کچھ عظمت ان کے قلوب میں نہیں ہے بلکہ اس قسم کے سوالات کرنا یہ خود دلیل اس کی ہے کہ عظمت نہیں ۔

دیکھو گورنمنٹ کے احکام کی چونکہ دل میں عظمت ہے اس لئے ان کی وجہ کبھی نہیں پوچھی جاتی ۔ اگر کوئی پوچھتا بھی ہے تو یہ جواب ملتا ہے میاں احمق ہو سرکاری حکم ہے اور یہاں علما سے حکمتیں اور علتیں دریافت کی جاتی ہیں ۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ علما جو جاننے کی چیزیں ہیں سب کچھ جانتے ہیں بہت سے احکام کی حکمت بھی جانتے ہیں اور علت بھی مگر اس حکیم کی مثل ہیں کہ جاہل مریض کو اس نے جھڑک دیا تھا اور اگر کوئی طالب علم سوال کرتا ہے تو وہ شگفتہ ہو کر جواب دیتا ہے ۔

ایک شخص میرے پاس ایک فرائض کا مسئلہ لائے ۔ اس میں بھتیجا اور بھتیجی تھے میں نے کہا یہ میراث بھتیجے کو ملے گی ۔ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بھتیجی کو نہ ملے گی ۔ حالانکہ دونوں بھائی بہن ہیں ۔ میں نے کہا جناب نوکری چھوڑ دیجئے اور فارغ ہو کر ہمارے پاس رہئے ۔ ہم اول سے صرف ونحو فقہ پڑھا کر سراجی آپ کو پڑھائیں گے اس وقت اس کی وجہ سے آپ سوال کرنے کے قابل ہوں گے اور اب تو یہ جواب ہے کہ سرکاری حکم اسی طرح سے ہے ۔

بہرحال یہ طرز اور اس پر بنائے کار رکھنا سخت مضر ہے کہ اگر معلوم نہ ہو تب تو عظمت ووقعت نہ ہوگی اور اگر کچھ سمجھ میں بھی آئے تو چونکہ علل وحکم منصوص کم ہیں اس لئے اکثر تخمین وظنی ہوں گے کیونکہ بدون خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے ہماری رسائی حقائق تک کب ہو سکتی ہے ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے علم سے ہمارے علم کو جو نسبت ہے وہ اس سے بھی زیادہ بعید ہے کہ جیسے ایک صغیر سن بچے کے علم کو باپ کے علم سے ۔

چنانچہ اب ملاحظہ فرمائیے کہ چھوٹے بچے کو آپ منع کرتے ہیں کہ کھٹا آم نہ کھاؤ اور دلیل اس کی کچھ بیان نہیں کرتے ۔ دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ ہمارا اس پر زور ایسا ہے کہ ہم جو بات اس سے کہہ دیں گے بلا دلیل وبلا چون وچرا اس کو ماننا ضرور ہے ۔ دوسری وجہ اس کی کم فہمی ہے کہ اگر وجہ بیان کی جائے گی تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گی ۔

صاحبو! کیا خداتعالیٰ کا اتنا بھی زور نہیں یا یہ گمان ہے کہ ہمارا علم کافی ہے۔ جب تھوڑے حقوق اور تھوڑا تفاوت علم پر لم (علت) وکیف قطع ہوجاتا ہے۔ تو خداوندتعالیٰ شانہ کے حقوق وعلم تو کہیں زیادہ ہیں۔ تعجب ہے کہ خداتعالیٰ سے اس کا انتظار کریں کہ جب وجہ سمجھ میں آجائے گی اس وقت مانیں گے اور چونکہ وہ محسن ہیں خالق ہیں اس لئے بعض جگہ حکم واسطہ خود بھی بیان فرمادیئے ہیں جیسے بچہ کی مثال ہیں باپ بعض مرتبہ کہتا ہے کہ کھٹے آم مت کھاؤ پھنسیاں نکل آئیں گی۔ اور جہاں بیان نہیں فرمایا وہاں اپنی طرف سے تراشنا سخت مضر ہے۔

بعض لوگ اس کاوش اسرار کے عذر میں کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہم کو خود تو شبہ نہیں ہے لیکن بعض مخالفین پوچھتے ہیں ہم کیا جواب دیں اس لئے ہم پوچھتے ہیں سو یہ بھی نادانی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پوچھ پوچھ کر جواب دو گے تو کہاں تک دو گے۔ کہیں تو بند ہوکر کہنا پڑے گا کہ ہم نہیں جانتے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ سیدھی بات کہہ دو کہ بھائی علماء سے پوچھو ہم نہیں جانتے۔ جب وہ علماء سے پوچھیں گے، تو علماء ان سے خود نبٹ لیں گے اور باقاعدہ ان سے گفتگو کرلیں گے۔

وہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر مذہب حق کے کچھ فروع اور اصول عقلی ہیں۔ نقل کو اس میں دخل نہیں۔ تو جو شخص اصول کو تسلیم کئے ہوئے ہے اس کو تو اس قدر کافی ہے کہ جب اصول تمہارے مسلمہ ہیں تو فروع تم کو ضرور تسلیم کرنا ہوں گے اور اگر اصول ہی مسلم نہ ہوں تو اول اصول میں گفتگو کرنا چاہیے۔ جب اصول طے ہوجائینگے فروع خود ان کے تابع ہیں۔ پس اس قاعدہ سے معلوم ہوگیا کہ مسلمان ہوکر اگر جزئیات کی وجہ دریافت کرے اس کے کوئی معنی نہیں۔ جزئیات کی وجہ دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اصول اسلامیہ ہی کلام ہے تو ایسے شخص کو اول توحید ورسالت میں گفتگو کرنا چاہیے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے وہ شخص ایک بادشاہ کی حکومت میں رہتے ہیں ایک شخص اہل اطاعت میں سے ہے اور ایک باغی ہے۔ جو مطیع ہے اس کو قوانین کی وجہ اور لم دریافت کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ جب اس نے بادشاہ کا بادشاہ ہونا اور اپنا رعایا ہونا تسلیم کرلیا تو اب احکام میں حجت نکالنا بے معنی ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ جس کو میں بادشاہ مانتا ہوں۔ یہ اس کے احکام ہیں اور باغی اگر دریافت کرے تو وہ اسلئے بیکار ہے کہ وہ بادشاہ کو بادشاہ نہیں مانتا۔ اس لئے بجائے توجیہ جزئیات کے اول تو اس سے بادشاہ کو بادشاہ منوائیں گے جب وہ مانے گا تو پھر احکام خود ہی اس کو ماننا پڑیں گے۔

غرض مخالفین کو جواب دینے کی غرض سے حکمتوں کا پوچھنا تو جیسا مثال مذکور سے مفہوم ہوا بالکل ہی لغو ہے اور اپنے عمل کے لئے اگر ہے تو اس لئے لغو ہے کہ مسلمان کا بس یہ مسلک ہونا چاہیے ۔

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت ازکار تو

زبان سے اقرار کرنا چاہیے کوئی علت نہ ڈھونڈ نا چاہیے۔

اگر کوئی کہے کہ بعض بزرگوں کے کلام میں بھی احکام کی حکمتیں پائی جاتی ہیں ،تو بات یہ ہے کہ جن حضرات کی زبان سے کچھ حکمتیں نکلی ہیں وہ انہوں نے کسی سے پوچھ پوچھ کر حاصل نہیں کیں بلکہ اس کا طریق الہام کا بھی یہ ہے کہ بدون کاوش انہوں نے عمل شروع کر دیا تھا۔عمل کرتے کرتے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نورعطا ہو گیا اس سے سب حقائق کھل گئے ۔تو تم بھی ایسا ہی کرو۔حسب استعداد تم پر بھی فضل ہو جائے گا اور حقیقت میں شریعت نے یہ احسان کیا ہے کہ تفتیش حکمت سے منع کر دیا ہے اور اس میں

بڑی حکمت ہے اس لئے اگر حکمتیں سوچ کر تم نے عمل کیا اور ہوں گی وہ تخمینی جیسا پہلے معلوم ہوا تو ممکن ہے کہ پچاس برس کے بعد وہ حکمتیں مخدوش ثابت ہوں تو جب بنا منہدم ہو گئی تو مبنی بھی نہ رہے گا۔ تو ان حکمتوں کا دروازہ کھولنا گویا اسلام پر سخت حملہ کرنا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بھائی اس راز کو سمجھتے نہیں ۔خلاصہ یہ ہے کہ اس پر امتثال کو مبنی کرنا سخت مضر ہے۔اس لئے روزہ کے متعلق بھی اس کے درپے مت ہو۔

روزہ کی خصوصیت

ضروری بات سمجھ لو کہ روزہ کی جزا خود دیں گے۔خواہ وہ جزا کچھ ہو۔اور خواہ اس میں وجہ مناسب تم کو معلوم نہ بھی ہو۔آگے فرماتے ہیں فانہ لی ،روزہ میری شے ہے یہ روزہ کی فضیلت ہے۔

رہی یہ بات کہ روزہ کو اپنا کیوں فرمایا۔اس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر عبادات ہیں ان کو کچھ نہ کچھ صورت بھی محسوس ہوتی ہے مثلاً نماز کی صورت رکوع ،سجود، قیام ،قعود محسوس ،زکوۃ کی صورت اعطاء محسوس ہے۔حج کی صورت ارکان مخصوصہ امکنہ مخصوصہ میں ادا کرنا محسوس ہے ۔نماز پڑھو تب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ نماز پڑھ رہا ہے۔حج کو تو سب دیکھیں گے بخلاف روزہ کے کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کی حقیقت چند اشیاء کا ترک ہے اور وہ محسوس نہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم ایک شخص کو صبح سے شام تک مقید رکھیں یا ہر وقت اس کے پاس رہیں

تو معلوم ہو جائے گا کہ روزہ ہے یا نہیں۔ تو وہ بھی محسوس ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ اس سے بھی روزہ کا علم ہو گا اس لئے کہ پیشاب پاخانہ غسلخانہ میں جانے کے وقت تو پہرہ ہٹاؤ گے۔ تو اس میں ممکن ہے کہ وہ روزہ توڑ ڈالے تو آپ کو کیا خبر ہو گی۔

غرض جب روزہ ایسی چیز ہوئی تو اور عبادتوں میں تو ریا کا بھی احتمال ہو سکتا ہے مگر روزہ کے اندر یہ احتمال بالکل نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر کوئی ظاہر کر دے کہ میرا روزہ ہے تو پھر روزہ میں بھی احتمال ریا کا ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی ریا نہ ہو گی۔ اس لئے کہ دیکھنے والوں کو روزہ کی صورت تو نظر آتی نہیں صرف اس کے اخبار سے ہی معلوم ہوا کہ روزہ ہے اور

الخبر یحتمل الصدق والکذب. یعنی خبر میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہے۔

ممکن ہے کہ اس کو جھوٹا سمجھا جائے بخلاف اور عبادتوں کے کہ اگر انکار بھی کرے تب بھی وہ انکار مفید نہیں اس لئے کہ مشاہدہ کے خلاف ہو گا پس ایک معنی تو **فانه لی** کے یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ میرے ہی لئے خالص ہے اس میں نمائش کا احتمال نہیں ہے۔

صلوٰۃ اللہ کی حقیقت

دوسری وجہ **فانه لی** فرمانے کی یہ ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب میں عبدیت کی شکل ہے مثلاً نماز حج وغیرہ یا بعض میں ایسی صفت ہے کہ مشترک ہے جیسے زکوٰۃ کی حقیقت کہ اعطاء ہے کہ عبد کی بھی صفت ہے اور آلہ کی بھی بخلاف روزہ کے کہ جس کی حقیقت **ترک الاکل والشرب والجماع** ہے اور ان امور سے منزہ ہونا خالص صفت حق تعالیٰ کی ہے حق تعالیٰ اس سے پاک ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ شب معراج میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے گئے اور ایسے مقام پر پہنچے جہاں فرشتے بھی نہ جا سکتے تھے اور آگے بڑھنا چاہا تو ندا آئی۔

قف یامحمد فان ربک یصلی یعنی ٹھہر وائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے کہ آپ کا رب نماز پڑھتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ بھی حق تعالیٰ کی صفت ہے۔

اس حدیث سے منکرین حدیث کو تو یہ ضرر ہوا کہ انہوں نے اس کے حدیث ہونے ہی سے انکار کر دیا۔ اور کم علم اور کم فہموں کو یہ غلطی ہوئی کہ وہ اس کے ظاہر کا اعتقاد کر بیٹھے بات یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ کے معنی توجہ اور رحمت کے ہیں جیسا قرآن شریف میں **ھو الذی یصلی علیکم**

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں رہا یہ شبہ کہ رحمت وتوجہ فرمانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آگے بڑھنے سے کیوں مانع ہوا۔ بات یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت مورد تجلیات اور رحمتوں کے رہتے تھے کہ کسی کو انبیاء واولیاء میں سے یہ مرتبہ حاصل نہ تھا لیکن اس وقت حق تعالیٰ نے چاہا کہ خاص تجلیات اور قرب خاص سے مشرف فرمادیں اوران تجلیات خاصہ وقرب خاص کے لئے ضرورت تھی استعداد خاص کی۔ اس لئے ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا کہ ابھی ٹھہرو، اللہ تعالیٰ تم پر اپنے انوار ورحمت فائض فرمارہے ہیں تا کہ تمہارے اندر استعداد تام ہوجائے آئندہ تجلیات کی۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں نماز کے معنی نہیں۔ غرض نماز خاص صفت بندہ کی ہے۔

بخلاف روزہ کے کہ اس میں شان تنزیہ کی ہے پس اس میں تشبہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ وہ ہماری شے ہے۔

ایک لطیفہ غیبی

یہاں سے ایک لطیفہ ظنی طریق سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور ظالمین کی نیکیاں مظلوموں کو دی جائیں گی تو بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ روزہ نہ چھنے گا۔ اس لئے کہ سرکاری جائداد ہے۔ اس کو کوئی نہ لے سکے گا مگر اس کا دعویٰ لطیفہ کے درجہ میں ہے ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ

انا اجزی به . میں خود ہی اس کی جزادوں گا۔

ایک نسخہ انا اجزی به بصیغہ مجہول بھی مشہور ہے اس کے معنی مشہور یہ ہیں کہ روزہ میرا ہے اور اس کے بدلہ میں دیا جاؤں گا۔ یعنی اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس کو ملوں گا۔ اور یہ مضمون گوفی نفسہٖ صحیح ہو کہ حق تعالیٰ اس کے بدلے میں مل جائیں گے۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دن دربار کیا اور یہ حکم کیا کہ جوشخص جس شے پر ہاتھ رکھ دے گا اس کو وہی شے دی جائے گی چنانچہ لوگوں نے اپنی خواہشوں کے موافق ایک ایک شے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لونڈی نے ہارون رشید کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہارون نے کہا یہ کیا۔ کہا کہ جب آپ میرے ہوگئے تو یہ چیزیں میری ہوگئیں اس لئے میں نے آپ کو انتخاب کیا ہے۔ بس جس کو خدا تعالیٰ مل گئے۔ اس کو سب نعمتیں مل گئیں۔

غرض یہ مضمون تو فی نفسہٖ صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اس حدیث سے نکالا جاتا ہے جوشخص ذرا

بھی عربیت سے مس رکھتا ہوگا وہ ہرگز اس سے یہ معنی نہ سمجھے گا اس لئے کہ عربیت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جزا دیا جاؤں گا۔ یعنی نعوذ باللہ مجھ کو کوئی جزا دے گا نہ یہ کہ میں جزا میں مل جاؤں گا۔ کہ یہ اس کا ترجمہ نہیں ہے پس یہ نسخہ غلط ہے صحیح وہی ہے

انا اجزی به۔ یعنی میں اس کو جزا دوں گا۔ اور روزہ کی فضیلت یہ کیا کچھ کم ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں جزا دوں گا۔ خیر یہ مضامین تو تبعاً بطور لطیفہ کے ہیں۔

روزہ اور فدیہ

مجھ کو **فانه لی** (وہ روزہ میرے ہی لئے ہے) سے ایک مضمون خاص مستنبط کرنا ہے جو کہ نہایت کارآمد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہ فرمایا کہ روزہ میرا ہے تو جب ہم نے روزہ رکھا تو گویا ہم زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ لیجئے حضور یہ آپ کے لئے ہے۔ اب آپ یہاں سے سبق حاصل کیجئے کہ اگر حاکم ضلع کے لئے کوئی شے تحفہ کے طور پر بھی لے جاؤ خاص کر جب کہ حاکم خود فرمائش بھی کرے تو اس کا کس قدر اہتمام کرو گے۔ جہاں تک ہو سکے گا عمدہ صاف ستھری شے لے جاؤ گے۔ اور اگر احتمال بھی اس میں عیب کا ہوگا تو اس کو ردی کر دو گے دوسری منگاؤ گے۔ ذرا گریبان میں منہ ڈال کر حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کو کہنا کہ روزہ میں بھی اتنا یا اس سے آدھا ہی اہتمام ہوا ہے بفضلہ تعالیٰ اکثر لوگ تو روزہ ہی نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ روزہ کی فلاسفی ہے کسر قوۃ بہیمیہ۔ تو جب یہ علت ہے تو ہم اپنے اندر اس وقت کو مغلوب پاتے ہیں۔ خاص کر بعض نام کے مولویوں کا ترجمہ بعض نے جب سے دیکھا ہے تو اور زیادہ دلیری بڑھ گئی۔

اس زمانہ میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ طبع ہوا ہے اس میں:

وعلى الذين يطيقو نه فدية. جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے نہ ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے۔ کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے۔ اس سے لوگوں کی جرأت بڑھ گئی اور بجائے روزہ کے فدیہ کو کافی سمجھ لیا۔

یاد رکھو کہ یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ کرنے والا ہی علوم سے بالکل جاہل ہے اس لئے کہ مولوی تو مولا والا ہے اور نفس علم کی وجہ سے اگر کوئی مولوی ہو جائے تو شیطان بڑا عالم ہے بلکہ معلم الملکوت و فرشتوں کا استاد مشہور ہے۔ خدا جانے یہ کہاں کی روایت ہے۔ کسی بزرگ کے کلام میں ہو تو اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ علوم میں فرشتوں سے زیادہ ہے۔ یہ

مطلب نہیں کہ فرشتوں کو میاں جی کی طرح پڑھایا کرتے تھے۔ اور شیطان کا علم میں زیادہ ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولویوں کو بہکاتا ہے۔ مولوی کو وہی شخص بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ دیکھئے اگر وکلاء کو کوئی دھوکا دے تو وہ وکالت دانی میں اس سے زیادہ ہوگا۔ جب مولویوں کو بھی دھوکا دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مولویوں سے زیادہ علم رکھتا ہے مگر صاحبو! علم تو اور ہی شے ہے علم وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں:

علم چہ بود آنکہ بنمایدت   زنگ گمراہی زدل بزدایدت
تو ندانی جز یجوز لا یجوز   خود ندانی تو کہ حوری یا عجوز

حقیقت میں علم وہی ہے کہ تم کو راہ حق دکھائے اور تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے۔ تم کو سوائے یجوز (یہ چیز جائز ہے) اور لا یجوز (یہ چیز ناجائز ہے) کے کچھ خبر نہیں۔ تمہیں اپنا علم نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود۔

جس نے تمام عمر ڈپٹی کلکٹری کی ہو وہ قرآن کا کیا ترجمہ کرے گا۔ بڑا کمال اس ترجمہ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ محاورہ کے موافق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسلم ہے لیکن جب غلط ہوا تو کس کام کا۔ اگر

حرمت علیکم امھاتکم. تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں۔

کا ترجمہ کوئی یہ کرنے لگے کہ نماز پڑھو تو یہ ترجمہ ہی نہیں۔ چنانچہ اس ترجمہ کا ایک مقام مجھ کو یاد آیا۔ سورۂ یوسف میں ہے

ذھبنا نستبق. ہم آپس میں دوڑنے لگ گئے۔

استباق کا ترجمہ ان مترجم صاحب نے کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ نقلاً بھی بالکل غلط ہے اور عقلاً بھی۔ نقلاً تو اس لئے کہ لغت میں دیکھ لیجئے کہ **استباق** کے کیا معنی۔ کیا خلاف لغت ترجمہ بھی معتبر ہوگا۔ استباق کے معنی آپس میں دوڑنا ہیں کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور چونکہ عقل پرستی کا آج کل زور ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ عقلاً بھی یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے کہ جس سے محافظ بچہ کی نسبت بھیڑیئے کے کھا جانے کا احتمال ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام ضرور جرح فرماتے۔

بہرحال **وعلی الذین یطیقونه** کی یہ تفسیر نہیں ہے اور نہ فدیہ دینے والے بری ہو سکتے ہیں۔ اور نہ یہ کہہ کر بری ہو سکتے ہیں کہ روزہ تہذیب نفس کے لئے ہے ہم تو خود مہذب ہیں اس

لئے کہ اول تو یہ کہنا غلط ہے کہ ہم مہذب ہیں اور دوسرے تہذیب نفس روزہ کی حکمت ہے نہ کہ بناء وعلت ۔ یہ خرابی اس کی ہے احکام کی مخترع حکمتوں پر مبنی کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا ذکر ہے جو تاویلیں کر کے روزہ رکھتے ہی نہیں۔

روزہ کی حقوق

بعض وہ ہیں جو رکھتے ہیں لیکن اس کے حقوق ادانہیں کرتے انہوں نے روزہ نام فقط اس کو رکھا ہے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا جائے ۔صاحبو! اگر حاکم تم سے یہ کہے کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور تم اندھا، بہرا لنگڑا، لولا، اپاہج محض لے جاؤ تو کیا حاکم اس سے خوش ہوگا ہرگز نہیں بلکہ حتی الوسع اس کی کوشش کرو گے کہ مرضی کے موافق آدمی ہو تو روزہ میں یہ قاعدہ کیوں مہمل چھوڑ دیا۔ آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں سب ہی کو گناہ سے بچانا چاہیے۔ دیکھو جب روزہ میں وہ چیزیں حرام کردی گئی ہیں جو پہلے مباح تھیں تو جو پہلے سے حرام ہیں وہ تو بطریق اولیٰ واجب الترک ہوں گی اور اگر روزہ میں گناہ ترک نہ کئے تو اس کا روزہ کیا ہے نام کا روزہ ہے۔

اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کو روزہ میں سے صرف بھوک پیاس اور جاگنا ہی میسر ہوتا ہے اور بعض لوگ اطمینان حاصل کرنے کے لئے دنیا کے تعلقات تو کم کردیتے ہیں لیکن بجائے اس کے شطرنج، گنجفہ، غیبت، بدنگاہی ناول دیکھنا اختیار کرتے ہیں یادرکھو کہ یہ افعال سم قاتل ہیں ان کو معمولی نہ سمجھیں۔ مگر پھونکنے کے لئے ایک چنگاری بھی کافی ہے۔ ظاہراً یہ افعال خفیف معلوم ہوتے ہیں لیکن واقع میں سخت ہیں۔

ادنیٰ بات یہ ہے کہ شطرنج سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور غفلت تمام امراض کی جڑ ہے طبیبوں سے پوچھئے کہ زکام کیا ہے اگر علاج میں ذرا غفلت کی جائے تو سینکڑوں امراض کا مقدمہ بن جاتا ہے اسی طرح ناول دیکھنا اس میں بھی اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا۔

اگر کوئی کہے کہ غفلت تو کچہری میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہیے سب چھوڑ دیں۔ بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں ایک ضروری اور ایک غیر ضروری۔ ضروری اشغال میں یوں تجربہ ہوا ہے کہ مضر نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا۔ تو دل اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی سی غفلت اس میں ہو جاتی

ہے اس کے لئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جائیگی اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مضر ہے اور مورث غفلت ہے اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفضی الی الکبائر بلکہ الی الکفر و کبیرہ گناہوں بلکہ کفر کی طرف پہنچانے والی ہو جاتی ہے بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے۔

وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بدمعاشی کے طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع جاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصہ صریحاً کذب اور عادتاً مستحیل ہیں مثلاً گل بکاؤلی کا قصہ بکاؤلی کی تصویر اور جنون کی عملداری وغیرہ من الخرافات ان قصوں سے کوئی ترکیب بدمعاشی کی نہیں سیکھ سکتا کیوں کہ اس میں وصال بکاؤلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پہنچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کرے گا۔ بخلاف ناولوں کے (ضبط کنندہ عرض کرتا ہے کہ ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے کہ واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا اثر خبیث پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نساء یا اطفالین میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قلب میں سوزش جیسی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔۱۲ جامع) کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو ہر شخص کر سکتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ دنیا کے سب کام چھوڑ کر روزہ میں غیبت کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ چار آدمی بیٹھ گئے۔اس پر طعن، اُس کی برائی اور جو کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ میاں روزہ بھی کسی طرح کٹے۔ الحاصل روزہ میں ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ سب کی حفاظت رکھنا چاہیے۔ان سب گناہوں سے روزہ کی برکت کم ہو جاتی ہے خصوص معدہ کا گناہ یعنی حرام کھانا اس کو تو ضرور ہی چھوڑ دو کہ یہ تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

حظ نفس

حکم تو یہی ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کو ترک کر دو۔ لیکن چونکہ اس طرح یک دم سے چھوڑنا کم ہمت لوگوں کو شاق ہے اس لئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایک ہی ماہ کے لئے اپنے نفس سے صلح کر لو۔ اور نفس سے کہہ دو کہ اے نفس صرف ایک ہی ماہ کے لئے متقی بن جاؤ۔ پھر اختیار ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اب جو نفس کو تقویٰ پہاڑ نظر آتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ اس قدر مشکل نہ سمجھے گا اور شدہ شدہ دائمی تقویٰ بھی میسر ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایک ماہ متقی ہوجانے سے تقویٰ کی ایک حلاوت محسوس ہوگی کہ جس کو آپ اس وقت محسوس نہیں کرتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں ایک حلاوت ہے کیونکہ جس وقت یہ نفس روکے گا اس کے روکنے میں ایک حظ ہوگا کہ اس کے برابر کسی شے میں حظ نہیں ہے اسی واسطے جوانوں کو جو لطف عبادت میں آتا ہے وہ بڑھاپے میں نہیں ہوتا۔

خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن خود قوی تر می شود خمر کہن

پرانی شراب تو اور زیادہ تیز ہوجاتی ہے خاص کر وہ شراب جو حق تعالیٰ کی طرف سے ہو یعنی شراب محبت اور کیفیت باطنی۔

لیکن اگر جوانی گزر گئی تو بڑھاپے ہی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ آئندہ آنے والی حالت میں یہ بھی نہ ہوگا جواب ہوسکتا ہے۔ بہرحال فلسفی طور پر ثابت ہے کہ عبادت میں لطف ہوتا ہے جب اسی طرح تقویٰ کے ساتھ پورا مہینہ گزر جائے گا تو شوال میں آپ کو یاد آئے گا کہ ہم نے نگاہ کو روکا تھا کیسا لطف آیا تھا۔ حلال کھانا کھایا تھا کیا نور پیدا ہوا تھا اور آپ کو ایک امتیاز حلال اور حرام میں ہوگا پھر ان ہی حظوظ کو جی چاہے گا اور ہمت بڑھے گی۔ اس طور سے ان شاء اللہ امید ہے کہ تقویٰ دائمی حاصل ہوجائے گا تقویٰ سے یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ کرتا ہے اس کو پریشانیاں نہیں ہوتیں۔ ہر کام میں اس کو سہولت ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس نیت سے تقوی نہ کرے، پھر بعد رمضان شوال میں نفس سے یہ صلح کرے کہ اے نفس ہر ماہ میں ایک ہفتہ کے لئے تقویٰ اختیار کرلے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ دن بڑھاتا جائے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ ہوگا کہ یہ شخص متقی کامل بن جائے گا اور یہ علاج میں نے بزرگوں کے ملفوظات سے سمجھا ہے۔

بعض بزرگوں نے حال میں لکھا ہے کہ اگر ان کو بیس میل چلنا ہوتا تھا تو نفس سے صلح کرتے تھے کہ اے نفس دو میل تک ذکر میں مشغول ہوجا۔ پھر تجھ کو اختیار ہے جب دو میل ختم ہوگئے دو میل کے لئے پھر صلح کرلی۔ اسی طرح تمام منزل ختم کردی اور اگر ابتداء ہی سے نفس کو یہ معلوم ہو کہ مجھ کو تمام راستہ یہ شغل ہوگا تو ہرگز اس پر راضی نہ ہوگا لیکن صاحبو! تقویٰ کلابی اختیار نہ کرنا کہ کتا جب پیشاب کرتا ہے تو ٹانگ الگ کرلیتا ہے مگر کھانے میں نجاست بھی سامنے آجائے تو وہ بھی کھا جاتا ہے۔ پس ٹانگ کو تو بچایا اور منہ کو آلودہ کرلیا۔ اسی طرح بعض لوگ وظیفوں کو تقویٰ سمجھتے ہیں اور حرام سے نہیں بچتے۔

تقویٰ کی صورت

تقویٰ ہر شے کا ہے۔ آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ بری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے۔ زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے کسی کو ستائے نہیں۔ اسی طرح ہاتھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے شہوت سے مس نہ کرے۔ پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ چل کر نہ جائے۔ کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے۔ راگ باجے سے بچے وضع میں بھی تقویٰ ہے کہ وضع خلاف شرع نہ رکھے۔ پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے۔

شاید یہاں یہ اشکال پیدا ہوگا کہ صاحب سب چیزوں کا تقویٰ ہے لیکن حرام آمدنی سے کیسے بچیں۔ اس لئے کہ ہمارا تو سب مال حرام ہے۔ غلہ ہے وہ حرام آمدنی کا ہے لباس ہے وہ ناجائز۔ اب اس کو کیسے چھوڑیں۔ یہ سخت مشکل ہے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ کہ ایک مرتبہ چوہوں میں کمیٹی ہوئی۔ سب چوہے جمع ہوئے اس میں گفتگو ہوئی کہ بلی نے ہمارے بنی نوع کو بہت ستایا ہے ہمیشہ کھا جاتی ہے اس کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ سب کی رائے اس پر قرار پائی کہ اس کو پکڑیں۔ کسی نے کہا میں ہاتھ پکڑلوں گا۔ کسی نے کہا ٹانگ پکڑلوں گا۔ علیٰ ہذا ایک بڑا چوہا خرانٹ تھا چپکا سب کی باتیں سن رہا تھا اور بولتا نہ تھا آخر میں اس نے کہا کہ صاحبزادو! یہ سب کچھ ہے لیکن جب وہ میاؤں کرے گی تو اس کو کون پکڑے گا کیا کرو گے۔

تو تمہارے نزدیک ایسے ہی اس حرام آمدنی کا اشکال ہے جس کا کچھ جواب ہی نہیں۔ جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ دس روپیہ تو کل تنخواہ اور اس میں گزر کنبہ کا پتہ چلتا نہیں اگر بالائی آمدنی نہ ہو تو کھائیں گے کہاں سے۔ تو صاحبو! میں میاؤں کا بھی علاج بتاتا ہوں اگرچہ اس کے ظاہر کرنے کی جرأت تو نہ ہوتی تھی مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان بہت تباہ حالت میں ہیں۔ دین سے بہت دور جا گرے ہیں۔ اس لئے بضرورت ظاہر کرتا ہوں کہ فقہاء رحمہم اللہ نے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے ہمارے لئے ایسی سہولتیں نکال دی ہیں کہ اگر ان سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی مبتلائے حرام ہو تو بڑا ہی بد بخت ہے۔

وہ یہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شے قرض کے روپیہ سے خریدی جائے اور وہ قرض حرام سے ادا کر دیا جائے تو اس شے میں خبث کا اثر نہیں آتا۔ گو حرام آمدنی کمانے کا گناہ ہوگا۔ تو آپ یہ کیجئے کہ رمضان بھر کے لئے تمام اشیا کھانے پینے کی نقد نہ خریدیئے۔ بلکہ کسی مہاجن سے یا کسی دوسرے مسلمان سے جس کی آمدنی حلال ہو پچاس روپیہ قرض لے کر تمام جنس خرید لیجئے۔ اور پھر وہ

قرض جہاں سے چاہے ادا کر دیجئے۔ اس طور سے آپ حرام کے اثر سے رمضان بھر کے لئے بچ سکتے ہیں لیجئے وہ سب سے زیادہ سخت سوال تھا اس کا علاج ہو گیا۔ گو حرام روپیہ سے قرض ادا کرنے کا گناہ ہوگا۔ مگر حرام کھانے سے تو بچے اور جو گناہ بالکل مہمل اور تفریح کے طور پر کئے جاتے ہیں ان کے چھوڑنے میں تو آپ کو کوئی عذر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طور سے آپ رمضان میں متقی بن سکتے ہیں اور پھر اس تقویٰ کا اثر آپ خود دیکھیں گے میرے بیان کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو رمضان کے لئے ہوا۔

گیارہ مہینے کے لئے یہ کیجئے کہ نفس سے صلح کیجئے کہ ہر ماہ میں سے تین دن کے لئے اسی طرح تقویٰ اختیار کر لے تو بقاعدہ **من جاء بالحسنة فله عشر امثالها**. یعنی جو شخص نیکی لائے اس کے لئے اس کی دس مثل ہیں۔

مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ تین بجائے تیس کے برکت میں ہو کر بقیہ ایام میں بھی اللہ تعالیٰ آپ کو تقویٰ کی دولت سے مالا مال کر دیں گے۔

ایک کام کی بات اور یاد آئی اور وہ ایک چھوٹی سے بچی سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ بعض مرتبہ حقائق اور حکم مجانین اور بچوں سے بھی مل جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بچی نے یہ کہا ہے کہ نفس جس لذت ولطف کا تقاضا کرے اس کے جواب میں اس کو روکو مت بلکہ ترک کی مہلت دو اور کہو کہ جنت میں چل کر اس لطف ولذت کو حاصل کریں گے۔ حقیقت میں یہ عجیب بات ہے بات یہ ہے کہ نفس کو گھونٹنا اور روکنا زیادہ ناگوار ہوتا ہے۔ اور آزادی اور اس کی خواہش کو پورا کرنا یا وعدہ کر لینا آسان ہے۔ چنانچہ اس تدبیر کا میں نے اول خود تجربہ کیا بہت ہی نافع ثابت ہوئی۔ پھر میں نے اوروں کو بتایا۔ انہوں نے بھی اس کا نافع ہونا ظاہر کیا۔

غرض یہ ہے کہ تدبیر کیجئے۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کیجئے۔ بے فکری بہت بری شے ہے اس سے گناہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور گناہ کے بڑھنے سے دل بے حس ہو جاتا ہے پھر اچھے برے کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ اور پہلے تو وعیدات شرعیہ ہی متنبہ کرتی تھیں۔ اور اب تو انقلابات عالم سے بھی تنبیہ ہو رہی ہے اگر ان تغیرات سے بھی اصلاح نہ ہو تو سخت افسوس ہے۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین!

الصّیام

مغفرت ذنوب کے متعلق یہ وعظ ماہ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں قریباً ۲۰۰ سامعین کی موجودگی میں بیٹھ کر فرمایا جو ۳ گھنٹہ ۵ منٹ میں ختم کیا محمد عبداللہ نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم ذنبہ ومن قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ماتقدم من ذنبہ[۱]

ترجمہ: ارشادفرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور اعتقاد اور طلب ثواب کے لئے تو اس کے پہلے گناہ بخشے جائیں گے اور جو شخص شب بیداری کرے رمضان میں ایمان سے اور طلب ثواب کے لئے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

فاعل بالاختیار

یہ ایک حدیث ہے جو مشتمل ہے دو جملوں پر۔ ایک جملہ میں صیام رمضان کی فضیلت اور دوسرے میں قیام رمضان یعنی رمضان میں شب بیداری کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رمضان کی دو عبادتوں کی فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اول صیام کی دوسرے قیام کی۔ میں اس وقت ان دونوں عبادتوں کے فضائل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن نہ

۱؎ الصحیح للبخاری: ۱:۱۶،۳:۳۳، الصحیح لمسلم، صلوٰۃ المسافرین :۱۷۵، سنن أبی داؤد التطوع ب: ۲۹، سنن النسائی ۴:۱۵۶،۱۵۷،سنن ابن ماجۃ: ۱۶۴۱، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۹۵۸

اس وجہ سے کہ فی نفسہٖ بھی ضروری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بیان فرماتے اور فضیلت کا انکار کیسے ہوسکتا ہے۔ قطع نظر رمضان کی خصوصیت کے خود ان دونوں عبادتوں میں بھی فضیلت ہے اور رمضان کی وجہ سے اور زیادہ فضیلت ان میں بڑھ گئی ہے لیکن خود روزہ اس میں مشروع ہونا بوجہ اس ماہ کی برکت ہے۔

رہی یہ بات کہ برکت اس ماہ میں کیوں ہے تو یہ بات قابل سوال نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ جس مخلوق کو چاہے بابرکت بنادے اور اس سوال کی مثال تو ایسی ہوگی جیسے کوئی انبیاء کی نسبت سوال کرے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نبی کیوں بنایا۔ حق تعالیٰ فاعل بالاختیار ہے جس کو چاہے برکت عطا فرمادے۔ کوئی شخص سوال نہیں کرسکتا کہ ایسا کیوں کیا۔ نہ حکومت کے اعتبار سے سوال ہوسکتا ہے اور نہ حکمت کے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں۔ کہ جو چاہیں کریں۔ اگرچہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو۔ اور اگر حکمتیں بھی ہوں جیسا واقع میں حکمت ہوتی ہے تو ان حکمتوں سے ہم سوال نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ اگر حکمتوں کا ہم سوال کریں تو منتہی ان کے جوابات کا پھر یہی ہوگا کہ یہی کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کریں۔ اس لئے کہ جو جواب دیا جائے گا وہ ایک لم کا جواب تو ہوجائے گا لیکن وہ جواب خود ایک واقعہ ہوگا جو محتاج علت ہے۔ اسی طرح پھر اس علت کی علت اور حکمت کی حکمت ہوگی۔ آخرکار یہی کہنا پڑے گا کہ حق تعالیٰ فاعل بالاختیار ہے جو چاہیں کریں۔

سائنس اور شریعت

یہ مسئلہ تعصب اسلامی کا شعبہ نہیں۔ ہر سائنس پرست اور فطرت پرست کو بھی آخرکار یہی کہنا پڑے گا کہ اس کا کوئی جواب نہیں۔

مثلاً انہوں نے زلزلہ کے معلوم کرنے کا ایک آلہ بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب زلزلہ قریب ہوتا ہے تو مقناطیس سے قوۃ جذب کی باطل ہوجاتی ہے۔ تو وہ آلہ اس قسم سے ہوگا کہ کہ مقناطیس سے لوہا چپکا دیا جاتا ہے اور نیچے کوئی بجنے والا برتن رکھ دیا جاتا ہے جب وہ لوہا اس پر گرتا ہے تو وہ بجتا ہے گھر والوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ زلزلہ آنے والا ہے گھر چھوڑ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تاکہ گھر گرے تو دب کر نہ مریں اور گھر چھوڑ کر چلے جانے میں کچھ حرج نہیں مسئلہ شرعیہ بھی ہے کہ جب زلزلہ آئے تو فرار مستحب ہے ہاں طاعون سے فرار ممنوع ہے وہاں قرار ضروری ہے۔

وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ طاعون سے تو مرجانا غالب نہیں ہے کیوں کہ وہ لگتا نہیں چنانچہ

جب طاعون ہوتا ہے اگر اموات اور احیاء کا شمار کیا جائے تو عدد احیاء کا زیادہ ہوگا۔ اگر کسی جگہ دس ہزار آدمی ہوں گے تو چھ ہزار اموات کی تعداد نہ ہوگی۔ اگر وہ لگتا ہوتا تو واقعی اس کا عکس ہوتا۔

رہی یہ بات کہ حکما کہتے ہیں کہ ایک کا طاعون دوسرے کا لگ جاتا ہے یہ بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ شریعت کی نظر وہاں تک ہے کہ حکماء وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ حکماء اور اطباء کی تو صرف اسباب ہی پر نظر ہے اور شریعت کو اس سے آگے کا بھی لحاظ ہے۔ پس طاعون کا لگنا بے اصل محض ہے، جس کو ہوتا ہے موثر حقیقی کی تاثیر سے ہوتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ہم تو مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک کو طاعون ہوتا ہے پھر دوسرے کو بھی ہو جاتا ہے اس کا جواب وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو دیا تھا۔ ایک اعرابی نے سوال کیا تھا رسول اللہ ایک اونٹ خارشتی اگر اونٹوں میں آ جاتا ہے تو سب کو وہ خارش لگا دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فمن اعدی الاول**[1] یعنی یہ تو بتلاؤ کہ اول کو کس نے لگائی۔

یعنی اگر تمہارے نزدیک دوسرے کی خارش کا یہی سبب ہے، تو اول کے اندر تو یہ سبب مفقود ہے اس کو کس نے لگائی جو اول کے لئے سبب قرار دیتے ہو ثانی کے لئے بھی اسی کو قرار کیوں نہ دو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے صرف اسباب ہی کو دیکھا ہے اس کی نظر اسباب ہی پر ہے اور اسباب ہی کو وہ موثر سمجھتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

عقل دراسباب می دارد نظر ☆ عشق مے گوید مسبب رانگر

عقل اسباب کی طرف دیکھتی ہے عشق کہتا ہے کہ مسبب کو دیکھنا چاہیئے۔

اسباب پرست کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دیہاتی ناواقف دیکھے کہ ریل آ رہی ہے اور ایک شخص سرخ جھنڈی لے کر کھڑا ہو گیا اور وہ ٹھہر گئی یہ دیہاتی سمجھا کہ سرخ جھنڈی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ریل کو کھڑا کر دیتی ہے۔ حالانکہ کھڑا کرنے والا دوسرا ہے سرخ جھنڈی تو ایک علامت ہے۔

عشق من پیداؤ معشوقم نہاں ☆ یار بیروں فتنہ اودر جہاں

فتنہ غلبہ حال اور جوش میں کہہ دیا ہے مراد تصرف ہے یعنی یار تو جہان سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہان کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔

اگر ڈرائیور نہ ہو اور ریل ٹھہر جائے۔ تو ہم بے شک جانیں کہ سرخ جھنڈی موثر ہے ہزار

---

[1] الصحیح للبخاری ۷:۱۲۶، ۱۷۹، ۱۸۰، الصحیح لمسلم، السلام: ۱۰۱، سنن ابی داؤد، کتاب الطب باب: ۲۴، سنن ابن ماجۃ: ۳۵۴۰

آپ سرخ جھنڈی دکھلائیں وہ ہرگز نہ ٹھہرے گی اوراسی طرح سبز جھنڈی سے چلے گی نہیں۔اسی طرح اگرآگ نے ابراہیم علیہ السلام کونہیں جلایا تو تعجب کی بات نہیں یہ تو امراصلی ہے۔ہاں جلانا اس کا یہ بے شک تعجب اور حیرت کی بات ہے۔اس لئے کہ وہ تو بے اختیار محض ہے اس کا تاثیر کرنا باعث حیرت ہوگی اور تاثیر نہ کرنا اور نہ جلانا تو امراصلی ہے مگر عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس کا عکس سمجھ رکھا ہے اوراسی بنا پر معجزات کا انکار کرتے ہیں حالانکہ حیرت جلانے سے ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایک امر جدید ہے اور تمام اسباب خواہ وہ یقینی ہوں یا ظنی یا وہمی سب کی یہی کیفیت ہے۔پس حقیقت امر تو اس کو مقتضی ہے کہ اسباب کا کسی درجہ میں بھی اعتبار نہ ہوتا۔لیکن چونکہ بندہ ضعیف ہے اس کی نظر کوتاہ ہے اس لئے حق تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا ہے کہ جہاں عادۃً سبب کے بعد مسبب کا ترتب غالب ہو بلکہ محتمل ہو وہاں اجازت نہیں دی۔

پس چونکہ زلزلہ کا سبب ہلاک ہونا غالب ہے اس لئے اس کا تو اعتبار کیا گیا اور طاعون کا سبب ہلاک ہونا غالب نہیں ہے بلکہ محتمل باحتمال مغلوب ہے اس لئے اس کا سبب اعتبار نہیں کیا گیا۔پس اگر اس مثال میں یہ سوال کیا جائے کہ یہ لوہا کیوں گرا تو اس کا جواب یہ دو گے کہ مقناطیس نے چھوڑ دیا۔اگر سوال کیا جائے کہ مقناطیس نے کیوں چھوڑ دیا تو یہ جواب دو گے کہ زلزلہ کی خاصیت یہی ہے۔پھر اگر پوچھا جائے کہ زلزلہ کی یہ خاصیت کیوں ہے تو یہی کہو گے کہ خواص کا ہم کو علم نہیں۔خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا ہی پیدا کیا ہے پس اگر یہاں اگر سب سوالات قطع ہو جائیں گے اور آگے سوال نہ کیا جائے گا کہ اس کی کیا وجہ ہے پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے افعال سے سوال نہیں ہوتا خود ارشاد فرماتے ہیں۔

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون یعنی وہ نہیں پوچھا جاتا جو کچھ کرتا ہے اور آدمی پوچھے جائیں گے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اگر ہم یہی جواب دیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کو ایسا ہی پیدا کیا ہے تو مجیب کے عجز پر محمول کیا جاتا ہے۔حالانکہ جیسا یہ اعتراض ہم پر ہے ایسا ہی اہل سائنس پر بھی ہے۔فرق اسی قدر ہے کہ ہم ہر شے کا فاعل خدا کو مانتے ہیں اور وہ طبیعت کو فاعل کہتے ہیں اور حیرت ہے کہ طبیعت کو فاعل بھی کہتے ہیں اور اس کو بے شعور بھی کہتے ہیں۔

اہل شرع اوران کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہوں۔انہوں نے ایک بہت عمدہ گھڑی دیکھی، کہ اس کے پرزے نہایت عمدہ اور نہایت خوبصورت اور وقت بہت صحیح دیتی ہے۔اب ان

دونوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کیونکر بنی ہے۔ ایک کہتا ہے کہ اس کی صورت بننے کی یہ ہوئی کہ کہیں سے اس کا کیس بہتا ہوا چلا آیا اور ایک جگہ سے بال کمانی اڑ کر آ گئی۔ اسی طرح سب پرزے اتفاقاً آ کر جمع ہو گئے۔ اور اس ترتیب خاص کے ساتھ جمع ہو گئے۔ بس گھڑی بن گئی۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں اس طرح نہیں بنی بلکہ اس کا کوئی بنانے والا ہے جو بڑا عاقل، ہوشیار، ذی اختیار، ذی قدرت ذی علم ہے۔ باوجود اس کے کہ اس نے بنانے والے کو دیکھا نہیں لیکن اس کے باوجود کو یقیناً جانتا ہے اب عقلاء خود ہی فیصلہ کریں بلکہ یہی اہل سائنس ہی بتلائیں کہ ان میں کون حق پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اول کو الو اور گدھا بتائے گا اور دوسرے کو عاقل کہے گا پس ایسا ہی اہل شریعت اور اہل سائنس میں اختلاف ہے کہ اہل سائنس جن کی نظر اسباب پر ہے ان کی مثال تو اوّل شخص کی سی ہے اور اہل شرع دوسرے شخص کی طرح۔

حکماء حقیقی

حکماء حقیقی واقع میں صرف اہل شرع ہیں۔ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا۔ پوچھا کہ جالینوس اور ارسطو اور فلاں فلاں فلسفی تھے قال لا۔ یعنی اس نے کہا نہیں۔ اس کے بعد اس نے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ اکبرؒ وغیرہ صوفیہ محققین کا نام لیا۔ قال ھم الفلاسفۃ حقا۔ یعنی افلاطون نے کہا کہ یہ لوگ ہیں سچے فلسفی۔ اور وجہ یہ ہے کہ فلسفی کہتے ہیں حقیت شناس کو اور حقیقت شناس واقع میں یہی لوگ تھے۔

بس حقیقت ہر شے کی یہ ہے کہ جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کا سوال مت کرو۔ سوال کرنا ممنوع ہے۔ جو بڑے عقل پرست ہیں وہ بھی آخر میں تھک کر اور پھر پھرا کر یہی کہیں گے۔ فرق اس قدر ہے کہ انہوں نے دھکے کھا کر اور وقت ضائع کر کے یہ بات کہی اور اہل شرع نے اول ہی کہہ دی تھی۔

آنچہ دانا کند کند ناداں — لیک بعد از خرابیٔ بسیار

یعنی جو کچھ دانا کرتا ہے وہی نادان کرتا ہے لیکن بہت سی خرابی اور دھکے کھانے کے بعد۔

حضرات صوفیاء رحمہم اللہ اس نکتہ کو سمجھے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ کسی شے کی حقیقت کی جستجو کرنا وقت ضائع کرنا ہے جو ضروری ہے یعنی اطاعت، اس میں مشغول ہونا چاہیے خود بخود اسرار اور حقائق حسب استعداد معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ جن کو معلوم ہیں وہ اہل کے سامنے بیان کرتے ہیں اور نااہل کی نسبت یہ کہتے ہیں۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ☆ بگذار تا بمیرد در رنج و خود پرستی

یعنی ظاہر پرستوں کے سامنے عشق و مستی کے اسرار مت بیان کر وان کو رنج وخود پرستی میں مرنے دو۔
اور جو اسرار سے سوال بھی کرتا ہے اس کو یہ کہتے ہیں۔

حدیث مطرب و مے گو در از دہر کمتر جو — کہ کس نکشو دنکشاید بحکمت ایں معمارا

یعنی محبت و معرفت و اطاعت میں مشغول ہو۔ راز دہر یعنی اسرار و حقائق کی فکر میں مت پڑو کیونکہ یہ اسرار الٰہی کا معمانہ کسی سے حل ہوا نہ حل ہو سکے گا۔

عبث میں مشغولیت

یہاں سے غلطی ظاہر ہوتی ہے ان لوگوں کی جو پوچھا کرتے ہیں کہ مریخ میں آبادی ہے۔ یا نہیں۔ راز دہر کی تلاش میں رہنا اپنا وقت برباد کرنا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه[1]

یعنی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ غیر نافع شے کو چھوڑ دے

حضور تو تمام مریخ وغیرہ طے کئے ہوئے تھے اور اوتیت علم الاولین والاخرین[2]۔
مجھ کو اولین وآخرین سب کا علم عطا کیا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ ناطق فرمادیا ہے۔ کہ عبث کے اندر مشغول ہونا خوبی کی بات نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تو بہت بڑا ہے حضرات اولیاء اللہ میں بہت ایسے ہیں کہ جو حقائق شناسی کے اندر حکماء سے بہت دور آگے بڑھ گئے۔

عبدالکریم جیلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دریا ایسا دیکھا ہے کہ ایک ایک موج اسکی ایسی ہے کہ تمام زمین وآسمان سے دس لاکھ حصہ زیادہ بڑی ہے اور اس کو فرشتے روکے ہوئے ہیں۔ اگر اس کو نہ روکا جائے اور وہ موج ادھر کو کھسک آئے تو زمین وآسمان سب کو بہادے اور فرماتے ہیں کہ میں نے دوزخ کی سیر کی اور اس کے ہر طبقہ کی پیمائش کی۔

بعض اہل کشف نے جنتیوں اور دوزخیوں کا عدد لکھ دیا ہے۔ مریخ تو کیا چیز ہے مریخ سے بڑی بڑی چیزوں کی سیر کر لی ہے اور ان کو حق تعالیٰ نے ایسی قوت کشفیہ عطا فرمائی تھی کہ وہ جس جگہ کی چاہتے تھے تحقیق کر لیتے تھے جب کہ افراد امت میں ایسے حضرات محققین موجود ہیں تو اگر خود حضور صلی اللہ علیہ

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمی ۸:۱۸، مسند أحمد ۱:۲۰، کنز العمال ۳:۸۲۹۱
[2] مجمع الزوائد للهيثمی ۸:۱۸، مسند أحمد ۱:۲۰، کنز العمال ۳:۸۲۹۱

وسلم حقائق بیان فرماتے تو حکماء اورصوفیا سب کے علوم ان کے سامنے گرد تھے مگر سبحان اللہ کیا شفقت ہے کہ کچھ بھی بیان نہیں فرمایا بلکہ ان چیزوں کے سوال ہی سے روک دیا۔اس لئے کہ دیکھا کہ اس میں کوئی نفع نہیں بلکہ احتمال ضرر کا ہے کہ اس میں مشغول ہوکر جوضروری امر ہے وہ فوت ہو جائے گا۔

جیسے باپ شفیق کہ وہ بادشاہ بھی ہو، اس کے ہاں سب کچھ موجود ہے لیکن اگر بچہ چاہے کہ مکتب کے دوران دوسرے شہر میں جا کر سیر کر آؤں ، تو اجازت نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر وہ سیر وسیاحت میں رہا تو سلطنت کی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سیر گاہ تو بہت بڑی ہے اگر اس کو بیان کیا جائے گا تو کوئی حد نہیں۔ اس لئے تعلیم کی ایک حد بنادی ہے اور امر ونہی مقرر فرمادی اس لئے کہ سیر گاہ کے دکھلانے میں احتمال تھا کہ آپ اسی میں رہ جاتے۔اور سلطنت کی لیاقت آپ کے اندر پیدا نہ ہوتی اور خلیفۃ اللہ کہلانے کے آپ مستحق نہ ہوتے۔اسی واسطے ارشاد فرمایا ہے:

لاتتکلموا فی القدر ۔ کہ تقدیر کے بارے میں کلام مت کرو۔

آج ایسے لوگ جو ذلیل اور جاہل ہیں اور جن کو کچھ بھی سلیقہ نہیں ہے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے کہ فلاں مسئلہ میں بولو مت یہ تو کمزوری کی بات ہے۔ سو یاد رکھو جس بات کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غور وخوض کرنے کو منع فرمادیا ہے واقعی اس میں بہت خطرے ہیں کہانیوں میں بچے کہا کرتے ہیں کہ تین کھونٹ شکار کو جائیو چوتھی کھونٹ نہ بھائیو۔اسی طرح حضور نے جس کھونٹ میں شکار کرنے سے منع فرمادیا ہے واللہ وہاں صدہا خطرات ہیں ؎

درراہ عشق وسوسہ اہرمن بسی ست ☆ ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

یعنی عشق کے راستہ میں شیطان کے وساوس بہت ہیں۔ہوش رکھو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو۔

اتباع کی ضرورت

یہ راہ وہ ہے کہ بے رہبر کے طے نہیں ہوتا ہے اور جو بے رہبر کے طے کرنا چاہے اس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرد ☆ بے قلاؤز اندریں صحرا مرد

راہ حق قطع کرنے کے لئے یار یعنی مرشد ضروری ہے۔ بلا رہبر کے اس صحرا میں قدم مت رکھو۔

حضرت فریدالدین عطارؒ کہتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ☆ عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

بغیر رفیق یعنی بغیر مرشد کے جو شخص راہ عشق پر چلا اس نے اپنی عمر گنوائی اور عشق سے خبر دار نہیں ہوا۔

جن کی آنکھیں ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ راہ میں کیا کیا آفتیں ہیں لیکن جن کی آنکھیں نہیں ہیں ان کو یہ تو چاہیے کہ آنکھوں والوں کی اقتدا کریں۔ اگر آنکھ والا یوں کہے کہ آگے نالی ہے تو اندھے کو چاہیے کہ آگے قدم نہ رکھے ورنہ گرے گا۔

جیسے کہ ایک حافظ جی نابینا دعوت سے آرہے تھے۔ ایک لڑکا ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے لئے جارہا تھا۔ خندق آئی۔ لڑکے نے کہا کہ حافظ جی کھائی۔ حافظ جی بولے کہ ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اس نے کئی دفعہ کہا انہوں نے یہی جواب دیا۔ آخر سر کے بل جا گرے۔ جب گرے تو کہا کم بخت یوں نہ کہا خندق۔

جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے ایک حد مقرر فرمادی اس سے آگے مت بڑھو تو ہم کو نہ چاہیے کہ ہم آگے ایک قدم بھی رکھیں۔ اگر ہم آگے بڑھیں گے تو ہم اس شائستہ گھوڑے سے بھی بدتر ہوں گے جو روکنے سے رک جاتا ہے اور بڑھانے سے بڑھ جاتا ہے۔ پس جب کہ ہم کو مسئلہ قدر میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ہم کو رکنا چاہیے۔

وجہ ممانعت کی یہ ہے کہ اگر اس میں گفتگو کی بھی تو اس مسئلہ کا پوری طرح انکشاف تو ہوگا نہیں اور خواہ مخواہ اور زیادہ شبہات پیدا ہوں گے اور جس قدر اس میں کاوش کی جاتی ہے اسی قدر زیادہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں کلام کرنے سے قطعاً بند کر دیا گیا جیسے کوکین اور افیون ہے کہ جس قدر اول کوئی شخص اس کو اپنے لئے تجویز کرتا ہے یہاں تک مشاہدہ ہوا اس مقدار پر نہیں رہتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے اطبا اور ڈاکٹر اس کو اول ہی سے بند کر دیتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر

اسی طرح مسئلہ قدر ہے کہ اس کے متعلق ایک بات کا جواب دیا جائے تو چار شبہے اور ہوں گے۔ اسی طرح سلسلہ چلا جائے گا کہیں ختم نہ ہوگا اور پریشانی بڑھتی چلی جائے گی۔

بدریا در منافع بے شمار است ☆ اگر خواہی سلامت بر کنار است

دریا میں منافع بے شمار ہیں لیکن سلامتی کنارہ ہی پر ہے۔

آپ تو کیا چیز ہیں بڑے بڑے عقلا کے یہاں چھکے چھوٹ گئے ہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس دریائے خونخوار کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ ایسا دریا ہے کہ اس میں جاتے ہی غرق ہو جائیں گے۔ نہ اس میں تیر سکتے ہیں اور نہ کشتی میں جا سکتے ہیں حالانکہ صحابہ جیسے عالم اور عارف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بتلانے والے اگر چاہتے تو سمجھا دیتے لیکن حالت کیا تھی کہ ایک مرتبہ چند صحابہؓ اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور سن کر چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور ممانعت فرمائی کہ اس مسئلہ میں کلام نہ کریں غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزئیاً بھی جیسا کہ اس حدیث میں اور کلیاً بھی جیسے حدیث

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه[1]

آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ غیر نافع شے کو چھوڑ دے۔

میں تحقیق علل و اسرار و حکم سے ممانعت فرما دی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو اختیار کامل ہے کہ جس شخص کو چاہے برگزیدہ فرما لے۔ اور جس زمانہ کو چاہے بابرکت بنا دے کسی کو یہ مجال نہیں کہ اس کی علت اور وجہ سے سوال کرے پس لم کا سوال تو فضول بلکہ مضر ٹھہرا۔ ہاں کیفیت کا سوال ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس میں امتداد اور تسلسل نہیں۔

تصرف حق تعالیٰ

سو کسی وقت یا کسی شب یا کسی ماہ کے بابرکت ہونے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنی تجلیات میں سے کوئی تجلی اس طرف منصرف فرما دیتے ہیں۔ اس سے اس وقت کے اندر برکت ہو جاتی ہے اور اس سے تعجب نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو اعلیٰ اور ارفع ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کی نظر میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دم کے دم میں کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔

حضرت نجم الدین کبری رحمتہ اللہ علیہ کو الہام ہوا کہ فلاں شہر میں ایک رئیس ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے ہیں۔ آپ ان کی تربیت کیجئے۔ یہ صاحبزادے حافظ شیرازیؒ تھے یہ وارستہ (آزادی) سے پھرا کرتے تھے اکثر جنگلوں میں رہا کرتے تھے اور یہ غلط ہے کہ شراب پیا کرتے تھے ہاں کسی قدر وارستگی سی تھی جس کی وجہ سے باپ ان کو بیوقوف اور دیوانہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نجم الدین اس شہر میں تشریف لائے اور اس رئیس کے ہاں پہنچے۔ وہ رئیس بہت تعظیم سے

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمي ۸:۱۸، مسند أحمد ۱:۲۰۱، كنز العمال ۳:۸۲۹۱

پیش آئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ انہوں نے سب کو بلایا مگر حافظ صاحبؒ کو بسبب ان کی دیوانگی کے چھوڑ دیا۔ حضرت نے فرمایا کوئی بیٹا باقی تو نہیں رہا۔ ان رئیس صاحب نے کہا کہ حضور ایک رہ گیا ہے وہ پیش کرنے کے قابل نہیں، دیوانہ سا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے اسی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کو بلایا تو اس ہیت سے کہ کیچڑ میں کپڑے ستے ہوئے اور بال پریشان۔ جب حافظ صاحبؒ کی نظر حضرت شیخ پر پڑی تو یہ شعر پڑھا۔

آنانکہ خاک رابنظر کیمیا کنند ☆ آیابود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ لوگ کہ خاک کوایک نظر سے کیمیا کر دیتے ہیں کیا اچھا ہو کہ ہماری طرف بھی کچھ نظر کریں

حضرت نے فرمایا کہ برخوردار ہونظر کردم (برخوردار تیری طرف میں نے نظر کی)

اس کے بعد سے تو پھر حافظ صاحب کی حالت ہی دگرگوں ہوگئی پس جب کہ اہل اللہ کی نظر میں یہ خاصیت ہے کہ حالت کو بدل ڈالا تو حق تعالیٰ کی نظر اور توجہ میں کیوں نہیں یہ خاصہ بلکہ اس سے بڑھ کر تصرف ہوگا وہ تو قادر مطلق ہے۔

مجاہدہ کی ضرورت

مجھے اس مقام پر ایک اندیشہ اور ہوتا ہے اس لئے درمیان میں اس کا جواب دے دینا ضروری ہوا۔ وہ یہ ہے کہ شاید کوئی صاحب اسی پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں کہ بس کوئی مل جائے گا ایک نظر میں کام بنا دے گا، ہم کو ہاتھ پاؤں بھی ہلانا نہ پڑیں گے اور اس لئے وہ بے فکر ہوں اور ایسے شخص کے انتظار میں ہوں۔ چنانچہ اس خیال کے بھی بہت لوگ ہیں۔ تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ بے شک نظر میں یہ اثر تو ضرور ہے لیکن استعداد شرط ہے اور استعداد پیدا ہونے کے لئے مجاہدہ ریاضت شرف عادی ہے۔

ریاضت مجاہدہ کی مثال وضو کی سی ہے کہ نہ نرا وضو کافی ہے بلکہ نماز مستقل علیحدہ فعل ہے جو مستقل اہتمام سے ادا کرنا ہوگی۔ اور نہ نماز کا تحقق بغیر وضو کے ہوتا ہے اس لئے کہ وہ شرط ہے ہاں اگر کسی کو پہلے ہی سے وضو ہوگا مثلاً غسل کیا ہو تالاب میں غوطہ لگایا ہو تو پھر مستقل افعال وضو کی ضرورت نہ ہوگی۔

اسی طرح نہ نرا مجاہدہ کافی ہے اور نہ مجاہدہ سے استغنا ہے بہرحال مجاہدہ شرط ہے۔ آگے مقصود کا ترتیب وہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے طالب کی تو یہ شان ہونا چاہیے۔

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے ☆ پر تجھ کو چاہیئے کہ تک لو لگی رہے

ہمارے حضرت ایسے موقع پر یہ پڑھا کرتے تھے ۔

یابم اورایانیابم جستجوئے می کنم ☆ حاصل آید یانیاید آرزوئے می کنم

محبوب کو پاؤں یانہ پاؤں اس کی جستجو میں لگا ہوا ہوں ملے یانہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں۔

اس شعر میں یابم یانیابم (پاؤں یانہ پاؤں) اور حاصل آید یانہ آید (ملے یانہ ملے) جو تعمیم ہے مبالغہ کے لئے ہے ورنہ وعدہ تو یہ ہے۔ "والذین جاهدوا ، الخ"

یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ان کو ضرور ہدایت کرتے ہیں۔

مجاہدہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے گھونسے مارا کرے بلکہ مجاہدہ نفس کے خلاف کرنے کا نام ہے اور مجاہدہ محض سبب عادی کے درجہ میں ہے ورنہ کار بفضل است باقی بہانہ (کام فضل سے بنتا ہے باقی سب بہانہ ہے) ملتا تو ہے سخی کے دینے سے لیکن مانگنا اور جھولی کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ مالدار تو جب ہی ہوگا جب سرکار گنیاں جھولی میں اپنے ہاتھ سے بھر دیں گے لیکن جھولی ہونا بھی ضروری ہے۔ پس یہ استعداد مثل جھولی کے ہے۔ حافظ شیرازی کے اندر استعداد پہلے سے تھی۔ چنانچہ طلب کے اندر تمام جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ دفعۃً اللہ تعالیٰ نے فضل فرمادیا۔ پس تم بھی اگر ایسی استعداد حاصل کرلو تو بے شک ایک نظر ہی کافی ہوگی۔ پیاس لگالو، پانی بہت ہے۔

آب کم جو تشنگی آور بدست ۔ پانی مت ڈھونڈو، پیاس پیدا کرو۔ پانی بہت ہے۔

توجہ کی اہمیت

آج کل یہ حالت ہے کہ کرنے کے تو کچھ نہیں اور خود بے فکر بیٹھے ہیں اور اس کے منتظر ہیں کہ کوئی ہم کو ولی بنادے بہر حال اولیاء اللہ کی نظر اور توجہ بعد استعداد کے کام دیتی ہے اور یہاں توجہ کے یہ معنی نہیں کہ پیر آنکھیں بند کر کے مرید کو سامنے بٹھلا دیں جیسا کہ متعارف طریقہ توجہ کا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا جی چاہے کہ فلاں شخص کو کچھ حاصل ہو جائے۔

جیسے استاد کے دو شاگرد ہوں ۔ دونوں کا ایک سبق ہے ایک ہی لیاقت کے ہیں اور ایک ہی عمر کے۔ لیکن استاد ایک کو دل سے بتاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو آجائے چنانچہ اس کو آجاتا ہے اور دوسرے کو نہیں چاہتا اس کو نہیں آتا۔ بلکہ اگر غور کرو تو تمام صفتوں میں اس کو نمونہ موجود ہے مثلاً ایک درزی کے دو شاگرد ہوں یا ایک لوہار کے ہوں۔

بس توجہ کے معنی یہی ہیں کہ خاصان حق کو توجہ ہو کہ اس کو کچھ آجائے یہ بڑی دولت ہے۔
بس توجہ یہی ہے کہ شیوخ کا جی چاہتا ہے کہ مرید کے اندر فلاں بات پیدا ہو جائے اور بے توجہ شیخ کے کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ راتنہا مرو ☆ بے قلاؤ زاندریں صحرا مرو

راہ حق قطع کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے تنہا اپنی رائے اور کتابوں سے سلوک طے نہ کرنا چاہیے۔ بے رہبر کے اس وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔

اس مضمون پر شبہ ہوتا ہے کہ بہت بزرگ ایسے بھی تو ہیں کہ ان کا شیخ کوئی نہیں تو اس شبہ کو مولانا رفع فرماتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادرایں راہ رابرید ☆ ہم بعون ہمت مرداں رسید

اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا ہے وہ بھی پیروں ہی کی امداد ہمت و توجہ سے پہنچا ہے۔

یعنی اول تو ایسا کم ہوا ہے کہ بے شیخ کے کوئی اس راستہ چلا ہو اور اگر شاذ و نادر ایسا ہوا ہے تو وہ بھی بدون توجہ مردان خدا کے نہیں پہنچا البتہ اس کو خبر نہیں ہے کہ کون کون مقبولان حق میری طرف متوجہ ہیں۔ بچہ کو کیا خبر ہے کہ ماں نے سوتے ہوئے میری راحت کے لئے کیا کیا کیا۔ کتنی دیر پنکھا جھلا ہے اور کتنی دیر مگس رانی کی ہے تو بدون توجہ کے تو کام کسی کا نہیں چلا۔ پس مجاہدہ اور ریاضت کر کے کوئی مغرور نہ ہو۔ بہر حال جب بزرگوں کی توجہ میں یہ اثر ہے تو خالق کی توجہ میں تو کس قدر ہوگا۔ بزرگوں کی توجہ کے لئے تو استعداد کی بھی ضرورت ہے اور وہاں استعداد کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ استعداد اور کمال دونوں معاً عطا فرماتے ہیں۔

داد اورا قابلیت شرط نیست ☆ بلکہ شرط قابلیت داد اوست

ان کی داد و دہش کے لئے قابلیت کی شرط نہیں ہے بلکہ ان کی داد ہی قابلیت کی شرط ہے۔

ان کی عطا سے قابلیت بھی ہوتی ہے اور داد بھی۔ وہ جھولی اور روپیہ دونوں ساتھ ساتھ دیتے ہیں۔ کریموں کے یہاں دیکھا ہوگا کہ سائل کو ظرف بھی دیتے ہیں اور اس میں چیز بھی دیتے ہیں۔ بہر حال ان کی نظر کی کیا انتہا ہے پس اگر وہ کسی زمانہ کی طرف توجہ فرما دیں تو اس کی برکت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے چنانچہ وارد ہے۔

قال رسول الله صلی اللہ علیه وسلم ان ربکم نفحات فی الدھر فتعرضوا لها[1] یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ہے کہ بیشک تمہارے رب کے لئے زمانہ کے اندر جھونکے ہیں فیوض کے پس تم اس کی جستجو کرو۔ پس انسان کو چاہیے کہ ایسے زمانے کو بہت غنیمت سمجھے۔

غفلت انسانی

چنانچہ جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، وہ رمضان المبارک کے برکات کو کھلی آنکھوں محسوس کرتے ہیں اور جو غافل ہیں ان کو یہ مہینہ اور دوسرے مہینے یکساں ہیں۔ رمضان آیا اپنی برکات اور انوار کا مینہ برسایا اور چلا گیا۔ان کو کچھ بھی خبر نہیں۔

ان لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص مکان کے اندر بیٹھا ہے اور باہر یہ حالت ہو کہ ابر آیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلیں اور بارش ہوئی اور لوگ اس سے خوش ہوئے اور ابر برس کر چلا گیا اور آسمان صاف ہوگیا اور یہ حضرت مکان کے اندر ہی رہے۔ ان کو کچھ بھی خبر نہیں کہ باہر کیا سے کیا ہوگیا۔ اور رمضان میں تو یہ برکات اور انوار ہوتے ہی ہیں اور زمانوں میں بھی بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس وقت کوئی طالب ہو تو وہ ان برکات سے کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ پس کسی وقت غفلت نہ کرے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ۔۔۔ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

یعنی حق تعالیٰ سے ایک پل بھر غافل نہ ہونا چاہیے ممکن ہے کہ کسی وقت وہ تم پر توجہ فرمائیں اور تم بے خبر ہو۔ سو غفلت اور بے خبری میں وہ الطاف وعنایات تمہارے حال پر نہ ہوں گی۔

اے ان کا تو اتنا بڑا حق تھا کہ اگر کچھ بھی عطا نہ کرتے تو ادھر ہی تکتے رہتے۔ دیکھو اگر کوئی محبوب یوں کہے کہ ہم کو تکتے رہو تو جو عاشق ہوگا وہ کبھی نہ کہے گا کہ کیا دوگے اور کہے تو وہ عاشق نہیں۔ عاشق تو اس اجازت کو غنیمت سمجھے گا۔ اور اس کو عین اپنا مقصود جانے گا۔ ہم کو تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسی محبت ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اور اول تو ہمارے پاس ہے کیا جو کچھ ہے جان اور مال اور اولاد وہ بھی ان کا ہی ہے۔ خیر مجازاً جو کچھ ہے اگر وہ سب کچھ لے لیں

---

[1] مجمع الزوائد للهیثمی ۱۰:۲۳۱، المعجم الکبیر للطبرانی ۱۹: ۲۳۴، إتحاف السادة المتقین ۴:۲۸۰، ۹:۳۷، کنز العمال: ۲۱۳۲۴

اور ایک مرتبہ اپنا نام لینے کی اجازت دیں تو واللہ بہت ارزاں ہے۔

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

اور ایک بزرگ لکھتے ہیں۔

آنکس کہ تراشناخت جاناں چہ کند ☆ فرزند وعزیز وخانماں راچہ کند

جس کو آپ کی شناخت اور معرفت ہوگئی وہ کیا کرے گا مال کو کیا کرے گا جاہ کو اور کیا کرے گا اولاد کو۔

ایسے لوگوں کو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ دیوانہ سمجھتے ہیں وہ ان کو جواب دیتے ہیں۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد۔ یعنی جو دیوانہ نہ ہوا وہی دیوانہ ہے۔

اور ان کو نکما اور بیکار سمجھتے ہیں اور وہ ان کے جواب میں یوں کہتے

تابدانی ہر کرایزداں بخواند ☆ از ہمہ کارجہاں بیکار ماند

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف بلالیا وہ دنیا کے تمام کاروبار سے بیکار ہو جاتا ہے۔

ان کا مذہب تو یہ ہے۔

دلآرامے کہ داری دل دروبند ☆ دگرچشم از ہمہ عالم فروبند

جس محبوب سے تمہارا دل پھنسا ہوا ہے تم اس کے علاوہ تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو یعنی بجز محبوب حقیقی کے سب سے آنکھیں بند کرلو۔

ان کی آنکھ میں تو بجز محبوب کے کچھ نہیں رہتا اور جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے وہ اس میں بھی اسی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

بسکہ درجان فگار وچشم بیدارم توئی ☆ ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے میں تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں۔

اور ایسی حالت ہو جانا کچھ عیب نہیں۔ اس کی مثال موجود ہے دیکھو جب تم کو کسی شخص کو خصوص محبوب کا انتظار ہو تو جب یہ کیفیت شدید ہوگی اور بہت انتظار بڑھے گا تو ذرا آہٹ بھی ہوگی تو بھی سمجھو گے کہ محبوب آیا ہے جو شے سامنے آئے گی اس کو وہی خیال کرو گے۔ اور جوش محبت میں ایسے شخص کے منہ سے اگر کچھ کلمات بھی نکل جائیں تو اس کو معذور کہا جائے گا۔

گفتگوئے عاشقاں درکار رب ☆ جوشش عشق است نے ترک ادب

عاشقوں کی گفتگو کار رب میں جوشش عشق کی وجہ سے ہے نہ ترک ادب کی وجہ سے۔

شریعت اور حقیقت

اول جب حال کا غلبہ ہوتا ہے تو یہی کیفیت ہوتی ہے اور آخر میں یہ کیفیت ہو جاتی ہے ۔

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ☆ ہرہوسنا کے نداند جام وسندان باختن

ادھر شریعت کا خیال ادھر عشق کا۔ شریعت و عشق دونوں کے مقتضی پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں۔

شریعت اور حقیقت دونوں میں اعتدال آ جاتا ہے گویا کہ ایک میزان ہے کہ اس کے دونوں پلڑے بالکل برابر ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ ایک میں بھی اختلال آ جائے اور پہلے اس سے مغلوب ہوتے ہیں شیخ شیرازی ایسے حضرات کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

مکن عیب درویش حیران و مست ☆ کہ غرق است ازاں می زند پاؤ دست

درویش حیران و مست کا عیب مت بیان کرو۔ وہ عشق میں ڈوبا ہوا ہے اس سبب سے ہاتھ پیر مارتا ہے۔

بس ایسے حضرات معذور ہیں اقوال میں بھی، افعال میں بھی۔ مگر خدا جانتا ہے کہ کون معذور ہے کون نہیں ہے بعض لوگ مکاری سے صوفی بنتے ہیں اور بزرگوں کے اقوال لوگوں کے سامنے بیٹھ کر نقل کرتے ہیں تا کہ لوگ معتقد ہوں ان کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں تومیکہ چشماں دوختند ☆ ازسخن ہاعالمے راسوختند

بڑے ظالم ہیں وہ لوگ جو آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کرتے ہیں۔

یہ تو اقوال کے بارہ میں ہے اور افعال کی نسبت کہتے ہیں ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ☆ پس بہروستے نباید دادوست

یعنی آدمیوں کی شکل میں بہت سے شیطان بھی ہیں۔ پس ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیے۔ یعنی ہر ایک سے بیعت نہ کرنی چاہیے۔

پس ایسے لوگ معذور نہیں ہوں گے۔ دیکھو عدالت میں گنوار اگر کوئی گستاخی کرے تو معذور سمجھا جائے گا اور عاقل کی گردن ناپی جاتی ہے۔ کیا خدا کو خبر نہیں ہے کہ کون شریر ہے اور کون سادگی سے کہہ رہا ہے۔ سادگی میں تو دلربائی ہی دوسری ہوتی ہے میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ عشق ومحبت کا مقتضی تو یہ تھا کہ اگر کچھ نہ ملتا تب بھی نہ ٹلتے چہ جائیکہ ملتا بھی ہے پس طالب کی شان یہ ہونا چاہیے کہ ہر وقت اس طرف توجہ رکھے۔ ضرور ایسا وقت ملے گا کہ اس پر فضل ہو جائے گا اس طرف سے کمی نہیں۔ کوئی لینے والا ہونا چاہیے حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد ☆ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب است

اے خواجہ جو بھی عاشق ہوا محبوب نے ضرور اس کے حال پر نظر کی ہے۔

حق یہ ہے کہ درد ہی نہیں ہے ورنہ طبیب موجود ہے۔

پس رستہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مٹادے۔ ذہانت سے یہاں کام نہیں چلتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ ☆ جز شکستہ ی نگیر دفضل شاہ

فہم وخاطر تیز کرنا یہ حق تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے۔ بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا۔

فلسفہ و منطق

آج وہ زمانہ ہے کہ کوئی روزہ کی فلاسفی بیان کرتا ہے، کوئی نماز کی، حالانکہ اصل فلاسفی یہ ہے۔

جملہ اوراق وکتب در نارکن ☆ سینہ رااز نورحق گلزارکن

تمام اوراق اور کتابوں کو آگ میں جھونک دو۔ سینہ کو انوار حق سے گلزار بناؤ۔

ان لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو پھانسی کا حکم ہوا تو اس کو تو فکر ہونا چاہیے تھا اور وکلا سے مل کر اپنے اوپر سے الزام کو دفع کرنا چاہیے۔ اس نے یہ تو کیا نہیں۔ وہ اس میں مشغول ہوا کہ پھانسی کی حقیقت بیان کرنے لگا۔ کہ پھانسی اس طور سے ہوتی ہے یا اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کو تختہ پر کھڑا کرتے ہیں پھر گلے میں اس کے پھانسی پہناتے ہیں اور تختہ کھینچ لیتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ ہیں کہ جن بلاؤں میں خود مبتلا ہیں ان کا تو فکر نہیں اور فضول قصوں میں مبتلا ہیں۔ ارے تم روزہ کی فلاسفی کیا بیان کرتے ہو تم کو اپنی فلاسفی کی بھی خبر ہے کہ یاد رکھو یہ فلاسفی اور معقولیت کسی کام کی نہیں۔ نہ دنیا میں کام آتی ہے نہ دین میں جو زیادہ فلسفیت بگھارتا ہے اور علل کی تحقیق کے درپے ہے وہ دنیوی کاموں میں ناکام رہتا ہے۔

ایک منطقی طالب علم کی حکایت مشہور ہے کہ ایک تیلی کے یہاں تیل لینے کیلئے پہنچے۔ دیکھا کہ تیلی تو اپنے کام میں مشغول اور بیل چل رہا ہے اور گھنٹی اس کے گلے میں پڑی ہے۔ طالب علم صاحب کو مرض تھا ہی کہ ہر شے کی علت تحقیق کرتے تھے۔ پوچھا کہ کیوں میاں تیلی! تم نے اس بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں ڈالی ہے۔ تیلی نے کہا کہ اس کے بجنے سے مجھ کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بیل چل رہا ہے کہنے لگے کہ اگر کھڑا ہی کھڑا سر ہلایا کرے۔ گھنٹی بجنے کیلئے چلنا لازم مساوی تو ہے نہیں۔ تیلی نے کہا کہ مولوی صاحب

آپ تشریف لے جایئے میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی۔ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ایسے احتمالات سیکھ لے۔ میں آپ کو تیل بھی نہیں دیتا دیکھئے وہ اپنی منطق دانی کی بدولت تیل سے محروم رہے۔

ایک نحوی کی حکایت مولانا نے لکھی ہے۔ایک نحوی صاحب کشتی میں بیٹھے جب کشتی چلی تو آپ کو نحو کا کچھ جوش آیا۔ملاح سے پوچھا،میاں ملاح تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے۔ملاح نے کہا جی نہیں۔نحوی نے کہا کہ تم نے تو آدھی عمر ہی برباد کردی۔آگے چل کر کشتی ایک بھنور میں آ گئی۔ملاح نے کہا میاں نحوی صاحب کچھ تیرنا بھی سیکھا ہے نحوی نے کہا نہیں۔کہا تم نے تو اپنی ساری عمر ہی برباد کی۔

مولانا نے اس مقام پر لکھا ہے کہ سنو یہاں نحو کام نہیں آتی۔یہاں نہ نحو سے کام چلتا ہے۔ پس پوچھو پاچھومت۔کام میں لگو۔کام کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا۔علوم تم پر خود بخود منکشف ہوجائیں گے مولانا فرماتے ہیں ؎

بنی اندر خود علوم انبیاء ☆ بے کتاب و بے معید واستا

اپنے اندر بے کتاب و بے معین واستاد انبیاء جیسے علوم دیکھو گے۔

تجلیات کی تاثیر

اس وقت تم ان علل اور فلاسفی پوچھنے والوں پر ہنسو گے۔بہرحال حق تعالیٰ کی تجلی اور نظر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ شے بابرکت ہوجاتی ہے۔پس رمضان المبارک کی طرف بھی کسی قسم کی تجلی فرمائی ہے کہ جس سے اس میں یہ برکت آ گئی اور جس طرح زمان کی طرف یہ تجلی ہوتی ہے اور اس میں برکت آجاتی ہے۔اسی طرح کسی مکان کی طرف اگر تجلی ہوگی تو وہ مکان بھی متبرک ہوجائے گا۔چنانچہ کعبہ کے اندر بھی تجلی الٰہی ہے کہ جس میں اس میں برکات اور انوار ہیں۔اور اس کی طرف قلوب کو کشش ہوتی ہے۔

کعبہ راہردم تجلی می فزود ☆ ایں زاخلاصات ابراہیم بود

کعبہ کو جو ہر دم تجلی افزوں ہو رہی ہے یہ ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی بدولت ہے۔

جس شے کو برگزیدہ کیا جاتا ہے اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اس پر تجلیات خاصہ میں سے کوئی تجلی فائز ہوتی ہے ایک بات طلباء کے کام کی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ مجسمہ(ایک فرقہ ہے جو خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا قائل ہے) نے **الرحمن علی العرش استوی**، اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی ، کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر ایسے ہی بیٹھے ہیں جیسے ہم چوکی پر بیٹھے ہیں۔ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ قدر نہ جانی اور عرش کو انہوں

نے بڑھادیا۔ کیونکہ مستقر بفتح القاف عادۃً مستقر باکسر القاف سے اوسع (یعنی جس چیز پر قرار پکڑا جاتا ہے وہ زیادہ وسیع ہوتی ہے قرار پکڑنے والی چیز سے) ہوتا ہے۔ حالانکہ عرش کو ذات باری تعالیٰ سے کوئی بھی نسبت نہیں۔ ایسی بھی نسبت نہیں ہے جیسے رائی کے دانہ کو ہم سے ہے۔ اگرکوئی رائی کا دانہ ہمارے قدم کے نیچے پڑا ہوتو کیا عاقل کہہ سکتا ہے اور کیا یہ محاورہ صحیح کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس پر بیٹھے ہیں۔ رائی کا دانہ بیچارہ کیا چیز ہے۔ پس عرش کہاں اور خالق عرش کہاں۔ پس معنی اس آیت کے یہ نہیں ہیں جو مجسمہ نے سمجھے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ پھر کیا معنی ہیں تو سلف صالحین نے اس آیت اور جو اس کے مشابہ اور آیات ہیں ان کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان کے معنی کی تعیین نہ کرو۔ اور ان کے معانی کو اللہ کے حوالے کرو۔ صرف اتنا اعتقاد رکھو کہ جو کچھ مراد ہے وہ حق ہے اور اسلم طریقہ آیات متشابہات میں یہی ہے۔ باقی متاخرین نے اس میں کچھ تاویل فرمائی ہے بعض نے یہ کہ استویٰ کے معنی استول ہیں اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں۔ اور ایک تاویل احقر کیا کرتا ہے کہ استوی علی العرش بمعنی برتخت نشستن کنایہ ہے نفاذ امور وتصرف فی الامور میں تصرف کرنا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد مدبر الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہوسکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الذی خلق السموت والارض فی ستة ایام ثم استویٰ علی العرش ، اللہ ہی ہے جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا استویٰ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ سو وہاں حسب قاعدہ القرآن یفسر بعضہ بعضا بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الٰہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم) ایک تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب وغریب فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ اللہ علی العرش استویٰ (اللہ عرش پر بیٹھے ہیں) تاکہ یہ لازم آئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمٰن فرمایا ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ بس حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرنے ہوئے ہے پس اس تاویل سے۔

یہ آیت۔ وسعت رحمتی کل شیء . میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے۔
کی مرادف ہوگی۔ اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلاواسطہ اس

کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بواسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوتی ہے۔

تجلی کے معنی

یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق متجلی لہ (جس کیلئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جائے۔ تجلی کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔

مجھ کو تجلی کے لفظ پر ایک حکایت یاد آئی۔ میرے ماموں صاحب نے ناناصاحب کی عجیب حکایت بیان فرمائی کہ ناناصاحب ذکر و شغل کرتے تھے لیکن کوئی کیفیت وارد نہ ہوتی تھی تو سخت حیرانی تھی۔ سالک کو ایسے وقت بہت پریشانی ہوتی ہے۔ خصوصاً اگر کوئی دست گیر نہ ہو تو اور بھی زیادہ مصیبت ہے اور یہی وہ حیرانی اور بھٹک جس کی نسبت ارشاد ہے۔ ووجدک ضالا فھدی. اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت حیران ہوا پایا۔ سو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ سلوک دکھلائی۔ مفسرین ضالاً کی تفسیر میں بہت حیران ہوئے ہیں۔ کسی نے کچھ کہا ہے کسی نے کچھ لیکن جو بات میرے دل کو لگتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ضلالت بھی حیرانی اور بھٹک ہے جو سالک کو کشور کار سے پہلے پیش آتی ہے اور فھدی میں سلوک کا ابتدا مراد ہے اور

الم نشرح لک صدرک. کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۔

اس قسم کی بھٹک سالک کو پیش آتی ہے تو اگر کوئی مرشد کامل موجود ہوا تو وہ تسلی کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کوئے نومیدی مرد کامید ہاست ☆ سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

ناامیدی کی راہ مت چل کیونکہ خدا کے فضل سے بہت سی امیدیں ہیں۔

ظلمت یعنی مدعیان مزور کی طرف مت جاؤ خورشید یعنی سنور باطن لوگ موجود ہیں۔

اور یہ بھٹک ابتدا میں ہوتی ہے پس اس قسم کی حیرانی اور بھٹک ناناصاحب کو تھی اور رہبر کامل کوئی موجود نہ تھا۔ ایک مکار درویش بنا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ پیر جی صاحب میں آپ کو تجلی دکھلادوں گا حضرت یہ طلب ایسی شے ہے کہ لکھے پڑھوں کی عقل گم ہو جاتی ہے۔

عشق رانازم کہ یوسف رابازار آورد ☆ ہمچو صنعا زاہدے رازیر زنار آورد

عشق کو مجھ پر ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بازار میں لاتا ہے اور مقام صنعا کے زاہد جیسے شخص کے زنار ڈلوادیتا ہے۔

طلب کے کرشمے

بعض مرتبہ اس طلب کی آگ میں بہت بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں ۔ حق تعالیٰ کی عنایت ہے ابتدا ہی سے شیخ کامل میسر ہو جائے اور اگر طلب پیدا ہو جائے دست گیر کوئی نہ ہو تو پوری مصیبت ہے۔

غرض نانا صاحب اس کے بہکانے میں آ گئے ۔ اس نے کہا کہ غوث گڑھ چلو ۔ وہاں ایک ویران مسجد اور تنہا جگہ ہے اس میں دکھلاؤں گا ۔ چنانچہ وہاں گئے ۔ دیا سلائیاں اس وقت نئی نئی چلی تھیں ۔ کوئی جانتا نہ تھا کہ کیا ہوتی ہیں کہنے لگا کہ وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور لا الہ الا اللہ کی ضربیں لگاؤ ۔ جب یہ ضربیں ذکر کی لگانے لگے تو اس مکار نے پیچھے سے ایک دیا سلائی کھینچی جس سے تمام مسجد روشن ہو گئی ۔ اول نانا صاحب کو حیرت ہوئی اس کے بعد کچھ سنبھلے اور مسئلہ تصوف کا یاد آیا کہ حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ نور غیب کے سامنے کوئی ظلمت باقی نہیں رہتی ۔

چو سلطان عزت علم بر کشد ☆ جہاں سر بجیب عدم در کشد

جب شہنشاہ حقیقی علم عزت کھینچتے ہیں جہاں گریبان عدم کی طرف سر کھینچتا ہے یعنی جب انوار الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے تو ماسوا باقی نہیں رہتا ۔

تو یہ کیسا نور ہے کہ میرا سایہ آگے پڑ رہا ہے اور نور غیب کے ساتھ ظلمت مجتمع ہو رہی ہے ۔ پیچھے جو دیکھا تو دیکھا کہ دیا سلائی جلا رہا ہے نکال کر جوتا خوب پیٹا ۔

ایک اور حکایت یاد آئی ۔ ایک نو مسلم نے مجھ سے بیان کی تھی کہ میں پہلے مہنت تھا ۔ راتوں کو جاگتا تھا ۔ دل میں طلب پیدا ہوئی کہ جس کا نام جپتے ہیں اس کو دیکھیں ۔ اسی طلب میں حیران سرگرداں تھا کہ ایک شخص ملا اس نے کہا کہ ہلکی سی جوت پرمیشر کی میں دکھلا دوں گا ۔ میں نے کہا اچھا ۔ چنانچہ وہ شخص مجھ کو ایک دریا پر لے گیا ۔ دور سے ایک روشنی نظر آئی ۔ مجھے کہا دیکھا یہ ہے پرمیشر کی جوت میں نے جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روشنی اچھلتی کودتی ہے ۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ کیسی جوت ہے جس میں حرکت ہے پرمیشر کی جوت میں تو وقار و سکون ہونا چاہیے ۔ پاس چل کر دیکھنا چاہیے ۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک پھوا ہے ۔ اس کے سر پر اس نے گارا جما رکھا ہے ۔ میں نے اس سے کہا کہ تو نے مجھ کو فریب دیا ۔ اس نے کہا کہ ارے کیوں بیوقوف ہوا ہے ۔ دنیا میں یوں ہی کام چلتا ہے ۔ میرے پاس رہ کر پوری کچوری کھایا کر ۔ کیوں حیران پھرتا ہے میرا دل اسی دن سے اس

مذہب سے اتر گیا اور مسلمان ہو گیا کہ شاید مسلمانوں میں کوئی ایسا مل جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا کوئی اعتبار نہیں ہے اگر مسلمانوں میں کوئی نہ ملا تو اسلام کو بھی جواب دے دو گے۔ تم مقصود ہی کو نہیں سمجھے تو مصرف اس قدر ہے کہ اپنے خالق کا یقین ہو جائے اور یہ یقین ایسی شے ہے کہ ذرہ ذرہ عالم کا اس پر دلالت کرتا ہے چنانچہ ایک اعرابی کہتا ہے۔

البعرة تدل على البعير والاثريدل على المسير فالسماء ذات الابراج والارض ذات الفجاج كيف لاتدلان على اللطيف الخبير

یعنی جب مینگنیاں اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور نقش قدم چھپنے والے کے وجود پر دال ہے تو یہ آسمان برجوں والا اور زمین کشادہ راہ والی کیوں نہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دال ہو گی۔

پس یہ ایسا علم ہے کہ ایک جنگلی کو بھی حاصل ہے اس لئے کہ فطری ہے اس نے کہا کہ نہیں اسلام کو نہ چھوڑوں گا۔ خواہ یہ مقصود حاصل ہو یا نہ ہو۔ میں نے کہا کہ ہم کو کیسے تسلی ہو۔ اس نے کہا میں نے اسلام میں ایسی بات پائی ہے جو کسی مذہب میں نہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا توحید۔ مجھ کو بہت تعجب ہوا اور یہ اثر توحید کے فطری ہونے کا ہے اور اس کا یقین دلائل کے یقین سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

ایک معقولی ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ بتلاؤ خدا کی کیا دلیل ہے ایک جنگلی ملا لٹھ لئے ہوئے اس سے پوچھا اس نے لٹھ دکھلا کر کہا؟ ہاں آپ کو خدا کے وجود میں بھی شک ہے۔ میں بتلاتا ہوں تجھ کو دلیل اور یہ کہہ کر لٹھ اٹھایا اور معقولی صاحب وہاں سے بھاگے۔ یہ تھا یقین فطری اور جس کی فطرت سلیم نہ ہو اس کا عمدہ علاج وہی ہے جو گنوار نے دکھلایا تھا۔

پس اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے السنان يزع اكثر ممايزع القرآن جس قدر قرآن پاک برائی سے روکتا ہے اس سے زیادہ سنان یعنی بھالا روکتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب کا قصیدہ ہے اسمیں اول شعر میں یہی مضمون ہے

الوعظ ينفع لوبالعلم والحكم   والسيف ابلغ وعاظ على القمم

وعظ نافع ہے اگر علم و حکم سے پر ہو اور تلوار سے لوگوں کے لئے بہت بڑا وعظ ہے۔

اب اس زمانہ میں بجائے تلوار کے اللہ تعالیٰ نے طاعون مقرر فرما دیا ہے۔

• وہ ایسا واعظ ہے کہ بڑے لمبے چوڑے واعظوں سے وہ کام نہیں چلتا جو اس سے چلتا ہے۔ نمازی بہت بڑھ جاتے ہیں اور روزہ رکھنے والوں کی تعداد بہت ہو جاتی ہے۔ مگر بعض ایسے بہادر

ہیں کہ اس وقت بھی نہیں چوکتے یا چند روز طاعون تک پڑھی جب کام نکل گیا۔ چھوڑ دی گویا اسی لئے پڑھی تھی کہ بلاٹل جائے۔

جیسے ایک بزرگ نے ایک شخص سے کہا تھا کہ اگر چالیس روز تک تکبیرہ اولی سے نماز پڑھو گے تو ہم ایک بھینس دیں گے اور مصلحت اس میں یہ سمجھی تھی کہ چالیس دن میں اس کو نماز سے محبت ہوجائیگی۔ پھر خواہ کچھ ملے گا یا نہ ملے گا یہ چھوڑے گا نہیں۔ چالیس روز کے بعد آیا کہ لاؤ بھینس۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس بھینس کہاں۔ میں نے تو اس مصلحت سے کہہ دیا تھا۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ جاؤ پھر ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے۔

یہ گفتگو استطراداً آ گئی پہلے سے یہ حکایتیں بیان کررہا تھا کہ ایک نے تجلی دیا سلائی سے دکھائی تھی ایک نے کھوے سے۔ سو تجلی کے یہ معنی نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔

ذکر و شغل کے اثرات

اسی طرح بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور ان کو کچھ انوار نظر آیا کرتے ہیں۔ وہ ان کو خدا کا نور سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اکثر اوقات تو یہ اس کے دماغ کے الوان ہوتے ہیں۔ جو اس کو نظر آتے ہیں۔

آج ہی ایک خط ایک شخص کا دہلی سے آیا ہے ان کا دماغ ضعیف تھا میں نے ان کو بجائے ذکر و شغل کے درود شریف کو پڑھنے کو لکھا تھا۔ آج کے خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے درود شریف پڑھا تو ایک چمکدار بازار دیکھا۔ میں نے ان کو لکھ دیا کہ اس کی طرف التفات نہ کرو۔ تم بوجہ پاس نہ ہونے کے تحریر سے اس کی حقیقت نہ سمجھو گے اپنے کام میں لگے رہو۔ تو وہ اس کے دماغ کی صورتیں ہیں جو متمثل ہو کر نظر کے سامنے آ گئیں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرید نے عرض کیا کہ حضرت مجھ کو ایک روشنی نظر آتی ہے اور اس میں سنہری حروف میں کچھ لکھا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم علاج کراؤ اور ذکر و شغل وغیرہ چھوڑ دو۔ تمہارے دماغ میں یبوست ہے اور یہ مقدمہ ہے جنون کا۔ اس نے کہنا نہ مانا نہ علاج کرایا اور نہ کام کو چھوڑا آخر خشکی بڑھی جنون ہوگیا۔ بالکل برہنہ مارے مارے پھرتے تھے نہ نماز نہ روزہ اور میرے سامنے حضرت نے ان کو وصیت فرمائی تھی کہ کھایا پیا کرو۔ قوت آئے گی اور یہ فرمایا تھا کہ دیکھو حدیث میں آیا ہے۔

المومن القوی خیر من المومن الضعیف وفی کل خیر[1]

مومن قوی مومن ضعیف سے بہتر ہے اور ہر ایک خیر ہے۔

غرض یہ ماہ بھی حق تعالیٰ کی تجلی خاص سے بافضیلت ومبارک ہوگیا اور اس فضیلت سے تلبس حاصل کرنے کو اس میں روزہ مقرر کیا گیا اور ان فضائل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بیان فرمایا ہے مگر میں بوجہ اس کے کہ اس سے بھی ایک اہم مضمون اس وقت پیش نظر ہے اس وقت ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا میں ایک بات اور بیان کرنا چاہتا ہوں۔

روزہ کی شان خاص

ارادہ یہ تھا اس کے بیان میں زیادہ وقت صرف کیا جائے گا مگر خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، نہ کلام اختیار میں ہے اور نہ کوئی شے بقول مولانا کے ؎

می تراود خود بخود از لب سخن   خود بخود زبان سے کلام جاری ہوتا ہے

تمہید میں بہت دیر لگ گئی مگر الحمد للہ یہ سب مضامین بھی بہت مفید ہیں وقت بیکار نہیں گیا اور وہ مضمون جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ صیام کے متعلق ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف التفات بہت کم ہے یا التفات ہے تو عمل نہیں کرتے، توجہ نہیں اور اس مضمون کے دو جزو ہیں۔ ایک میں تو ایک عامیانہ خیال کی اصلاح ہے اور دوسرا خاص مضمون ہے وہ ایک علمی مضمون ہے اور پہلا مضمون عملی ہے۔ بسط جس قدر ہوگا وہ عملی مضمون ہوگا اور وہ یہ ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ روزہ فرض ہے اور اس فرض روزہ ہی کی فضیلت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ جس شخص نے ایمان اور ثواب کی طلب کے واسطے روزہ رکھا اس کے پچھلے گناہ سب بخشے جائیں گے۔ لوگ اس فضیلت کو بھی جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ کس شان کا روزہ ہے جس کی یہ فضیلت ہے اور آیا یہ خاصیت ہر روزہ میں ہے یا وہ کوئی خاص روزہ ہے۔ سو یہ بھی حدیث سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر روزہ نہیں ہے بلکہ خاص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ[2] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ناک خاک میں مل جائے اس کی ناک خاک میں مل جائے۔ اس کی ناک خاک میں مل جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ کون ہے۔ فرمایا تین شخص ہیں ایک تو وہ جس نے اپنے

---

[1] الصحیح لمسلم، القدر: ۳۴، سنن ابن ماجہ: ۷۹، ۴۱۶۸، مسند أحمد ۲: ۳۷۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۹۸

[2] الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۱۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۴۹۱۲، الدر المنثور: ۴: ۱۷۲

ماں باپ کو بڑھاپے میں پایا اور اس نے جنت نہ حاصل کی (یعنی ان کی خدمت کرکے)

دوسرا وہ جس کے سامنے میرا ذکر آیا اور اس نے درود شریف نہ پڑھا۔

تیسرا وہ جس کے اوپر رمضان کا مہینہ آیا اور اس نے گناہ معاف نہ کرائے اور وہ اسی طرح نکل گیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان یا روزہ میں خود معافی کا اثر نہیں بلکہ اس کے اندر خاص شان ہونا چاہیے اور وہ خاص شان وہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع طعامه و شرابه[1]

جو شخص روزہ میں باطل بولنا اور برا کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو کچھ حاجت نہیں ہے اس بات کی کہ چھوڑ دے اپنا کھانا اور اپنا پینا۔

یہ ہے وہ شرط کہ جس کے پائے جانے سے روزہ کے اندر معافی کی شان آجاتی ہے اور اس شرط کا حاصل ہے معاصی کا چھوڑ دینا۔ سو اس کی طرف عام کا التفات نہیں یا التفات ہے تو عمل نہیں ہے۔

روزہ کا ادب

دیکھ لیجئے کہ کتنے ہیں ایسے لوگ جنہوں نے رمضان سے پہلے کی حالت بدل دی ہو۔ جو حالت رمضان سے پہلے تھی وہی اب بھی ہے جن کو لڑکوں اور عورتوں کو گھورنے کی عادت تھی وہ اب بھی گھورتے ہیں۔ جو غیبت کیا کرتے تھے وہ اب بھی کرتے ہیں جن کو کسی سے کینہ تھا وہ اب بھی ہے اور جو پہلے سے پرایا حق کھا رہے تھے وہ اب بھی کھا رہے ہیں۔ کون سا فعل ہے کہ کسی نے اس کو رمضان کی وجہ سے چھوڑا ہو بلکہ رمضان کے آنے سے اور زیادہ وبال بڑھ جائے گا۔ اس لئے کہ جیسا کہ مکان کے مقدس ہونے سے معصیت کے اندر شدت آجاتی ہے۔ اسی طرح زمان کے مقدس ہونے کا بھی یہی اثر ہے کہ اس سے معصیت زیادہ بڑھ جاتی۔ جیسے کوئی مسجد کے باہر بیٹھ کر شراب پیئے تو گناہ ہے لیکن مسجد کے اندر بیٹھ کر پینا اور زیادہ گناہ ہے پس رمضان سے جس سے نیکیاں بڑھتی ہیں اسی طرح اگر اس میں معاصی ہوں گے تو وہ بھی شدید ہوں گے۔ رمضان کا ادب یہ ہے کہ کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں، تمام جوارح کی حفاظت کرو۔

تقویٰ کی مشق

ایک بات کہتا ہوں اگرچہ میرے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ ہم کو تو یہی کہنا

[1] سنن ابی داؤد: ۲۳۶۲، سنن الترمذی: ۷۰۷، مشکوۃ المصابیح: ۱۹۹۹

چاہیے کہ دائمی تقویٰ اختیار کرو لیکن کیا کیا جائے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بہت بلاؤں میں مبتلا ہیں تو جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں سے فرمایا تھا۔

القوا ما انتم ملقون. یعنی ڈالو جو کچھ تم کو ڈالنا ہے

حالانکہ بظاہر یہ گناہ کا امر معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ سحر کرنا اور نبی کا مقابلہ کرنا تو کفر ہے لیکن چونکہ یہ ذریعہ تھا۔ حقائق حق کا اور غلبہ حق کا اس لئے ان کو امر فرمایا۔ اسی طرح اس امید پر کہ میرا یہ مشورہ ذریعہ ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دوام تقویٰ کا، میں بھی کہتا ہوں کہ اگر آپ سے دائمی تقویٰ نہ ہو سکے تو صرف اس ماہ رمضان میں تقویٰ اختیار کرو بعد رمضان کے تم کو اختیار ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی گیارہ ماہ میں تقویٰ مت کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفس سے ایک ماہ کے لئے صلح کرلو اور ایک ماہ کے لئے تقویٰ پر اس کو راضی کرو اور یہ کہو کہ اے نفس ایک ماہ کے لئے متقی بن جا ایک ماہ کے بعد پھر آزادی ہے اور جب مہینہ گزر جائے تو ایک ماہ کے لئے اور صلح کرلو۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اس کو دائمی تقویٰ سکھلاؤ۔

ایک بزرگ نے اسی طریقہ سے نفس کو ذاکر دائمی بنانے کی تدبیر بتلائی ہے مثلاً تم کو مظفر نگر جانا ہے تو نفس سے اگر یہ کہتے کہ اے نفس مظفر نگر پہنچنے تک اللہ اللہ کر تو نفس ہرگز راضی نہ ہوتا۔ نفس سے صلح کی۔ اے نفس صرف اسٹیشن تک ذکر کر لے پھر جب اسٹیشن تک پہنچے تو کہو کہ اے نفس صرف نانوتہ تک اللہ اللہ کر لے۔ اسی طرح نانوتہ پہنچ کر رامپور تک صلح کر لے۔ حتیٰ کہ مظفر نگر تک اللہ اللہ کرتے چلے جایئے۔ اگر ابتدا سے نفس پر بار ڈالتے تو نفس کبھی منقاد (تابعدار) نہ ہوتا۔

لیکن ان بزرگ نے کسی بزرگ ہی نفس کو دیکھا تھا۔ ہمارا نفس تو اس حکمت کو اول ہی سے سمجھ کر کبھی کہنا نہ مانے۔ اللہ تعالیٰ ناس کرے اس نفس کا کہ اس نے بہت راہ مارا ہے تاہم باوجود شرارت کے اس میں یہ خاصا ہے کہ اگر اس کو راہ پر لانا چاہیں تو کچھ تو آ ہی جاتا ہے۔ اس کی بچہ کی سی خاصیت ہے کہ بچہ بہلائے سے بہل بھی جاتا ہے۔ پس تم بھی نفس سے کہہ دو کہ عید کے دن تک تو متقی ہو جا۔ بعد میں تجھ کو اختیار ہے۔

اگر کوئی کہے کہ عید تک متقی ہونے سے کیا نفع۔ تقویٰ تو جب ہی کارآمد ہے جب کہ مرنے تک ہو۔

صاحبو! میں اس میں ایک فائدہ سمجھے ہوئے ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک تدبیر ہے دائمی تقویٰ حاصل کرنے کی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ نفس جو تقویٰ کی طرف مائل اور معصیت سے نفور نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ کی لذت اور معصیت کی کدورت سے واقف نہیں۔ اس کو یہ خبر ہی نہیں کہ تقویٰ کے اندر کیا لذت اور نور ہے اور معصیت کے اندر کیا کدورت اور ظلمت ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ چونکہ ہمیشہ معصیت ہی میں رہا ہے اس لئے نور تقویٰ سے آگاہی نہیں ہے اور جب کہ نور تقویٰ سے آگاہی نہیں تو بقاعدہ

الاشیاء تتبین بضدھا. اشیاء اپنی ضدوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔

معصیت کی ظلمت کا بھی احساس نہیں۔ پس ضرورت اس کی ہے کہ اس نور اور ظلمت یا یوں کہو کہ اس لذت اور کدورت سے واقف بنایا جائے۔ جب اس کو تقویٰ کی لذت حاصل ہوگی تو معصیت میں کدورت محسوس ہوگی۔ پس لامحالہ تقویٰ کی حرص اور معصیت سے نفرت پیدا ہوگی۔ جب پورے رمضان المبارک میں متقی رہو گے تو کچھ تو احساس ہوگا۔ لذت تقویٰ وکدورت معصیت کا شوال میں جب کہ میعاد صلح کی ختم ہو جائے گی، تو اس میں نور اور حلاوت ولذت کو یاد کرے گا اور یہ کہے گا۔

بازگو ازنجد وازیاران نجد ☆ تادر ودیوار راآری بوجد

پھر نجد اور یاران نجد کی داستان بیان کروتا کہ در ودیوار وجد میں آئیں۔

اور یہ کہے گا۔

بازدیوانہ شدم من اے حبیب ☆ بازسودائے شدم من اے طبیب

اے حبیب پھر میں دیوانہ ہوا اور اے طبیب پھر میں سودائی ہوا۔

اور اس وقت اس کو ولولہ ہوگا، طلب ہوگی اور اس حالت سے ایک جست کرے گا اور اس کو کشاکشی ہوگی۔ نور تقویٰ اپنی طرف کھینچے گا اور معاصی کی کدورت سے اس کو روکے گا اور وہ زبان حال یا قال سے یہ کہے گا۔

ہرکسے کودور ماند ازاصل خویش ☆ بازجوید روزگار وصل خویش

یعنی جو شخص اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے پھر اس زمانہ وصال کو جویا ہوتا ہے۔

پس وہ اسی طرح رفتہ رفتہ متقی بن جائے گا۔

معصیت اور اطاعت

اگر کوئی کہے کہ جیسے معصیت کے وقت طاعت کو یاد کرے گا اسی طرح طاعت کے وقت معصیت کو یاد کرے گا۔ پس وہ بین بین رہے گا۔ طاعت کا غلبہ کیسے ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول دو مقدمے سمجھ لینا چاہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ہر شے کا میلان اپنی اصلی حالت کی طرف ہوتا ہے۔ ہر عنصر اپنے جز کی طرف راجع ہوتا ہے اور دوسرا مقدمہ یہ سمجھو کہ مسلمان کی اصلی حالت طاعت ہے اور معصیت عارضی اور وہ کسی عارض کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طاعت گو اختیاری شے ہے لیکن اس کے مناشی اور اصول فطری ہیں۔ چنانچہ دیکھئے غیر عاقل بچوں میں گو طاعت نہیں ہے لیکن طاعت کے مبادی اور مناشی کہ اخلاق حمیدہ ہیں موجود ہیں۔ دیکھئے بچہ جھوٹ نہیں بولتا۔ جب کچھ ہوش آجاتا ہے اور دوسرے سے سیکھتا ہے اس وقت بولتا ہے اور جو کچھ اس سے پوچھو بے تکلف بتا دیتا ہے کچھ تصنع بناوٹ اس میں نہیں ہوتی۔ خاکساری ہے کینہ پروری نہیں۔ بچہ میں ایک صفت تو صوفیا کی سی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے مربی سے رنج پہنچے تب بھی اسی کی طرف دوڑتا ہے۔ ماں مارتی ہے اور بچہ اماں ہی اماں پکارتا ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا ہے کہ اے موسیٰ ہمارے ساتھ ایسے رہو جیسے بچہ ماں کے ساتھ۔ اگر غور کیا جائے تو بچہ کے اندر لاکھوں پاکیزہ صفات ہیں۔ بچہ مطیع ہے فرمانبردار ہے اور بہت صفات ہیں اور اسلام نے یہی صفات سکھلائے ہیں۔ پس جب یہ صفات فطری ہیں اور یہ اصلی حالت ہے تو معصیت میں طاعت یاد آنے سے معصیت کو چھوڑ کر طاعت کی طرف آؤ گے۔ یہ نہ ہوگا کہ طاعت میں معصیت کو یاد کر کے طاعت سے معصیت کی طرف آؤ۔ چنانچہ ایسا کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ تارکین دنیا طالبان دنیا بنے ہوں۔ اور ایسے لاکھوں قصے ہیں کہ طالبان دنیا تارکان دنیا ہو گئے۔

اب راز سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رمضان میں متقی بن جانے سے کس طرح دائمی متقی بن جاؤ گے۔ دیکھا آپ نے کہ کیا سہل نسخہ ہے۔

حلال وحرام

یہاں سے ایک آیت کی عجیب تفسیر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون اياما معدودات.

تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ۔ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔

ایاماً معدودات کے عامل میں گفتگو ہوئی ہے کہ کون ہے۔ مفسرین نے ایک صوموا

مقدر نکال کر اس کا معمول بنایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تتقون کے متعلق نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ تقویٰ تو دواماً مطلوب ہے وہ ایاماً کا عامل کیسے ہوسکتا ہے لیکن اس تقریر سے اس کا تتقون سے معمول ہونا سمجھ میں آ گیا ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ چندروز متقی بن جاؤ یہ تم کو دائمی متقی بنا دے گا۔

باقی یہ بات کہ یہ تفسیر کسی نے کی نہیں سو یہ کوئی بات نہیں قواعد شرعیہ وعربیہ کی موافقت کے بعد نقل خاص کی ضرورت نہیں۔ بہر حال کیسی آسان صلح نکل آئی۔

اب یہاں پر ایک اشکال باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ آپ شاید یوں کہیں گے کہ ہم آنکھوں کی بھی حفاظت کرلیں گے اور ہاتھ پاؤں سب جوارح کی۔ لیکن یہ حضرت شکم علیہ الملام (اس پر ملامت ہو) کا تقویٰ ہم سے نہ ہو سکے گا اور ان ہی حضرت پر دارومدار ہے۔ اس لئے کہ یہ بمنزلہ حوض بدن کے ہے اور دیگر جوارح بمنزلہ نالیوں کے ہیں۔ جو اس سے منشعب (نکلنے والی) ہوئی ہیں پس جیسا حوض میں پانی ہوگا نالیوں میں ویسا آئے گا اگر حوض میں پانی پاک وصاف ہے تو نالیوں میں بھی پاک صاف ہوگا اور اگر حوض میں ناپاک اور خراب پانی ہے تو نالیوں میں بھی خراب پانی ہوگا۔ پس اگر پیٹ میں حرام غذا ہے تو جوارح سے افعال بھی خبیث ہی صادر ہوں گے اور اگر حلال غذا ہے تو افعال بھی نیک ہوں گے اور ہماری حالت یہ ہے کہ گھر میں جنس ہے وہ حرام ہے، کپڑا بدن پر ہے وہ حرام ہے۔ روپیہ ہے وہ حرام وجہ سے حاصل کیا جاتا ہے تو اب ہم رمضان بھر کیسے متقی بنیں۔ ہاں گھاس کھودیں تو حلال غذا کھائیں تو ہم ایسے سخت کام کے عادی نہیں ہیں۔ یہ اشکال ہے۔

حلال کی صورت

جواب اصلی تو اس کا یہ ہے کہ کچھ ہی ہو سب چھوڑ و اور تقویٰ اختیار کرو۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ کوئی نہ چھوڑے گا۔ اس لئے اس کی سہل صورت اس کے لئے بھی بتلاتا ہوں گو دل تو چاہتا نہ تھا کہ بتلاؤں لیکن کیا کروں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر واللہ بہت دل دکھتا ہے کہ خلاف شریعت کر کے دین تو تباہ کرتے ہیں دنیا بھی برباد کر رہے ہیں۔ اس لئے ایسی صورتیں بتلانے پر جسارت ہوتی ہے ورنہ فی الواقع یہ باتیں ظاہر کرنے کی نہیں ہیں۔

سو صاحبو! یہ سخت اشکال بھی تمہارا رفع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس پیٹ کا علاج یہ ہے کہ تم اپنی پہلی جنس اور پہلے روپیہ کو قفل کر کے رکھ دو اور رمضان رمضان کے لئے جنس کسی [illegible] اجن سے

ادھار لے لو یا روپے قرض لے کر اس سے جنس خرید لو۔ پھر اس ادھار کو اپنی آمدنی سے ادا کر دینا
اگر کوئی کہے کہ مہاجن کے پاس روپیہ یا اناج حلال کہاں سے آیا اس کے پاس تو سود وغیرہ کا ہے۔
بات یہ ہے کہ اگر سلطنت کے اندر دو شخص ہوں ایک تو باغی ہو اور ایک رعایا میں ہے جو نمبردار ہے۔
دونوں مثلاً زیادت ستانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تو اس نمبردار کو تو زیادت ستانی کی قید ہوگی
اور باغی کی اس پر قید نہ ہوگی۔ اس کے لئے یہ جرم ہی نہیں۔ اس کو سزا ہوگی بغاوت پر۔ وہ
اگر بغاوت سے معافی چاہے تو سب کھایا معاف ہے بس کفر تو بمنزلہ بغاوت کے ہے۔ اس کے
ہوتے ہوئے احکام فرعیہ کا مخاطب ہی نہیں اور ہم ہیں رعایا میں سے پس مہاجن کے لئے سود
وغیرہ جرائم نہیں ہیں اس کے یہ جرائم کفر کے اندر کھپ گئے اور ہمارے لئے یہ سب جرائم ہیں۔

بہت موٹی بات ہے کہ جب تک اپنا بیٹا یا شاگرد دائرہ اطاعت میں رہتا ہے تو اس سے ہر قسم
کا مواخذہ کیا جاتا ہے اور جب کہ دائرہ اطاعت ہی سے نکل جائے تو پھر اس سے ہر بات پر گرفت
نہیں ہوتی اس کی بڑی شکایت یہ ہوگی کہ اطاعت نہیں کرتا۔ یہ شکایت نہ ہوگی کہ فلاں شرارت
کیوں کی اور جزئی نافرمانیاں معاف ہو جائیں گی۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مہاجن سے جو قرض آپ لیں گے اس میں کوئی شبہ نہ ہوگا
یہ اس اشکال کی سہل تدبیر ہے جو آپ کو پیش آیا۔ جی نہ چاہتا تھا کہ بیان کروں۔ اس لئے کہ اس
زمانہ میں قیاس فاسد بہت شائع ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو سن کر قیاس کریں اور حرام گیری اور
حرام خوری پر کمر باندھیں۔ اب فرمایئے کیا عذر ہے تقویٰ اختیار کرنے میں۔

طالب علمی کا رنگ

اگر کوئی کہے کہ ہم تو ڈاڑھی کٹاتے ہیں، پاجامہ ٹخنے سے نیچے رہتے ہیں۔ داڑھی کٹی ہوئی
اور ٹخنے چھپے ہوئے ہم کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ تو یہ کوئی عذر نہیں۔ اس کو چھوڑ دینا کوئی مشکل
نہیں۔ کیونکہ کوئی دنیا کی کارروائی اس پر موقوف نہیں اور مشکل تو واللہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر بھی
اگر کوئی تقویٰ نہ کرے تو اس کو یہی کہا جائے گا۔

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے ☆ جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

پس اب ۳۰ رمضان المبارک تک تو خدا کے لئے متقی بن جاؤ۔ بعد ۳۰ رمضان کے دیکھا
جائے گا۔ ایک دفعہ تم کو اس کا ذائقہ آ جائے پھر تو ان شاء اللہ رفتہ رفتہ تم کو دین اپنی طرف کھینچ لے

گا۔ جیسے کوئی ایک دفعہ طالب علمی کر لیتا ہے تو پھر اس ۔ کے اندر ایک سادگی اور بے تکلفی ایسی آجاتی ہے کہ خواہ کسی درجہ پر پہنچ جائے مگر وہ طالب علمی کا رنگ نہیں جاتا۔

شاھجہانپور میں ایک کورٹ انسپکٹر ملے۔ ان کے اوضاع واطوار میں ایک محبوبانہ اور بے تکلفی کا انداز تھا۔ میں نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے عربی کی طالب علمی کی تھی۔ بس وہ رنگ گیا نہیں تھا۔ اسی طرح جو شخص اہل اللہ کی جماعت میں ایک دفعہ آ پھنستا ہے وہ گو کہیں پھرے لیکن پھر آئے گا۔ اب نہیں تو پھر کسی وقت آئے گا اور اگر زندگی میں نہ آئے گا تو مر کر تو ضرور ہی آئے گا۔ غرض نکلے گا نہیں۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ☆ گر بود صافی ندانم چوں کند

یعنی ایک گھونٹ خاک آلودہ جب ایسا مجنون بنا دیتا ہے اگر بالکل پاک وصاف ہووے تو نہ معلوم کیا کرے گا۔

پس ہمارا یہ تقویٰ طہارت ذکر جو معاصی اور ظلمات ہوا وہوس میں ملا ہوا ہے جب یہ اثر دکھاتا ہے تو اگر یہ ثمرات صاف کی طرح صاف ہو جائے۔ تو خدا جانے کیا حالت کر دے اسی واسطے میں مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنے بچوں کو اہل اللہ کے پاس لے جاؤ اور ان کے پاس رکھو۔ اگر چہ وہاں رہ کر نہ نماز پڑھیں نہ روزہ رکھیں لیکن یہ خالی ان کے پاس کا رہنا پھل پھول لاتا ہے پچھلے سفر میں میں مچھلی شہر گیا تھا۔ میں نے یہ مضمون بیان کیا تھا کہ میں اولاد کو انگریزی پڑھانے کو منع نہیں کرتا۔ انگریزی پڑھاؤ مگر انگریز نہ بناؤ اور جو زمانہ ان کی تعطیل کا ہے اس کے دو حصے کر دو۔ آدھا حصہ گھر رہ کر تفریح وآسائش میں گزاریں اور آدھا حصہ کسی کامل کی صحبت میں رکھو اور اس کا وعدہ ہم کرتے ہیں کہ ہم ان کو روزہ نماز کے لئے بھی نہیں کہیں گے۔ چند روز ہی میں دیکھ لینا کہ وہ دین کا ہو کر رہے گا اور اس وجہ سے لوگ ان کے پاس اولاد کو نہیں بھیجتے کہ یہ دنیا سے جاتے رہیں گے۔

جناب حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص آنے لگا تھا۔ اس کے کسی عزیز نے کہا کہ جب سے یہ آپ کی خدمت میں آنے لگا ہے کسی کام کا نہیں رہا۔ حضرت نے فرمایا کہ بھائی ہم تو بگاڑتے ہی ہیں۔ اگر تم کو پسند نہ ہو تو اس کو روک دو۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے اپنے جیسا بنالیں۔ مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ عقائد تو ان کے صحیح ہو جائیں گے کافر تو نہ بنیں گے۔ یہ مضمون تھا مچھلی شہر کے وعظ کا۔

اب وہاں کے ایک مولوی صاحب رئیس کا خط آیا ہے کہ اگر اجازت ہو تو اپنے بچوں کو وہاں

بھیج دوں۔ میں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ اگران کو بھی رغبت ہو بھیج دو۔ اس لئے کہ اگر خود رغبت ہو تو صحبت نافع ہوتی ہے الحاصل صحبت نیک کی طرح رمضان کا تقویٰ بھی دل میں ان شاء اللہ گھر کرلے گا اور شوال اور دیگر مہینوں میں وہ وقتاً فوقتاً ابھرے گا۔ اب بتلایئے اس سے زیادہ آسان طریقہ اور کیا ہوگا۔ اب اگر اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ چاہتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کام ہی نہیں کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو عملی مضمون تھا۔

تصوف اور فقہ

اب ایک دوسرا مضمون اس کے مقابل ہے۔ وہ ایک علمی مضمون ہے۔ یہ مضمون تو ان لوگوں کے متعلق تھا جو گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے کہ جو ان کے مقابل ہیں کہ وہ مباحات کے اشتغال پر بھی ملامت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ رمضان میں پیٹ بھر کر نہ کھاؤ بلکہ کم کھاؤ۔ اگر زیادہ کھاؤ گے تو روزہ کی جو حکمت ہے کسر بہیمت نفس وہ باطل ہوجائے گی۔ اور روزہ رکھنا نہ رکھنا برابر ہوجائے گا یہ قول بعض اہل لطائف کا ہے اور بظاہر بہت لذیذ اور صحیح اور دقیق وغامض بات معلوم ہوتی ہے۔ اپنی اپنی بات ہے ہم کو تو یہ بات پسند نہیں آئی ۔

للناس فیما یعشقون مذاهب

(جس چیز میں لوگوں کا عشق ہوا اس میں ان کے مختلف مذاہب ہیں)

ہمارا تو مذہب یہ ہے ۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم ☆ الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

جو کچھ ہم نے پڑھا تھا۔ بجز حدیث یار کے سب کو فراموش کردیا ہے۔ اسی (حدیث یار) کی تکرار کرتے ہیں۔

پس اگر یہ قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر منطبق ہوجائے تو سبحان اللہ ہم اس کو حدیث سے جانچیں گے۔ اگر اس کسوٹی پر بھی درست رہا تو سر اور آنکھوں پر ہے۔ ورنہ جناب ہم کو پسند نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ حدیث پر گو منطبق نہ ہو، تصوف پر تو منطبق ہے۔ تو حضرت یہ دیکھنا ہے کہ تصوف کیا شے ہے؟ تصوف بھی اصل میں حدیث ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس نے رنگ بدل کر تصوف نام رکھا ہے اور فقہ بھی حدیث ہی ہے جس نے رنگ بدل لیا ہے اس لئے فقہا فرماتے ہیں۔ القیاس مظہر لا مثبت یعنی قیاس نص کے حکم کو ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں

ثابت کرنے والا حکم کا نص ہے۔ پس تصوف اور فقہ جدا جدا شے نہیں ہیں ہاں رنگ مختلف ہیں۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد　　　و کل الیٰ ذاک الجمال یشیر

عنوان مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے۔ ہر ایک عنوان انہی مضمون کی طرف مشیر ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ☆ من انداز قدت رامی شناسم

جس رنگ کا جوڑا چاہے پہن لے میں انداز قد سے پہچان لوں گا۔

محبوب خواہ کسی رنگ سے آئے اور کسی لباس میں آئے عاشق اس کو ہر طرح پہچان لے گا۔ اور جو نہ پہچانے وہ عاشق نہیں ہے۔ پس حدیث ایک ایسا محبوب ہے کہ جس نے اس کو پہچان لیا ہے تو وہ خواہ فقہ کے رنگ میں جلوہ گر ہو یا تصوف کے لباس میں ظاہر ہو پہچان لے گا۔

ہاں اگر حدیث ہی نہ ہو تو اس کی پہچان کیسے ہوگی۔ اس سے فوراً قلب میں استنکار ہوگا۔ ہم کو تصوف کا انکار نہیں ہے اس لئے ہم یہ جواب نہ دیں گے کہ تصوف پر منطبق نہیں ہے۔ دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ یہ قول فی نفسہٖ صحیح نہیں کہ کم کھاؤ کم پیو اور اس کی دلیل یہ بیان کرنا کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف نفس کو ہو، یہ ان کی دلیل ہے اور ان کی مسلم ہے۔

شرعی مجاہدے

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مقدمہ کی کیا دلیل ہے کہ روزہ کی حکمت یہی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ روزہ سے مقصود تو مجاہدہ اور کسر قوۃ نفس ہے اور مجاہدہ اور مشقت جب ہی ہوگا جب کہ کم کھائے گا اور اگر ہمیشہ کی عادت سے بھی زیادہ کھایا پیا تو مجاہدہ ہی کیا ہوا تو جواب یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ حکمت مجاہدہ ہے، لیکن مجاہدہ تقلیل طعام وشراب میں ہونے میں کلام ہے۔ مجاہدہ نام کھانے پینے کے ترک یا تقلیل کو نہیں کہتے بلکہ مجاہدہ نام ہے ترک عادت کا۔ اگر چہ رات بھر کھاؤ پیو لیکن دن کو جب وقت کھانے کا آئے گا تو فوراً تقاضا کھانے کا ہوگا اور یہ اس تقاضے کے خلاف کرے گا۔ بس یہی مجاہدہ ہے گو بھوک بھی نہ ہو لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تقلیل طعام مطلوب نہیں بیشک مطلوب ہے اور احادیث میں ترغیب بھی اسکی آئی ہے کلام اس میں ہے کہ آیا تقلیل طعام وشراب مکمل صوم ہے یا نہیں اس پر کوئی دلیل نہیں۔ دلیل ظنی تخمینی یا قرائن کا تو اعتبار ہے نہیں۔ کتاب وسنت، یا اجماع قیاس سے دلیل ہونا تقلیل طعام کی وجہ سے جو برکت ہوتی ہے وہ جدا شے ہے اور روزہ کی وجہ سے جو برکت حاصل ہوتی ہے وہ علیحدہ ہے اول موقوف علیہ ثانی کی نہیں ہے۔

روزہ کی برکت خاص یہ ہے کہ عادت کے وقت نفس کو نہیں ملا۔ اور یہ کوئی نہ کہے کہ عادت دو چار روز میں بدل جائے گی پھر یہی عادت ہو جائے گی کہ رات کو کھایا کریں۔ بات یہ ہے کہ نفس ایسی شے ہے کہ خواہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے مگر وہ تقاضا اس کا نہیں جاتا۔

ایک چور کی حکایت مشہور ہے کہ وہ ایک پیر کا مرید ہو گیا۔ پیر نے چوری سے توبہ کرائی۔ خانقاہ میں رہنے لگا۔ صبح کو جب سب اٹھتے تو دیکھتے کہ ہر ایک کی ایک جوتی دوسرے کی جوتی کے ساتھ رکھی ہے۔ دو چار دن تک تو صبر کیا پھر تحقیق کرنا شروع کیا تو چور صاحب پکڑے گئے۔ پکڑ کر پیر کے پاس لے گئے۔ پیر نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ کہا سنئے حضرت بات یہ ہے کہ مجھے عادت تھی چوری کی۔ جب وہ وقت آتا ہے تو میرے نفس میں تقاضا ہوتا ہے، تو چوری تو میں کرتا نہیں، بڑی مشکل سے نفس کو اس ہیرا پھیری پر راضی کرتا ہوں۔

تو جناب یہ نفس صاحب وہ ہیں کہ خواہ کتنا ہی زمانہ گزر جائے مگر عادت کا تقاضا ہوتا ہے گو خفیف اور لطیف ہو لیکن ہوتا ہے ضرور۔ اور شریعت کے مجاہدے جوگیوں کے سے مجاہدے نہیں ہیں کہ اپنا ہاتھ سکھالو یا کئی کئی سال بھوکے رہو یا بالکل متبتل ہو کر آبادی کو چھوڑ کر ویرانہ اختیار کرلو۔ شریعت کے مجاہدے نہایت لطیف اور آسان اور نفع میں بہت زیادہ اس پر مجھ کو ایک صاحب علم کا مقولہ یاد آیا۔ وہ علم معقول و منقول کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ علم معقول کے اندر جو شخص عمر کھپاوے اس کی مثال اس شکاری کی سی ہے کہ تمام بدن شکار میں رہے۔ شام کو گھر آئے تو بچوں نے پوچھا کہ ابا کیا لائے ابا نے تمام دن میں سور کا شکار کیا تھا جو کسی مصرف کا نہیں۔ نہ اس کا گوشت کام کا نہ کھال کام کی۔ ہاں جثہ میں بہت بڑا اور شکار بھی بڑی مشکل سے ہوا۔

روزہ اور تقلیل طعام

میری دلیل (یکن ان یقول الخصم ان عدم وجد انکم الدلیل لایستلزم عدم الدلیل وایضاً یلزم الاحتجاج بعدم الدلیل وھولیس بصحیح عندنا کماھو مصرح فی اصول الفقه) ممکن ہے کہ خصم یہ اعتراض کرے کہ تمہارا دلیل کا عدم وجدان عدم دلیل کو مستلزم نہیں اور نیز لازم آتا ہے احتجاج عدم دلیل سے یہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں جیسا کہ اصول فقہ میں اسکی صریح کی ہے، چونکہ اس کے متعلق نصوص معلوم ہیں۔ ان میں نہ ہونا دلیل ہے عدم دلیل کی اور چونکہ بدون دلیل کے حکم ثابت نہیں ہوتا اس لئے یہ احتجاج بالدلیل ہے بعدم

الدلیل نہیں۔۱۲منہ) یہ ہے کہ اگر روزہ کا کمال اس پر موقوف ہوتا تو کہیں تو اللہ تعالی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ کم کھاؤ۔ کسی حدیث میں ایسا مضمون نہیں۔ ہاں اگر ہے تو اس کے خلاف ہے فرماتے ہیں:

کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر

یعنی صبح ہونے سے پہلے کھاؤ پیو۔

اس لئے میری سمجھ میں تو یہ آتا نہیں کہ رمضانیت کی فضیلت تقلیل طعام پر موقوف ہے۔

اب یہاں پر ایک شبہ باقی رہا۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے

خلوف فم الصائم اطیب عند الله من ریح المسک[1]

یعنی صائم کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔

اور یہ بو اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ معدہ میں کچھ نہ ہو۔ جب معدہ بالکل خالی ہوتا ہے تو اس سے کچھ روائح اوپر کی طرف صعود کرتے ہیں۔ ان کا اثر منہ میں بھی آتا ہے تو اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم کھانا مطلوب ہے ورنہ اگر زیادہ کھایا اور وہ کھانا معدہ میں رہا تو خلوف کا وجود کہاں ہوگا اور لیجئے ایک دوسری حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کو روزہ سے سوائے بھوک پیاس کے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ روزہ میں بھوک پیاس مطلوب ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ کم کھانا کم پینا مطلوب ہے۔

اول حدیث کی مثال تو ایسے ہے جیسے ماں کہے کہ مجھے تو اس بچہ کا پیشاب بھی پیارا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماں کو مقصود یہ ہے کہ بچہ اس کے اوپر پیشاب کرے۔ مقصود تو اس کی محبوبیت کا اظہار ہے پس مطلب یہ ہے کہ اگر روزہ کی یہاں تک نوبت پہنچے کہ اس کے منہ سے بدبو آنے لگے تو اللہ تعالی کے نزدیک ناپسند نہیں اب اس سے یہ لازم نہیں کہ ایسی حالت پیدا کیا کرو کہ یہ مطلوب ہے۔

دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے روزہ میں معاصی نہیں چھوڑے تو اس کو اگرچہ بھوک پیاس کی بھی مشقت لاحق ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے اس سے مطلوبیت کیسے لازم آئی۔ اگر کسی کو اس کے خلاف تحقیق ہو تو مہربانی فرما کر وہ مجھ کو بتا دیں۔ مجھ کو اپنے قول پر اصرار

[1] الصحیح للبخاری ۳:۳۱، ۷:۲۱۱، سنن النسائی کتاب الصیام ب: ۴۱، مسند احمد ۲:۲۹۳، ۳۰۶، ۵:۴۷۵، ۵۳۲

نہیں۔ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ بیان کر دیا۔

اگر کوئی کہے کہ جناب اگر حدیث میں تقلیل طعام کو مکمل صوم ہونا نہیں آتا تو اس کے خلاف پیٹ بھرنے کا بھی ذکر نہیں آیا تو اس اعتبار سے دونوں مساوی ہو گئے۔ اگر چہ یہ شبہ سطحی ہے مگر ہمارے مدعا کو مضر نہیں۔ اس لئے کہ ہمارا مقصود تو یہ ہے کہ تقلیل مکمل صوم نہیں ہے اور یہ ثابت ہے لیکن تبرعاً اب ہم اس کے خلاف کے دلائل بیان کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی روزہ دار کو افطار کرا دے اس کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے اور اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملتا ہے صحابہؓ نے عرض کیا یارسولؐ اللہ ہمارے سب کے پاس روزہ دار کے افطار کرانے کی قدر نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ثواب تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی دے دیتے ہیں جو تھوڑے دودھ یا ایک چھوہارہ یا ایک گھونٹ پانی پر افطار کرا دے اور جو اس کو پیٹ بھر کر کھلا دے اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے سیراب کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیٹ بھر کر کھلانا ثواب کی بات ہے اور اس کا پیٹ بھر کر کھانا ذرا نقص نہیں ورنہ اس کی اعانت باعث فضیلت نہ ہوتی۔ پس بحمداللہ ثابت ہو گیا کہ تقلیل طعام کو روزہ سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ بہت زیادہ کھانا اور اناڑی کی بندوق کی طرح بھرنا یہ ناپسند ہے۔

بس تفصیل یہ ہے کہ جو شخص قوی ہواس کے لئے کسی قدر قلت بہتر ہے اور جو ضعیف القویٰ ہواس کے لئے قلت طعام نہیں چاہیئے۔ اس کو قلت سے تشویش ہوگی۔ اسی واسطے ہمارے بزرگ اس زمانہ میں تقلیل طعام کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ اس سے قوت آئے گی۔ قوت ہوگی تو کام بھی کر سکو گے۔ اور اگر تقلیل کی تو قویٰ چونکہ اس زمانہ میں ضعیف ہیں اور زیادہ ضعف ہو کر باعث تشویش اور پریشانی ہوگی۔

اگر کوئی کہے کہ جب پیٹ بھرنے سے قوت آتی ہے تو زیادہ کھانے سے اور زیادہ قوت آئے گی۔

تو جواب یہ ہے کہ قوت کا مدار ہے ہضم پر اور ہضم جب ہوتا ہے کہ پیٹ کے برابر یا کچھ کم کھایا جائے اور پیٹ بھرنے کے بعد جو کچھ کھایا جائے وہ ہضم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ مضمون تھا جو خواص کے متعلق تھا۔

روزہ کی حکمت

ایک بات مفید اور یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ میں نے دعویٰ کیا تھا کہ مجاہدہ ترک عادت کو کہتے ہیں

الحمدللہ اس کی دلیل بھی حدیث سے سمجھ میں آئی۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس نے روزہ کے متعلق مختلف سوالات کئے۔ منجملہ ان کے یہ سوال بھی کیا۔

کیف من صام الدھر قال لاصام ولاافطر[1]

یعنی یارسول اللہ وہ شخص کیسا ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے فرمایا کہ اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔ یعنی اس کا روزہ رکھنا اور نہ رکھنا برابر ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو روزہ رکھنے نہ رکھنے کو برابر فرمایا تو اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ حکمت روزہ کی نہ رہی۔ اس لئے کہ حکمت تو تھی ترک عادت اور اب اس کو یہی عادت ہوگئی اور اگر کم کھانا ہی حکمت ہوتی تو ایسا نہ فرماتے اور صوم داؤد علیہ السلام کی فضیلت بھی اس حکمت کی بناء پر ہے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میری تحقیق تصوف پر منطبق ہے یعنی مجاہدہ کہ جس کو صوفیا مطلوب کہتے ہیں وہ کم کھانے میں منحصر نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک غلطی عوام کی ہے کہ روزہ میں بھی معاصی سے اجتناب نہیں کرتے اور ایک غلطی خواص کی ہے کہ مباحات کے اندر تنگی کرتے ہیں۔ بحمداللہ دونوں کے متعلق کافی بیان ہوگیا ہے اور مجموعہ حدیث شریف کے اول جزو

من صام رمضان ایماناً واحتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه[2]

جس شخص نے رمضان کے روزے ایمان اور ثواب سمجھ کر رکھے تو اس کے اگلے پچھلے گناہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

کا بیان ہوا۔ اب دوسرے جزو کا بیان ان شاءاللہ تعالیٰ دوسرے وقت ہوگا۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو معاصی سے بچنے کی توفیق عطا فرماویں۔ اور روزہ کی برکات نصیب کریں۔

واخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

وصلی الله تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد

واله واصحابه اجمعین . آمین

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الصیام باب:۳۶ ، رقم:۱۹۶،۱۹۷، سنن أبی داؤد:۲۴۲۵ ، سنن الترمذی:۷۶۷، سنن النسائی ۴:۲۰۶،۲۰۷،۲۰۹،مشکوٰۃ المصابیح:۲۰۴۴

[2] الصحیح للبخاری ۱:۱۶،۳:۳۳،الصحیح لمسلم صلوۃ المسافرین:۱۷۵، سنن أبی داؤد باب:۲۹

الفطر

احکام فطرہ کے متعلق یہ وعظ ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا جو ۳ گھنٹہ میں ختم ہوا حاضری قریباً ایک ہزار کی تھی۔ سید احمد حسن سنبھلی صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

انما یوفی الصبر ون اجرھم بغیر حساب. (الزمر:۱۰)

ترجمہ: مستقل مزاج والوں کو اس کا اجر بے شمار ہی ملے گا

تمہید: یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اور اس میں کسی خاص موقع کے یا کسی خاص عبادت کے متعلق مضمون نہیں ہے۔ ایک عام مضمون ہے اور اس وقت کا مقتضا یہ تھا کہ کوئی ایسا مضمون بیان کیا جاتا جس کو صیام وفطر سے منابست ہوتی۔ زیادہ مناسبت فطر سے ہوتی کیونکہ احکام صیام وقیام کے مختلف موقعوں پر بیان ہو چکے ہیں۔ اس وقت موقع احکام فطر کے بیان کرنے کا تھا۔ سو یہ مناسب تھا کہ اسی کی خصوصیت کے موافق کوئی آیت یا حدیث ہوتی جس میں اس کے احکام مذکور ہوتے اور یہ آیت جو پڑھی ہے۔ اس کو کوئی خاص خصوصیت اس مقام سے نہیں ہے لیکن تاہم اپنے عموم کے اعتبار سے ظاہراً کچھ زیادہ مناسبت صیام سے معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ حدیثوں میں عید کے متعلق ایسا مضمون آیا ہے کہ حق تعالیٰ روزہ داروں کی نسبت ملائکہ سے فرماتے ہیں۔

ماجزاء اجیر وفی عمله. اجیر کی اس کے کام میں کیا جزا ہے

اور وہ کہتے ہیں جزائه ان یوفی اجره. اس کی جزا یہی ہے کہ اس کا اجر پورا دیا جائے۔

اسی طرح یہ مضمون آیا ہے کہ رمضان کی آخری شب میں امت کی مغفرت ہو جاتی ہے اوراس کی وجہ یوفی اجرہ اذاقضی عملہ. جب وہ اپنا کام پورا کرے تو اس کو اس کا پورا اجر دیا جائے گا۔

فرمائی ہےاوراس آیت میں بھی صابرین شامل للصائمین (جوروزہ داروں کے شامل ہیں) کے توفیہ اجر (اجرت پوری دینے) کا ذکر ہے۔اس اعتبار سے اس کی خصوصیت مضمون فطر سے بھی ثابت ہوگئی۔ چنانچہ اول اس کا ترجمہ سن لینا چاہیے اس کے بعد ان حدیثوں کو سن لیا جائے۔

صبر کے مواقع

پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب** (مستقل مزاج والوں کو اس کا اجر بے حساب ہی ملے گا) یعنی اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے۔ یعنی یہ امر ضرور محقق ہے کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر پورا دیا جائے گا۔ صبر کے معنی ہیں روکنے کے، کبھی کسی چیز سے روکنا ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز میں نفس کو روکنا اور کبھی کسی چیز پر روکنا ہوتا ہے مثلاً معاصی سے نفس کو روکنا اس صورت میں اس کا صلہ عن آتا ہے اور مثلاً شدت وفقر میں روکنا یہ مصائب پر ہوتا ہے اوراس صورت میں صبر کا صلہ فی آتا ہے جیسے **والصبرین فی السراء والضراء** (اورصبر کرنے والے خوش حالی اور سختی میں) جب اس کا صلہ علیٰ ہو تو مراد یہ ہوگی کہ کسی فعل پر ثابت وقائم رہے اوراس کا تحقق عبادات کے موقع پر ہوتا ہے یعنی عبادت پر۔ سو صبر کے تین موقعے ہوئے۔

۱۔معاصی سے صبر کرنا ۲۔مصائب میں صبر کرنا ۳۔عبادات پر صبر کرنا

آیت میں عام صبر کی فضیلت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں ان کو ان کا اجر پورا دیا جائے گا اور بغیر حساب اس لئے بڑھایا کہ پورا دینے سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ اجر میں کمی نہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ زیادہ ملے گا یا نہیں اس میں دونوں احتمال تھے۔ پس بغیر حساب بڑھانے سے اس احتمال کو متعین فرمادیا یعنی پورے اجر سے بھی زیادہ عطا فرمایا جائے گا مطلب یہ کہ کمی تو کیا ہوتی اور زیادہ مرحمت ہوگا۔

نیم جاں بستاندو صد جاں دہد ☆ آنچہ دروہمت نیایدآں دہد

نیم جاں یعنی جان فانی لیتے ہیں اور سینکڑوں جان یعنی جان باقی عطا کرتے ہیں۔ وہ عنایت کرتے ہیں جو تمہارے وہم میں بھی نہیں آسکتا۔

صد سے مراد ہے تکثیر نہ کہ تعیین عدد مخصوص کی۔ چنانچہ آگے خود کہا ہے ۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازارا ☆ کہ بیک گل ے خری گلزار را

ایسا بازار کہاں نصیب ہوگا کہ ہر ایک پھول کے بدلے سارا چمن خرید لو۔

ظاہر ہے کہ گل سے گلزار ہزار حصے بڑھا ہوا ہے اور وہ زیادتی اس قدر ہوگی کہ جس کا حساب نہ ہوگا۔

قانون اجر

دین میں اجر کا قانون یہ ہے کہ کمی جائز نہیں رکھی گئی اور زیادتی جس قدر بھی ہو جائے اس کی روک نہیں اور عمل کا قانون یہ ہے کہ جس طرح اس میں کمی جائز نہیں۔ حدود کی۔ اسی طرح لحاظ واجب قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ فرض نماز ہے جو تمام عبادات میں افضل ہے اور قرب جس قدر فرائض ادا کرنے سے ہوتا ہے کسی عبادت سے اس قدر نہیں میسر ہوتا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ مجھ سے فرائض کے واسطہ سے جو قرب حاصل کرتا ہے ویسا قرب اور کسی عبادت سے اس کو نہیں حاصل ہوتا۔ مگر اس میں زیادت جائز نہیں ۔ مثلاً ظہر کے فرض چار ہیں کوئی شخص پانچ یا چھ پڑھنا چاہے تو اس کو اجازت نہیں بلکہ ایسا کرنا حرام ہے۔ پس کام تو اتنا ہی کرو جتنا بتلایا ہے اور زیادہ مت کرو اور اجر کی انتہا نہیں۔ سبحان اللہ کیا شان کریمی ہے کہ محنت کی زیادتی کو منع کر دیا اور اجر کی زیادت کا وعدہ فرمایا البتہ نوافل میں تکثیر کی اجازت ہے۔ مثلاً شب و روز نوافل پڑھنا چاہے تو اجازت ہے مگر طلوع و غروب و استوار کے وقت اور بعد الفجر الی طلوع الشمس (فجر کے بعد سورج نکلنے تک) اور بعد العصر (عصر کے بعد) ممانعت ہے ان اوقات میں پڑھنا گناہ ہے۔ سو اس میں بھی علی الاطلاق کثرت کی اجازت نہیں۔ کیا عنایت و رحمت ہے کہ اجر کا تو حساب نہیں اور طاعت حساب ہی ہے ہو گو کتنی ہی بڑی طاعت ہو حتیٰ کہ بعض جگہ یہ سخت حکم لگایا ہے کہ اگر کوئی زیادہ کرے گا تو طاعت نہ ہوگی بلکہ معصیت ہوگی۔

روزہ اتنی بڑی عبادت ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بد بو حق تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے۔ مگر ۳۰ رمضان کے بعد یا اگر ۲۹ رمضان کو چاند نظر آجائے تو ۲۹ کے بعد وہی روزہ جو سب میں زیادہ پسندیدہ تھا۔ مبغوض ہو جاتا ہے یعنی عید کے روز روزہ رکھنا مکروہ تحریمی اور مبغوض الی اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی راز کو اہل اللہ نے سمجھا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

بزہد وورع کوش صدق وصفا ☆ ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

زہدو پرہیزگاری اور صدق وصفا میں کوشش کرو مگر نہ اتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے۔

شارع پر زیادتی کرنا گویا شریعت میں اصلاح دینا ہے اور اس کو ناقص سمجھنا ہے اور ظاہر ہے کہ قانون شاہی کا مقابلہ کرنا بغاوت ہے۔ شریعت کے آگے مت بڑھو۔ جہاں اور اسرار ہیں بدعت کے حرام ہونے میں وہاں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ حق تعالیٰ بندوں کے ساتھ سہولت چاہتے ہیں اور بندہ اپنی ذات پر سختی کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یریداللہ بکم الیسر ولایرید بکم العسر ۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسی کا ایک سرا ستون سے بندھا ہوا دیکھا۔ فرمایا یہ کس نے باندھا ہے۔ عرض کیا گیا ھذہ لزینب، یہ زینب نے باندھا ہے۔ عبادت کرتی رہتی ہیں۔ اور اونگھ آتی ہے تو لپٹتی نہیں ذرا اس سے سہارا لے لیتی ہیں اور رات بھر عبادت کرتی ہیں فرمایا اس کو توڑ ڈالو۔ جب تک طبیعت تازہ ہے نماز پڑھے: **لیصل احدکم نشاطہ**[1] ۔ (جب تک تم کو نشاط رہے اس وقت تک نماز پڑھتے رہو) جتنا بتلا دیا اتنا کرو اور جب نیند غالب ہو سو رہو۔ **ان اللہ یحب ان یوتی رخصہ کمایحب ان یوتی عزائمہ**[2]

یعنی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اس بات کو کہ اس کی رخصتیں ادا کی جائیں جیسے کہ اس بات کو محبوب رکھتا ہے کہ اس کی عزیمتیں بجالائی جائیں۔

خدا تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتا ہے کہ یہ بندہ ہے اور محتاج وضعیف ہے اور اس کی سہولت سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ رحیم ہیں حتیٰ کہ بعض اقسام رخصت میں یعنی رخصت اسقاط میں عزیمت پر عمل بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پوری نماز سفر میں پڑھے گا تو عاصی ہوگا۔

اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں ہے **ان خفتم** یعنی اگر تم کو دشمن سے اذیت کا خوف ہو تو قصر کرو۔ سو اب تو خوف نہیں رہا۔ پس اب اس قید کے اعتبار سے سفر میں قصر نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ انعام تھا اور خاص تھا اب عام ہوگیا۔ **فاقبلوا صدقة** (اللہ تعالیٰ کے انعام کو قبول کرو)

چنانچہ اگر حاکم انعام دے اور کوئی نہ لے تو مورد عتاب ہوتا ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ☆ خاک برفرق قناعت بعد ازیں

---

[1] سنن أبی داؤد، التطوع باب: ۱۹، سنن ابن ماجہ: ۱۳۷۱، سنن النسائی قیام اللیل ب: ۱۴

[2] مسند أحمد ۲: ۱۰۸، حلیة الأولیاء، ۲: ۱۰۱، ۶: ۲۷۶، کنز العمال: ۵۳۳۴، ۵۳۳۵

جب شاہ دین ہم سے طمع کے خواہشمند ہوں اس کے بعد ہم کو قناعت کو ترک کرنا چاہیئے۔

دعا کی اہمیت وافادیت

یہی لطف وعنایت منی ہے اس کا کہ حضرت باری عزاسمہٗ دعا کو محبوب فرماتے ہیں اور دعا نہ کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: **من لم یسال اللہ یغضب علیہ**[1] (جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اس پر ناراض ہوتے ہیں) عجیب بات ہے کہ بندہ ناراض ہوتا ہے مانگنے سے اور حق تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں نہ مانگنے سے اور مانگنے سے خوش ہوتے ہیں اور دیکھئے عام عادت ہے کہ دروازہ پر سائل آتا ہے اور تنگ کرتا ہے اور الحاح والحاف (مبالغہ) سے مانگتا ہے تو ہر شخص ناراض ہوتا ہے اور اسی واسطے شریعت نے بھی فی مابین العباد (بندوں کے درمیان) لحاظ کیا ہے ان طبائع کا کہ مانگنے کو پسند نہیں فرمایا اور ان لوگوں کی مدح کی ہے جو الحاف سے نہیں مانگتے چنانچہ قرآن مجید میں ہے: **لایسئلون الناس الحافا** (وہ لوگوں سے مانگنے میں الحاح اور مبالغہ نہیں کرتے) اور اس امر طبعی کا اس درجہ لحاظ فرمایا کہ اس کو شرعی بنادیا۔ مگر حق تعالیٰ الحاح سے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء حدیث میں وارد ہے یعنی اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو دعا میں الحاح کرتے ہیں کیونکہ اس میں احتیاج اور انکسار بندہ کو ظاہر ہوتا ہے اور اسی احتیاج کی وجہ سے حدیث میں دعا کو مخ العبادۃ فرمایا ہے۔ یعنی عبادت کا مغز دعا ہے۔ اسی تذلل وافتقاء کی وجہ سے نماز جو بڑی محبوب ہے حق تعالیٰ کو تو اسی لئے کہ اس میں تذلل زیادہ ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزمرہ پانچ بار فرض کی گئی ہے۔ تاکہ ہروقت موقع ملے اظہار افتقاء کا جو کہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے۔ پس بندگان نفس تو تکرار صلوٰۃ سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مشقت ڈالی گئی مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ حق تعالیٰ غایت محبت سے تمہاری ان حرکات کو محبوب رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کو بار بار دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے بچہ کو ماں ٹہلاتی ہے اگرچہ کسی قدر تھک بھی جائے۔ صرف اسی لئے کہ چلتا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے البتہ جب دیکھتی ہے کہ زیادہ چلنا مضر ہوگا تو روک لیتی ہے۔

شیطان کا مکر

ایک لطیفہ ہے جس سے ایک عمدہ نتیجہ نکلتا ہے کوئی عورت تھی جس کو لوگوں نے ایک دفعہ دیکھا کہ رستہ چلتے ہوئے اپنے بچہ کی انگلی پکڑے ہوئے ہے اور سوکن کے بچہ کو کندھے پر چڑھائے

[1] سنن الترمذی: ۳۳۷۳، إتحاف السادة المتقین ۵: ۳۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۳۸

ہوئے ہے۔ عورتوں کو تعجب ہوا اور انہوں نے کہا کہ بی تمہاری خوبی کی بات ہے کہ سوت کے بچہ سے اس قدر محبت کرتی ہو۔ وہ بیچاری تھی بچی۔ کہا کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجھ کو سوت کا بچہ چلتا پھرتا برا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کو اپاہج کر دیا۔ ایک نتیجہ معترضہ تو یہ ہے کہ دشمن چاہے کیسی ہی دوستی ظاہر کرے وہ دشمنی ہی ہوتی ہے۔

ایک شخص تھے جو شیطان پر ایک ہزار روزمرہ لعنت کیا کرتے تھے۔

اللهم العن ابليس. یعنی اے اللہ اپنی رحمت سے دور فرمادے شیطان کو۔

ایسے لوگوں کی صحبت رہی ہوگی جن کا یہ مذہب ہوگا کہ لعنت عبادت ہے۔ اتفاق سے برسات میں لیٹے تھے کہ شیطان آیا اور کہا جلدی ہٹو دیوار گرتی ہے۔ چنانچہ وہ ہٹ گئے اور دیوار گر پڑی۔ کہنے لگے آپ تو میرے محسن ہیں۔ آپ کون ہیں؟ یہ بیچارے واقف نہ تھے کہ دشمن ہے اور اس احسان میں بھی اس کے کچھ دام ہیں۔ اس نے کہا کہ میں وہی ابلیس ہوں جس پر ایک ہزار بار یومیہ لعنت کیا کرتے ہیں کہنے لگے کہ تعجب ہے کہ تم نے میرے ساتھ ایسا احسان کیسے کیا۔ اس نے کہا یہ احسان نہیں ہے حقیقت میں بدخواہی ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ **من مات تحت الهدم فهو شهيد** (جو شخص کسی چیز کے گرنے سے اس کے نیچے دب کر مر جائے وہ شہید ہے)

سو میں نے تم کو شہادت سے محروم رکھنا چاہا۔

اسی طرح ایک حکایت مولانا نے مثنوی میں لکھی ہے کہ ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تہجد کے لئے شیطان نے جگایا۔ پہچان کر پوچھا کہ تجھ کو کیا مناسبت کہنے لگا۔ آخر کبھی تو میں بھی اسی وضع کا تھا۔ پرانی حالت کا جوش آجاتا ہے۔ بقول شخصے (مومن خان مومن)

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے دھوکوں میں نہ آؤں گا۔ اس وقت کہا کہ میں کل تہجد کے وقت آپ کو سلا کر بہت پچھتایا کیونکہ آپ نے صبح کو بہت گریہ وزاری کی جس سے آپ کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ آج جگا دوتا کہ اور مرتبہ نہ بڑھ جائے۔ مولانا نے ٹھیک کہا ہے۔

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت   دام داں گرچہ زوانہ گویدت

یعنی دشمن اگرچہ تم سے دوستانہ طور پر کوئی بات کہے تو اس کو جال ہی سمجھو اگرچہ دانہ کی بات کرے یعنی اس کو مکر وحیلہ ہی سمجھے۔

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر ☆ تاکہ گیرد مرغ راآں مرغ گیر

اس سبب سے شکاری پرندہ کی بولی بولتا ہے تاکہ وہ پرندے پکڑنے والا پرندے کو پکڑے۔

اسی واسطے اہل اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان کے مکروحیلہ سے نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیے۔ اس لئے کہ اس کا مکر نہایت سخت ہے۔ کبھی تو ابتداء ہی سے گناہ کا راستہ بتاتا ہے جس کی مدافعت اکثر اشخاص کو سہل ہے اور کبھی نیکی کے پیرایہ میں گناہ کراتا ہے جس کا مقابلہ اور فہم نہایت دشوار ہے اور جیسا شیطان مکار ہے نفس بھی ایسا ہی مکار ہے اس کے فریب سے بھی عذر رکھنا چاہیے۔

ایک نتیجہ اس حکایت سے یہ بھی نکلا اس کو اپنے بچہ کی حرکات محبوب تھیں۔ ان کے دیکھنے کے لئے اس کو پیادہ چلایا لیکن اس کے تحمل سے زیادہ کبھی اس کو نہ چلنے دیتی۔

بغیر حساب

اسی طرح حق تعالیٰ ہم سے عبادات کا کام لیتے ہیں وہ ان حرکات کو پسند کرتے ہیں لیکن تحمل سے زیادہ خود نہیں کرنے دیتے۔ کتنی بڑی رحمت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **ربنا ولاتحملنا مالاطاقة لنابه** (اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسے مصائب اور واقعات نہ ڈالئے جس کی ہم کو برداشت نہیں ہے)

اس تعلیم کے ضمن میں جتلایا ہے کہ ہم طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا کرتے ہیں۔ یہ معاملات ہیں خدا تعالیٰ کے۔ کوئی شخص واقعات دیکھے پھر کتاب اللہ میں غور کرے تو ہر جگہ رحمت ہی رحمت نظر آئے گی۔ غرض وہ ہمارے تحمل سے زیادہ ہم کو کام کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ اگر مجاہدہ کی حرص میں کوئی دو پہر کو نماز پڑھے تو مواخذہ ہوگا۔ غرض خدا تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے عمل میں تو حد سے زیادہ ممنوع اور اجر میں زیادت موجود۔ اسی لئے بغیر حساب بڑھا دیا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر اجر ملے گا جو ہمارے حساب سے باہر ہے اس لئے کہ فرماتے ہیں۔

وكل شيء احصينه في امام مبين. یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا ہے۔

ان کے احاطہ علمی سے کوئی شے خارج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم نہیں شمار کر سکتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ان تعدوا نعمة الله لاتحصوها. یعنی اگر تم نعمت خداوندی کو شمار کرنا چاہو تو نہ شمار کر سکو گے۔

پس جس طرح یہ عدم احصاء (نہ احاطہ کرنا نہ شمار کرنا) بندہ کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ

لاتحصوھا نہیں احاطہ کر سکتے تم ان کا) میں عدم احصاء کی اسناد مخاطب کی طرف اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بغیر حساب کے یہ معنی ہیں کہ تم حساب نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندازہ سے باہر نہیں ہے۔ وہ تو خوب بالتفصیل جانتے ہیں۔

حاصل یہ کہ عمل محدود ہے اور متناہی ہے اور اجر غیر محدود اور غیر متناہی بمعنی **لاتقف عندحد** (کسی حد پر موقوف نہیں ہے)۔ یہ تو اس آیت کے متعلق بیان تھا اب وہ حدیثیں سن لی جائیں جن کی نسبت میں نے وعدہ کیا تھا کہ اول اس آیت کا ترجمہ سن لینا چاہیے پھر حدیثوں کا مضمون بیان کیا جائے گا۔

نعمت فقر

سو وہ حدیثیں دو ہیں جن کا مضمون مختصراً عرض کرتا ہوں۔ امام احمدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب اخیر شب ہوتی ہے رمضان کی تو اللہ پاک میری امت کی مغفرت فرماتے ہیں۔ عرض کیا صحابہؓ نے کیا وہ لیلۃ القدر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں لیکن **العامل انمایوفی اجرہ اذاقضی اعملہ**[1] یعنی جب کام کرنے والا کام پورا کر دیتا ہے تو اس کو پوری مزدوری مل جاتی ہے۔

مگر یہ سمجھ لو کہ پورا ہونا کسے کہتے ہیں۔ ٹھیکے داروں سے پوچھ لو جب کہتے ہیں کہ پل پورا ہو گیا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانچ میں پورا ہو گیا۔ چنانچہ جب جانچ میں وہ تعمیر پوری نہیں ہوتی تو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کو از سر نو بناؤ پیائش میں پورا ہونا معتبر نہیں جب تک منظوری کے نمونہ کے موافق نہ ہو جائے۔ ذرا متنبہ ہونا چاہیے۔

مگر یہاں اور وہاں کے معاملہ میں اتنا فرق ہے کہ یہاں تو اگر حکم ہوا تھا تیس فرلانگ سڑک بنانے کا اور اس کو انتیس تک ہوش نہیں اور تیسویں میں ہوش آیا تو تمہارے تیس کے تیس برباد گئے۔ یہ تو یہاں کے قانون میں ہے اور قانون خدائی یہ ہے کہ اگر تیسویں روزہ میں بھی ہوش آ جائے اور اس کو باقاعدہ ادا کیا جائے اور ماضی (گزرے ہوؤں) سے معذرت کر لی جائے تو تیسوں ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور مقبول ہو جاتے ہیں۔ مگر کون قدر کرے۔ چونکہ آسانی اور سہولت سے یہ نعمت میسر ہوتی ہے، یہی سبب ہو گیا بے قدری کا۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد ☆ گوہرے طفلے بہ قرص ناں دہد

---

[1] الدر المنثور للسیوطیؒ ۱: ۱۸۴

جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے وہ ارزاں دے بھی دیتا ہے اس کی قدر نہیں کرتا۔ چنانچہ بچہ نادان قیمتی موتی کو ایک قرص نان کے عوض میں دے دیتا ہے۔

اے گرانجاں خوار و بد مستی مرا ☆ زاں کہ بس ارزاں خریدستی مرا

اے کاہل تو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے فقر کی شکایت کی۔ فرمایا کہ اس کی قدر مجھ سے پوچھو۔ اس کے لئے میں نے سلطنت چھوڑ کر فقر اختیار کیا ہے۔ اس کی قیمت میں جانتا ہوں۔ چنانچہ ایک بار آپ نے جنگل میں کنوئیں میں وضو کے لئے پانی نکالنے کو ڈول ڈالا پہلی بار چاندی ڈول بھر کر نکلی۔ آپ نے اس کو پھینک دیا۔ پھر دوبارہ ڈول ڈالا تو سونا بھر کر ڈول نکلا۔ پھر آپ نے اس کو الٹ دیا۔ پھر تیسری بار اسی طرح جواہرات نکلے۔ آپ نے حضرت باری میں عرض کیا اے جناب باری! آپ میرا امتحان کرتے ہیں، یہ چیزیں تو میرے پاس بہت تھیں۔ اے اللہ اب میں کیا ان کی رغبت کروں گا۔ مجھے وضو کے لئے پانی عنایت فرما دیجئے۔ چنانچہ پھر ڈول ڈالا تو اس میں پانی آ گیا۔

اگر فقر ایسی چیز نہ ہوتی تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کیوں پسند اور اختیار فرماتے۔ جب حق تعالیٰ نے بلسان جبرئیل آپؐ سے دریافت فرمایا کہ اگر آپؐ چاہیں تو احد پہاڑ آپؐ کے لئے سونا کر دیا جائے۔ فرمایا کہ میں یہ نہیں چاہتا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اجوع یوماً و اشبع یوماً: یعنی کسی دن بھوکا رہوں اور کسی دن شکم سیر ہوں۔

نعمت میں تو نعمت پر نظر ہے اور صبر میں منعم پر۔ جو اس راز کو سمجھ گیا وہ فقدان کو وجدان پر ترجیح دے گا اور ایسا ہی شخص توقف عدم قبول دعا سے بھی تنگ نہ ہوگا۔ بلکہ خوش ہوگا۔ اور علامت محبوبیت کی سمجھے گا۔ جیسے کوئی حسین شخص مانگنے جائے اور گھر والا اس پر عاشق ہو تو وہ ٹالتا ہے کیونکہ اس کو شدت سے تعلق ہے لہٰذا چاہتا ہے کہ یہ میرے پیش نظر رہے اور مجھ سے بات چیت کرتا رہے اور اس وجہ سے وہ اس کو شے مطلوب کے دینے میں تامل کرتا ہے۔ ایک طبیب امرد حسین کی حکایت ہے کہ کوئی عاشق مزاج پاگل خبطی اس پر عاشق تھا۔ اتفاق سے یہ بیمار ہوا اور علاج کے لئے وہی طبیب بلایا گیا۔ پس وہ مریض دعا کرتا تھا کہ میں اچھا نہ ہوں۔ اگر اچھا ہو گیا تو پھر حکیم صاحب کا ہاتھ میرے ہاتھ کو کیوں محیط ہوگا۔ جو لذت میں عاشق کے محیط اور محبوب کے محاط ہونے سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ معشوق کو بغل میں لینے اور معشوق اگر اس کو اپنی اپنی بغل میں لے لے ان

دونوں میں جوفرق ہے اس کوعشاق جانتے ہیں۔

یہاں سے اندازہ کرنا چاہیےاس نعمت کا

الاانه بکل شیء محیط. یادرکھووہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کواحاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ اور پھر یہ کیوں آئیں گے۔ بہر حال فقر کی طرح اور جتنی نعمتیں مفت مل گئیں ان کی قدر نہیں۔ انہی نعمتوں میں سے یہ نعمت بھی ہے جس کا میں بیان کررہا تھا کہ حق تعالیٰ کا عجیب قانون ہے کہ اگر تیسویں روزہ میں بھی تدارک کرلے تو پچھلے انتیس بھی مقبول ہوجاتے ہیں۔

بہرحال جس پورا ہونے پر وعدہ ہے وہ وہ ہے جونمونہ کے موافق ہو۔ اوراگر نہ ہوتو توبہ کر کے موافق کرلیا جائے۔ اس وقت وعدہ ہے مغفرت (یوفی اجرہ) (اس کی اجرت پوری دی جائے گی) ایک حدیث تو یہ تھی۔

نیک صحبت کا اثر

دوسری حدیث وہ ہے جس کو بیہقی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اذاکان یوم عید هم یعنی یوم فطرهم باهی بهم ملائکته فقال یاملئکتی ماجزاء جیروفی عمله قالو ربنا جزاء ه ان یوفی اجره**[1]۔ جب ہوتا ہے ان کی عید کا دن یعنی عیدالفطر کا۔ تو ان کے سبب سے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فخر کرتے ہیں۔ پس فرماتے ہیں اے میرے فرشتو! کیا ہے بدلا اس اجیر کا جس نے اپنا پورا عمل کرلیا ہو۔ فرشتے کہتے ہیں اس شخص کا بدلا یہ ہے کہ اس کی اجرت پوری دی جائے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ارجعوا قدغفرت لکم وبدلت سیئاتکم حسنات

اپنے گھروں کو جاؤ۔ میں نے تم سب کی مغفرت کردی۔ تمہارے سیئات کو حسنات سے بدل دیا۔ اور حق تعالیٰ کو اجر دینا تو ہے مگر فرشتوں کو اس لئے باربار جلاتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی نسبت ظاہراً اعتراض کیا تھا کہ **اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک** کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو اس میں فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں آپ کی حمد کے ساتھ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] العلل المتناهية ۲: ۴۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱: ۱۹۶، مجمع الزوائد ۲: ۲۰۱، بلفظ مختلف

اور یہ کلام بلا تشبیہ ایسا ہے جیسے کلکٹر کہے کہ ہم ایک عملہ فلاں کام انجام دینے کے لئے تجویز کریں گے اور اس پر پرانا عملہ کہے کہ حضور دوسری جماعت کی کیا حاجت ہے، ہم تو خدمت میں حاضر ہی ہیں جو کچھ کام ہو ہم ہی سے لیجئے۔ تو یہ نہ فخر ہے نہ اعتراض بلکہ وفاداری ہے۔ لیکن صورۃً اعتراض تھا۔ حق تعالیٰ اس کے جواب دینے کے لئے قیامت تک ملائکہ جمع کر کے انسان کے اعمال محمودہ ان کو جتلاتے رہیں گے تاکہ ان کے خیال کی تغلیط اور انسان کے فضائل کی تازگی ان کے سامنے ہوتی رہے۔

چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے جہاں ذکر الٰہی یا وعظ وغیرہ ہوتا ہے تو ملائکہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ وہاں جمع ہو کر ذکر سنتے ہیں اور متلذذ ہوتے ہیں جب واپس جاتے ہیں حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں میرے بندے کیا کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر حبیب کا ذکر تو اچھا معلوم ہوتا ہی ہے۔ دوسرے ملائکہ ہی کی زبان سے ان کے فضائل کا بیان کرانا، جس میں راز

انی اعلم مالا تعلمون. میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے

کا ظاہر ہوتا ہے زیادہ مناسب ہے۔ پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ آپ کا ذکر کر رہے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے اور کیا کرتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ جنت ملنے اور دوزخ سے بچنے کے ئے دعا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے یا جنت و دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں نہیں اگر دیکھے تو اور بھی زیادہ رجاء و خوف کا غلبہ ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے سب کو بخش دیا۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ حضور فلاں شخص اس مجلس میں بغرض سماع ذکر نہیں آیا تھا بلکہ کسی اور کام کے لئے آیا تھا وہاں بھی بیٹھ گیا۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ اس کو کیوں بخشا جاتا ہے وہ اس کا اہل نہیں اس لئے اس کی مغفرت نہ ہونی چاہیے بلکہ وہ ملائکہ گویا پولیس میں سے خفیہ پولیس ہیں کہ ان کا کار منصبی یہی ہے کہ واقعات کو کما حقہ نقل کریں۔ پس جب وہ مامور اسی پر ہیں اور اس میں مرضی باری ہے تو یہ صورت اعتراض اور اس بندہ کی بدخواہی کی نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے: **غفرت له هو القوم لايشقى جليسهم** یعنی میں نے اس کو بخش دیا اس لئے کہ جن لوگوں میں وہ بیٹھا تھا وہ ایسے ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

بزرگوں کی ہم نشینی بھی بڑی دولت ہے۔

حضرت سیدنا و مولانا قطب الاقطاب غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ

حضرت فلاں مردہ کے لئے دعائے مغفرت فرما دیجئے۔ فرمایا کہ وہ شخص میرا مرید تھا یا میرے وعظ میں کبھی بیٹھا تھا یا مجھ سے ملاقات تھی یا کبھی سے دور سے دیکھا تھا یا مجھ کو جانتا تھا۔ عرض کیا گیا کہ ان باتوں میں سے کوئی بھی بات نہ تھی۔ فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ سے کسی طریقہ سے مغفرت طلب کروں یعنی خصوصیت کے کس طرح اس کی مغفرت کی دعا کروں پھر خود ہی فرمایا کہ خصوصیت کی تو کوئی وجہ نہیں ہے ہاں اس طرح دعا کرتا ہوں:

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین امنوا

(اے ہمارے پروردگار بخش دیجئے ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان لائے ہیں)

کہ یہ الفاظ عام ہیں۔ ان میں سب کے لئے دعا ہے خواہ وہ مخصوص حضرات ہوں یا اجنبی۔

بزرگوں کی صحبت بڑی دولت ہے

ہرکہ خواہد ہم نشینی باخدا گو نشیند درحضور اولیاء

جو شخص خدائے تعالیٰ کی ہم نشینی کا خواہاں ہو تو اس کو چاہیے کہ اولیائے کرام کے پاس بیٹھا کرے۔

حدیث انا جلیس من ذکرنی (جو مجھ کو یاد کرتا ہے میں اس کا جلیس ہوں) اس کی موید ہے اس طرح کہ اولیاء چونکہ ذاکر ہیں پس وہ ہمنشین خدا ہیں۔ تو ان کے پاس بیٹھنے والا بھی ہمنشین خدا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ بزرگوں سے لپٹا رہنا بھی بڑی رحمت ہے گو خود ان میں سے نہ ہو۔

روزہ داروں کی فرحتیں

بہر حال یوم فطر میں فرشتوں سے ارشاد ہوتا ہے کہ اے فرشتو! کیا بدلہ ہے اس شخص کا جو اپنا کام پورا کر چکے۔ وہ عرض کرتے ہیں: جزاء ہ ان یوفی اجرہٗ (یعنی اس شخص کا بدلہ یہ ہے کہ اس کی اجرت پوری دی جائے)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے گھر کو جاؤ۔ میں نے تم کو سب کی مغفرت کر دی اور تمہارے سیئات کو حسنات سے بدل دیا۔ یہ وہ حدیثیں ہیں ختم صوم و یوم عید کے متعلق جن کا تعلق آیت سے بھی اوپر مذکور ہو چکا اور اگر صابرین کی تفسیر صائمین سے کی جائے تو آیت کا اور زیادہ تعلق ظاہر ہو جائے گا اے صاحبو! اب تک تو ہم رمضان میں خالی ہاتھ رہے۔ اگر بقیہ ایام بھی اسی طرح گزر گئے تو حسرت اس کا انجام ہے۔ پس تین چار دن جو باقی ہیں ان میں بھی تلافی ممکن ہے، تلافی کرلو۔

یوم عید میں علاوہ مجاورت صیام کے اور خاص برکات بھی ہیں۔ چنانچہ اس میں افضل

العبادات یعنی نماز ہے اور پھر صدقہ فطر ہے۔ اور نادار حسرت نہ کریں کہ ہم برکات صدقہ سے محروم ہیں۔ بات یہ ہے کہ صدقہ کچھ صدقہ مالیہ میں منحصر نہیں ہے بلکہ کپڑا پہننا صدقہ ہے۔ بیوی کے منہ میں لقمہ دینا نیز خود بھی کھانا صدقہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ امور سب اللہ کے واسطے بجالائے جائیں تو سب صدقات میں شمار ہوتے ہیں۔

مثلاً بیوی کو اس نیت سے کھلائے کہ اس کا نان ونفقہ میرے ذمے فرض ہے اس کو ادا کرتا ہوں۔ اور اسی طرح کپڑا مثلاً اس نیت سے پہنے کہ حق تعالیٰ نے ستر ڈھکنا فرض اور باقی جسم کا مستور کرنا مستحب فرمایا ہے۔ سو ان نیتوں سے مباح بھی عبادت ہو جاتا ہے اور امور دنیاویہ بھی دینی عبادات ہو جاتے ہیں۔ لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کی خدمت کرنا دنیا میں داخل ہے حالانکہ یہ بھی دین میں شمار ہے اور اسی طرح سونا بھی جو راحت ہے عبادت ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص عبادت عملی خواہ علمی کرتا ہو تھک کر سو جائے تو یہ سونا بھی عبادت ہے۔ کیونکہ سونے والے کا یہ قصد ہے کہ میں راحت حاصل کر کے پھر خدمت الٰہیہ میں مشغول ہو جاؤں گا۔ اور عبادت کا ذریعہ عبادت ہوتا ہی ہے۔ اس واسطے نوم العالم عبادۃ حدیث میں آیا ہے یعنی عالم کی نیند عبادت میں شمار ہے جاہل کے جاگنے سے عالم کا سونا بہتر ہے اور لطف حق دیکھئے کہ عید میں علاوہ عبادات کے جمع کرنے کے ہمارے امور طبعیہ کا بھی لحاظ کیا گیا ہے کیونکہ عبادت بوجہ رعایت امر عادی کی سہولت سے ادا ہو جاتی ہے اور متروک نہیں ہوتی۔ خواہی نخواہی ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ عید میں سامان فرحت طبعی کا جمع کیا گیا۔ لباس و زینت سے آراستہ ہونا، خوشبو لگانا، جمع ہونا، اظہار بشاشت کرنا و مثل ذلک۔ چنانچہ اس کے دلائل جزئیاً جزئیاً بھی وارد ہیں اور کلیاً حدیث **للصائم فرحتان**[۱] (روزہ دار کیلئے دو فرحتیں ہیں) کا عموم بھی اس پر دال ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ روزہ دار کو دو فرحتیں حاصل ہوتی ہیں۔

فرحة عند الافطار و فرحة عند لقاء الرحمن

(ایک فرحت افطار کے وقت اور ایک فرحت اللہ تعالیٰ کے لقا کے وقت)

سو ایک تو افطار اصغر ہے جو روزانہ ہوتا ہے اور دوسرا افطار اکبر ہے جو مجموعہ رمضان کا افطار ہے یعنی عید و اور ان دونوں کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام جو منجملہ جوامع الکلم کے ہے

[۱] سنن النسائی کتاب الصیام باب: ۴۱، مسند احمد ۲: ۲۵۷، ۳۴۵، کنز العمال ۲۳۵۹۳

شامل ہے۔ پس یوم عید جامع ہوگیا عبادات وفرح طبعی کا پھر خود ان عبادات میں بھی فرح ونشاط طبعی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جوش مسرت میں مسلمان کا طبعی امر ہے اللہ اکبر! اللہ اکبر کہنا۔ سو نماز میں یہی داخل کیا گیا۔ ولتکبروا اللہ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ کی یہ بھی تفسیر کی گئی ہے۔ غرض جو امر طبعی تھا اس کو جزو نماز کر دیا اور چونکہ موقع تھا اظہار سرور کثیر کا واقل الجمع ثلاث. کم سے کم جمع میں تین ہوا کرتے ہیں۔ تین تکبیریں ایک رکعت میں اور تین دوسری رکعت میں مقرر فرمائیں اور بعض بعض صحابہؓ کے نزدیک زائد بھی ہیں مگر تین سے کم نہیں۔ پھر قرأت کے فصل سے رکوع وسجدہ کے اللہ اکبر بھی سب جمع ہوگئے کہ اظہار سرور کے کلمہ کا تواتر بھی امر طبعی ہے اور یہ رکعت ثانیہ میں تو ظاہر ہے باقی پہلی رکعت میں تعجیل اظہار کے نکتہ سے قرأت پر تکبیر مقدم ہوگئی۔ غرض امر طبعی کو جزو نماز بنادیا گیا۔ یہ تو نماز کا بیان تھا۔

صدقہ فطر: اب صدقہ فطر کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ صدقہ صاحب نصاب کے ذمہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اور اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے ادا کرے۔ اولاد بالغ اور بیوی کی طرف سے واجب نہیں اگر بیوی اور بالغ اولاد خود مالدار بنصاب صدقہ فطر ہوں تو خود اپنی طرف سے ادا کریں ورنہ ان کے ذمہ بھی واجب نہیں۔

اگر گیہوں سے صدقہ فطر ادا کیا جائے تو پونے دو سیر نمبری سیر سے ادا کرنا چاہیے اور اگر پورے دو سیر دے دے تو زیادہ بہتر ہے اور اگر جو دیوے تو اس سے مضاعف (دوچند) دیوے۔ مگر یہ دوچند وزن کے اعتبار سے دینا جو بعضی اردو کی کتابوں میں لکھا ہے غلط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس برتن میں پونے دو سیر گیہوں سماویں اس سے دوچند بڑے برتن میں جتنے جو سماویں وہ صدقہ فطر میں دیئے جائیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ دوچند ہونے میں کیل یعنی ناپ کا اعتبار ہے وزن اور تول کا اعتبار نہیں خوب سمجھ لو اور یاد رکھو اسی طرح جن کے نام حدیث میں آئے ہیں مثلاً تمر وہ گندم سے مضاعف ہیں اور جن کا نام نہیں آیا ہے جیسے مکی، چاول، چنے وغیرہ۔ سو اس کا حکم یہ ہے کہ کسی منصوص کی برابر قیمت میں دے دیا جائے۔ بنگال میں چاول کا یہی حکم ہے کہ چاول اتنے دینے پڑیں گے جو قیمت میں نصف صاع گندم یا ایک صاع جو یا تمر کے برابر ہو۔ اور جہاں گیہوں وغیرہ نہیں ہوتے وہاں قیمت کا اندازہ کرنے کا طریق جزئیہ تو دیکھا نہیں مگر قواعد سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اقرب البلاد میں جس نرخ سے فروخت ہوتے ہیں اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔

ایک امر قابل ذکر یہ ہے کہ صدقہ فطر نماز سے پہلے دینا مناسب ہے۔ جناب رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جیسے تمہارے عید ہے ایسے ہی مساکین کی عید ہے تو اگر نماز سے پہلے ان کو پہنچ جائے گا تو بیچارے پکا کر کھالیں گے یہ قومی ہمدردی ہے۔

زیردستوں کے حقوق

مدعیان، ہمدردی تو ہمہ درد ہیں۔ اس لفظ کا مصداق تو وہاں نظر ہی نہیں آیا۔ چنانچہ برتاؤ ظاہر ہے۔ فقط نام ہے کہ ہمدردان قوم ہیں۔ دیکھئے جو ہمدرد قوم ہوتے ہیں وہ تو نوکروں کے ساتھ بھی باوجود ان پر حکومت ہونے کے ترحم اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔

مامون الرشید ایک خلیفہ ہیں جن کے زمانہ میں سلطنت اسلامی کا بڑا عروج تھا۔ ان کے یہاں حضرت یحییٰ بن اکثم قاضی مہمان تھے جو امام بخاریؒ کے استاد ہیں۔ رات میں ان کے مہمان کو پیاس لگی۔ خود انہوں نے اٹھ کر ان کو پانی پلایا۔ انہوں نے کہا کسی غلام کو آپ نے حکم کر دیا ہوتا فرمانے لگے غلام بیچارے تھکے تھکائے رات کو سو جاتے ہیں۔ دل کو گوارا نہیں کہ ان سے رات کو بھی کام لیا جائے۔ ذرا بھی شان کا خیال نہ کیا۔ اور حضرت شان کیا چیز ہے مہمان کا اکرام سنت ہے اور گو یہ ماموں معتزلی ہے مگر زمانہ کی برکت ہے۔

اسی کی یہ حکایت ہے کہ ایک بار رات میں اس نے غلام کو پکارا یا غلام یا غلام۔ وہ اٹھا بڑبڑاتا ہوا کہ یا غلام یا غلام کئے جاتے ہو۔ خدا کا خوف نہیں۔ کوئی وقت ہمارے چین ہی کا نہیں اور خلیفہ خاموش تھے۔ یحییٰ بن اکثم قاضیؒ کو غلام کے اس گستاخانہ کلام پر غصہ آیا۔ خلیفہ نے کہا کہ میں اس طریق سے اور اس تحمل سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرتا ہوں۔

اب تو امراء ملازمین کی بری گت بناتے ہیں۔ ان لوگوں کو چونکہ ذی اختیار ہیں اس لئے زیادہ ترحم اختیار کرنا چاہیے کیونکہ حکومت کی حالت میں اتلاف حقوق پر زیادہ قدرت ہونے سے اس کا وقوع چنداں بعید نہیں اور بعضے امراء اچھے بھی ہوتے ہیں جن کو اہل اللہ کی صحبت نصیب ہوگئی ہے کیونکہ یہ بات اہل اللہ ہی میں ہوتی ہے کہ ان کو اس کا بڑا خیال رہتا ہے کہ کسی کو ہم سے تکلیف نہ ہو۔

ایک قصہ حدیث میں ہے کہ لیلۃ البراۃ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مکان کے باہر سے پکارا اور خود اندر نہیں آئے کہ رات کا وقت تھا۔ حضرت عائشہؓ مکان کے اندر تھیں۔ کچھ بدن وغیرہ سونے میں کھل جاتا ہے۔ تو حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح باہر تشریف لے گئے کہ

قام رويدا۔ یعنی آہستہ کھڑے ہوئے وانتعل رويدا یعنی جوتا آہستہ پہنا۔ وفتح الباب رويدا۔ یعنی دروازہ آہستہ کھولا وخرج رويدا۔ یعنی تشریف لے گئے آہستہ واغلق الباب رويدا۔ اور دروازہ کو آہستہ بند کر دیا۔ ہر جگہ رويدا کہا۔ کہاں تک سننے والا سبق نہ سیکھے گا۔ یہی مذاق اہل اللہ کا ہے کہ نائم کی آنکھ نہ کھل جائے۔ یہ مدعی کیا ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں فقط زبان سے کہتے ہیں کرتے نہیں۔ قوال یعنی کثیر القوال ہیں اور افعال نہیں یعنی کثیر العمل نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: انتم الی امام فعال احوج منكم الی امام قوال. (یعنی تم لوگ بہ نسبت واعظ وامام قوال کے زیادہ محتاج ہو)

اہل شریعت بولتے کم ہیں کرتے زیادہ ہیں۔

خلاصہ بیان: غرض عید الفطر میں بھی مساکین کی رعایت سے تقدیم صدقہ کا حکم ہے اور اس میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی ہے تا عید وعید نہ ہو جائے بلکہ سارے محل میں عید ہو جائے۔ سب مسکینوں کو پہنچنا چاہیے چاہے وہ نہ پکاویں۔ مگر اطمینان تو ہو گیا کہ سب بھائیوں کے پاس کھانا موجود ہے۔ پس اس طرح صدقہ مقرر کر دیا۔ اور چونکہ حاجت مند کو دے کر بھی مسرت طبعی ہوتی ہے تو اس عبادت میں بھی سرور طبعی کی رعایت رکھی گئی۔

تیسری عبادت اس یوم کی امر بالمعروف ہے جس کے لئے خطبہ مقرر فرما دیا۔ یہ بھی طبعاً علامت محبت کی ہے کہ اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کی جائے اور محبت سے زیادہ سرور طبعی کس چیز میں ہوگا۔ تو یہ تو احکام خاص یوم عید کے ہوئے۔

اب چونکہ روزہ کی عادت پڑ چکی تھی۔ جب عید کے دن لقمہ منہ میں جائے گا روزہ یاد آئے گا اور ارمان ہوگا کہ کاش یہ نعمت قائم رہتی۔ پس عید سے اگلے دن سے پھر صیام شروع فرما دیا اگر جی چاہے تو پھر چھ روزے رکھ لو تا کہ ارمان پورا ہو جائے بلکہ فضیلت بھی حاصل ہو جائے۔ قانون رحمت ہے کہ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها. جو ایک نیکی کرتا ہے اس کو اس سے دس گنا ملتا ہے۔

پس اس اعتبار سے ایک ماہ رمضان اور ان چھ روزوں کے رکھنے سے سال بھر کے روزوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ پس ان احکام کو سمجھ لو اور یاد رکھو اور عمل کرو۔

اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق نیک دے۔ آمین!

النسوان فی رمضان

روزہ کی آسانی کے متعلق یہ وعظ ۲۹ رمضان ۱۳۴۵ھ کو بوقت صبح اپنے مکان میں کرسی پر بیٹھ کر مستورات کی فرمائش پر فرمایا جو ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمَنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عسیٰ ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجاً خیرا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عٰبدات سائحات ثیبت وابکارًا. (التحریم: ۵)

ترجمہ: اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو بہت جلد تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں' توبہ کرنیوالیاں' عبادت کرنیوالیاں' روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ کچھ کنواریاں۔

اہل بیت

یہ ایک آیت ہے سورۂ تحریم کی جس میں ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو خطاب ہے۔ جس کا سبب نزول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ میں ایک واقعہ ہو گیا تھا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکدر ہو گئے تھے۔ اجمالاً صرف اتنا جان لینا کافی ہے کیونکہ مقصود بیان تفصیل پر موقوف نہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری منظور نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کا علاج یہ کیا کہ ازواج مطہرات کو عتاب کیا گیا اور ان کو دھمکی دی گئی۔

ان آیات میں اسی عتاب کا ذکر ہے اور یہ دھمکی ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی محبت تھی اور یہ کہ وہ دنیادار نہ تھیں بلکہ کامل دیندار تھیں کیونکہ یہاں جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی گئی نہ کسی آفت ارضیہ وسماویہ سے ڈرایا گیا بلکہ دھمکی یہ دی گئی کہ اگر تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکدر کرو گی تو اندیشہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں اور ہم آپ کو تم سے بہتر بیبیاں دے دیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دھمکی عاشق ہی کو دی جاسکتی ہے جو بیوی عاشق نہ ہو اس کے حق میں یہ کچھ بھی دھمکی نہیں بلکہ وہ تو اس کو بشارت سمجھے گی۔ خصوصاً جب کہ عدم محبت کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ شوہر کے یہاں کھانے پہننے کی بھی تنگی ہو۔ دنیا کی عیش وراحت بھی نہ ہو جیسا کہ حضور کے یہاں حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں فاقہ بھی ہوتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض دفعہ دومہینہ تک ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ بس کچھ چھوارے اور پانی کھاپی کر گزر کر لیتے تھے اور یہ سخت تنگی کی حالت اوائل ہجرت میں تھی۔ بعد میں یہ حالت تو نہ رہی تھی کیونکہ جب فتوحات کی کثرت ہوئی تو آپ کے پاس اس قدر سامان آتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک آدمی کو سوسو اونٹ عطا فرمائے۔ ایک اعرابی کو بکریوں کا اتنا بڑا ریوڑ عنایت فرمایا جس سے جنگل بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک آدمی کو سوسو اونٹ اور ہزاروں بکریاں دے دینا اس کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سامان تھا مگر اس پر بھی یہ توسیع اپنے لئے نہیں تھا بلکہ دوسروں ہی کے لئے تھا۔ اپنے واسطے تو یہ حالت تھی کہ اگر شام کو کچھ سونا چاندی آیا تو رات سے پہلے خرچ فرمادیتے تھے اور صبح کو آیا تو شام سے پہلے خرچ فرمادیتے تھے۔

چنانچہ ایک دفعہ عصر کی نماز سے سلام پھیر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت تیزی کے ساتھ اپنے دولت خانہ میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ کو اس سرعت سے تشویش ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس تشریف لاکر فرمایا کہ میرے گھر میں کچھ سونا رکھا تھا جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوا تھا اور نبی کو مناسب نہیں کہ رات کو اس کے گھر میں دینار رہے۔ اس لئے میں نے جاکر اس کی تقسیم کا انتظام کردیا۔

اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بعض دفعہ فتوحات کے بعد ہی تنگی ہو جاتی تھی کیونکہ آپ سخی بے حد تھے۔ گھر میں روپیہ پیسہ رکھتے نہ تھے ورنہ آپ نعوذ باللہ مفلس نہ تھے حق تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا۔ بھلا کہیں مفلسوں کو بھی ایسا دیکھا ہے کہ ایک ایک آدمی کو سوسو اونٹ اور بکریوں کا ریوڑ جنگل بھرا ہوا دے دیں۔

غرض اول اول تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں فاقہ کی نوبت آتی تھی اور فتوحات کے بعد یہ تو نہ رہا تھا بلکہ آپ اپنی سب بیبیوں کا سال بھر کا خرچ ایک دم سے دے دیا کرتے تھے مگر پھر بھی زیادہ وسعت نہ تھی کیونکہ مال آپ کے یہاں جمع تو ہوتا ہی نہیں تھا اور اس سال بھر کے خرچ کی تفصیل تو معلوم نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ ہے:

اللهم اجعل رزق آل محمد قوتا. کہ اے اللہ آل محمدؐ کا رزق بقدر قوت کیا جائے۔

اور قدر قوت وہ ہے جس سے بقدر کفایت گزر ہو جائے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں۔ بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ ازواج مطہرات تو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اصالۃً داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے۔ پس یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور ازواج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہوگیا ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی و فاطمہ و حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا

اللهم هولاء اهل بيتي[1] (کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں)

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ ان کو بھی **انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا** کی فضیلت میں داخل کرلیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عباء میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عباء میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جا سکتا تھا۔ یہ

---

[1] سنن الترمذی: ۲۹۹۲، ۳۲۰۵، ۳۷۳۳، ۳۷۷۷، ۳۸۷۱، مسند احمد ۳: ۱۰۷، ۶: ۲۹۲، ۳۰۴

تو اشکالات کا جواب تھا۔

اصل مدعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ازواج اولاً داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے۔ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا، ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قالوا تعجبين من امر الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد

ترجمہ: فرشتوں نے کہا کہ کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی اور (خصوصاً) اس خاندان کے لوگو تم پر اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع اقسام) کی برکتیں (نازل) ہوتی رہتی ہیں بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) بڑی تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انہی سے ہے معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔

ازواج مطہرات

جب یہ ثابت ہو گیا اور ادھر یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آل محمد کے لئے یہ دعا فرمائی ہے کہ ان کا رزق بقدر قوت ہو تو خود ازواج کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدر قوت سے زیادہ کیوں تجویز کیا ہوگا۔ پس گو نفقہ سالانہ کی مقدار معلوم نہیں مگر اس دعا سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا کہ ازواج کا سالانہ نفقہ قدر قوت سے زیادہ نہ تھا۔ پھر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سخی بھی تھیں۔ خصوصاً حضرت زینب وحضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی سخاوت تو مشہور تھی اور بخیل تو ان میں سے ایک بھی نہ تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سخی تھے ہی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مہمان نواز تھے کہ ایک وقت میں بعض دفعہ بارہ بارہ مہمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہوتے تھے اور گھر میں گھڑے کے پانی کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اس سخاوت اور مہمان نوازی کے ساتھ تو اگر زیادہ سامان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہوتا جب بھی تھوڑا تھا چہ جائیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کچھ سامان جمع بھی نہ ہوتا تھا۔

پس ایسی حالت میں حضرات ازواج مطہرات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کی تمنا کرنا ان کی عافیت محبت کی دلیل ہے اور ان کی یہ حالت خود اس آیت سے معلوم ہو رہی

ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو صرف یہ دھمکی دی ہے کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے کر اور نکاح کر لیں اس دھمکی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ اگر وہ دنیادار ہوتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو محبت نہ ہوتی تو اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا اور ایسی حالت میں اس کا نزول عبث ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔

ازواج مطہرات میں جو کبھی سوکنوں جیسے واقعات ہوئے ہیں تو وہ دنیا دار مال کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ ان سب کا منشا صرف یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایات ومحبت کسی کے ساتھ زیادہ دیکھ کر باہم رشک ہوتا تھا اور یہ محبت وعشق کے لوازم میں سے ہے۔

باسایہ ترانمی پسندم ☆ عشق است وہزار بدگمانی

(میں تمہارے سایہ کے ساتھ بھی کسی کو پسند نہیں کرتا' عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں)

عاشق تو یوں چاہتا ہے کہ میرے سوا کسی کو میرے محبوب کی خبر بھی نہ ہو۔ چنانچہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ میں آپ کے کسی عاشق کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا کہ فلاں پہاڑ پر جاؤ۔ وہاں تم کو ہمارا ایک عاشق ملے گا یہ وہاں پہنچے اور جا کر اس کو سلام کیا۔ بس سلام کی آواز سنتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور فوراً مر گیا۔ یہ بزرگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ میں تو اس سے ملنے اور بات کرنے آیا تھا۔ یہ میری آواز سنتے ہی ختم ہو گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ☆ روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

(افسوس پلک جھپکتے ہی موسم بہار ختم ہو گیا۔ ابھی پھول کو جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ موسم بہار ختم ہو گیا)

حق تعالیٰ سے اس کا راز دریافت کیا۔ جواب ملا اس شخص کو اب تک یہ خیال تھا کہ بس اللہ تعالیٰ کو جاننے والا دنیا میں تنہا میں ہی ہوں۔ اس خیال میں یہ خوش تھا اور مست تھا۔ تمہارا سلام اور اس میں رحمت اللہ سن کر اسے خبر ہوئی کہ نہیں اور بھی خدا تعالیٰ کے جاننے والے دنیا میں موجود ہیں (اور قباء سے محفوظ نہیں ہوں) اس کا اس کو اس قدر غم ہوا کہ تحمل نہ کر سکا اور فوراً جان دیدی۔

جب عشق کا یہاں تک تقاضا ہے تو بھلا عاشق کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ محبوب کو کسی دوسرے کی طرف زیادہ توجہ ومیلان ہو۔ اسی وجہ سے ازواج مطہرات میں کبھی کبھی کچھ چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تھی جس کا منشا عداوت نہ تھا، نہ دنیا کی محبت وحرص تھی بلکہ محض حضور کی محبت اس کا منشا تھی۔

چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے فتوحات عطا فرمائیں اور غلام باندی

اور مال ومتاع اور باغات غنیمت میں بکثرت آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں اسے تقسیم فرمایا تو اس وقت حضرات ازواج مطہرات نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کو بے دریغ عطا فرمارہے ہیں تو ہم کو بھی مال غنیمت میں سے کچھ عطا فرمایا جائے اور ہمارے نفقہ میں بھی پہلے سے زیادہ کچھ اضافہ فرمادیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار کیا۔ ازواج مطہرات نے کچھ اصرار کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا۔ اس پر آیات تخییر کا نزول ہوا۔ جن میں حضرات ازواج کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ متاع دنیا کی طالب ہیں تو بس ایک دفعہ جی بھر کر دنیا لے لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے کر علیحدہ کردیں اور اگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دار آخرت کی طالب ہیں تو اسی حالت میں راضی رہیں جس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم رکھنا چاہیں۔

یایها النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیواۃ الدنیا وزینتها فتعالین امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلا، الخ.

ترجمہ: اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیویوں سے فرمادیجئے کہ تم اگر دنیوی زندگی (کا عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال ومتاع (دنیوی) دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ آیات سنائیں اور فرمایا جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ عائشہ کم سن بچی ہیں اور بچپن میں دنیا کی حرص ہونا کچھ بعید نہیں تو ایسا نہ ہو یہ جلدی سے دنیا کو اختیار کرلیں۔ اس لئے فرمایا کہ اپنے والدین سے مشورہ کرے جواب دینا کیونکہ ان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مفارقت کی رائے کبھی نہ دیں گے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آیات تخییر کو سن کر فوراً جواب دیا۔

فی هذا استامرا بوی. کیا اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت الله ورسوله والدار الآخرة. میں نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا اور دار آخرت کو۔

ان کے اس جواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔

عشق ومحبت

احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب کہ یہ چھ سال کی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جس وقت آئی تھیں اس وقت ان کی عمر نو سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تو نو سال کی لڑکی شوہر کے پاس جانے کے اور گھر داری کے قابل نہیں ہوسکتی۔ مگر عرب میں نشو ونما اچھا ہوتا ہے وہاں نو سال کی لڑکیاں اٹھان میں اچھی ہوتی ہیں۔ اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آگئی تھی۔ مگر اس عمر میں بچپن کی باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ نشو ونما اچھا ہونے سے بچپن تو زائل نہیں ہوجاتا۔ تو اس عمر میں اگر مال ومتاع دنیا کی زیادہ حرص ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ بچوں کو زیور، گہنے کی حرص ہوتی ہے۔

مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا باوجود اس کم سنی کے بڑی بڑی عورتوں سے عقل وفہم وادب میں کم نہ تھیں۔ بلکہ سب سے بڑھی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ ان سے مشکل مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان کی فہم وسلامت رائے معلوم کرتے تھے۔ اسی عقل وفہم کا یہ اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں بھی ان کے اندر بچیوں کی سی حرص وطمع نہ تھی بلکہ دانا عورتوں کی طرح استغناء کی شان تھی۔

بڑی بات یہ تھی کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت تھی وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں۔ چنانچہ یہ جواب دے کر عرض کرتی ہیں کہ یارسول اللہ میری ایک درخواست ہے۔ فرمایا وہ کیا؟ کہا، وہ یہ کہ آپ میرے اس جواب کو دوسری ازواج سے بیان نہ فرمایئے گا۔ مطلب یہ تھا کہ کہیں میرا جواب سن کر میری تقلید میں سب یہی کہہ دیں اور وہ چاہتی یہ تھیں کہ سب اپنی اپنی رائے سے جواب دیں تو اچھا ہے۔ ممکن ہے کسی کی رائے دینا لینے ہی کی ہو تو وہ الگ ہوجائے اور رقیبوں کی تعداد کچھ کم ہوجائے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو منظور نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا جواب دیا تو میں بتلا دوں گا۔ ہاں بدون پوچھے مجھے بتلانے کی ضرورت نہیں۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس درخواست سے ان کی محبت کا رنگ معلوم ہوگیا کہ وہ

یوں چاہتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اتنے شریک ہیں وہ کم ہو جائیں تو اچھا ہے اور اس میں دوسرں کے ساتھ برائی کا قصد نہ تھا بلکہ اپنے لئے بھلائی کا قصد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا میرے ہی لئے ہوں اور اس تمنا میں عاشق معذور ہوتا ہے ایک رنگ تو یہ تھا۔

ایک رنگ یہ تھا کہ حضرت ام حبیبہؓ نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ میری بہن سے شادی کر لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم کو یہ گوارا ہے؟ انہوں نے کہا یارسولؐ اللہ میں آپ کے پاس اکیلی تو ہوں نہیں بلکہ اب بھی میرے شریک بہت ہیں تو اگر اس خیر میں میری بہن شریک ہو جائے تو اس سے معتبر کیا ہے۔ غیروں کی شرکت سے بہن کی شرکت تو پھر اہون ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرے واسطے حلال نہیں۔

عشق کا ایک رنگ یہ بھی ہے جو حضرت ام حبیبہؓ میں تھا کیونکہ وہ بہن کا سوت ہونا محض اس لئے گوارا کرتی تھیں کہ میری بہن کو بھی حضور سے خاص تعلق ہو جائے جو اس کے لئے سعادت آخرت کا سبب ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی کتنی قدر دان تھیں۔

بہر حال جب یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضور ہی کو اختیار کیا۔ دنیا کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں رہنا منظور تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی منظور نہ تھی۔ چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی وغیرہ نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی تم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں۔ اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر بیبیاں کہاں سے ملیں گی۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیں۔ عسىٰ ربه ان طلقكن ان يبدله ازواجاً خيرمنكن. یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا۔ آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ بیبیاں کیسی ہوں گی۔

مسلمات کی خصوصیات

مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عبدات سائحات. وہ اسلام والیاں ہوں گی اور ایمان والیاں اور خشوع خضوع والیاں، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والیاں اور عبادت

اور سائحات ہوں گی۔ سائحات کی تفسیر عنقریب آتی ہے۔ یہ تو تشریعی صفات ہیں آگے تکوینی صفات مذکور ہیں ثیبٰت و ابکاراً۔

اس مقام پر ایک اشکال طالب علمانہ ہے۔ وہ یہ کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ازواج مطہرات سے خیر و بہتر عورتیں موجود تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو یہ دھمکی کیسی؟ اور اگر تھیں تو یہ بظاہر بہت بعید ہے کہ ان سے بہتر عورتیں دنیا میں ہوں اور حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کمتر تجویز فرمائیں۔

دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال فیض وقوت تاثیر صحبت پر نظر کر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ عورتوں سے بہتر کوئی ایسی عورت ہو سکے جس نے ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں کی اور خود نص میں بھی تو ہے یانسآء النبی لستن کاحدمن النسا ان اتقیتن (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو) اس آیت میں قلب ہے مطلب یہ ہے لیس احد من النساء کمثلکن کہ کوئی عورت تم جیسی نہیں ہے اگر تم متقی ہو۔ اور ازواج مطہرات کا متقی ہونا معلوم تو ثابت ہوا کہ ان کے مثل کوئی عورت دنیا میں اس وقت نہ تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تب نہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو۔ یانساء النبی دینات کغیر کن۔

اس اشکال کا جواب میں نے ایک عالم کے خادم سے سنا ہے۔ وہ اپنے شیخ سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ازواج مطہرات کی خیریت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح ہی کی وجہ سے تھی۔ قبل از نکاح تو وہ اور دوسری عورتیں یکساں تھیں۔ پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے تو ان سے خیریت کم ہو جاتی اور دوسری جس بیوی سے نکاح کر لیتے نکاح کے بعد وہ ان سے بہتر ہو جاتی۔ پس خیراً منکن بالفعل کے اعتبار سے نہیں فرمایا گیا بلکہ مایول کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے۔ اب کوئی اشکال نہیں یہ جواب مجھے بہت پسند آیا۔ یہ تو اشکال کا جواب تھا۔ اب میں ان صفات کو بیان کرتا ہوں جو حق تعالیٰ نے خیریت کے متعلق بیان فرمائی ہیں کیونکہ مقصود بیان کا انہی صفات سے مستنبط ہے تو فرماتے ہیں۔

مسلمات : کہ وہ عورتیں مسلمان ہوں گی اور اسلام جب ایمان کے مقابل مستعمل ہوتا ہے تو اس سے عمل مقصود ہوتا ہے یعنی وہ احکام الٰہیہ کی عملاً مطیع ہوں گی۔

مؤمنات: یعنی وہ ایمان والیاں ہوں گی۔ اس میں درستی عقائد کا بیان ہے کہ جن چیزوں کی تصدیق ضروری ہے جیسے توحید ورسالت ومعاد وغیرہ ان سب پر ان کو ایمان ہوگا۔ یہاں تک تو عقائد واعمال کا ذکر ہوا آگے فرماتے ہیں۔

قنتت: کہ وہ صاحب قنوت ہوں گی جس کے معنی خشوع وخضوع کے ہیں۔ میرے نزدیک اس میں حال کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان واسلام کے ساتھ وہ صاحب حال بھی ہوں گے جس میں اصل خشوع وخضوع ہے جو حاصل ہے فنا کا اور فنا ارفع احلال ہے اور ممکن ہے کہ قنت سے مراد یہ ہو کہ وہ زوج کی مطیع ہوں گی۔

تئبت: وہ توبہ کرنے والی ہوں گی۔ یعنی وہ عمل کے ساتھ توبہ کرنے والی ہوں گی اور یہ نظیر اس آیت کی ہے جو سورۂ ذاریات میں ہے۔ **كانوا قليلا من الليل مايهجعون وبالا سحارهم يستغفرون** (وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے) جس کی تفسیر میں علماء نے فرمایا ہے۔ **اى يستغفرون لتقصيرهم فى العبادة** (یعنی اپنی عبادت میں کوتاہیوں پر استغفار کرتے تھے) کہ وہ رات کو بہت کم سوتے ہیں اور زیادہ حصہ رات کا عبادت میں صرف کرتے ہیں اور صبح کے وقت استغفار کرتے ہیں کہ ہائے ہم سے کچھ بھی نہ ہوسکا۔ شیخ شیراز فرماتے ہیں:

فرس کشتہ ازبس اشب راندہ اند ☆ سحرگہ خروشاں کہ واماندہ اند

(ساری رات گھوڑا دوڑایا یعنی عبادت میں مصروف رہے اور صبح کے وقت اپنی کوتاہی کا اظہار کرتے ہیں)

یہی تفسیر یہاں مناسب ہے کہ وہ بیبیاں ایسی ہوں گی کہ باوجود عمل کے اپنی تقصیر سے توبہ کریں گی۔

عبدات: اور وہ عورتیں عبادت کرنے والی ہوگی یعنی توبہ کے بعد بھی وہ عبادت وعمل میں تقصیر نہ کریں گی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ کوشش کریں گی۔ ہماری طرح نہ ہوں گی کہ ہم توبہ کے بھروسے گناہ کرتے اور عمل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ بھلا یہ کون سی عقلمندی ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی جیسے تریاق کے بھروسے کوئی سانپ سے کٹوائے۔

دوسرے آج کل بہت سے آدمی توبہ کو ہر گناہ کے لئے کافی سمجھتے ہیں حالانکہ حقوق العباد میں محض توبہ کافی نہیں بلکہ بندوں سے حقوق معاف کرانا یا ادا کرنا بھی لازم ہے اور حقوق اللہ میں بھی توبہ سے صرف گناہ معاف ہوتا ہے ادائے حقوق کے لئے توبہ کافی نہیں۔

مثلاً کسی نے نمازیں قضا کردی ہوں۔ زکوٰۃ نہ دی ہو، حج نہ کیا ہوتو توبہ سے گناہ معاف ہوجائے گا لیکن قضا کردہ نمازوں کی قضا لازم ہوگی۔ زکوٰۃ بھی گزشتہ سالوں کی لازم ہوگی۔ حج کے لئے بھی وصیت وغیرہ لازم ہوگی۔ آگے فرماتے ہیں۔

سئحت: یہی صفت اس وقت مقصود بالبیان ہے۔ جمہور سلف نے سائحات کی تفسیر صائمات کی ہے کہ وہ بیبیاں روزہ رکھنے والی ہوں گی اور بعض نے اس کی تفسیر مہاجرات کی ہے۔ اس میں بھی معنی صوم کے مرعی ومحفوظ ہیں۔ کیونکہ ہجرت میں بھی کھانا پینا چھوٹ جاتا یا کم ہوجاتا ہے۔ اول تو گھر سے بے گھر ہونا ترک مالوف میں صوم کے مثل ہے کیونکہ انسان کو اپنے گھر سے بھی بہت الفت ہوتی ہے اور جیسے کھانا پینا چھوڑنا اس کو گراں ہے ایسے ہی وطن کو چھوڑنا اور گھر سے بے گھر ہونا بھی گراں ہے دوسرے لغت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کے اصل معنی ترک مالوف کے ہیں۔ یہ مفہوم اس کے سب معانی میں مشترک ہے۔ اب جس میں ترک مالوف زیادہ واضح ہوگا وہ سیاحت کا مصداق زیادہ ہوگا اور جس میں یہ مفہوم کم ہوگا وہ سیاحت کا مصداق دوسرے درجہ میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ ترک طعام وشراب وغیرہ میں جو کہ حقیقت صوم ہے ترک مالوف زیادہ ہے۔ کیونکہ غذا پر حیات انسان کا مدار ہے اس سے ہر شخص مالوف ہے اور کسی کو اس سے چارہ نہیں اور بدون گھر کے بہت سے لوگ زندہ ہیں اور رہ سکتے ہیں اس لئے سیاحت کی اصل تفسیر صوم نہیں ہونا چاہیے۔

جس نے ہجرت سے تفسیر کی ہے اس نے بھی معنی صوم کی اس میں رعایت کی ہے کہ ہجرت بھی صوم کی مثل ہے اور اس میں کھانا پینا بھی چھوٹ جاتا ہے کیونکہ سفر میں کھانے کا وہ انتظام نہیں ہوتا جو گھر میں ہوتا ہے۔ بے وقت تو اکثر ہی ملتا ہے اور یہ وصف مردوں کی تعریف میں بھی وارد ہوا ہے سورۂ توبہ میں آیا ہے۔

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراكعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر والحافظون لحدود الله.

(وہ ایسے ہیں جو (گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں اور (اللہ کی) عبادت کرنیوالے ہیں اور حمد کرنیوالے ہیں اور روزہ رکھنے والے ہیں رکوع کرنیوالے اور سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنیوالے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدود (احکام) کا خیال رکھنے والے ہیں)

جس کی تفسیر بعض نے صائمون ہی سے کی ہے اور بعض سے سیاحت وسفر سے کی ہے

جوغزوہ کے لئے ہو یا طالب علم کے لئے یا حج کے لئے۔ کیونکہ سیاحت مطلقہ شرعاً مطلوب نہیں کہ امریکہ اور پیرس اور چین کی مصنوعات دیکھنے کے لئے سفر کرو۔

سیاحت الدین

اگر آج کل کے نوجوانوں کو یہ تفسیر بالسیاحت اس آیت کی مل جاتی تو وہ اسی سے اکتشافات جدیدہ اور سیاحت متعارفہ کو ثابت کر لیتے جیسے انہوں نے انگریزی تعلیم کا ثبوت اطلبوا العلم ولو بالصین[1] سے نکالا ہے اور استدلال اس طرح کیا کہ حضور ﷺ نے چین سے بھی طلب علم کا امر فرمایا ہے حالانکہ وہاں اس وقت علم دین بالکل نہ تھا۔ محض مصنوعات کا علم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ علم بھی شرعاً مطلوب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ حدیث ثابت نہیں۔ محدثین نے اس کو ضعیف بلکہ بعض نے بے اصل کہا ہے۔ **قال السخاوی ؒ فی المقاصد ر بوجھین عن انس وھو ضعیف من الوجھین بل قال ابن حبان انہ باطل لااصل لہ وذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات. (ص ۳۰)**

دوسرے اگر بطریق تنزل اس کو مان بھی لیا جائے تو خود اس حدیث ہی کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ایسے علم کی تحصیل کا ذکر فرما رہے ہیں جو چین میں نہ تھا کیوں کہ اس میں لفظ ولو ہے جو کہ لغۃ فرض وتقدیر کے لئے ہے اور فرض معدومات کے ساتھ خاص ہوتا ہے موجودات کو فرض نہیں کیا جاتا۔ اب تو اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ ایسے علم کی تاکید فرما رہے ہیں جو چین میں اس وقت مفقود تھا اور بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ علم دین ہے نہ کہ علم مصنوعات۔

اسی طرح اگر ان لوگوں کو اس آیت کی تفسیر نظر پڑ جاتی تو وہ **اطلبوا العلم ولو بالصین** کی طرح اس آیت سے بھی علم مصنوعات پر استدلال کرنے لگتے اور اگر بحث پر نظر پہنچ جاتی تو وہ عورتوں کے لئے بھی سیاحت امریکہ اور سیاحت لندن کو ثابت کرنے لگتے کیونکہ جو لوگ عبدالدینار وعبدالدرہم ہیں ان کو ہر جگہ دنیا ہی سوجھتی ہے۔ جیسے کسی نے ایک بھوکے سے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں۔ کہا چار روٹیاں۔ حالانکہ مطلق سفر مقاصد شرعیہ سے نہیں بلکہ سفر کے متعلق تو ایک حدیث میں یہ آتا ہے۔

---

[1] میزان الاعتدال: ۱: ۳۲۱، لسان المیزان: ۱: ۲۶۱۱، ۱۰۹۰، کنز العمال: ۲۸۶۹۷

السفر قطعة من العذاب فاذا قضی احدکم نهمة فلیعجل الرجوع الیٰ اهله[1]

سفر جہنم کا ٹکڑا ہے جب کام ہو چکے، جلدی سے اپنے گھر لوٹ آؤ۔

ہاں جو سفر دین کے واسطے ہو جیسے حج اور طلب علم و جہاد وغیرہ تو وہ البتہ مشروع ہے اور لغت میں بھی لفظ سیاحت مطلق سفر کے لئے موضوع نہیں بلکہ سیاحت کے معنی ہیں الذہاب فی الارض للعبادۃ والسائح الصائم الملازم للمسجد کذا فی القاموس۔ پس سحت یا سحُون سے مطلق سفر کی فضیلت ثابت نہیں کی جا سکتی۔

پس سلف نے خوب سمجھا ہے السحون اور سحُت کی تفسیر سیاحت سے بھی کی تو اس میں عبادت کی قید بڑھا دی کہ اگر سفر ہو تو طلب علم کے لئے ہو یا حج کے لئے یا جہاد کے لئے اور حدیث میں بھی تو ہے۔ **سیاحة امتی الجهاد فی سبیل الله**[2] اس سے بھی معلوم ہوا کہ مطلق سیاحت وسفر اس امت کی عبادت نہیں جب تک اس کو عبادت کا ذریعہ نہ بنایا جایا۔

اب میں اس تفصیل کے بعد قصر مسافت کرتا ہوں کہ سائحات کی تفسیر یا سیاحت سے یا صوم سے اور راجح معنی صوم کے ہیں مگر دونوں میں وجہ اشترک یہ ہے کہ سیاحت میں بھی بعض دفعہ کھانے پینے کو نہیں ملتا کیونکہ سیاح کا مقصود کوئی خاص مقام نہیں ہوتا وہ تو ویسے ہی مارا مارا پھرتا کرتا ہے اور اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

دست از طلب نہ دارم تا کام من برآید ☆ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(میں طلب سے اس وقت ہاتھ نہیں ہٹاؤں گا جب تک میرا کام بن نہ جائے یا تو میرا بدن محبوب تک پہنچ جائے یا میری جان نکل جائے)

اور یہ حالت لندن اور پیرس کے سفر میں کہاں جس میں کھانے پینے کے لئے صدہا قسم کے سامان ساتھ ہوتے ہیں۔ کہیں سوڈا کہیں برف۔ یہ حالت صرف اسی سفر میں ہوتی ہے جو خدا کے لئے ہو جیسے جہاد کا سفر یا طالب علم کا سفر یا حج کا سفر۔

اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے سیاحت الدین کی شان معلوم ہوگی۔ ایک قاری صاحب جو ریاست رام پور کے رہنے والے تھے ان کو حج کا شوق ہوا اس وقت ان کے پاس صرف ایک روپیہ چار آنے تھے۔ بس اسی طرح انہوں نے حج کا ارادہ کر لیا۔ ایک روپیہ کے تو چنے بھنوائے اور چار آنے کا ایک تھیلا سلوالیا جس میں وہ چنے بھر لئے اور پیادہ پا چل کھڑے ہوئے۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۳:۱۰،۴:۱،۷:۷،۱۰۰، الصحیح لمسلم كتاب الإمارة: ۱۷۹، سنن ابن ماجة: ۲۸۸۲، مشكوٰة المصابيح: ۳۸۹۹ [2] إتحاف السادة المتقين ۷:۲۹۵، المغنی عن حمل الأسفار: ۱:۲٦۷

دن کو روزہ رکھتے ۔ راستہ میں اگر بلا طلب کھانا مل گیا تو کھالیا ورنہ ایک مٹھی چنے کھالئے اور پانی پی لیا۔ اسی طرح کئی مہینے میں بمبئی پہنچے واقعی یہ سیاحت ہے جو ملحق بالصوم ہے۔

اب بمبئی سے آگے دریا تھا اس میں تو چلنا مشکل تھا اور جہاز میں سوار ہونے کیلئے ٹکٹ کے دام چاہئیں اور ان کے پاس دام کہاں، جب حاجی جہاز پر سوار ہونے لگے تو یہ بھی جہاز میں پہنچے اور کپتان سے کہا کہ مجھے بھی جہاز میں نوکری کی ضرورت ہے اس نے ان کی صورت عالمانہ اور بزرگانہ دیکھی تو عذر کر دیا کہ آپ کی شان کے لائق میرے پاس کوئی ملازمت نہیں وہ صورت سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی نیک اور بزرگ آدمی ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی ☆ نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(انوار الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں اگر تو اہل دل ہے تو آن کا ادراک کر سکتا ہے)

کسی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ☆ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ لائق اور غیر لائق سے بحث نہ کیجئے جو نوکری بھی ہو کیسی ہی ذلیل ہو میں کرلوں گا۔ (کیونکہ نوکری مقصود تھوڑا ہی تھی جہاز میں سوار ہو کر مکہ پہنچنا مقصود تھا) کپتان نے کہا کہ آپ سے وہ نوکری نہ ہو سکے گی۔ کہا تم بتلاؤ تو ایسی وہ کیا نوکری ہے؟ کہا میرے پاس صرف بھنگی کی نوکری خالی ہے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ مجھے منظور ہے۔ کپتان بڑا حیران ہوا کہ یہ فرشتہ صورت آدمی یہ کام کیسے کرے گا۔ اس نے قاری صاحب کو عاجز کرنے کے لئے کہ اس کے ساتھ ایک کام مشقت کا بھی ہے تم سے نہ ہو سکے گا۔ اگر تم کو اسی پر اصرار ہے تو اچھا یہ بورا اٹھاؤ۔ وہاں دواڑھائی من کا ایک بورا پڑا ہوا تھا۔ قاری صاحب اس کی طرف چلے اور بسم اللہ کہہ کر ہاتھ لگایا اور حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک تو میرا کام تھا میں نے کر دیا اب آپ کا کام ہے میری امداد فرمایئے اور دعا کر کے جو اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے۔ اور پھر رکھ دیا کپتان نے کمر تھپکی اور کہا شاباش شاباش! اچھا ہم نے تم کو ملازم کرلیا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس دبلے پتلے کمزور آدمی نے اتنا بڑا بورا کیونکر اٹھایا۔ یہ محض خدا تعالیٰ کی امداد تھی ورنہ وہ بیچارے مجاہدے ریاضتیں کرنے والے اور مہینوں کا راستہ پیدل طے کئے ہوئے کب اتنا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔

اس وقت اور بھی دو غریب آدمی جو حج کے متمنی تھے کھڑے تھے انہوں نے بھی کپتان سے کہا

کہ ہم کو بھی کوئی ملازمت جہاز کی دے دیجئے اس نے کہا کہ یہی بھنگی کی ملازمت تم کو بھی مل سکتی ہے وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو قاری صاحب نے فرمایا کہ ارے اللہ کے بندو حج سے کیوں محروم رہتے ہو۔ اگر تم کو اس کام سے عار آتی ہے تو تم یہ نوکری منظور کرلو۔ تمہارا کام بھی میں ہی کردیا کروں گا۔ چنانچہ کئی آدمیوں کا کام اپنے سر لے لیا اور اب یہ حالت ہوئی کہ روزانہ جہاز کے پاخانوں کو کماتے اور دھوتے تھے۔ ہائے ؎

ایں چنیں شیخ گدائے کوبہ کوبہ ☆ عشق آمد لاابالی فاتقوا

(ایسا فقیر صفت شیخ عشق میں بڑا لاابالی ہے پس ڈرتے ہی رہو)

یہ عشق کی نیرنگیاں ہیں اس کا کچھ ضابطہ نہیں ہے ؎

عشق را نازم کہ یوسف را بازار آورد ☆ ہمچو صنعا زاہدے راز یر زنار آورد

(عشق کو اس پر ناز ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ہر بازار سے آیا صنعا جیسے زاہد کو زنار پہنادیا)

بس اس کا ایک ضابطہ تو رہ جاتا ہے کہ شرعی حدود پر رہے باقی سب رخصت اور اگر کوئی عاشق مجذوب ہوگیا تو اس کے لئے یہ ضابطہ بھی نہیں رہتا۔

قاری صاحب دن کو یہ کام کرتے۔ نمازوں کے وقت دوسرے کپڑے غسل کر کے پہن لیتے اور رات کو تہجد میں قرآن خوش الحانی سے پڑھتے ایک دفعہ کپتان بھی رات کو قاری صاحب کے پاس گزرا۔ ان کا قرآن سن کر کھڑا ہوگیا اور سنتا رہا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا، کہ تم یہ کیا پڑھ رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ ہمارے خدا کا کلام ہے۔ کپتان بولا کہ ہم کو بھی سکھلاؤ۔ ہم کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے فرمایا کہ اس کے پڑھنے کے لئے پاک ہونا شرط ہے۔ اس نے کہا ہم نہالیں گے۔ قاری صاحب نے فرمایا وہ پاکی نہانے سے نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ اس سے وہ پاکی ہوتی ہے۔ کہاں ہاں ہم سب کچھ کریں گے۔

چنانچہ قاری صاحب نے اس کو غسل کرایا اور غسل کے بعد کلمہ پڑھایا پھر چند سورتیں چھوٹی چھوٹی سکھلائیں۔ وہ کپتان ہروقت کلمہ یا سورتیں پڑھتا پھرتا تھا۔ دوسرے انگریزوں نے جو اس کا کلمہ اور قرآن پڑھتے ہوئے سنا، کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو۔ کہا یہ خدا کا کلام ہے ہم کو اچھا معلوم ہوا اس لئے پڑھتے ہیں انگریزوں نے کہا تم تو اس سے مسلمان ہوگئے۔ کہا نہیں نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا انگریزوں نے کہا کہ اس کے پڑھنے سے تو آدمی مسلمان ہوجاتا ہے کہا اچھا ہم اپنے بھنگی سے پوچھ کر آتے ہیں۔

وہ قاری صاحب کے پاس آیا اور کہا کیا ہم مسلمان ہوگیا ہے؟ فرمایا تم کو آج خبر ہوئی تم تو کئی دن ہوئے مسلمان ہو چکے۔ یہ سن کر اول تو اس کو تحیر سا ہوا۔ پھر قرآن کی نورانیت نے اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ کچھ پروا نہیں۔ اب بس ہم مسلمان ہی رہیں گے۔ مگر اس کلام کو نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنی میم سے بھی کہہ دیا کہ ہم تو مسلمان ہوگئے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ رہنا چاہو اسلام قبول کرو ورنہ ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب جہاز جدہ کے قریب پہنچا، تو اس کپتان نے بھی اپنے عہدہ سے استعفا، دے دیا اور قاری صاحب کے ساتھ جا کر حج کیا اور بڑا پکا مسلمان ہوگیا۔

یہ قصہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ سیاح کے پاس زادراہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ تو مارا مارا پھرا کرتا ہے جیسے یہ قاری صاحب سیاح ہو کر حج کر آئے۔

عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ میں حج کو جا رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا کہ بدون زادوراحلہ کے قافلہ کے ساتھ ہے۔ میں نے پوچھا، صاجزادے کہاں کا قصد ہے۔ کہا بیت حبیب کا۔ میں نے کہا، اور تم نے زادوراحلہ کچھ بھی ساتھ نہ لیا۔ تو فوراً جواب دیا

وفدت على الكريم بغيرزاد   من الحسنات والقلب السليم

(میں کریم کے دروازے پر بغیر سامان سفر کے حسنات اور قلب سلیم سے فدا ہوں)

یہ معنی نہیں کہ اعمال حسنہ بھی ترک کر دیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اعمال کو ادا کر کے ان کو زاد نہ سمجھے۔ ان پر اعتماد نہ کرے۔

فان الزاد اقبح كل شيء   اذاكان الوفود على الكريم

(کیونکہ سامان ساتھ لینا ہر شیء سے برا ہے جبکہ وجود کریم کے دروازہ پر ہوں)

میں اس جواب سے سمجھا کہ معمولی شخص نہیں بلکہ عاشق ہے۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ پھر میں اس لڑکے کو منٰی میں دیکھا جب کہ سب لوگ قربانیاں کر رہے تھے، اس نے حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور عرض کیا، بارالہا! سب لوگ آپ کی جناب میں نذر پیش کر رہے ہیں اور میرے پاس بجز اپنی جان کے کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ قبول ہو جائے تو حاضر ہے۔ یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور جان دے دی۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے ہاتف کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے کہ اس قربانی کی بدولت سب کی قربانیاں اس سال قبول ہوگئیں اور اس کے حج کی بدولت سب کا حج قبول ہوگیا۔

خیر یہ مضمون بیچ میں استطراداً آ گیا تھا جس کو مضمون مقصود سے زیادہ تعلق نہ تھا مگر کچھ مضائقہ نہیں اس کی بھی ضرورت تھی کیونکہ اب حج کا بھی موقع آ رہا ہے۔

سراپا انعامات

بہرحال بعض علماء نے جو سائح کی تفسیر سیاحت کنندہ سے کی ہے انہوں نے سیاحت کرنے والے کو تشبیہا بالصائم سائح کہہ دیا ہے۔ صائم کو سیاحت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دے کر سائح نہیں کہا گیا۔ پس اصل تفسیر سحت کی صائمات ہے اور قول جمہور دلیل مستقل ہے کہ اکثر علماء مفسرین نے سحت کی تفسیر یہی کی ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سحت کی تفسیر روزہ رکھنے والیاں ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ روزہ بڑی عبادت ہے کیونکہ تخصیص بعد تعمیم اہتمام کے لئے ہوتی ہے تو حالانکہ مسلمات اور عبدات میں روزہ بھی داخل تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اہتمام کے ساتھ الگ بیان فرمایا ہے جس سے اس کی خاص عظمت وفضیلت معلوم ہوئی کہ یہ بہت بڑی عبادت ہے مگر اس سے ناز نہ کرنا کہ ہم نے بڑا کام کیا بلکہ حق تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ انہوں نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ☆ منت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

(تو اس بات کا احسان نہ رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہے بلکہ بادشاہ کا ممنون احسان ہو جس نے تجھے ملازم رکھ لیا ہے)

دیکھو! اگر کسی سائیس کو عید کے دن آقا سے آٹھ آنے انعام ملنے کی امید ہو اور اس کو آٹھ ہزار مل جائیں تو وہ ناز کرے گا یا حیا سے گڑ جائے گا۔ کہ مجھ نالائق پر ایسا انعام۔ اسی طرح آپ اس پر ناز نہ کیجئے کہ آپ روزہ رکھ رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان مانئے کہ انہوں نے آپ سے یہ کام لے لیا اور شکر کے طور پر یوں کہئے ۔

تصدق اپنے خدا پہ جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے انعام یہ دم بدم

حضرت جتنے کام حق تعالیٰ ہم سے لے رہے ہیں، یہ خود انعام ہے پھر انعام پر انعام کیسا؟ انعام تو عمل پر ہوا کرتا ہے اور یہاں خود یہ اعمال ہی سراپا انعامات ہیں ورنہ ہم کس قابل تھے کہ حق تعالیٰ کی عبادت کر سکیں اس کو شیخ فرماتے ہیں ۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی ☆ منت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

(تو بادشاہ پر اپنا احسان نہ سمجھ کہ تو اس کی خدمت کرتا ہے مگر بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت کرنے کی اجازت دی ہے)

سہولت صوم

اس وقت بیان سے ایک مقصود تو فضیلت صوم تھی جو مختصراً بیان ہوگئی۔ دوسرا مقصود سہولت صوم کا بیان ہے جس کا بیان اس جمعہ کے وعظ میں ہو چکا ہے۔ مگر بعض باتیں اس وقت بیان نہ ہوئی تھیں وہ اب بیان کروں گا۔ گویا یہ اس کا تتمہ ہوگا۔ اس لئے اہل طابع کو بھی مناسب ہے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ ہی طبع کیا جائے۔

اب سنئے کہ اس آیت سے بھی ایک وجہ سہولت صوم کی معلوم ہوتی ہے مگر اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اقتران بالذکر فضول نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اس سے بھی کچھ فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ جب دو چیزوں کو ذکر میں مقترن کیا جاتا ہے تو ان دونوں میں کچھ تعلق وارتباط ومناسبت ومشابہت ضرور ہوتی ہے۔ جس کی دلیل دو حدیثیں ہیں۔

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت **فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور** (تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے (بالکل) کنارہ کش رہو اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو)۔ کی تفسیر میں فرمایا ہے **عدلت شهادة الزور بالشرک بالله**[1] کہ جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کردی گئی۔ حالانکہ آیت میں محض اقتران ذکری ہے اس کے سوا تسویہ پر کوئی امر بظاہر دال نہیں۔

دوسرے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا ومروہ کے درمیان سعی فرمائی ہے تو یہ آیت پڑھی **ان الصفا والمروة من شعائر الله** پھر ارشاد فرمایا **نبدأ بمابدأ الله**[2]۔ پھر یہاں بھی محض ترتیب ذکری کی وجہ سے صفا کو مروہ پر مقدم فرمایا۔ اور خود ہمارے محاورات میں بھی یہ بات ہے کہ جب کوئی ایسی دو چیزوں کو ذکر میں مقترن کرے جن میں باہم ارتباط نہ ہو یوں کہتے ہیں کہ اس میں اور اس میں کیا جوڑ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقتران فی الذکر فضول نہیں ہوا کرتا بلکہ اس سے مقترین میں مناسبت وتعلق پر دلالت ہوتی ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد ۳۵۹۹، سنن الترمذی: ۲۳۰۰، سنن ابن ماجة: ۲۳۷۲، مشکوٰة: ۳۷۷۹

[2] سنن الترمذی: ۸۶۲، ۲۹۶۷، سنن النسائی کتاب الحج باب: ۱۵۷، باب: ۱۶۲، باب: ۱۶۶، سنن ابن ماجة: ۳۰۷۴، مؤطا مالک: ۳۷۲

اب سمجھئے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سائحات کو جس کی تفسیر ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس کے معنی روزہ رکھنے والیوں کے ہیں مقرون کیا ہے ثیبت وابکارا کے ساتھ۔ جو صفات غیر اختیاریہ ہیں اور صفات غیر اختیاریہ سب سے زیادہ سہل ہیں کیونکہ ان میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا حتیٰ کہ ارادہ واختیار کو بھی صرف کرنا نہیں پڑتا بلکہ وہ بدون ارادہ واختیار کے خود بخود ثابت ہیں اور اوپر ابھی معلوم ہوا کہ اقتران حکمت سے خالی نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ صفت صوم کو صفات غیر اختیاریہ سے مقرون کرنے میں بھی کچھ حکمت ہے۔ اور وہ حکمت میرے نزدیک یہی ہے کہ صوم بھی مثل صفات غیر اختیاریہ کے سہل ہے کہ اس میں بھی کچھ فعل وجود ہی کرنا نہیں پڑتا۔ پس اس آیت سے سہولت صوم پر عجیب طرز سے دلالت ہے۔

رہا یہ کہ یہ صفات غیر اختیاریہ کیسے ہیں تو سنئے کہ ثیوبت تو اس لئے غیر اختیاری ہے کہ لغت میں ثیوبت بکارت کے مقابل ہے۔ اور شرعاً ثیب وہ ہے جو صاحب زوج ہو چکی ہے پھر اس سے فرقت ہوگئی ہے۔ بوجہ طلاق یا موت کے اور بکر وہ ہے جو ابھی تک صاحب زوج نہیں ہوئی۔ پس ثیوبت کے مفہوم میں دو جز ہیں۔ ایک صاحب زوج ہونا جو نکاح پر موقوف ہے اور نکاح گو بعض صورتوں میں حقیقتاً عورت کی منسوب ہوتا ہے مگر اس کی نسبت ایسی ضعیف ہے کہ گویا بمنزلہ عدم کے ہے اور اس بنا پر اگر کوئی یوں کہنے لگے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کرتی بلکہ اس کا نکاح ولی کرتا ہے تو یہ بات غلط نہیں۔ کیونکہ اگر وہ صغیرہ ہے تب تو ظاہر ہے کہ اس کا نکاح میں کچھ بھی دخل نہیں اور اگر بالغہ ہے تو نکاح اول میں جو کہ ثیوبت کا پہلا جزو ہے اس کا لزوم تعلق شرعاً معدوم ہے۔ صرف اس کا سکوت ہی اذن قرار دیا گیا اور اس بنا پر گو بوجہ اس کے کہ اس کو اتنا اختیار تھا کہ انکار کر دیتی اس کے سکوت کو نکاح کا سبب اختیاری کہا جائے گا۔ لیکن پھر بھی یہ اختیار عادت طبعیہ کے اعتبار سے مثل عدم اختیاری کے ہے۔ یہ تو جز اول کی حالت پر اور دوسرا جزو یہ ہے کہ نکاح کے بعد فرقت ہو جائے۔ یہ تو بالکل ہی عورت کے اختیار میں نہیں کیونکہ فرقت اگر طلاق سے ہے تو وہ زوج کے اختیار میں ہے عورت کا اس میں کچھ اختیار نہیں اور موت سے ہے تو یہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں اور جن صورتوں میں عورت کو طلب فرقت کا اختیار بھی ہے وہاں قضا قاضی شرط ہے یا متارکت زوج ضروری ہے تو وہاں بھی فرقت عورت کے اختیار میں نہ ہوئی بلکہ زوج ہی کے اختیار میں ہوئی۔ کیونکہ جہاں قضاء قاضی سے فرقت ہو سکتی ہے ان صورتوں میں قاضی زوج کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ رہی

ردت وہ ناگوار و مکروہ اور مسلمان کی شان سے بعید و مستنکر ہے۔ اس کے اعتداد کی کوئی وجہ نہیں۔ پس ثیوبت کو اگر اپنے جزو اول کے اعتبار سے من کل الوجوہ غیر اختیاری تسلیم نہ بھی کیا جائے تب جزو ثانی کے اعتبار سے تو یقیناً غیر اختیاری ہے کہ اس صفت کا ثبوت عورت میں بدون اس کے اختیار کے ہو جاتا ہے۔ تو جزو اخیر ثیوبت کی علت تامہ کا ہر حال میں غیر اختیاری رہا۔ اگر مجموعہ اجزاء پر نظر کی جائے تب بھی مجموعہ اختیاری و غیر اختیاری کا غیر اختیاری ہوتا ہے تو ثیوبت غیر اختیاری ہی رہی۔ اور بکارت کا غیر اختیاری ہونا تو ظاہر ہے پس بحث کا ثیبت وابکارا کے (وہ اسی اقتران کی مثل ایک اور صفت ہے اقتران اسی کا اہم اثر ہے تقدیر اس کی یہ ہے کہ سورۂ احزاب میں صائمین وصائمات کا قتران **محافظین فروجھم ومحافظات** کے ساتھ ذکر میں واقع ہوا ہے اور حفظ فروج اہل طبائع کا سلیمہ کا اور ان میں سے بھی بالخصوص اناث کا امر طبعی ہے تو اس امر طبعی کے ساتھ اقتران نیز موید ہر صوم کے مشابہ امور طبیعہ ہونے کا جو کہ بے حد سہل ہوتے ہیں جیسا کہ متن میں مذکور ہے یہ مضمون بعد میں ذہن میں آیا۔ اس لئے حاشیہ میں لکھ دیا گیا۔ ۱۲ منہ) ساتھ مقرون کرنا بتلا رہا ہے کہ صوم مثل امور طبعیہ کے سہل ہے اور واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوم امر طبعی ہے کیونکہ امر طبعی وہ ہے جس کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کھانے پینے کے لئے تو قصد و ارادہ کی ضرورت ہے اور نہ کھانے اور نہ پینے کے لئے قصد و ارادہ کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہم گھنٹوں بدون کھانے پینے کے کام میں لگے رہتے ہیں اس وقت اس حالت پر التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہم اس وقت کھاتے پیتے نہیں ہیں۔

دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کے زیادہ تر اوقات نہ کھانے اور نہ پینے ہی کے ہیں۔ کھانے پینے کے تو چند اوقات معین ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نہ کھانا نہ پینا امر اصلی ہے۔ اگر کھانا پینا امر اصلی ہوتا تو اس کے اوقات زیادہ ہوتے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور اصلی میں اصل سہولت ہے۔

رہا یہ شبہ کہ نہ کھانے پینے کی حالت میں جو التفات شراب وطعام کی طرف نہیں ہوتا تو یہ اسی وقت تک ہے جب تک بھوک نہ لگے اور جب بھوک لگتی ہے تو خاص التفات ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بھوک میں بھی طعام وشراب کی طرف التفات بیکاری کی حالت میں ہوتا ہے اور اگر کسی کام میں لگ جائے تو کھانے پینے کی تو کیا بھوک کی خبر نہیں ہوتی۔

چنانچہ بہت واقعات ایسے ہو چکے ہیں اور کم وبیش ہر شخص کواس کا تجربہ ہوتا ہوگا اوراگر مان بھی لیا جائے کہ بھوک میں طعام وشراب کی طرف التفات ہوتا ہے تواس کا تو انکار ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ ایک عارض کی وجہ سے ہے۔اب معدہ ان رطوبات اصلیہ کے ہضم کی طرف متوجہ ہوگیا جس سے تکلیف ہوتی ہے۔جب یہ عارض مرتفع ہوجائے گا التفات بھی جاتا رہے گا۔

اب یہاں سے میں ایک اورشبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جس کا جواب دینا جمعہ کو (یاد نہ رہا ہوگا ورنہ اس وعظ میں بھی مذکور ہے ۱۲منہ) بھول گیا تھا۔وہ یہ کہ نہ کھانا اور نہ پینا اگر آسان ہے تو کسی کومہینہ بھرتک بھوکا رکھ کر دیکھا جائے۔معلوم ہوجائے گا کہ نہ کھانا کیوں کر آسان ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عدم اکل کی حقیقت فی نفسہ دشوار نہیں بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استداد عدم اکل دشوار ہے۔تو یہ دشواری استداد عارض سے ہوگئی نہ کہ حقیقت عدم اکل سے۔ اور شریعت نے جو عدم اکل وشرب کی حد مقرر کی ہے وہ ممتد نہیں ہے۔اسلئے صوم کچھ دشوار نہیں ہے پس اب سب اشکالات رفع ہوگئے اور سہولت صوم کا یہ دعویٰ بے غبار ہوگیا۔

نماز روزہ کی پابندی کا فرق

پھر اقتران سحت وثیبت وابکارا علاوہ خصوصیت مقام سے اس سہولت میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔وہ یہ کہ اس جگہ عورتوں کے روزہ کا ذکر ہے اور عورتوں کو طبعاً بھی روزہ اس لئے آسان ہے کہ ان میں رطوبت وبرودت زیادہ غالب ہوتی ہے۔ ہاں کوئی ضعیف ونحیف ہوتو اور بات ہے ورنہ عام طور سے مزاج عورتوں کا رطب وبارد ہے اور ایسے مزاج والے کو روزہ دشوار نہیں ہوتا۔ روزہ حار ویابس مزاج والے کوزیادہ گراں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں نماز میں تو سست ہیں مگر روزہ میں بچیاں بھی ہمت والی ہیں۔

نیز عورتوں کا طرز عمل بھی بتلاتا ہے کہ ان کو روزہ سہل ہے۔ وہ یہ کہ عورتیں جب کبھی نذر ومنت مانتی ہیں تو زیادہ تر روزہ کی منت مانتی ہیں۔نماز کی نذر کوئی کوئی کرتی ہے کیونکہ نماز ان کوگراں ہے۔اس میں پابندیاں بہت ہیں اور افعال اختیار یہ بھی زیادہ ہیں۔

پابندی کا تو یہ حال ہے کہ نماز میں بات بھی نہیں کرسکتے۔گوہمارے ہاں ایک بڑھیا ہے وہ تو نماز میں بولتی رہتی ہے مگر یہاں بڑھیا عورتوں کا ذکر ہے جو سمجھ دار ہیں اور وہ بڑھیا تو پاگل ہے اور یہ خاص پابندی عورتوں پر سب سے زیادہ سخت ہے کیونکہ ان کو بولنے اور باتیں کرنے کا زیادہ شوق ہوتا

ہے۔ اور نماز میں افعال اختیاریہ زیادہ اس طرح ہیں کہ کہیں قرأت ہے کہیں ذکر کبھی قیام ہے، کبھی قعود، کبھی رکوع ہے، کبھی سجود اور روزہ نہ کچھ پابندی ہے نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرح آزادی ہے۔ جدھر چاہو دیکھو جہاں چاہو چلو پھرو۔ چاہے باتیں کرو، چاہے سو رہو، روزہ ہر حالت میں موجود ہے مگر نماز میں ان سب پابندیوں کے ساتھ ایک آزادی ایسی ہے جو کسی عبادت میں بھی نہیں۔ وہ یہ کہ نماز کی حالت میں انسان مخلوق کی تعظیم بجالانے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ادنیٰ سپاہی بھی نماز میں ہو اور بادشاہ وقت اس کے پاس سے گزر جائے تو وہ کبھی عدم تعظیم کا شاکی نہ ہوگا۔ گو کافر ہی بادشاہ کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ وہ نماز کی حقیقت سے واقف ہو۔ روزہ میں یہ بات نہیں ہے روزہ میں تو آپ کو اپنے پاس آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع، تعظیم وتکریم سب ہی کچھ کرنا پڑے گی۔

خلوت گاہ حق

مجھے اپنے پھوپھا کے بھائی مولوی ظہیر الدین مرحوم کا قصہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ درویش آدمی تھے اور ایسے آدمی کو مخلوق کے اختلاط سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو انہوں نے گوشہ نشینی کی یہ صورت اختیار کی کہ اپنی بیٹھک میں رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے رہتے۔ یہ خلوت در انجمن تھی۔ اس حالت میں بھی کوئی ان سے ملنے آجاتا تو نماز کا سلام پھیر کر وہ ایک دو بات کر لیتے تھے اور بقدر ضرورت بات کر کے پھر اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دیتے۔ اس طرح سے جلوت میں بھی خلوت ہو گئی تھی۔ ورنہ اگر خلوت کی یہ صورت اختیار کرتے کہ جنگل میں چلے جاتے یا گھر کے کواڑ بند کر لیتے تو اس سے شہرت ہو جاتی اور شہرت کے بعد انسان کو چین نہیں ملتا۔ لوگ خواہ مخواہ آکر گھیر لیتے ہیں جن سے بد خلقی بھی نہیں کی جاسکتی۔ بس یہ ترکیب بہت اچھی تھی کہ نماز کی کثرت کرتے تھے، اس سے نہ تو شہرت ہوئی نہ خلوت فوت ہوئی۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں

گر گریزی بر امید راحتے ☆ ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست ☆ جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق سے یہ مراد نہیں کہ حجرہ میں بند ہو کر رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ خلوت در انجمن کرو۔ جس کے لئے نماز کی ترکیب سب سے زیادہ بہتر ہے کہ اس میں کوئی کچھ شکایت ہی نہیں

کر سکتا۔ وظیفہ میں مشغول رہنے سے بھی آرام نہیں مل سکتا۔

چنانچہ میں ایک بار نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک صاحب پیچھے سے آئے اور میرا کندھا پکڑ کے مصافحہ کا مطالبہ کیا۔ اور اگر کوئی یوں چاہئے کہ آنکھیں بند کر کے سونے کا بہانہ کر کے پڑ رہوں تو اس طرح بھی چین نہیں مل سکتا۔

ایک دفعہ میں سیوہارہ گیا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کو سفر کیا تھا صبح نیند کا غلبہ ہوا۔ ایک تخلیہ کے مکان میں سونے کے قصد سے جا لیٹا۔ ایک صاحب جو حج کو جاتے تھے ملنے کیلئے آئے اور بلند آواز سے کہا، السلام علیکم ۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ نیند آ چلی تھی۔ مگر ان کے سلام سے نیند کافور ہوگئی میں جاگ تو گیا مگر میں نے قصداً آنکھیں نہ کھولیں۔ اور ویسے ہی آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ بعض حاضرین نے ان سے کہا کہ اس وقت آنکھ لگ گئی ہے۔ آپ تشریف لے جائیں کہنے لگے واہ! ہم حج کو جا رہے ہیں۔ ہم تو مصافحہ کر کے جائیں گے۔ ان ہی بعض حاضرین احباب نے کہا، بھائی یہ وقت مصافحے کا نہیں مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور اسی حالت میں اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں سے رگڑ کر اور اپنے نزدیک مصافحہ کر کے چلتے ہوئے۔ ان کا تو مصافحہ ہوا مگر میری نیند برباد ہوگئی۔

لکھ کر ہمارا نام زمین پر مٹا دیا ☆ ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

پس تجربہ سے معلوم ہوا کہ سونے کی حالت میں بھی مخلوق چین نہیں لینے دیتی۔ مولانا تو یوں فرماتے ہیں ۔

گر گریزی برامید راحتے ☆ ہم ازآں جاپیش آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

کیونکہ میں تو راحت ہی کے لئے نیند کی صورت بنا کر لیٹا تھا مگر اس حالت میں بھی آفت کا سامنا ہوا۔ بس ان آفات سے نجات نماز ہی میں مل سکتی ہے۔ تو نماز میں گو داخلی پابندیاں ہیں مگر مخلوق سے بالکل آزادی ہو جاتی ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ نمازی خدا کا غلام ہو کر مخلوق کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تو یہ آزادی تو نماز میں سب سے زیادہ ہے۔

نماز روزہ کا فرق

باقی دوسری آزادیاں روزہ میں زیادہ ہیں کہ نماز ہنسنے بولنے اور رونے اور پیشاب پاخانہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ روزہ میں ایسی آزادی ہے کہ وہ کسی بات سے نہیں ٹوٹتا۔ سوائے اکل وشرب و جماع کے۔ وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً کھایا پیا جائے اور بھول کر کھا پی لے تو کچھ حرج نہیں

اور نماز میں عمد ونسیان سب برابر ہیں وہاں جتنے مفسدات ہیں ہر حال میں مفسد ہیں۔

ہاں ایک مولوی صاحب کی مریدنیوں کا مذہب لیا جائے تو پیشاب پاخانہ سے بھی روزہ ٹوٹے گا۔ ان مریدنیوں کی یہ حالت تھی کہ مغرب کی اذان سنتے ہی اور تو سب کھانے پینے کی طرف دوڑتے اور وہ لوٹا لے کر پاخانہ کی طرف دوڑتیں۔ اوروں کا افطار تو چھوارہ اور پھلکیوں سے ہوتا تھا اور ان کا افطار رفع حاجت سے ہوتا تھا۔ بیچاری دن بھر پیشاب پاخانہ کو دبائے پھرتی تھیں۔ مغرب کے وقت ان کو سب سے پہلے اسی کا اقتضا ہوتا تھا۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا ورنہ روزہ میں ایسی آزادی ہے کہ وہ کسی کام سے نہیں ٹوٹتا جب تک عمداً اکل وشرب و جماع نہ ہو۔ یہ دوسرا مقصود بالبیان تھا کہ روزہ بہت سہل ہے اس کی تفصیل جمعہ کے وعظ میں ہو چکی ہے بعضی اسی وقت رہ گئی تھیں وہ اب بیان کر دی گئیں۔

یہ مضمون میں نے اس لئے بیان کیا ہے تا کہ لوگ روزہ کو گراں نہ سمجھیں کیونکہ بعضے لوگ ایسے موجود ہیں جو روزہ کو گراں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے تو ختم رمضان پر آخری جمعہ کو کہتے ہیں الوداع الوداع یا شہر رمضان۔ کہ اے رمضان رخصت رخصت اور بار بار اس لفظ کا تکرار کرتے ہیں اور جو شخص دوبار یا تین بار کہے رخصت رخصت تو سارے زبان دانوں سے پوچھ لو کہ وہ کیا کہیں گے۔ سب یوں ہی کہیں گے کہ پاپ کاٹ رہا ہے۔ اگر اس کو حسرت ہوتی تو بار بار رخصت رخصت نہ کہتا بلکہ ایک ہی بار دبی زبان سے رخصت کہتا۔

نیز اگر ان کو رمضان کے جانے کی حسرت ہوتی تو رمضان کے آنے کی خوشی بھی تو ہوتی۔ تو ابتدائے رمضان میں ایک خطبہ مرحبا مرحبا یا شہر رمضان کا بھی پڑھنا چاہیے اور وہاں تکرار مرحبا مفید مسرت ہے یہ محاورہ کے موافق ہے۔ اور صاحبو! یہ سب زبانی دعوے ہیں ورنہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیا جائے ان لوگوں کو رمضان کے جانے کی حسرت ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ آج رمضان کی ۲۹ تاریخ ہے۔ نہ معلوم کتنوں کی نیتیں بگڑ رہی ہوں گی کہ کسی طرح آج ہی چاند ہو جائے۔ خصوصاً یہ سن کر کہ بعض جگہ آج ۳۰ تاریخ۔ مگر وہ وہیں کی تیس ہے۔ ہمارے یہاں تو آج ۲۹ ہی ہے۔ اب اس حالت میں کیسے مان لیا جائے کہ ان کو رمضان کے جانے کا رنج ہے اور آنے کی مسرت ہے بلکہ حالت اس کے برعکس ہے کہ رمضان کے آنے سے گرانی ہوتی ہے اور جانے سے خوشی ہوتی ہے۔ میں اس بیان سے اس کا علاج کرنا چاہتا ہوں کہ روزہ کو گراں نہ سمجھو وہ تو بہت آسان و سہل

ہے اس لئے اس کے آنے سے گرانی اور جانے سے مسرت نہ ہونی چاہیے۔

فرحت افطار

ہاں ایک طرح اختتام رمضان شرعاً بھی موجب فرح ہے کہ اس خیال سے فرح ہو کر الحمدللہ خدا تعالیٰ نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

شکر للہ کہ نہ مردیم ورسیدیم بدوست آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین ہے)

چنانچہ اکثر علماء نے حدیث **للصائم فرحتان فرحة عند الفطر وفرحة عند لقاء الرحمٰن**[1] کی تفسیر میں یہی فرمایا ہے کہ افطار کے وقت جو فرحت ہوتی ہے وہ اتمام عمل کی وجہ سے ہوتی ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام لے لیا۔ اور روزہ تمام آفات سے منزہ ہو کر پورا ہو گیا۔ اور بعض نے فرحت افطار کا سبب ظاہری بیان کیا ہے کہ افطار کے وقت زوال جوع اور تناول غذا وشراب سے خوشی ہوتی ہے اور یہ اختلاف تفسیر اختلاف مذاق پر مبنی ہے۔ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں۔ کسی کو افطار کے وقت کھانے پینے کی خوشی ہوتی ہے اور کسی کو اتمام عمل کی۔

اختلاف مذاق پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بادشاہ نے ملک کی چار سمتوں کی چار عورتیں اکھٹی کر کے ان کو داخل محل کیا تھا۔ ایک مشرقی تھی، ایک مغربی، ایک جنوبی، ایک شمالی، پھر اس نے سب کی ذہانت ولطافت مزاج کا امتحان کرنا چاہا تو ایک رات صبح کے قریب سب سے پوچھا کہ بتلاؤ اب کیا وقت ہے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ صبح قریب ہے۔ بادشاہ نے ہر ایک سے دلیل پوچھی کہ تم کو محل کے اندر بیٹھے ہوئے کس طرح معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی، ایک نے جواب دیا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جواہرات صبح کی ہوا سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ دوسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی ہوگئی ہے۔ تیسری نے کہا کہ پان کا مزہ منہ میں بدل گیا ہے۔ چوتھی نے کہا کہ پیشاب آرہا ہے صبح ہی کو پیشاب پاخانہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ بات ایک ہی تھی مگر اختلاف مذاق کی وجہ سے ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق کے موافق وجہ بیان کی۔

اسی طرح فرحت صائم کی توجیہات میں اختلاف مذاق سے اختلاف ہو گیا۔ ہم جیسوں

---

[1] سنن النسائي كتاب الصيام باب: ۴۱، مسند أحمد ۲: ۲۵۷، ۳۴۵، كنز العمال: ۲۳۵۹۳

نے فرحت دنیویہ پر محمول کیا اور اکابر نے فرحت دینیہ پر۔

تکمیل صوم

اب ایک تیسرا مقصود اور ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کردوں گا۔ وہ یہ کہ جس طرح صوم سہل ہے ایسے ہی تکمیل صوم بھی سہل ہے اور یہ مضمون بھی جمعہ کو بیان سے رہ گیا تھا اور اس کے بیان کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ ہم تکمیل صوم کی فکر کریں۔ بہت لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ یہ نہایت اہم ہے۔ حدیث میں ہے: **من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس للہ حاجة ان یدع شرابه وطعامه**[1] جو شخص بیہودہ باتیں اور بیہودہ عمل ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہے۔

اس میں تنبیہ ہے کہ روزہ میں ترک اکل وشرب وغیرہ سے زیادہ ترک محرمات کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ اکل وشرب وجماع فی نفسہ تو حرام نہیں بلکہ روزہ کی وجہ سے ایک وقت خاص وحد متعین تک ممنوع ہوگئے ہیں اور قول زور وعمل زور تو فی نفسہ حرام ہے۔ یعنی جھوٹ، غیبت، زنا سود، رشوت وغیرہ جب تم نے محرمات کا ارتکاب کر کے روزہ کو ناقص کردیا تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے بھوکے پیاسے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جھوٹ اور غیبت اور سود ورشوت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نہیں! روزہ تو نہیں ٹوٹتا مگر ان اعمال کے ساتھ جو روزہ ہوتا ہے وہ ایسا روزہ ہے جیسے تم کسی سے کہو کہ فلاں کام کے واسطے ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ وکیل تمہارے سامنے ایک مضغۂ گوشت لاکر رکھ دے جو نہ حرکت کرسکے نہ کام کرسکے اور جب اس سے کہا جائے کہ میاں یہ کس کے لے آئے تو وہ جواب میں کہے کہ آپ نے آدمی کو کہا تھا اور یہ آدمی ہے کیونکہ حیوان ناطق اس پر صادق ہے۔ پس جیسے یہ مضغۂ لحم معقول آدمی تھا مگر کام کا آدمی نہ تھا ایسے ہی آپ کا روزہ محض اصطلاحی روزہ ہوگا مگر کام کا روزہ نہ ہوگا۔

اس حالت میں آپ ایسے روزہ دار ہوں گے جیسے ایک نوجوان مولوی صاحب گاؤں میں گئے تھے اور وہاں جاکر وعظ میں بے نمازیوں کی خوب خبر لی کہ بے نمازی آدمی سور اور کتے سے بھی بدتر ہے۔ اس پر گاؤں کے چوہدری خفا ہوگئے اور لاٹھیاں لے کر رات کو مولوی صاحب کے مارنے کو اکٹھے ہوگئے جس شخص کے یہاں مولوی صاحب کا قیام تھا وہ یہ خبر سن کر گھبرایا ہوا آیا اور کہا

---

[1] سنن أبي داؤد: ۲۳۶۲، سنن الترمذی: ۷۰۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۹۹

مولوی صاحب آپ اپنی جان کی خیر مناؤ۔ گاؤں والے آپ کو مارنے کے واسطے آ گئے۔ کہا، کیوں؟ کہا اس لئے کہ آپ نے ان کو سور اور کتا بنایا تھا کہا بس اتنی بات پر خفا ہیں ان سے تو میں نمٹ لوں گا۔ چنانچہ گاؤں والے جب سامنے آئے تو مولوی صاحب نے پوچھا کہ بھائیو! تم کیوں آئے ہو؟ سب نے کہا ہم تم کو ماریں گے کیونکہ تم نے ہم کو سور اور کتے سے بدتر کہا ہے مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تم کو سوا اور کتے سے بدتر نہیں کہا بلکہ بے نمازیوں کو کہا ہے اور تم تو نمازی ہو۔ بتلاؤ تم نے کبھی آخری جمعہ کی نماز بھی پڑھی ہے؟ کہا ہاں! کئی دفعہ۔ پھر پوچھا اور عید بقرعید کی نماز بھی پڑھی ہے؟ کہا یہ تو ہر سال پڑھتے ہیں۔ کہا پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے تم تو نمازی ہو بے نمازی تو وہ ہے جس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نماز نہ پڑھی ہو۔ یہ سن کر گاؤں والے خوش ہو گئے کہ ہم بھی نمازیوں میں داخل ہو گئے۔

تو جیسے یہ لوگ نمازیوں کی فہرست میں داخل ہو کر خوش ہو گئے ایسے ہی ہم اپنے کو روزہ داروں میں شامل سمجھ کر خوش ہیں۔ گو گاؤں والوں کی یہ خوشی ایک معنی کو صحیح بھی تھی۔ وہ گو پکے نمازیوں کے سامنے بے نمازی تھے مگر پھر بھی غنیمت تھے کیونکہ یہ عید کے نمازی میرٹھ کے اس مسلمان بیرسٹر سے تو اچھے تھے جس سے عید کے دن مسلمان ملنے گئے تو وہ کہتا ہے کہ ویل (Well) آج آپ لوگوں کا عید تھا اس کم بخت کو اس سے بھی عار تھی کہ اسلامی عید کو اپنی طرف منسوب کرے۔ تو وہ گاؤں کے عید کے نمازی اس سے بدرجہا بہتر تھے۔ وہ اسلامی عید کو اپنی عید تو سمجھتے تھے اور سال بھر میں ایک دفعہ تو خدا کے سامنے جھک جاتے تھے۔ گو پنج وقتہ نماز پڑھنے والوں کے اعتبار سے وہ بے نمازی ہی ہیں۔ جیسا کہ پنج وقتہ معمولی نماز پڑھنے والے کامل نماز پڑھنے والوں کے سامنے بے نمازی ہیں جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

پنج وقت آمد نماز اے رہنموں ☆ عاشقاں ہم فی صلوٰۃ دائموں

(نماز تو پانچ وقت آئی ہے مگر عاشق ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں)

اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ آج کل کے جاہل صوفیوں اور ملحدوں نے سمجھا ہے کہ آج پنج وقتہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ یہ تو اہل ظاہر کی نماز ہے عاشقوں کی نماز تو مراقبہ ہے جو ہر وقت ہو سکے۔ یہ مطلب بالکل غلط ہے کیونکہ اس میں نصوص کی تحریف ہے جس سے مولانا بری ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ عام لوگ تو صرف پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور عشاق چونکہ ہر وقت ان پانچ وقتوں کی

نماز کی فکر میں مشغول رہتے ہیں وہ ہر وقت نماز ہی میں ہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔ **من کان ینتظر الصلوۃ فھو الصلوۃ ما کانت تحبسہ**[1] (جو شخص نماز کا انتظار کرتا ہے پس وہ نماز میں ہے جس کیلئے وہ محبوس ہے) **او کما قال** ۔ کہ منتظر صلوٰۃ نماز ہی میں ہے اور عشاق ہر وقت نماز کے انتظار اور فکر میں رہتے ہیں تو وہ ہر حالت میں نماز ہی کے اندر ہیں اور ظاہر ہے جو ایسا ہوگا وہ پانچ وقت کی نماز کا پابند کیوں نہ ہوگا؟ غرض عشاق کی حالت تو یہ ہے جو حدیث میں ہے **جعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ**[2] کہ ان کو نماز ہی میں چین ملتا ہے

اس لئے ان کی طبیعت ہر وقت نماز کی طرف راغب و مائل رہتی ہے اور اس کی فکر لگی رہتی ہے کہ کب وقت آئے اور نماز پڑھیں ۔ تو ان کاملین کے مقابلہ میں تو ہم اور آپ بے نمازی ہیں اور ہمارے آپ کے سامنے عید کے نمازی بے نمازی ہیں مگر وہ اس بیرسٹر کے سامنے نمازی ہیں جو یوں کہتا تھا کہ آپ لوگوں کا آج عید تھا ۔ اس نے ایسی انگریزی پڑھی تھی کہ زبان بھی اردو نہ رہی ۔ افسوس انگریزی تو صحیح بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی تقلید کرنے والے ان کی ریس میں اردو بھی غلط بولنے لگے ۔

کانپور میں ایک خانساماں کو جو ہندوستانی تھا میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا ۔ بھلا ان کم بختوں کو کیا ہوا جن کی اردو زبان مادری زبان ہے جو صحیح بولنے پر پوری طرح قادر ہیں ۔ انگریز تو معذور ہیں کہ ان کی زبان غیر ہے مگر وہی تقلید کا شوق جس سے عقلیں مسخ ہو رہی ہیں ۔

بہر حال تکمیل صوم کی سخت ضرورت ہے ورنہ ہمارا روزہ برائے نام روزہ ہوگا ۔ کام کا روزہ نہ ہوگا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تکمیل صوم بھی بہت سہل ہے کچھ دشوار نہیں ۔

تکمیل کے درجے

مگر اول ایک مقدمہ سمجھ لیجئے ۔ وہ یہ کہ تکمیل کے دو درجے ہیں ۔

ایک تکمیل ضروری ....دوسری تکمیل کامل

تکمیل ضروری وہ ہے جس سے شے نقصان سے نکل جائے اور اس کو ناقص نہ کہہ سکیں ۔

اور تکمیل کامل یہ ہے کہ رفع نقصان کے علاوہ اس میں کچھ حسن وخوبی اور پھول پتیاں بھی لگ جائیں ۔

جیسے ایک تو حسن ہے جو قبح کے مقابل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ناک اور نقشہ اچھا ہو

---

[1] لم أجد الحديث فی " موسوعة أطراف الحديث النبوی الشريف" [2] فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳۴۵، إتحاف السادة المتقين للزبيدی: ۳: ۱۳۱، ۱۳۸، ۵: ۳۱۱، ۷: ۳۳۸، ۹: ۵۵۳، کنز العمال: ۱۸۹۱۲

اور رنگ نکھرا ہوا ہو۔ دوسرے زینت کا درجہ ہے کہ علاوہ حسن کے لباس اور زیور بھی بہت کچھ ہو۔ پس تکمیل ضروری تو حسن کا درجہ ہے اور تکمیل کامل زینت و آرائش کا درجہ ہے۔

اب سمجھئے کہ روزہ کی تکمیل ضروری تو کچھ بھی دشوار نہیں بلکہ بہت ہی آسان ہے کیونکہ وہ بھی عدمی ہے اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ محرمات کو ترک کردو۔ غیبت نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ نگاہ بد نہ کرو۔ رشوت نہ لو۔ سود نہ لو۔ اور یہ سب عدمیات ہیں۔ پس روزہ کی تکمیل ضروری محض سکوت اور نوم سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے نفلیں پڑھنے اور تلاوت قرآن کرنے یا درود و اذکار بجالانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص دن بھر سوتا رہے صرف نماز کے وقت جاگ کر نماز پڑھ لیا کرے تو اس کا روزہ کامل ہوگا ناقص نہ ہوگا۔

فقہاء نے جو کثرت نوم کو روزہ میں مکروہ لکھا ہے وہ اس کے لئے ہے جو روزہ کا وقت کاٹنے کے لئے سوئے اور جو محرمات سے بچنے کے لئے سوئے اس کے واسطے کراہت نہیں۔ نیز وہ کراہت اس کے لئے ہے جس کو جاگنے میں ابتلاء فی المحر مات کا اندیشہ نہ ہو اور جس کو یہ اندیشہ ہو کہ میں جاگنے کی حالت میں لڑائی جھگڑے اور جھوٹ غیبت سے نہ بچ سکوں گا اس کے لئے سونا مکروہ نہیں۔

(گفتم ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ)

تو دیکھا آپ نے کہ تکمیل ضروری کس قدر آسان ہے جو خاموش رہنے اور سوتے رہنے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ تکمیل کامل میں زیادت اعمال کو بھی دخل ہے کہ روزہ میں تلاوت قرآن زیادہ کرو۔ ان اعمال سے روزہ کی تکمیل زیادہ ہوگی مگر مطلق تکمیل اس پر موقوف نہیں۔ پس جس کو تکمیل کامل کی ہمت نہ ہو وہ تکمیل ضروری کو ہاتھ سے نہ دے کہ اس میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا۔ بالخصوص غیبت سے بہت پرہیز کرو کیونکہ عورتوں کو غیبت کا بہت مرض ہے۔ وہ عورت ہی نہیں جو غیبت نہ کرے اور غیبت تو غیر رمضان میں بھی حرام ہے اور رمضان میں تو بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ شرف زمان سے جیسے اعمال صالحہ کا ثواب بڑھتا ہے ایسے ہی گناہوں کا گناہ بھی بڑھ جاتا ہے جیسے شرف مکان کو عمل صالحہ کے ثواب بڑھانے اور عمل بد کے گناہ بڑھانے میں دخل ہے۔

مثلاً کوئی شخص مسجد میں نماز پڑھے تو ثواب زیادہ ہے اور اگر مسجد میں منہ کالا کرے تو گناہ بھی بہ نسبت خارج مسجد کے زیادہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

پھر غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں۔ پھر اگر

اس کو خبر ہو گئی اور اس سے دشمنی پڑ گئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور اگر ذرا اول میں حس ہو تو غیبت کرنے کے ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔ اس لئے میں مستورات سے کہتا ہوں کہ تم خاص طور پر اس سے بچنے کا اہتمام کرو۔ کیونکہ تمہارے یہاں اس کا بازار بہت گرم ہے عورتوں کو روزہ کا شوق تو بہت ہے مگر جتنا شوق ہے اتنا ہی ان کا روزہ ناقص ہوتا ہے اور وہ صرف اس منحوس غیبت کی وجہ سے کیونکہ اور گناہ رشوت اور ظلم اور سود وغیرہ سے یہ محفوظ ہیں۔ تو بھائی خدا کے لئے روزہ میں اپنی زبان کو روک لو۔

اب تو ایک دن یا ڈیڑھ ہی دن رمضان کا رہ گیا ہے۔ جتنا حصہ باقی ہے اس میں تو اپنی بخشش کرا لو۔ اور بخشش کرانے کا طریقہ یہی ہے کہ گزشتہ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور آج سے اپنی زبان کو گناہوں سے روک لو اس سے تو بخشش ہو جائے گی اور روزہ کامل ہو جائے گا اور جس قدر ہو سکے اعمال صالحہ میں زیادتی کر لو اس سے تکمیل ہو جائے گی۔

شب قدر کی عبادت

میں اس حدیث کا اس وقت پھر اعادہ کرتا ہوں جو جمعہ کے بیان میں پڑھی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **رغم انف رجل ادرک رمضان فانسلخ قبل ان یغفرلہ**[1] کہ اس شخص کی ناک رگڑ جائے مٹی میں مل جائے یعنی وہ ذلیل ہو جائے جس نے رمضان کو پا لیا اور وہ اس کی اپنی مغفرت سے پہلے ختم ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کس قدر سخت ہے آپ کی دعا یا بددعا کے قبول ہونے میں کیا شک ہے (اور اس پر جو شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بددعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے اس کا جواب جمعہ کے وعظ میں دیا جا چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ حکم اس بددعا کا ہے جو از راہ بشریت ہو اور جو بددعا تشریعی طور پر اس کا یہ حکم نہیں)۔

صاحبو۔ ہم نے یہ رمضان پا لیا ہے جو اس وقت قریب ختم ہے اگر ہم نے اس میں اپنی مغفرت نہ کرائی تو ہم اس وعید میں داخل ہو جائیں گے پس اہتمام کے ساتھ اپنی مغفرت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیا ڈیڑھ دن بھی گناہوں سے رکنا کچھ مشکل ہے اور شاید آدھا ہی دن ہو۔ اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ رحمت و برکت کا وقت ہے۔ کیا خبر پھر کس کو رمضان نصیب ہوتا ہے کس

[1] سنن الترمذی: ۳۵۴۵، مسند أحمد ۲: ۲۵۴

کونہیں۔ ابھی کچھ حصہ رمضان کا باقی ہے جس کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں فضل کا ثواب فرض کے برابر ہے اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے اور لیلۃ القدر کی عبادت کا ثواب تو اسی سال کی عبادت سے بھی زیادہ ہے۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ☆ کہ بیک گل می خری گلزار را
نیم جاں بستاند وصد جاں دہد ☆ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(تمہیں ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلے میں چمن ہی خرید لے۔ حقیر و فانی جان لیتے ہیں باقی جان دیتے ہیں جو تمہارے وہم گمان میں نہیں آ سکتا وہ دیتے ہیں)

واقعی ہم اس قابل کہاں جو یہ نعمتیں حاصل کر سکیں۔ جو کچھ ہے محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جو لوگ شب قدر کو پا چکے ہیں ان کے لئے بشارت ہے اور جو محروم رہے وہ آئندہ اس مضمون کو یاد رکھیں اور اگر خدا تعالیٰ پھر رمضان تک پہنچا دیں تو اس میں شب قدر کی عبادت کا اہتمام کریں۔

یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کسی کو یہ وسوسہ ہوتا کہ اب تو شب قدر کا وقت گزر چکا ہے اب اس مضمون کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی تو میں نے بتلا دیا کہ اس لئے بیان کر دیا تا کہ آئندہ کے لئے اس کو یاد رکھا جائے اور صاحب اگر مسلمان خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کرے تو اس کے لئے وہی رات لیلۃ القدر ہے جس میں اس کا تعلق خدا تعالیٰ سے درست ہو جائے اس کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ☆ ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے خواجہ تو شب قدر کی نشانی کیا پوچھتا ہے اگر تو قدر سمجھتا ہے تو ہر رات لیلۃ القدر ہے)

جو شخص شب قدر میں مردود تھا مگر آج کی رات مقبول ہو گیا تو اس کے لئے یہی رات لیلۃ القدر ہے بس اس سے بھی بہتر ہے۔ پس اگر شب قدر گزر گئی تو اس کا غم نہ کرو۔ خدا تعالیٰ سے علاقہ جوڑنے کی فکر کرو۔ جب ان سے علاقہ جوڑ لو گے تو وہ تمہارے واسطے رمضان کی اخیر رات کو بھی شب قدر کر سکتے ہیں۔

ایک فضیلت رمضان کی یہ ہے کہ اور اعمال کا ثواب محدود ہے کہ دس گنے سے سات سو گنے تک ملتا ہے اور روزہ کا ثواب غیر محدود ہے کہ اس کے ثواب کی کوئی حد ہی نہیں۔ میں نے اس مضمون کو ایک وعظ میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ روزہ کا ثواب غیر متناہی بمعنی لا یقف

عندحد ہے ۔ وہ اس بارے میں بہت ہی اچھا وعظ ہے ۔خدا کرے جلد شائع ہو جائے ۔تو ان فضیلتوں کو سن کر جو حصہ تھوڑا سا رمضان کا باقی ہے اس کی قدر کرنا چاہیے اور جو کچھ ہو سکے اس میں کر لینا چاہیئے ۔ جو فوت ہو گیا وہ تو قبضہ کے باہر ہے مگر جو باقی ہے اس کو تو فوت نہ کیا جائے ۔

پس اب قصد کر لو کہ آج کا دن طاعت ہی میں گزاریں گے اور زبان کو گناہوں سے بچائیں گے ۔ اسی وقت سے کام میں لگ جاؤ ۔قرآن پڑھو اور نفلیں پڑھو اور خدا کو یاد کرو، توبہ واستغفار کرو اور اپنی کوتاہی پر رنج وافسوس کرو ان شاء اللہ اس طرح تم اس رمضان کی برکات سے محروم نہ رہو گے اور اس وعید میں داخل نہ ہو گے جو حدیث میں مذکور ہے ۔بس یہی میرا مقصود تھا کہ ڈیڑھ دن یا ایک دن تو شریعت کے موافق اپنی حالت بنالو اور اس میں تو خدا تعالیٰ کو راضی کرلو۔ سو بحمد اللہ مختصر طور پر یہ مقصد پوری طرح بیان ہو گیا۔

اب دعا کرو اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل عطا فرمائیں اور رمضان کی برکات ہم کو نصیب فرمائیں ۔جن میں سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائیں اور ہماری مغفرت فرمائیں ۔آمین ثم آمین.

وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ

واصحابہ اجمعین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

رمضان فی رمضان

یہ وعظ ۲۴ شعبان ۱۳۳۸ھ بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا۔ جسے خواجہ عزیز الحسنؒ مجذوب صاحب نے قلمبند فرمایا۔

نوٹ: پیشتر حضرت والا نے جمعہ کے دوسرے خطبہ کے ختم کے قریب رمضان المبارک کے متعلق ایک مختصر سی تقریر فرمائی جو ذیل میں نقل کی جاتی ہے اس کے بعد نماز سے فارغ ہو کر مستقل وعظ فرمایا وہ مختصر تقریر اور مفصل وعظ بالترتیب نقل کئے جاتے ہیں۔

تقریر قبل وعظ

روزہ کے حقوق

صاحبو! ہم لوگوں کوخوش ہونا چاہیے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے۔سب جانتے ہیں کہ روزہ کتنی بڑی عبادت ہے اور یہ مہینہ کس قدر بابرکت ہے۔ہمیں چاہئے کہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کا بہت اہتمام رکھیں اور ہمیشہ اس کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ رمضان المبارک کے ختم تک اس کا خاص طور سے خیال رکھیں کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہونے پائے۔ بالخصوص،غیبت، بری نگاہ، حرام روزی بالکل ہی چھوڑ دیں گو یہ گناہ ہمیشہ ہی برے ہیں اور ان کو ہمیشہ ہی کے لئے چھوڑ دینا چاہیے،مگر رمضان میں بالخصوص ان سے اور زیادہ بچنا چاہیے۔

ایک عبادت رمضان المبارک کی تراویح ہے۔اس میں پریشان نہ ہوں کہ صاحب گرمی میں کھڑا نہیں رہا جاتا۔ابھی تو بفضلہٖ راتوں کو ٹھنڈ رہتی ہے اور اگر کچھ مشقت بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ رمضان المبارک کی خاص عبادت ہے۔آخر دنیا کے واسطے بھی تو کتنی کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک گھنٹہ کا کام ہے پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سلام پھیرتے رہتے ہیں اور ہر چار رکعت کے بعد آرام کے لئے وقفہ ملتا رہتا ہے۔اس میں پنکھا کرلیا کریں۔لیکن امام کے ساتھ فوراً نماز میں شامل ہو جانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جب امام رکوع میں جانے لگا تب شریک ہوئے۔ غرض اس مبارک مہینہ میں نہایت خوشی کے ساتھ اور نہایت رغبت اور شوق کے ساتھ عبادت کرنی چاہیئے اور جتنے گناہ سب کو چھوڑ دینا چاہیے یہ اجمالاً حقوق ہیں رمضان المبارک کے۔

باقی اس سے قبل کا حق یہ ہے کہ چاند کی تحقیق کی جائے۔سو اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبان کی پہلی بدھ کی روز تھی۔تو بدھ بدھ ۲۹،لہٰذا بدھ کے روز چاند کی تلاش چاہیے۔ بدھ کے دن چاند کو دیکھیں۔اگر نظر آجائے تو دوسرے دن سے روزے رکھیں۔اور تراویح

اسی دن سے شروع کر دیں۔ ورنہ ۳۰ دن پورے کر کے شروع کریں یہ ہے حکم چاند کے متعلق۔
لیکن جو کوئی چاند دیکھے وہ مدرسہ میں اطلاع کر دے کیونکہ بہت سے مسائل ایسے باریک ہیں جن کو اہل علم ہی جانتے ہیں۔ لہٰذا خود اپنی تحقیق پر عمل نہیں چاہیئے۔ کسی عالم کے فتویٰ کے موافق عمل کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شعبان کی پہلی منگل کو تھی تو پھر چاند منگل کی شام کو بھی دیکھنا چاہیے۔ بہرحال یہ چاند کے احکام ہیں اور وہ جو میں بیان کر چکا ہوں اجمالاً روزہ کے حقوق تھے۔

میں نے اس واسطے اتنے جملے اس وقت کہہ دیئے ہیں کہ بعد نماز کے شاید بعض بیچارے چلے جائیں۔ ورنہ اگر بعد نماز کے بھی ٹھہرنا ہو تو بیان کا بھی ارادہ ہے۔ جس کا جی چاہے سننے کے لئے ٹھہر جائے اور جو اس وقت حاضر نہیں ہیں ان کو بھی یہ احکام پہنچا دیں۔ خصوص عورتوں کو غیبت سے بچنے کی اور نماز کی پابندی کی ذرا زیادہ تاکید کر دیں۔ یہ غیبتیں بہت کرتی ہیں اور اپنے روزوں کو تباہ کرتی ہیں۔ اور اکثر نماز کی بھی پابندی کم ہوتی ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھا دیں کیونکہ مردوں کے ذمے ان کا حق ہے۔ سمجھا بھی دیں اور جب خلاف کریں ٹوک بھی دیں کہ دیکھو تم نے کیا کہا تھا اور اب تم کیا کر رہی ہو۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. شَهْرُ رَمَضَانَ الخ

تمہید: یہ سب کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آ پہنچا ہے۔ لہٰذا مناسب بلکہ واجب ہے کہ رمضان المبارک کے متعلق کچھ ضروری مضامین بیان کر دیئے جائیں اور وہ مضامین مختلف ہیں۔ ایک قسم تو ان مضامین کی ہے فضائل رمضان کے۔ ایک قسم ہے آداب رمضان المبارک کے۔ ایک قسم ہے حقوق رمضان المبارک کے۔

حقوق اور آداب میں میں نے اپنی اصطلاح کے موافق یہ فرق رکھا ہے کہ حقوق تو وہ ہیں جو واجب ہوں اور آداب وہ ہیں جو غیر واجب ہوں لیکن میں آسانی تعبیر کے واسطے ایک قسم کا نام آداب رکھتا ہوں اور ایک کا حقوق۔ غرض یہ کہ رمضان المبارک کے متعلق مضامین مختلف ہیں۔

اب دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ کون سا مضمون زیادہ ضروری ہے اس کو مقدم رکھا جائے اور اگر وقت رہے تو دوسرے مضامین کے متعلق بھی بیان کر دیا جائے ورنہ ضروری امر تو فوت نہ ہو۔ تو ان تینوں قسموں کی شان اور درجہ میں غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ضروری کون سی قسم ہے یعنی یہ ظاہر ہے کہ جو حقوق واجب ہیں وہ سب سے زیادہ ضروری اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کے متعلق جو مضمون ہوگا وہی سب سے زیادہ ضروری ہوگا کیونکہ حقوق کے فوت

ہونے سے مضرت ہے اور آداب کے فوت ہونے سے مضرت نہیں گو منفعت میں کمی واقع ہوجائے اور تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مضرت کا دفع کرنا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت منفعت کے حاصل کرنے کے۔ تو حقوق کا آداب سے زیادہ ضروری ہونا اور زیادہ اہم ہونا اس طرح ثابت ہوا۔

رہا فضائل کا درجہ۔ سو وہ دراصل ترغیب کے لئے موضوع ہیں۔ تو یہ شعبہ عمل کے باب میں سے ہے نہ کہ عمل کے اور حقیقت میں مقصود علم سے بھی عمل ہی ہے۔ عمل ہی کی اعانت کے واسطے فضائل کا علم ظاہر کیا جاتا ہے تا کہ عمل کی رغبت پیدا ہو۔ کیونکہ طبعیتیں ضعیف ہیں محض امر اور نہی عمل کے لئے محرک نہ ہوتے۔ ان کی تاثیر میں قوت پیدا کرنے کے لئے شارع نے طریقہ اعانت کا یہ رکھا کہ ترغیب اور ترہیب سے بھی کام لیا۔ یعنی رغبت دلا کر اوامر پر ابھارا اور خوف دلا کر نواہی سے روکا۔ تو حقیقۃً فضائل ترغیب کے لئے بیان کئے جاتے ہیں جن کا تعلق علم سے ہے اور اس عمل سے بھی مقصود عمل ہے پھر عمل میں بھی دو درجے ہیں ایک درجہ کا تعلق تو آداب سے ہے اور ایک درجہ کا تعلق حقوق سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں مقصود حقوق کا اہتمام ہے۔

ماہ رمضان کا اہتمام

تینوں قسموں میں اہم اور اقدم یہی ہوا یعنی حقوق کا اہتمام۔ لہٰذا میں اس وقت اسی مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ حقوق فی نفسہٖ بھی اہم ہیں۔ علاوہ اس کے ہم لوگ زیادہ کوتاہی ان ہی کے متعلق کرتے ہیں یعنی رمضان المبارک کے حقوق کی ہم کو پروا اور اہتمام نہیں۔

اس کے فضائل کا تو کم وبیش علم ہے بھی۔ تفصیلاً نہیں تو اجمالاً تو ضرور ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رمضان المبارک بہت فضائل کا مہینہ ہے، بہت اجر کا مہینہ ہے، بہت عبادت کا مہینہ ہے، بہت برکت کا مہینہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔ غرض بقدر ضرورت فضائل رمضان المبارک کا تو علم ہے بھی۔

رہے آداب، سو اول تو یہ اس درجہ کا ضروری مضمون نہیں جس درجہ کا حقوق کے متعلق مضمون ہے مگر خیر جس درجہ میں بھی مطلوب ہے اس پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی کسی قدر اہتمام ہے یا یوں کہئے کہ اگر اہتمام نہیں تو علم تو ضرور ہے جہاں فضائل کا علم ہے آداب کا بھی کسی قدر علم ہے کیونکہ جب رمضان کے متبرک ہونے کا علم ہے اور متبرک چیز کے لئے ادب کا لحاظ عادۃً لازم ہے تو جب برکت کا اعتقاد ہوا تو ادب کی بھی ضرورت قلب میں پیدا ہوگئی۔ غرض اس کا بھی کسی درجہ میں اہتمام اور علم ہے گو وہ اجمال کے درجہ میں ہے لیکن بقدر ضرورت اس کے ساتھ بھی علم متعلق ہے۔

باقی رہے حقوق سوان کے متعلق نہایت درجہ کا اخلال واقع ہو رہا ہے علماً بھی اور عملاً بھی۔ یعنی اس طرف کبھی ذہن بھی نہیں جاتا کہ رمضان المبارک کے کچھ حقوق بھی ہیں۔ اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رمضان آنے سے لوگ زوائد کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً دودھ کا بندوبست کرلیا جاتا ہے۔ صفائی کرالی جاتی ہے۔ کچھ برف کا انتظام سوچ لیا جاتا ہے۔ شکر، کھجوریں، تخم بالنگو وغیرہ جمع کرلیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ گھر میں لکڑی بھی ہے، غسل وسل کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تو اہتمام ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ بھائی رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے، لاؤ غیبت سے بچنے کا کوئی انتظام کریں۔ یہ کہیں نہیں ہوتا کہ باہم مشورہ کر کے چند احباب نے یہ طے کرلیا ہو کہ اگر کوئی غیبت کرنے لگا تو ایک دوسرے کو روک دیا کرے۔ ٹوک دیا کرے اکثر دنیا کے کاموں میں تو ایک دوسرے سے اعانت کی جاتی ہے۔ دین کا کام ایسا آسان سمجھ رکھا ہے کہ اس میں کسی کی اعانت کی حاجت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس کے لئے کبھی ذہن میں آتا ہی نہیں کہ آپس میں التزام کرلیں۔

کانپور میں ہم نے دیکھا کہ بعض محبین نے یہ التزام کرلیا تھا کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو ایک دودن پہلے ایک دوسرے سے درخواست کرتے تھے اور آپس میں مشاورت کرلیتے تھے کہ جس کے منہ سے غیبت نکلے دوسرا فوراً روک دے کہ روزہ ہے۔ روزہ میں غیبت مت کرو لیکن ایسا التزام بہت ہی شاذ ونادر ہے۔ بس یہ دیکھ لیجئے کہ میں نے ساری عمر میں اس قسم کا یہ ایک ہی جلسہ دیکھا ہے بہرحال ان لوگوں کو توجہ تو تھی۔

اسی طرح اس کا ذہن میں بھی کبھی خیال نہیں آتا کہ بھائی قرآن مجید سننے کا زمانہ آرہا ہے کوئی ایسا حافظ تلاش کرو جو اچھا اور صحیح پڑھتا ہو۔ بھائی اس کے پیچھے تراویح پڑھنی چاہیں۔ جو تجوید کے ساتھ قرآن مجید پڑھتا ہو۔ کلام مجید جس کو رمضان المبارک کے مہینہ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ کیونکہ وہ نازل ہی اس ماہ مبارک میں ہوا ہے کبھی اس کے سننے میں بھی آپ کو اہتمام کی فکر ہوئی ہے بلکہ اہتمام تو ایسے سامان کا کیا جاتا ہے جس میں اور سستی بڑھے۔ اور اگر کوئی تجوید کے ساتھ پڑھنے والا حافظ تجویز کیا جاتا ہے تو مخالفت کی جاتی ہے کہ تراویح میں دیر لگے گی۔ کھڑا نہیں رہا جائے گا۔

غرض رمضان المبارک کے لئے پہلے سے اور تو سب اہتمامات اور انتظامات کئے جاتے ہیں کہ سحری میں یہ ہو۔ افطاری میں یہ ہو لیکن ہم نے کہیں نہیں دیکھا کہ اپنے نفس کا آمادہ کیا ہو کسی نے کہ میں مطلق غیبت نہ کروں گا یا گناہوں کے ترک کا عزم کیا ہو کہ میں بالکل گناہ نہ کروں گا۔ تو گویا رمضان

المبارک کے حقوق کے باب میں بہت ہی زیادہ کوتاہی اور بہت ہی بے پروائی ہے عملاً بھی کوتاہی ہے اور علماً بھی کوتاہی ہے اہتمام بھی حقوق کا کم ہے اوران کا علم بھی کم ہے اس واسطے یہ مضمون ضروری ہوا۔

معصیت کے آثار

تو میں اس وقت رمضان المبارک کے حقوق کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے اس میں ہر چند مضمون فضائل رمضان کا ہے لیکن میں اسی آیت سے حقوق رمضان کو مستنبط کرنا چاہتا ہوں۔بعض مقدمات کی تمہید کے بعد ایک مقدمہ تو اجمالاً میری تقریر سے معلوم ہوا ہوگا۔کہ رمضان المبارک کے چند حقوق ہیں۔ان کا خلاصہ کیا ہے؟ یہ ہے کہ جملہ معاصی کو ترک کرنا چاہئے خواہ وہ معاصی یوم کے متعلق ہوں یا لیل کے متعلق ہوں۔عبادت کے متعلق ہوں یا عبادت کے متعلق ہوں یا معاملات کے متعلق ہوں۔یہ گویا خلاصہ ہے حقوق رمضان کا کہ کل معاصی کو ترک کردے۔اس میں وہ امور بھی آگئے جن سے روزہ میں خلل آجاتا ہے یا تراویح میں خلل آجاتا ہے۔غرض سب معاصی سے احترازلازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے جو خلاصہ ہے حقوق رمضان کا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے اثر کے اعتبار سے بھی ایک قسم کی ظلمت اور تاریکی ہے حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔یعنی معصیت کے ان آثار سے جو بیان کئے ہیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

ان آثار کا حاصل یہ ہے کہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ دھبہ اس کے قلب کے اوپر پیدا ہوجاتا ہے اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ اس دھبہ کو صاف کردیتا ہے۔اور اگر توبہ نہیں کرتا اور پھر عود کرتا ہے اس گناہ کی طرف اور اس پر اصرار کرتا ہے تو وہ دھبہ پھیلتا ہے۔پھر پھیلتے پھیلتے وہ بہت بڑا ہوجاتا ہے۔یہاں تک کہ محیط ہوجاتا ہے سارے قلب کو۔پھر استشہاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون.

(ہرگز ایسا نہیں بلکہ انکے دلوں پر انکے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے)

اس کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے۔

ہر گناہ زنگے ست بر مرأت دل ☆ دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی ☆ نفس دوں را بیش گر دو خیرگی

(ہر گناہ شیشہ کے مانند صاف دل پر ایک داغ ہے اوراس داغ سے دل ذلیل وخوار ہوتا ہے جب دل پر سیاہی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو کمینہ نفس میں بے حیائی اور ظلمت میں اضافہ ہوجاتا ہے)

اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی اپنے قلب کی طرف رجوع کرے تو فقط یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اس لئے بے شک سچ ہے بلکہ خود بھی مشاہدہ کر لیجئے اول تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے بعد ہم کو مشاہدہ کا انتظار نہیں چاہئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خبر دے دینا ہمارے لئے مشاہدہ سے بھی بڑھ کر ہے لیکن تائید کے واسطے عرض کرتا ہوں کہ اگر ذرا بھی وسوسہ ہو تو خود مشاہدہ کر لیجئے اور اپنے قلب کی طرف رجوع کر کے اور اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ گناہ صادر ہو جانے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔

ممکن ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو رات دن گناہ کرتے ہیں ہمیں تو اپنے قلب میں کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے کسی سرحدی دیہاتی نے ایک وعظ میں یہ سن کر بغیر وضو کے نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہا تھا۔ بارہا کہ کردیم وشد۔ ہم نے تو بہت دفعہ بے وضو پڑھی اور ہوگئی۔ تو وہ جاہل حقیقت ہی نہ سمجھا تھا نماز کے ہونے کی۔ بس منہ میں جو آیا بک دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ ہم تو ہمیشہ گناہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ بھی ظلمت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا قلب تو اچھا خاصا تروتازہ رہتا ہے ویسا ہی خوش بہ خوش جیسے گناہ کرنے سے پہلے تھا ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔

تو میں اس کی تکذیب تو نہیں کرتا لیکن یہ کہوں گا کہ وہ جھوٹ تو نہیں بولتا مگر دھوکا میں ضرور ہے کہ بے چارے غریب نے ظلمت کے مقابل جو چیز ہے یعنی نور اس کا کبھی مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ اسے کبھی احساس ہی نور کا نہیں ہوا۔

معرفت کا مدار

یہ مسلم مسئلہ عقلیہ ہے کہ **الاشیاء تعرف باضدادھا** کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے جس نے کبھی نور نہ دیکھا ہو وہ بے چارا کیا سمجھے کہ ظلمت کیا چیز ہوتی ہے جیسے کسی نے تنگ کوٹھڑی میں پرورش پائی ہو تو اس کیلئے کوٹھڑی کے اندر تنگی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسے خبر ہی نہیں کہ میدان فراخ کس کو کہتے ہیں اور فراخی کیسی ہوتی ہے۔

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں ست ☆ زمین وآسمان وے ہماں ست

(جو کیڑا پتھر میں پوسیدہ ہے اس کیلئے زمین وآسمان وہی ہے)

لیکن جس شخص نے میدان دیکھا ہوگا اگر اس کو کوٹھڑی میں قید کردیا جائے تو اس کی وحشت کا کچھ ٹھکانہ اور اس کی تنگی کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ اسی طرح جس نے انوار کا مشاہدہ کیا ہو اگر اس کو ظلمات میں لاکر ڈال دیں تو اسے ظلمت سے کیا وحشت ہوسکتی ہے جس نے عمر بھر ظلمت میں پرورش پائی ہو وہ کیا جانے کہ نور کیسا ہوتا ہے اور انوار کس کو کہتے ہیں جیسے مٹی کا کیڑا کہ چونکہ اس کو خوشبو کی خبر نہیں اس لئے بدبو کی بھی خبر نہیں اس لئے وہ خوشبو بدبو کا نام سن کر سوچتا ہے کہ خوشبو کیا چیز ہوتی ہے۔ پھول میں کیا بات ہوتی ہے جو سب لوگ اس کی تمنا کرتے ہیں اگر اس کے سامنے پھول لائے جائیں تو وہ تو یہی کہہ دے کہ ان میں کیا رکھا ہے ہم تو انہیں نہیں چاہتے۔ لوگ کہتے ہیں خوشبو خوشبو۔ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خوشبو بھی کوئی چیز دنیا میں ہے اور کہتے ہیں کہ پاخانہ میں بدبو ہوتی ہے۔ صاحب ہم تو عمر بھر سے اسی میں رہتے ہیں ہمیں تو کبھی نہیں محسوس ہوئی۔

جس نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہو وہ سایہ کی حقیقت ہی نہیں جان سکتا۔ اس واسطے کہ سایہ مقابل ہے دھوپ کے۔ لہٰذا سایہ کی معرفت دھوپ سے ہوسکتی ہے اور دھوپ کی معرفت سایہ سے ہوسکتی ہے ایک کی معرفت کا مدار دوسرے کی معرفت پر ہے دونوں لازم ملزوم ہیں۔

حضرت یہاں تک اس قاعدہ کا اثر ہے کہ بعض اہل اللہ نے جن پر غلبہ ذکر کا تھا قسم کھا کر مدتوں بعد کسی غافل کے واقعہ کو دیکھ کر کہا کہ واللہ! ہم یہ نہ جانتے تھے کہ دنیا میں کوئی غافل بھی ہے یہ گمان تھا کہ دنیا میں جتنے لوگ ہیں سب ذاکر ہیں۔ تو بات یہی ہے کہ چونکہ وہ ابتداء ہی سے ولی مادرزاد تھے ذکر ان کے لئے امر فطری ہوگیا تھا۔

جیسے حدیث میں اہل جنت کی صفت یہ آئی ہے **یلھمون التسبیح کمایلھمون النفس**[1] تسبیح کا انہیں الہام ہوگا جیسے سانس بلا اختیار آتا ہے اسی طرح سبحان اللہ سبحان اللہ! یا اللہ یا اللہ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کرے گا۔ کسی وقت غفلت طاری نہ ہوگی۔ بعض اولیاء کی شان دنیا میں بھی ایسی ہی رہی ہے کہ ان پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ذاکر ہی رہے اور چونکہ خود ہر وقت ذکر میں مشغول رہے انہیں اہل دنیا کی غفلت کا احساس ہی نہیں ہوا اور خبر بھی نہیں ہوئی کہ دنیا میں اہل غفلت بھی موجود ہیں۔ جب کسی کو معصیت میں مبتلا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت متنبہ ہوئے اور حیرت سے

---

[1] الصحیح لمسلم، الجنة:۱۸، ۱۹، ۱۰، مسند أحمد ۳:۳۵۴

پوچھا کہ اللہ اکبر! کیا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوا کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوں۔

نورطاعت

غرض جب اہل نور نے اہل ظلمت کو نہ پہچانا تو اگر اہل ظلمت اہل نور کو نہ پہچانیں تو تعجب کیا۔ تو بہرحال معصیت کا ظلمت ہونا محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے کبھی طاعت کے نور کو نہیں دیکھا۔ اگر نور طاعت کو کبھی دیکھ لیتا تب معلوم ہوتا کہ معصیت میں کیسی ظلمت ہوتی ہے اگر یقین نہیں آتا تو اس کو امتحان کر کے دیکھ لو۔ امتحان ہی کے طریقہ سے تھوڑے دنوں طاعت کر کے دیکھو زیادہ نہیں دو چار ہی دن سہی یا ایک ہی رات سہی مولانا فرماتے ہیں۔

خواب را بگذا را مشب اے پسر ☆ یک شبے درکوئے بے خواباں گذار

(اے لڑکے ایک رات سونے کو ترک کردے اور کسی اللہ والے کے پاس ایک رات گزار لے اور ان بے خوابوں کی گلی کا لطف دیکھ)

ایک دن تو ایسا کرو کہ رات کو سونا چھوڑ دو اور جاگنے والوں کے محلّہ کو گزر جاؤ۔ تب تمہیں معلوم ہو کہ جاگنا کتنی بڑی دولت ہے جس کے سامنے سونے کی کوئی حقیقت نہیں اب تک تو تم نے یہی دیکھا کہ سونا کیا ہے۔ ایک دن جاگنا بھی تو دیکھ آؤ کیا ہے۔ تب معلوم ہو کہ ہم کتنے بڑے خسارہ میں ہیں اور کس قدر ٹوٹے میں ہیں۔ غرض ۔

یک شبے درکوئے بے خواباں گزار (اور ایک رات ان بے خوابوں کی گلی کا لطف دیکھ)

صرف ایک شب جاکر بے خوابوں کو دیکھ لو۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ جاکر ان کے ساتھ عبادت کرلو۔ نہیں بلکہ صرف ان کی حالت ہی دیکھ لو۔ ان کے پاس کو ہی ہو کر گزر جاؤ۔ ان کے انوار تم پر منعکس ہونگے۔ اس وقت منکشف ہوگا کہ ہم سراسر خواب میں ہیں سراسر غفلت میں ہیں۔ سراپا ظلمت میں ہیں۔ بہرحال امتحان یہ ہے کہ تھوڑے دنوں طاعت اختیار کر کے دیکھ لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ طاعت میں کیسا نور ہے اور کیا کیفیت ہے اور اس کیفیت کو ذہن میں محفوظ رکھ کر پھر اس حالت کے اثر کو ذہن میں مستحضر کرو۔ جو حالت غلبہ ہے ہماری یعنی معاصی۔ اس کے بعد جو کیفیت طاعت کی ذہن میں محفوظ ہے اس سے اس حالت غالبہ کے اثر کو موازنہ کرو اس وقت معلوم ہوگا هل تستوی الظلمت والنور، کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ وہ نور تھا یہ ظلمت ہے وہ اور چیز تھی یہ اور چیز ہے۔ تو عبادت اگر خلوص سے بھی نہ بھی نہ کرو محض

امتحان ہی کے لئے کرو جب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تفاوت محسوس ہونے لگے۔ اور اگر خلوص سے کہیں نصیب ہوگئی عبادت تب تو کچھ انتہا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں امتحان ہی کے لئے کچھ دن عبادت کرلو۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اکابر کا ارشاد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان کی نیت سے بھی عبادت کرلینا کافی نہیں حقیقت پر پہنچنے سے ایک درجہ میں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ۔

سالہا توسنگ بودی دل خراش ☆ آزموں رایک زمانے خاک باش

(برسوں تو تم دلخراش پتھر (متکبر) بنے رہے، آزمائش اور امتحان کی نظر سے کچھ دن خاک بن کر دیکھ لو) یوں نہیں فرمایا۔

ازخلوصے یک زمانے خاک باش (خلوص سے ایک زمانہ خاک بن جاؤ (تواضع اختیار کرو)

بلکہ یوں فرمایا ہے ۔

آزموں رایک زمانے خاک باش (ایک زمانہ بطور آزمائش کے خاک بن کر دیکھ لو)

یعنی خلوص سے توفیق طاعت نہیں تو امتحان ہی کے لیے کچھ روز خاک بن کر دیکھ لو پتھر تو بہت دنوں بن کر دیکھا۔ لیکن کیا دیکھا۔ کچھ بھی نہیں اب کچھ روز خاک بن کر بھی دیکھو تب تفاوت معلوم ہوگا کیا معلوم ہوگا؟ یہ معلوم ہوگا ۔

دربہاراں کے شود سرسبز سنگ ☆ خاک شو تاگل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہوجاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اگیں گے)

تفاوت یہ معلوم ہوگا کہ مدتوں پتھر رہے تھے لیکن کبھی ایک پھول بھی نہ کھلا لاکھوں بارشیں ہوتی رہیں خاک بن دیکھا تو بس ایک بارش ہی کافی ہوگئی طرح طرح کے پھول کھل گئے۔ تمام میدان معطر و معنبر ہوگیا تو مولاناؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ ۔

آزموں رایک زمانے خاک باش (بطور آزمائش کچھ عرصہ کے لئے خاک بن جاؤ)

امتحان ہی کے لئے کچھ روز خاک بن کر دیکھو۔ تو معلوم کیا آپ نے تفاوت معلوم کرنے کا طریقہ؟

صحبت کا اثر

اس طرح سے اگر امتحان کیا جائے گا تو ظلمت اور نور میں تفاوت معلوم ہوجائے گا۔ اور اس وقت معلوم ہوگا کہ واقعی معصیت سخت ظلمت ہے۔ چنانچہ جن کو نور نصیب ہوگیا ہے ان کا خود مشاہدہ ہے کہ جن گناہوں سے پہلے مدتوں تک پریشانی تو کیا ہوتی حظ حاصل ہوتا رہا اور جن گناہوں

میں مدتوں مشغول رہنے سے بھی حس نہیں ہوتا تھا۔ پریشانی کا آج عزم تو کیا ان کا حدیث النفس بھی ہونے لگتا ہے تو بے انتہا پریشان ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہو جاتی ہے جس کو مولاناؒ فرماتے ہیں ۔

بردل سالک ہزاراں غم بود ☆ گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج وغم صادر ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی ہوتی ہے)

ایک تنکا بھی اگر باغ دل میں کم ہو جاتا ہے تو بس پوچھو مت کیا حالت ہوتی ہے لیکن یہ پریشانی اسی کو محسوس ہوتی ہے جو سالک ہو چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس کی عصر کی نماز جاتی رہی **فکا نما وتر ماله و اهله** ، وہ لٹ گیا اس کا سارا مال و دولت چھن گیا تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوروں کو تو علم الیقین کے ذریعہ سے صادق معلوم ہوتا ہے لیکن اہل اللہ اس ارشاد کو عین الیقین کے ذریعہ سے سچ جانتے ہیں اور اہل اللہ کی تو بڑی شان ہے۔ ہم لوگوں کو جن کو نہ کچھ علم ہے نہ ادراک ہے البتہ **فهو منهم** میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی کی برکت سے ان حضرات کا ایک چھینٹا ہم پر بھی پڑ گیا ہے اور ایک حالت تمیز کی پیدا ہو گئی ہے۔

اس وقت ایک نظیر یاد آ گئی۔ حدیث شریف میں عشاء کے بعد بات چیت کرنے کی ممانعت اور کراہت آئی ہے۔ اس کا اعتقاد تو تھا طالب علمی کے زمانہ میں لیکن ذوقاً اس کا درجہ مضرت نہیں معلوم تھا اس وقت سے اس فعل سے وحشت عقلی تھی طبعی نہ تھی۔ اور اب یہ کیفیت ہے الحمد للہ کہ عشاء کے بعد اگر کوئی سامنے بھی آ کھڑا ہوتا ہے تو جی چاہیے اس قدر غصہ آتا ہے کہ گولی ماردوں۔ کیوں غصہ آتا ہے اب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ بس ان حضرات کی صحبت کا اثر ہے اور کچھ بھی نہیں ۔

ولیکن مدتے باگل نشستم (لیکن ایک عرصہ تک پھول کے ساتھ نشست وصحبت رہی)

لیجئے اتنی تمیز تو اندھے ہونے پر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم اندھے ہیں لیکن اتنا حس تو ہمیں بھی ہونے لگا ہے اور واقعی بعضے اندھوں کو دیکھا ہے کہ ٹٹولنے سے بیل کا رنگ بتا دیتے ہیں ۔یعنی کمر پر ہاتھ پھیرا اور بتلا دیا کہ سفید ہے گویا باصرہ صحیح نہیں لیکن مس کرتے کرتے لامسہ میں بھی باصرہ مودع ہو گیا اور ودیعت ہو گیا۔ گو آنکھیں درست نہیں لیکن چھوتے چھوتے تکرار اتصال کی برکت سے ہاتھوں ہی میں آنکھوں کی صفت پیدا ہو گئی کہ ٹٹولنے سے رنگ محسوس ہونے لگا۔

اسی طرح حضرات اہل اللہ کی صحبت میں رہتے رہتے ہمیں بھی کچھ کچھ محسوس ہونے لگا ہے کہ ہاں واقعی عشاء کے بعد جاگنا بڑی وحشت اور کراہت کی چیز ہے تو میں نے یہ ایک نمونہ پیش کیا ہے۔

پس جب اہل اللہ کی صحبت سے کچھ تھوڑی بہت تمیز ہم لوگوں میں بھی ہونے لگی کہ پہلے جو علم الیقین تھا وہ پھر گویا آنکھوں سے نظر آنے لگا تو جو پوری پوری اطاعت کرے گا وہ تو کیوں نہ دیکھ لے گا کہ واقعی جو حضورؐ نے فرمایا کہ وتر اهله وماله وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ٹھیک تو پہلے بھی مانتے ہوئے تھا لیکن اب خود اپنی آنکھوں سے نظر آ گیا۔ اور اس کو مشاہدہ ہو گیا کہ واقعی میں لٹ گیا اسی کو کہتے ہیں مولاناؒ۔

بردل سالک ہزاراں غم بود ☆ گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج و غم صادر ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی ہوتی ہے)

تو یہ گویا مضرت ہے معاصی کے درمیان میں اور یہ گویا ضرر ہے نافرمانی کے درمیان میں لیکن یہ ضرر اسے محسوس ہوتا ہے جو کبھی طاعت کے نفع کا مشاہدہ کر چکا ہو۔ تو گویا انعکاس سے انوار کے تھوڑا بہت احساس ظلمت کا ہونے لگتا ہے تو بہر حال کیا اس کا امتحان ممکن نہیں ہے۔ اس امتحان سے بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی معصیت کے درمیان میں پریشانی ہوتی ہے پریشانی اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہے۔

تو اس کو میں بیان کر رہا تھا کہ یا تو گناہوں میں مدتوں مشغول رہنے پر بھی پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا یا طاعت اختیار کرنے کے بعد آج حدیث النفس ہونے سے ہی بے حد غم اور پریشانی لاحق ہو جاتی ہے اور جو ابتداء ہی سے حالت میں مشغول ہیں ان کی حالت تو پوچھو ہی مت۔ معصیت کے دیکھنے ہی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ خود ارتکاب بھی نہیں کیا۔ دوسرے مرتکب ہی کو دیکھ کر یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ تھے انہوں نے کسی کو کہیں معصیت میں مبتلا دیکھ لیا۔ گھر جو گئے اور پیشاب جو کیا تو دیکھا کہ بجائے پیشاب کے خون آتا ہے اس قدر کلفت اور تکلیف انہیں ہوئی محض معصیت کے ارتکاب کو دیکھنے سے معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کر ہی اس قدر دل گیر ہوئے کہ پریشانی میں پیشاب کی راہ سے خون آنے لگا۔ خود ارتکاب تو بڑی چیز ہے۔ حضرات اہل اللہ تو دوسرے کو مرتکب دیکھ کر بھی بے حد پریشان ہوتے ہیں اسی واسطے بھاگتے ہیں مخلوق سے کہ اہل ظلمت کے دیکھنے سے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

ظلمت معصیت

دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ معصیت کے درمیان میں ظلمت ہے تو ایک مقدمہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رمضان المبارک کے حقوق کا حاصل ترک معصیت ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ

معاصی جو ہیں وہ ظلمت ہیں اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے فرار کرتی ہے۔ یہ قاعدہ عقلی ہے یعنی ظلمت نور سے بھاگتی ہے اور نور ظلمت سے مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ہر چند کہ ہر ضد میں بعض خارجی دلائل سے یہ خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ امر مشاہدہ سے متعین ہے کہ ایک ضد پر یہ خاصیت رافع ہونے کی زیادہ صادق آتی ہے اور ایک ضد پر کم۔ یعنی مثلاً نور اور ظلمت ہے محض تضاد کی بناء پر تو نور سے ظلمت رفع ہو جاتی ہے اور ظلمت سے نور مرتفع ہو جاتا ہے کیونکہ فی نفسہٖ دونوں میں صفت ارتفاع یکساں ہے لیکن اگر غور سے مشاہدہ کیا جائے تو نور میں زیادہ قوت رفع کی ہے اور ظلمت میں کم قوت ہے۔ نور میں تو اس قدر قوت ہے کہ ظلمتیں چاہے کتنی ہی جمع ہو جائیں نور ان کا دافع ہو جاتا ہے۔ ظلمت میں یہ خاصیت نہیں۔ البتہ ظلمت میں یہ خاصیت ہے کہ اگر اسباب ظلمت کے جمع ہو جائیں تو وہ نور کے ساتر ہو جاتے ہیں مزیل نہیں ہوتے تو نور تو رافع ظلمت ہے اور ظلمت ساتر نور ہے اپنے اسباب کے اعتبار سے۔

دیکھئے چراغ جس وقت جلایا جاتا ہے تو اس کا نور تو مکان کی تاریکی کو رفع کر دیتا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مکان میں تاریکی گھس ہی نہیں سکتی۔ جب تک چراغ گھر میں موجود ہے تاریکی کے آنے کی مجال نہیں۔ باقی ظلمت تو خاصیت فی نفسہٖ تو اس کی بھی یہی ہے کہ وہ نور کو مرتفع کر دیتی ہے لیکن قضیہ شرطیہ ہی کے درجہ میں رہی کہ" اذا جاء ت الظلمة ارتفع النور "(جونہی ظلمت آئی نور اٹھ گیا) لیکن مقدم ہی کا وجود نہیں۔ اس لئے کہ یہی ممکن نہیں کہ نور کے ہوتے ہوئے ظلمت آئے۔ البتہ اگر کسی تدبیر سے اور کسی طریق سے آ سکے تو وہ حکم صحیح ہوگا۔ مگر وہ براہ راست آتی ہی نہیں۔ البتہ اس کا کوئی سبب ایسا ہو جو نور کا ساتر بن جائے تو ظلمت اپنے سبب کے واسطہ سے نور کی ساتر ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی چراغ روشن ہے۔ اس کے اوپر کسی نے آ کر ہنڈیا رکھ دی تو ظلمت بواسطہ ظرف کے ظاہر ہوئی اور اصل میں ظرف صرف ساتر ہو گیا نور کا۔ تو ظرف سبب ہے ظلمت کا۔ اس کے واسطے سے ظلمت نمودار ہوئی۔ یہ نہیں ہوا کہ ظلمت نے بالکل رفع کر دیا ہو نور کو صرف ظرف ساتر بن گیا نور کا۔ اور جہاں تک احاطہ اس ظرف کا ہے وہاں تک ساتر ہے حد سے اور جو حد سے خارج ہے وہاں تک ساتر نہیں۔ چنانچہ ہنڈیا دائرہ کی شکل ہے تو ہنڈیا کے ادھر ادھر تو ستر ہے نور کا لیکن دائرہ کے اندر اندر وہ ظرف حائل نہیں۔ بلکہ اندر تو اور زیادہ نور بڑھ گیا ہے کیونکہ نور کا خاصہ ہے کہ جتنا اس کی شعاعوں کو محدود کرتے جائیے اتنا ہی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا

ہے۔ البتہ ہنڈیا کے باہر نور کو زائل کہئے یا مستور کہئے یا مضمحل کہئے وہاں البتہ وہ مضمحل ہوگیا ہے۔

باقی نور کو اس کی حاجت نہیں کہ کسی سبب کے واسطہ سے پھیلے یہ نہیں ہے کہ خود نور کے علاوہ کوئی اور سبب نور ہو۔ بخلاف ظلمت کے جو اپنے اثر رفع نور میں سبب کی محتاج ہے جیسے کہ ہنڈیا کی مثال سے واضح ہو چکا ہے یعنی چراغ پر جو ظرف کو رکھا گیا تو جس حد تک وہ ظرف مظلم تھا وہیں تک ظلمت پھیل سکی اور جو اس کی حد سے باہر تھا وہاں ظلمت نہ پہنچ سکی۔

یوں سمجھئے کہ دو طرفیں ہیں اس کی حد کی۔ ایک تو باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ باہر کی طرف جو حد ہے یعنی جو اس کی محیط ہے وہاں سے تو نور کو دفع کر سکا۔ اور جو حد اندر کی طرف ہے وہاں سے نور کو زائل نہ کر سکا۔ یہاں تو وہ ظرف اس نور کو ایک حد خاص تک دفع کر سکا۔ باقی نور میں ایسی قوت ہے کہ وہ ساتر ظلمت یا مزیل ظلمت حد کے اندر اندر تک نہیں۔ یہ نہیں کہ جہاں تک چراغ ہو وہاں تک تو نور رہو اور جہاں تک چراغ نہ ہو وہاں تک نہ ہو۔ نہیں! بلکہ نور اپنی شعاعوں سے نورانی کرتا ہے اور وہ خاص اس حد تک جس حد تک چراغ ہے۔ البتہ اگر کسی وجہ سے کہیں شعاع نہ پہنچی تو وہاں البتہ ظلمت رہے گی لیکن پھر بھی اس کی شعاعیں وہ چیز ہیں کہ جس حصہ میں ظلمت ہے وہاں بھی ظلمت محضہ نہیں ہے بلکہ ایسی ظلمت ہے کہ مرکب ہے نور ظلمت سے جس سے وہ نور ضعیف ہوگیا جس کو ظل کہتے ہیں۔ چنانچہ سایہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ایک کیفیت ہے جو مرکب ہے ظلمت اور نور سے۔

بہر حال یہ تو سائنس کا مسئلہ ہے جو تفنن کے طور پر ذہن میں آ گیا۔ اس مضمون سے جو میں بیان کر رہا تھا اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں لیکن کچھ تعلق ضرور ہے کیونکہ طاقت جو نور ہے اور معصیت جو ظلمت ہے ان میں سے بھی ہر ایک کا۔ دوسرے پر اثر ہوتا ہے نور طاعت کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ ظلمت معصیت کو دور کر دیتا ہے اور ظلمت معصیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ظلمت معصیت ہو تو نور طاعت کا اثر کم ہوتا ہے۔ صرف اس قدر تعلق ہے اس مضمون سے۔

مگر مقصود اصلی یہ فرع بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ ظلمت اور نور میں تضاد ہے یعنی نور جو ہے وہ ظلمت کا رافع ہوا کرتا ہے۔ یہ گویا تیسرا مقدمہ ہوا میں ان تینوں مقدمات کا مختصراً پھر اعادہ کرتا ہوں۔ پہلا مقدمہ تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے حقوق یہ ہیں کہ جملہ معاصی کو ترک کردے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ معصیت ظلمت ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ نور دافع ظلمت ہے۔

نور کی حقیقت

ان تینوں مقدمات کے بعد اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے رمضان المبارک کے حقوق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان المبارک کی ایک خاص فضیلت بیان فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مہینہ نورانی ہے۔ چنانچہ نورانی ہونا اس کا ابھی مذکور ہوگا۔

اب ان مقامات کو مستحضر کر لیجئے کہ نور کی خاصیت ہے دفع ظلمت جب نور کی خاصیت دفع ظلمت ٹھہری تو اس کا مقتضی یہ ہوا کہ ظلمت دفع ہوا اور وہ تھی معصیت تو معصیت کو ترک کرنا گویا حقوق رمضان میں سے ہوا یہ دلالت ہوگئی۔

اسی طرح یہ مہینہ نورانی ہے وہ اس طرح کہ حق جل شانہٗ فرماتے ہیں **شهر رمضان الذی انزل فيه القران هدی للناس وبينت من الهدی والفرقان** یعنی ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ اور قرآن کی خاصیت ہے **هدی للناس وبينات من الهدی والفرقان**، یہ سب مادے دلالت کرتے ہیں قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ **هدی، بينات، فرقان**.

ہدیٰ و بینات تو ظاہر ہے۔ رہا فرقان سو فرقان کسے کہتے ہیں ممیز بین الحق والباطل کو۔ یعنی قرآن مجید سے فرق ہوتا ہے حق اور باطل میں۔ اور یہ حقیقت شناسی ہی نور ہے کیونکہ نور یہ تھوڑا ہی ہے کہ اس میں چمک اور دمک ہو۔ کہیں چمک اور دمک پر مغرور نہ ہو جانا کہ کچھ تارے سے نظر آنے لگے تو سمجھ لیا کہ ہمارے قلب میں نور پیدا ہو گیا۔ ارے! وہ نور ہی کب ہے قلب میں تو وہ نور ہے کہ اس کے آگے نور شمس کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی کہ نور مطلق است ☆ آفتاب ست وزانوار حق ست

(حضرت شمس تبریزیؒ جو سراپا نور ہدایت اور آفتاب ہدایت اور انوار الٰہی سے منور ہیں)

اب شمس تبریزیؒ کوئی نور تھے کیا ان سے کوئی لالٹین روشن ہو جاتی تھی۔ حکماء بھی نور کی حقیقت کو کچھ سمجھے ہیں مگر عوام وہاں تک نہیں پہنچے۔ حکماء علم کو کہتے ہیں کہ نور ہے حالانکہ علم آنکھوں سے نظر آنے والا نور نہیں مثلاً ہم کو علم ہے کہ زید قائم تو کیا اس علم کی وجہ سے کوئی چمک نظر آنے لگی۔ اگر اندھیری کوٹھری میں بھی تصور کریں اور زید کا ادراک کریں تو کیا کوئی چمک محسوس ہوگی۔ اس تصور سے کون سی چمک پیدا ہوگئی۔ عوام نور کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جب اللہ تعالیٰ کی یہ صفت سنتے ہیں کہ **اللہ نور السموت والارض** تو یہ سمجھتے ہیں کہ نورحق بھی کوئی چمک دار چیز ہوگی۔اے صاحبو! چمک اس کے سامنے کیا چیز ہے وہ تو وہ نور ہے کہ چمک بھی ظلمت ہے اس کے سامنے! مگر جہلاء یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نور میں بھی چمک ہوتی ہے۔

چنانچہ اس وقت دو قصے بے ساختہ یاد آ گئے۔ایک تو ہمارے ننھیال ہی کا ہے ہمارے ننھیال میں ایک بزرگ تھے ذاکر شاغل۔یہیں تھانہ بھون کا واقعہ ہے اس زمانہ میں دیا سلائی نئی نئی چلی تھی۔بہت سے لوگوں نے تو دیکھی بھی نہ تھی۔ایک درویشی کا مدعی جاہل شخص کہیں سے آ گیا۔اس نے ان سے کہا کہ میں تمہیں خدا کا نور دکھادوں گا یہ مشتاق تھے ہی انہیں باور آ گیا۔واقعی طلب وہ چیز ہے کہ بہت سے طالب دھوکوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔جب حقیقت نہ معلوم ہو۔مقام وعدہ کا ''غوث گڑھ'' قرار پایا کہ وہاں چل کر دکھائیں گے۔

غوث گڑھ ایک چھوٹا سا گاؤں یہاں سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے وہاں بستی کے باہر ایک ویران مسجد ہے اس نے کہا کہ اس مسجد میں لے جا کر تمہیں اللہ کا نور دکھائیں گے کیا سب کے سامنے اللہ میاں کو اپنا جلوہ دکھاتے ہوئے نعوذ باللہ شرم آتی تھی۔کیا نعوذ باللہ ان میں عورتوں کی صفت ہے۔مگر صاحب! طلب عجیب چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔طلب کے اندر ایک شان حیرت کی ہوتی ہے جب علم پر طلب غالب ہو۔اسی واسطے یوں دعا کرنی چاہیے کہ حق تعالیٰ طلب اور علم دونوں عطا فرمائے نرے عشق اور نری طلب کے اندر عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔بہت لوگ عشق میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔عقل مغلوب ہونے پر یاد آیا۔

ایک بنیا کی تھالی گم ہوگئی تھی۔اس نے سب جگہ تو دیکھا ہی مگر گھڑے کے اندر بھی دیکھا کسی نے کہا ارے بیوقوف! تھالی اور گھڑے کے اندر یہ کیا حماقت ہے تو اس نے جواب دیا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ گھڑے کے اندر تھالی نہیں جا سکتی مگر احتیاطاً دیکھ لیا۔تو وہ کیا بات تھی۔حرص تھی۔اجی کسی کو عشق دنیا کا کسی کو عشق دین کا۔اس بنیا پر اس قدر عشق تھالی کا غالب ہوا کہ جہاں ہونا عقل بھی جائز نہیں رکھتی وہاں بھی تلاش کر لیا۔

اس قصہ سے بھی وہی مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جب طلب کا غلبہ ہوتا ہے تو سمجھ جاتی رہتی ہے اور جب عشق غالب ہوتا ہے تو عقل برباد ہو جاتی ہے لکھے پڑھے آدمی جاہل کے کہنے میں آ گئے

۔غوث گڑھ پہنچے اس نے کہا کہ پہلے دو رکعت پڑھو پھر کچھ وظیفہ بتا دیا کہ ایسے آنکھیں بند کئے پڑھتے رہنا جس وقت میں کہوں فوراً آنکھ کھول دینا پھر جو دیکھو گے وہ اللہ کا نور ہوگا۔ بیچاروں نے سارے جتن کئے اول دو رکعتیں پڑھیں پھر بیٹھے غریب آنکھیں بند کر کے اور وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے آواز آئی ''ہوں''۔ انہوں نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا کہ تمام مسجد روشن ہے تو ظالم نے کیا شرارت کی تھی کہ پس پشت کھڑے ہو کر ایک دیا سلائی جلا کر ''ہوں'' کر دیا دیکھا کہ تمام مسجد نور سے روشن ہے مگر لکھے پڑھے آدمی تھے وہ یوں کہتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ سایہ بھی پڑ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو خدا کا نور ہے۔ اس میں ظلمت کیسی یہ خدا کا نور کیسا ہے جس میں ظلمت کے دفع کرنے کی بھی قوت نہیں۔ مجھے اس پر شبہ ہوا مڑ کر جو دیکھا تو آپ ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی لئے کھڑے ہیں اٹھ کر اور جوتا نکال کر وہ جوتے پہ جوتا۔ پیر صاحب کی خوب ہی مرمت کی۔ کہا نالائق یہ خدا کا نور ہے جب نجات ہوئی صاحب اس دھوکا باز سے۔

تو غرض وہ کیا بات تھی اس نے نور چمک کا نام سمجھا تھا اسی سے دھوکا دینا چاہا علم بھی کیا کام کی چیز ہے اور زیادہ دھوکا تو جب ہوتا جب اس نور کے ساتھ ظلمت بھی نہ ہوتی چنانچہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

ایک حکایت

اس شعبدہ پر ایک حکایت اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے بچپن میں سنا تھا کہ دیوالی کی رات کو جن بازاروں میں نکلتے ہیں اور ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سایہ نہیں ہوتا۔ دیوالی کی رات آئی ہم شوق میں اور جنون میں جنوں کے بازار میں پہنچے دیوالی کے چراغ چل رہے تھے دیکھا کہ مجمع تو بہت ہے مگر کسی کے سایہ نہیں نہ ادھر نہ ادھر بہت سے لوگ ان میں سے ایسے بھی تھے جنہیں اسی دن اول بار دیکھا تھا۔ پہلے سے بالکل جان پہچان ہی نہیں تھی ان پر تو جن ہونے کا گمان ہوسکتا تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جن سے جان پہچان تھی ان کے بارہ میں یہ تاویل کر لی کہ ممکن ہے کہ جن انہی کی صورت میں آ گئے ہوں جن سے جان پہچان ہے مگر پھر اپنے کو وجود دیکھتے ہیں تو یہاں بھی سایہ نہیں بڑے حیران کہ اے اللہ! اپنا تو علم ہے کہ میں محمد یعقوب ہوں میں کیسے جن ہوسکتا ہوں۔ مولانا ذہین تھے بیحد۔ بچپن کا قصہ ہے مگر ذہانت بچپن ہی سے غضب کی تھی سوچا تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ میاں چاروں طرف تو چراغ ہیں آخر سایہ ہو کدھر۔ یہ وجہ ہے سایہ نہ پڑنے کی جن ون کوئی نہیں۔

تو اس شعبدہ باز کو سوجھی نہیں ورنہ وہ بھی کوئی ایسا ہی پکھنڈ کرتا کہ مشتاق زیارت کو اپنا سایہ بھی نظر نہ آتا۔ مگر باطل کے پیر نہیں اللہ تعالیٰ کسی اور طریق سے اس کو رسوا فرما دیتے۔ تو غرض! عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ نور چمک کو کہتے ہیں۔

ایک اور شخص تھا ہمارے یہاں کانپور میں آیا تھا۔ اس کی بھی تمنا یہ تھی کہ کس طرح خدا کا نور دیکھ لوں۔ چنانچہ اسی تمنا میں میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے کہا کہ بھائی خدا کا نور تو خود میں نے بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں تمہیں کیا دکھا سکتا ہوں۔ اور میں کیا دیکھتا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی نہیں دیکھا تو تمہاری ہماری تو کیا حقیقت ہے۔ اور انہوں نے تمنا بھی کی لیکن تمنا پر بھی صاف جواب مل گیا۔ کہ لن ترانی اور لن فرمایا یعنی کبھی نہیں نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن یہ تابید بھی موبد نہیں بلکہ مقید ہے اور محدود ہے تابید کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ایک دنیا کی تابید اور ایک آخرت کی تابید

آخرت کی تابید تو غیر محدود ہے لیکن دنیا کا جو "ابد" ہے وہ حقیقۃً ابد ہی نہیں کیونکہ ابد تو وہ ہے کہ لا اخر له، جس کا اخیر ہی نہ ہو لیکن یہ بھی محاورات میں ابد ہی کہا جاتا ہے۔ اور جس کا طرح ابدیت کے صیغہ سے کبھی مدت محدود مراد ہوتی ہے اسی طرح کبھی مدت محدودہ کے صیغہ سے بھی ابدیت مراد ہوتی ہے جیسے شیطان کے بارہ میں ارشاد ہے ان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین (اور بیشک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک)

مردود ابدی

یہاں الیٰ یوم الدین سے مراد غیر محدود ہے مگر بعض کج فہم لوگ اس کو ابدیت غیر محدود سمجھ کر شیطان کی نجات کے قائل ہو گئے کہ صرف قیامت تک اس پر لعنت رہے گی پھر نہ رہے گی۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مراد تو ہوتی ہے ابدیت غیر محدود لیکن اس کو تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ تابید محدود کو تعبیر کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم لوگوں کی عقول ضعیفہ کی رعایت سے قرآن مجید ہمارے محاورات میں نازل ہوا ہے۔ سو ہم ابدیت غیر محدود کو بھی اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں کہ قیامت تک یہ بات نہ ہو گی یعنی کبھی نہ ہو گی۔

دوسرے یہ کہ دنیا دار العمل ہے اور اس کی انتہا قیامت ہے۔ پس جب ایک شخص دنیا کے ختم تک ملعون رہا۔ اب دار الجزاء میں ناجی ہونے کا اس کے کب احتمال ہے۔ اس طرح بھی ابدیت

غیر محدود لازم آگئی گولفظ کو اس پر دال نہ مانا جائے اس واسطے میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید کے سمجھنے کیلئے عربی کی صرف ونحو کے علاوہ محاورات کے علم کی بھی ضرورت ہے۔ محاورات نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ سمجھے کہ الیٰ یوم الدین میں غایت حقیقیہ ہے پس شیطان قیامت تک تو مردود رہے گا بس قیامت میں مرحوم ہو جائے گا نعوذ باللہ! بالکل غلط بلکہ عجب نہیں کفر ہو یہ اعتقاد۔ اسی واسطے کہ شیطان کے مردود ابدی ہونے پر سب کا اجماع بھی ہے اور منصوص بھی ہے اس آیت میں۔

کمثل الشیطن اذقال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری ءٌ منک انی اخاف اللہ رب العلمین فکان عاقبتھما انھما فی النار خالدین فیھا وذلک جزآء الظلمین.

(شیطان کی سی مثال ہے کہ اول تو انسان سے کہتا ہے تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو اس وقت (صاف) کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں کہ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں سو آخری انجام ان دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی ہی جگہ ہے)

بہر حال یہ ابدیت کبھی ختم نہ ہوگی اور لن ترانی میں اس کا عکس ہے کہ لفظ ابدیت کا ہے مگر مراد امدت محدودہ ہے سو بعض کو اس میں غلط فہمی ہوئی اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے معتزلہ اس کے قائل ہو گئے کہ یہاں تابید دائمی مراد ہے۔ آخرت میں بھی رویت نہ ہوگی مگر یہ غلط ہے یہی عقیدہ متواتر المعنی ہے کہ آخرت میں رویت باری تعالیٰ ہوگی اور وہ جب عوام مومنین کو بھی ہوگی۔ تو حضرت علیہ السلام کی شان تو بہت ارفع واعلیٰ ہے ان کو کیوں نہ ہوگی اسی واسطے یہاں لن ترانی محمول ہے تابید محدود پر نہ کہ تابید دائم پر۔

طلب صادق کا اثر

بہر حال میں نے اس شخص سے کہا کہ یہاں دنیا میں رویت شرعاً محال ہے کہنے لگا میں جانتا ہوں اور یہ میرا عقیدہ ہے مگر کیا کروں شوق ایسا ہے کہ میں اس تمنا سے باز نہیں آسکتا میں تو طلب کروں ہی گا چاہے کامیابی نہ ہو۔ چنانچہ کیفیت اس کی یہ تھی کہ بے انتہا سوزش اور درد اور کرب میں مبتلا تھا۔ رات بھر اس قدر بے چین رہتا تھا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ جانے کتنا زمانہ اسی حالت میں گزر چکا تھا۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایک درد اور سوزش سی محسوس ہوتی تھی۔

پہلے وہ ہندو تھا کبھی کہتا تھا میں مذہب بھی اسی تمنا میں بدل چکا ہوں۔ چنانچہ اسلام کے قبل بھی اسی طلب میں تھا یعنی ہندو ہونے کی حالت میں بھی۔ کہنے لگا میں بڑے بڑے رشیوں،

جوگیوں اور مینوں سے ملا لیکن سب نے جواب دیدیا کہ یہاں تو یہی مالا جپنا ہے ۔ بھائی ہم تو تمہیں خدا کا نور نہیں دکھا سکتے البتہ ایک نے وعدہ کیا کہ پرمیشر کی جوت ہم تمہیں دکھا دیں گے پھر اس نے کیا کیا کہ مغرب اور عشاء کے درمیان مجھے جھونپڑی کے اندر لے جا کر باہر کی طرف اشارہ کیا اور ایک روشنی نظر آئی جو چل رہی تھی ۔ اور آہستہ آہستہ آگے کو اچھلتی ہوئی سرک رہی تھی اس نے کہا دیکھ! یہ ہے جوت پرمیشر کی ۔ میں اس کی طرف دوڑا تو اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ہاں! ہاں یہ کیا کرتا ہے ارے یہ پرمیشر کی جوت ہے جل جائے گا ۔ وہ جوت ایسی تھوڑا ہی ہے کہ اس کی کوئی تاب لا سکے ۔ میں نے کہا میں تو مرنے ہی کو پھر رہا ہوں ۔ اگر پرمیشر کی جوت میں جل کر مر جاؤں تو اس سے بڑھ کر کیا ہے یہ تو میری عین تمنا ہے ۔

غرض وہ تو بوڑھا تھا میں جوان ہاتھ چھڑا کر دوڑتا ہوا جو اس روشنی کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کچھوا ہے اس کے سر پر بہت سی مٹی جمی ہوئی ہے اور اس مٹی پر ایک چراغ رکھا ہوا ہے جس میں موٹی سی بتی پڑی ہوئی ہے کہتا تھا کہ اول تو میں اس روشنی کو دیکھتے ہی دھوکا میں آ گیا کہ ہو گا نور اللہ میاں کا لیکن جب میں نے اس روشنی کو اچھلتے ہوئے دیکھا تو اس پر مجھے شبہ ہوا واقعی عقل بھی بڑی نعمت ہے ۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ نور اچھلتا کیوں ہے آدمی جو شریف ہوتا ہے اس میں بھی وقار ہوتا ہے ۔ اچھلتا کودتا نہیں یہ تو پرمیشر ہے یہ اچھلتا کودتا بچوں کی طرح کیوں چلتا ہے ۔ اس سے مجھے شبہ ہوا اس لئے میں بھاگا کہ آخر دیکھوں تو یہ ماجرا کیا ہے اس نے مجھے پکڑا بھی مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگ ہی گیا ۔ لوٹ کر اس سے کہا کہ واہ باوا جی اچھا پرمیشر دکھایا وہ ہنسنے لگا کہ بچہ میرے پاس تو یہی ہے کہ جھونپڑی میں رہ اور بس بڑا موج کیا کر ۔ یہاں تو بیٹھے کچوری اور بالائی اور مٹھائی لئے جاؤ ۔ بس بیٹھو اور لیکن ان کو بھلا ان چیزوں کی کب ہوس تھی یہاں تو طلب ہی اور تھی اور یہ خود بڑا شخص تھا ۔ مشہور جوگی تھا ۔ ریاضت مجاہدے بہت کیا کرتا تھا ۔ اسی دوران میں خدا کے نور کی طلب دل میں پیدا ہوگئی ۔

اس نے کہا کہ باوا جی! یہ چیزیں مجھے درکار نہیں ۔ مجھے تو خود یہ سب حاصل تھا ۔ اب میں نے اس کو جو چھوڑا ہے تو اسی طلب کے اندر کہ کسی طرح خدا کو دیکھ لوں اسی طلب کے اندر یہ نیازمندی اختیار کی ہے ۔

مگر صاحبو! طلب عجیب چیز ہے واقعی اگر اس نے خدا کو نہیں دیکھا تو اس طلب کا نتیجہ

اتنا تو ہوا کہ اس وقت خدا کے دیکھنے کے قابل تو ہو گیا یعنی مسلمان تو بنا۔ ہائے ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

طلب تو وہ چیز ہے کہ مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے پھر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دینا تو کچھ بھی مشکل نہیں۔

مقامِ صدیق رضی اللہ عنہ

یہ وہ مضمون ہے جس سے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا تھا کیونکر! اس طرح کہ معراج شریف کے قصہ میں کفار حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں اطلاع دی کہ تم نے سنا بھی تمہارے دوست نے ایک اور بھی دعویٰ منکر کیا ہے کہ مجھے آسمان پر بلایا گیا تھا۔ مجھے معراج ہوئی ہے میں سب آسمانوں بلکہ عرش تک کی سیر کر آیا ہوں تم نے سنا بھی یہ ایک اور نئی بات ہوئی ہے اب تک تو صرف نبوت ہی کا دعویٰ تھا۔ یہ اس سے بڑھ کر ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بڑھ کر تو نہیں ہے بلکہ گھٹ کر ہے جب میں اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ آسمان والے یعنی فرشتے ان کے پاس آتے ہیں تو اگر یہ آسمان والوں کے پاس پہنچا دیئے گئے تو عجب ہی کیا ہے۔ جس کے یہاں بادشاہ آتا ہو اگر اس کو دربار میں بلا لے تو واللہ کچھ بھی حیرت کی بات نہیں۔ میں جب جبرئیل علیہ السلام کی نسبت جو کہ سدرۃ المنتہیٰ کے بسنے والے ہیں اور عرش جن کا نشیمن ہے یہ تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر حاضر ہوتے ہیں تو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام کے نشیمن پر تشریف لے جانے کا دعویٰ فرمائیں تو کیا میں ان کی تکذیب کر دوں گا۔

تم لوگ بیوقوف ہو کہ ایسی موٹی بات میں مجھ کو دھوکہ دینے آئے ہو اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں تو مجھے ایمان لانے اور انہیں سچا سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ جواب ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کفار کے مقابلہ میں پیش کیا تھا۔ غرض عشق میں یہاں تک خاصیت ہے کہ ؎

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

قبر میں زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس پر ایک لطیف نکتہ بعض اہل لطائف نے کیا ہے۔ بعضے نکتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ علوم تو نہیں ہوتے محض نکتے دل خوش کن ہوتے ہیں لیکن اگر متاید ہوں نصوص سے تو ان میں بھی ایک علم کی شان پیدا ہو جاتی ہے دعویٰ تو نہیں کیا جاتا۔ احتمال کا درجہ ہے ایک محمل ہے یہ بھی۔ یہ جو حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آ کر تین سوال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی سوال ہوتا ہے۔

ما تقول فی حق ھذا الرجل یعنی یہ کون بزرگ ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں۔ جو ہماری ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے یہ ہے مضمون حدیث کا۔

یہاں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ہذا محسوس باشارہ حسیہ کے لئے ہے وہاں قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہوں گے۔ جو ہذا سے پوچھا جائے گا۔

جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر۔ حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی یہ صورت ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھ رہے ہیں۔ یہ جواب بالکل کافی ہے لیکن بعض اہل لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں مگر عشاق نے محقق کر لیا ہے شوق میں۔ اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے اگر اس امید سے متلذذ ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ اس کے اور رسولؐ کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں وہ سب اٹھا دیئے جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوں گے۔ اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔

اور یہ رفع حجاب تو ہے اس میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضورؐ اپنی جگہ پر رہیں یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب اٹھیں اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرم فرمائیں۔ بعض عشاق شدت شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔

بعضے عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے ہی شوقاً الی القاء رسول اللہ بھی تمنا موت کی جائز ہے کچھ حرج نہیں۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے ان پر شوق کی حالت غالب تھی صاحب حلال بزرگ تھے اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ کی زیارت مشہور ہے اس کی کیا اصل ہے۔ یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہوگئی اور یہ شعر پڑھا۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں ☆ بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

اور فرمایا کہ مقتضی تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لا کر نماز جنازہ پڑھتے مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ کی وفات ہی میں مصلحت تھی۔ خیر! اگر یہ دولت حاصل نہ ہوسکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جاسکتی ہے اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھو یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوادی۔ اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے کیا عجب ہے کہ گو یہ زیارت عام نہ ہو لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کشش شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور ان کی اس امید کو انا عندظن عبدی بی[1] کی بناء پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔

عبدیت کا خاصہ

میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ طلب وہ چیز ہے کہ خود مطلوب کو طالب کے دروازہ پر حاضر کر دیتی ہے تو اگر طالب کو مطلوب کے دروازہ پر حاضر کر دے تو کیا تعجب ہے۔ تو اس شخص کی طلب نے اس کو مطلوب کے دروازہ پر تو پہنچا ہی دیا جو اسلام ہے اور جو باب حقیقی ہے رویت باری تعالیٰ کا خیر رویت نہیں ہوئی تو رویت کے قابل تو بنا دیا۔ ہوسناک کے لئے تو یہ کم ہے مگر طالب صادق اور عاشق کے لئے تو یہی بہت کچھ ہے۔

[1] مسند أحمد ۲:۳۱۵،۴،۱۰۶، الترغيب والترهيب للمنذرى ۲:۳۹۳،۴:۲۷۷،۴:۲۶۹

مرا از زلف تو موئے بسند ست ☆ ہوس رارہ مدہ بوئے بسند مست

(مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

یہ شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے اللہ اکبر! کیا موقع پر لکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایک صحابی نے تراشے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ سب لوگوں کو تقسیم کئے گئے اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ! لیکن ہم بھی بدقسمت نہیں خیر! اگر بال ہم تک نہیں پہنچے تو ہم کو یہ بھی کم نہیں کہ اس واقعہ کی خبر تو پہنچ گئی اور اس مقام پر انہوں نے یہ شعر لکھا ہے۔

مرا از زلف تو موئے بسند ست ☆ ہوس رارہ مدہ بوئے بسند مست

(مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

واقعی عاشق صادق کی یہی شان ہے جس کو ہر چیز میں چاہے کسی درجہ کی ہو اپنے محبوب ہی کا جلوہ نظر آتا ہے کہتے ہیں نا۔

ہر چہ بینم درجہاں غیر تو نیست ☆ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)

ہر درجہ پر قانع ہیں اس واسطے کہ محبوب سے کچھ تو تعلق ہے۔

ہر چہ بینم درجہاں غیر تو نیست ☆ یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)

تو غرض شیخ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ہم تک نہیں پہنچے تو خیر یہی سہی خبر تو پہنچی

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتا تو بڑی مصیبت ہوتی)

یعنی اگر محبوب کی حکایتیں بھی ہم تک نہ پہنچتیں تو کیا ہوتا پھر کون سی تسلی تھی عاشق کے لئے۔ اس سے زیادہ اگر ہو جائے عنایت ہے ورنہ ہمارا حق تو اتنا بھی نہیں یہ نہایت تواضع کی بات ہے۔ عاشق صادق کی عبدیت لازم ہے اور عبدیت کا خاصہ ہے کہ بلند پروازی نہیں رہتی جو کچھ بھی عطا ہو جائے اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہے وہ بزبان حال یا بزبان قال یہ کہتا ہے۔

ادائے حق محبت عنایتے ست زاوست ☆ وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خرسند ست

(ادائے حق محبت بھی حق تعالیٰ کی عطا اور توفیق سے ہے وگرنہ عاشق مسکین کس بات سے

خوش ہے یعنی اس کی توفیق سے)

عاشق مسکین کو تھوڑا سا بھی مل جائے تو وہ اس میں بھی راضی ہے اور یہ مشرب الحمدللہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایک زندہ بزرگ کا دیکھ لیا ورنہ کتابوں ہی میں پڑھے ہوتے تو یہ سمجھتے کہ لوگوں کی لطافتیں ہیں، ذہانتیں ہیں، توجیہیں ہیں اپنے بزرگوں کے اقوال کی۔ حضرت حاجی صاحب کے دیکھنے کے بعد اب کوئی شک نہیں رہا۔ حضرت کا بھی بالکل یہی مشرب تھا ۔

وگرنہ عاشق مسکین نہ ہیچ خرسندست (وگرنہ عاشق مسکین کس بات سے خوش ہے)

میں کہتا ہوں جس کا نام عبدیت ہے بڑی مشکل ہے۔ سب حالات کا حصول آسان ہے، عبدیت ہی کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ حضرتؒ میں بفضلہٖ عبدیت کامل عطا فرمائی گئی تھی۔ گویا عبدیت اس زمانہ میں حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرتؒ کوئی ایسی ترکیب ارشاد فرمائیں کہ جس سے زیارت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاصل ہو جائے۔ فرمایا آہا۔ آپ کا بڑا حوصلہ ہے کہ آپ کا ذہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تک پہنچتا ہے۔ آپ کی نظر بہت دور پہنچی، واللہ! ہم تو اپنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد شریف کی زیارت کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ اگر وہی نصیب ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ اس سے آگے تو ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا۔ آپ بڑے لوگ ہیں کہ آپ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تمنا ہے۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے عبدیت کا۔ اور یہی ہے وہ حالت جس کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود ☆ کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف رائے

(بخدا مجھے تو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے اور دل رکتا ہے کہ ان نظروں سے محبوب کو دیکھوں)

قسم کھاتے ہیں کہ میرا جی اس سے بھی جھجکتا ہے اور رکتا ہے کہ محبوب کو ان نظروں سے دیکھوں

عشاق کی شان

دیکھئے عاشق اس سے بھی جھجکتا ہے کہ محبوب کو آنکھ اٹھا کر دیکھے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تو بے عقلوں کا مذاق ہے۔ صحابہؓ سے زیادہ تو کوئی عقلمند نہ تھا۔

ایک صحابیؓ سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو آپؓ کہتے ہیں کہ ارے یہاں دیکھا تھا کس نے نظر بھر کر جو بیان کر دوں بیٹھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلیہ تھا۔ ہمت

ہی نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی نہ ہوئی۔

ایک کافر رئیس کی شہادت ملاحظہ ہو جو حدیبیہ میں صحابہؓ کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس نے بہت سے واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب وعظمت کے بیان کر کے مختصراً یہ حالت بیان کر دی کہ

لا یحدون النظر الیہ یعنی گھور کر نہیں دیکھ سکتے

اور گھورنا کسے کہتے ہیں نظر بھر کر دیکھنے کو۔ غرض کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ بس! یہ حالت تھی صحابہ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً صحابہؓ نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ اور یہ تو ہمت کس کی ہو سکتی تھی کہ نظر سے نظر ملا کر دیکھے۔ تو عشاق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ تھوڑے سے پر بھی راضی ہو جاتے ہیں وہی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کا مذاق ؎

مرا از زلف تو موئے بسند ست ☆ ہوس رارہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس نہ ہونی چاہیے)

تو میں کہتا ہوں کہ رویت نہ ہو رویت کی قابلیت ہی عطا ہو جائے گو فی الحال رویت حاصل نہیں لیکن وعدہ تو ہے گو ادھار ہی سہی۔ وہ بھی کافی ہے ایک عاشق کہتا ہے ؎

اگر چہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی از راہ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمائے)

امید بھی صرف اتنی کہ شاید ایسا ہو جائے اور واقعی خرسندی امید پر بھی ہوتی ہے **ولو کان توھماً** یہاں تک کہ اشعب طماع کی حکایت ہے۔ یہ معمولی شخص نہیں ہیں۔ بڑے معتبر علماء میں سے گزرے ہیں مگر بے چارے مجبور تھے۔ طمع کے ہاتھوں ان کی طمع کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔

چنانچہ ایک بار انہیں بہت سے لڑکے چھیڑ چھاڑ رہے تھے۔ جو آدمی کسی بات میں مشہور ہو جاتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ لوگ اسے چڑایا کرتے ہیں۔ انہوں نے لونڈوں سے کہا کہ میاں فلاں جگہ کھانا بٹ رہا ہے یوں ہی جھوٹ موٹ کہہ دیا اپنا پیچھا چھڑایا۔ لونڈے دوڑ کر اس طرف کو جھپٹے۔ انہیں دوڑے ہوئے جاتا دیکھ کر آپ کیا دل میں کہتے ہیں کہ اجی شاید بٹ ہی رہا ہو اور خود بھی پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔

حضرت ہم ان پر تو ہنستے ہیں لیکن ہم سب مبتلا ہیں ایسے ہی عدم تدبر میں۔ان کی طمع تو سب کو معلوم تھی ہمارا عام تدبیر کسی کو معلوم نہیں۔ ہمارے دھوکا کا کسی کا پتہ نہیں وہ کیا عدم تدبر ہے اور ہم کیوں کر دھوکا میں آجاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم اول تو لوگوں کو اپنے جھوٹے حالات اور وضع سے اپنا معتقد بناتے ہیں جب لوگ معتقد ہو جاتے ہیں تو اب ان کے اعتقاد سے خود ہی استدلال کرتے ہیں کہ ہم کچھ تو ضرور ہوں گے جب تو لوگ معتقد ہیں ہمارے۔اگر ہم کچھ نہ ہوتے تو کیا سارے کے سارے بے وقوف ہی ہیں اگر ہم واقع میں کچھ نہ ہوتے تو اتنے سارے لوگ ہمارے کیوں معتقد ہو جاتے۔معلوم ہوتا ہے ہم ضرور کچھ ہو گئے اور یہ خبر نہیں احمق الناس کو کہ ہمیں نے تو دھوکا دیکر لوگوں کو اپنا معتقد بنایا ہے۔اگر ہم کوئی ترکیب نہ کرتے اور پھر بھی لوگوں کا ہمارے ساتھ اعتقاد ہوتا اس میں تو احتمال ہو بھی سکتا تھا لیکن یہاں ہم ہی نے تو ترکیبیں کر کے لوگوں کو غلطیوں میں اور تلبیس میں ڈالا۔ہم ہی نے تو سارا کارخانہ اور منصوبہ گانٹھا کہ کسی طرح لوگوں کو معتقد بنانا چاہئے اور جب لوگ معتقد ہو گئے تو اب ہم اس منصوبے کو بھول گئے۔اور اب خود ہمارا اپنا اعتقاد ان کا اعتقاد ہے۔

ہم ان کے اعتقاد پر بنا کرتے ہیں اپنے اعتقاد کی تو گویا ہمارا اعتقاد بواسطہ ان کے اعتقاد کے ہے اور ان کا اعتقاد بواسطہ ہماری تلبیس کے ہے تو گویا ہمارا اعتقاد ہماری ہی تلبیس پر مبنی ہے۔گویا ہم اپنی ہی تلبیس سے اپنے معتقد ہیں تو ہم اشعب طماع پر کیا ہنستے ہیں ہم خود ایسی ہی بے ہودگیوں میں مبتلا ہیں۔

یہ تو محض تفریع اور تتمیم فائدہ کے لئے عرض کیا گیا باقی میرا اصل مقصود اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ طلب اور محبت وہ چیز ہے کہ امید موہوم پر بھی طالب مسرور رہتا ہے اسی واسطے کہا گیا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی از راہ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمائے)

تو غرض یہ مذاق ہے عاشق کا کہ تھوڑا سا بھی اگر مل جائے تب بھی اسے کافی ہے۔کہتے ہیں نا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کہیں یہ سنا تھا کہ ہمارا ذکر محبوب کی محفل میں ہو رہا تھا تو بس اسی پر خوش ہو گئے کہ خیر اگر ہم اس محفل میں نہیں تھے تو ہمارا ذکر تو تھا۔بس اسی پر بے چارہ خوش ہے کہ میرا ذکر تو اس محفل میں ہے۔

مشہور ہے نا کہ ایک دیہاتی عورت اپنے شوہر پر عاشق تھی لیکن وہ اس کی طرف التفات ہی نہ

کرتا تھا۔ ایک دفعہ شوہر گاجریں کھا رہا تھا۔ پینڈی کاٹ کاٹ کر پھینکتا جاتا تھا کھاتے کھاتے آپ کو جو جوش ہوا تو بیوی کے پینڈی کھینچ کر ماری منہ پر زور سے۔ اور وہ اس کی آنکھ پر جا کر لگی۔ اب آنکھ بند بھی اور آنکھ میں درد بھی لیکن اسی حالت میں اس نے ڈومنی یا نائن کو بلایا اور اپنے باپ کے گھر یہ کہلا کر بھیجا کہ کھائی تھی گاجر ماری تھی پینڈی۔۔ اماں سے کہیو کہ کچھ ساگ بھوڑنے لگا ہے اب آگئے ہیں بھلے دن۔ چھیڑ چھاڑ تو شروع ہوگئی ہے۔ میرے گاجر کی پینڈی تو ماری۔ اگر نہ مارتے تو میں کیا کر لیتی۔

تو یہ کیا عاشق ہے۔ اگر عاشق ہے تو محبوب کے دربار میں اپنا بڑا درجہ ہرگز نہ چاہے گا۔ اور عاشق کو تو شرم آتی ہے درجے مانگتے ہوئے کیونکہ وہ اپنی حقیقت خوب جانتا ہے کہ میں ہوں کیا۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک گونہ رویت ہی ہے کہ رویت کی قابلیت ہو جائے۔ اگر حقیقی رویت نہیں ہے تو حکمی تو ضرور ہے۔

مساوات اسلامی کا سبق

اس نومسلم نے اپنا قصہ شوق رویت اور اسی شوق میں اسلام لانے کا جو مجھ سے بیان کیا تو مجھے شبہ ہوا کہ جب اس کی طلب کسی جگہ پوری نہ ہوگی تو عجب نہیں کہ یہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائے۔ کہیں کوئی پادری صاحب کہنے لگیں کہ میں دکھلا دوں گا۔ تمہیں خدا کا نور۔ پھر وہ بھی کوئی دھوکا دے اور سائنس والوں کا دھوکا شاید سمجھ میں بھی نہ آئے میں نے صاف کہہ دیا کہ بھائی تمہارا کیا اعتبار۔ مجھے قوی شبہ ہوا ہے کہ کہیں تم اسلام ترک نہ کر دو کیونکہ تمہارا مقصود تو یہ ہے کہ میں خدا کو دیکھ لوں۔

جب تمہیں خدا نہ دکھائی دے گا تو پھر تم اسلام کو بھی چھوڑ سکتے ہو جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب کو چھوڑ کر اسی تمنا میں مسلمان ہوگئے ہو کہنے لگے جی نہیں۔ اب اسلام کو نہیں چھوڑوں گا چاہے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔ بالکل گنوار اور لٹھ تھا لیکن اس نے ایسے علوم و معارف بیان کئے کہ میں دنگ رہ گیا۔

چنانچہ جب میں نے کہا کہ ہمیں کیسے اطمینان ہو کہ تم اسلام نہ چھوڑ دو گے اس نے کہا کہ اسلام میں میں نے ایک ایسی خاصیت پائی ہے کہ نہ کسی مذہب میں تھی نہ ہو میں نے پوچھا وہ کون سی خاصیت ہے کہا اس مذہب میں توحید ایسی کامل ہے کہ کسی مذہب میں نہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ابھی سے کیا جانے کہ توحید کیا چیز ہے میں نے پوچھا مثلاً۔ کہا دیکھئے یہ کیا توحید نہیں ہے کہ ایک شخص بھنگی ہے یا چمار ہے وہ مسلمان ہوگیا تو آج تمام مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاتے ہیں ورنہ ساری قومیں ایسے شخص کو اپنے سے گھٹا ہوا

اور ذلیل سمجھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ شادی بیاہ نہ کریں۔ یہ تو اپنی اپنی مصلحت ہے باقی حقیر کوئی نہیں سمجھتا یہ توحید ہی کا اثر ہے کیا اچھی بات کہی اور استدلال بھی کیسے کھلے ہوئے واقعہ سے کیا اللہ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں جو مساوات کرتے ہیں اگر طوعاً نہیں تو کرہاً سہی۔

ایک حکایت اپنی کرہاً کی اور ایک حکایت دوسرے کی طوعاً کی سناتا ہوں مجھے تو یہ حکایت پیش آئی کہ میں ایک دفعہ کالپی گیا۔ وہاں ایک شخص تھا نہایت صاف ستھرا، اجلے کپڑے پہنے ہوئے ہوئے جامع مسجد میں نماز کو آیا۔ اس کے گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ یہ پہلے بھنگی تھا اب مسلمان ہو گیا ہے لیکن وہاں کے چودھری ساتھ کھانا پلانا تو درکنار اس کے ہاتھ کا برتن بھی نہیں لیتے تھے۔ وہاں کا جلسہ تھا اس میں وہ بھی موجود تھا۔ اور وہاں کے رئیس بھی سب جمع تھے۔

بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس موقع پر ان لوگوں کو سمجھا دوں کہ ایسا پرہیز نہ کیا کریں۔ اس کی سخت دل شکنی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ نرے سمجھانے سے کچھ کام نہ نکلے گا ۔ سمجھانے سے تو سب اس وقت ہاں ہاں کہہ دیں گے پھر بعد کو کون پروا کرتا ہے میں نے کہا ایک بدھنے میں پانی منگاؤ جب پانی آ گیا تو میں نے اس نومسلم سے کہا کہ پیو ٹونٹی سے منہ لگا کر۔ اس نے پیا پھر بدھنا اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے بھی ٹونٹی ہی سے منہ لگا کر اس کے بچے ہوئے پانی میں سے پیا۔ پھر میں نے سب سے کہا کہ پیو۔ حضرت سوا مان لینے کے کسی سے کوئی عذر نہ بن پڑا۔ سب نے جیسے تیسے پیا۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھو بھائی اب اس سے پرہیز نہ کرنا۔ کہنے لگے اجی بس! اب منہ ہی کیا رہا پرہیز کرنے کا۔ تم نے ترکیب ہی ایسی کی کہ ہمارا سارا دھرم ہی لے لیا۔ اب اطمینان رکھو اب ہم اسے اپنے ساتھ کھلائیں پلائیں گے اب اس سے پرہیز ہی کیا رہ گیا جب اس کا جھوٹا پانی ہی تم نے پلوا دیا۔ خیر سب کو بڑی خوشی ہوئی لیکن پیتے وقت جھجکتے سب تھے لیکن چونکہ میں خود پی چکا تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ انکار کر دے اور سچی بات یہ ہے کہ میں بھی، یاد ہے مجھے۔ پی تو گیا لیکن اندر سے جی رکتا تھا۔ اللہ معاف کرے اور کچھ اس کے ساتھ ہی نہیں بلکہ کسی کو جھوٹا پانی یا جھوٹا کھانا ہو مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ سخت رکاوٹ ہوتی ہے اگر کبر اس کا سبب ہے تو اللہ معاف کرے اور اگر ضعف طبیعت ہے تو معذور ہے یا کوئی معتقد یہ کہہ لے کر لطافت ونظافت ہے۔ نفس کی شرارت تو دیکھئے خود ہی ایک خوب صورت عنوان بھی بتلا دیا۔ کسی بزرگ کے سامنے کا بچا ہوا بھی مجھ سے نہیں کھایا پیا جاتا۔ میں کیا کروں طبیعت متلاتی ہے اسی لئے

میں خود جو کھانا کھاتا ہوں تو باالتزام اسی طرح کھاتا ہوں کہ دیکھنے والے کبھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی کے سامنے کا کھایا ہوا ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بس اتنا ہی نکالا گیا ہے۔

اس قدر صاف کر کر کے اور ترتیب کے ساتھ کھاتا ہوں کہ کسی کو دیکھ کر نفرت نہیں ہوسکتی۔ میں اور بھی لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف آلودہ کر دیتے ہیں جس کو دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے اور پانی میں یہ وہم ہوتا ہے کہ یہاں منہ لگا ہوگا یہاں تھوک لگا ہوگا۔ بس مجھ سے تو کسی کا نہ جھوٹا پانی پیا جائے نہ جھوٹا کھانا کھایا جائے۔

ہاں کسی کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لینے سے نفرت نہیں ہوتی۔ اب میں اپنی اس طبیعت کو کیسے بدل دوں۔ میں نے تو کبھی بزرگوں کا بھی جھوٹا کھانا نہیں کھایا نہ کبھی جھوٹا پانی پیا الا نادراً مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی برکت سے محروم نہیں رکھا ان کے ہاں بچی چیزیں ہی اتنی تھیں کہ ان کی برکت سے ہی کافی ہوگئی جھوٹی چیزوں کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ بس بچی ہی چیزیں حصول برکت کے لئے کافی تھیں۔

خیر یہ تو نکتہ شاعرانہ ہے۔ شاعروں کی خاطر سے بیان کر دیا ہے ورنہ دراصل بزرگوں کے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو جھوٹا کہہ سکیں اور جس کو جھوٹا کہتے ہیں وہ بھی بچی ہی چیز ہے اس میں بھی سچ مچ برکت ہے۔ تو غرض یہ حکایت تو کرہاً کی تھی جو مجھ کو پیش آئی اور اس پر بھی حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ گو طبعاً کراہت ہوئی مگر الحمد للہ عقلاً اس کو نہایت خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی توفیق تھی۔

حق پرستی

اب دوسری حکایت طوعاً کی عرض کرتا ہوں۔ مولوی جمال الدین صاحب بھوپال میں مدار المہام تھے گویا وزیر ریاست تھے۔ وزارت اس وقت تو ضابطہ ہی کی رہ گئی ہے۔ اس زمانہ میں تو واقعی سلطنت تھی۔ کیونکہ پہلے اتنے ضابطے نہ تھے اور پھر خود ایک بڑی رئیسہ نے ان سے نکاح بھی کر لیا تھا۔ غرض ان کا بہت بڑا مرتبہ تھا مگر تھے بڑے حق پرست۔ یہاں تک کہ وہ رئیسہ بوجہ انتظامات ریاست کے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے گئے مولوی جمال الدین عالم تو تھے ہی۔ نماز پڑھانے کے لئے لوگوں نے آگے کھڑا کر دیا۔

اتفاق سے ایک ولائتی مولوی صاحب بھی موجود تھے انہوں نے ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا کہ تم

نماز نہیں پڑھا سکتے۔ تم اس قابل نہیں اور کوئی پڑھائے مگر مجال کس کی تھی کہ وزیر صاحب کے سامنے اور کوئی پڑھانے کے لئے بڑھے بالخصوص ایسے موقع پر۔ جب کوئی نہ بڑھا تو وہ آپ خود جاکر مصلے پر کھڑے ہو گئے کہ ہم پڑھائیں گے اور یہ کہا کہ تمہاری بیوی پردہ نہیں کرتی۔ اور تم اس کو گوارا کرتے ہو۔ لہٰذا تم دیوث ہو اور دیوث کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہ فقہ کا مسئلہ ہے یہ کہا اور اللہ اکبر! وزیر صاحب جماعت میں شریک رہے۔ نماز پڑھ کر بھی کچھ نہیں بولے بلکہ وہیں سے سیدھے پہنچے رئیسہ کے پاس۔ وہ اس وقت اجلاس میں تھیں آپ نے بے دھڑک سب کے سامنے علی الاعلان اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہارے پردہ نہ کرنے کی وجہ سے میں بدنام ہوا۔ لوگ مجھے دیوث کہتے ہیں اور میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ تم نے مجھے بھی ذلیل کیا۔ یا تو وعدہ کرو کہ میں پردہ میں بیٹھوں گی نہیں تو تین طلاق۔

حق پرستی اور ہمت تو دیکھئے برسر اجلاس یہ کہہ دیا۔ گویا سارا ملک ہاتھ سے دے دینا گوارا کرلیا۔ مگر اول تو حکومت پھر بڑھیا۔ تو مولوی جمال الدین ایسے حق پرست تھے۔

اسلام دوستی

ایک بار ان کے یہاں کوئی تقریب تھی یا جلسہ تھا جس میں کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ باوجود اتنے اقتدار کے ان میں تواضع اس درجہ تھی کہ کھانا خود رکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک بھنگی آیا اور اس نے کہا میاں سلام! میاں میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کرلو۔ مدارالمہام صاحب نے سب کام چھوڑ چھاڑ اسے بٹھلایا اور مسلمان کرلیا۔ پھر خدمت گار سے کہا کہ اسے حمام میں لے جا کر غسل کراؤ اور ہمارا جوڑا پہنا کر یہاں لاؤ۔ حیرت سب کو ہوئی مگر اسی وقت جوڑا پہنا کر حاضر کر دیا گیا۔ حکم دیا کہ اسے بٹھلاؤ دسترخوان پر۔ دسترخوان پر بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑے بڑے خاں اور بیگ سبھی کھاتے تھے بس لوگوں کی ناکیں چڑھ گئیں۔ منشی جی نے کہا۔ وہ تھے تو مولوی مگر منشی مشہور تھے۔ کہا آپ صاحبان منقبض نہ ہوں یہ شخص آپ کے ساتھ نہیں کھائے گا۔ اس کے ساتھ میں کھاؤں گا کیونکہ یہ اسی وقت مسلمان ہوا ہے اس وقت اس کے ذمہ ایک بھی گناہ نہیں۔ بالکل پاک اور صاف۔ یہ اس وقت ایسا پاک اور صاف ہے کہ یہاں ایک شخص بھی اتنا پاک صاف نہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر میں کھاؤں گا۔ ہر ایک کو کہاں یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ دولت تو میں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھی ہے تمہاری قسمت کہاں کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانے کا شرف

حاصل کر سکو میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں اسے تمہارے ساتھ کھانے کے لئے نہیں بٹھلاؤں گا۔ میں خود اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ تم مت گھبراؤ۔ الگ کھاؤ میں اپنے برتن میں اس کو شریک کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر کھانا منگوایا اور کہا آؤ بھائی! ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔ اب وہ بچے کہ میں مدارالمہام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھالوں مگر انہوں نے زبردستی بٹھلالیا کہ بھائی! تم اب بھنگی کہاں رہے تم تو اب ہمارے بھائی ہوگئے۔ غرض ایک برتن میں دونوں نے کھانا کھایا۔

واللہ! حکایت تو یہ بڑی مزیدار ہے مگر ذرا عمل کر کے دیکھئے کیسی بدمزہ ہے مگر صرف اولاً بدمزہ ہے اور عمل کے بعد تو واللہ وہ حلاوت ہے کہ بیان میں نہیں آسکتی مگر صاحب اولاً تو پورا جہاد اور بڑا سخت مجاہدہ ہے۔ یہ انہیں کا حوصلہ تھا ورنہ ایسے شخص کے ساتھ تو بہت ہی برابرتاؤ کرتے ہیں۔

تکبر کی صورت

یہ حالت تکبر کی ہے کہ اسے خطاب بھی کرتے ہیں تو ان الفاظ سے اب او بھنگی کے۔ ایک عبدالکریم تھا جو ہمارے ہاں مسلمان ہوگیا تھا اس کو لوگ بھنگی کا کر کے پکارتے تھے۔ بعد مسلمان ہوجانے کے بھی لوگ ایسوں کو بھنگی کا اور چمار کا کہنا نہیں چھوڑتے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ مگر خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ ''کا'' بڑھادیا۔ بھنگی اور چمار نہ کہہ دیا۔ بھنگی اور چمار کا ہی کہا کیونکہ آخر اس کا باپ تو بھنگی ہی تھا مگر یہ زیادہ خوشی کی بات اس لئے نہیں کہ محاورہ میں یہ اضافت مضاف مضاف الیہ میں تغایر کے لئے نہیں آتی بلکہ تحسین کلام کے لئے بطور زائد کے لائی جاتی ہے جیسے ''را'' ہے تو اضافت کے لئے موضوع مگر اکثر تحسین کلام کیلئے زائد بولا جاتا ہے اور یہ کیونکر معلوم ہوا۔

یوں معلوم ہوا کہ یہیں تھانہ بھون میں ایک سید تھے مگر تھے بیچارے غریب! انہوں نے اپنے یہاں ایک بہلی کرلی تھی۔ غریب آدمی بے چارے کرایہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ شریف آدمی ،ذات کے سید۔ مگر اللہ بچاوے مفلسی بھی عجب چیز ہے سب کچھ کرالیتی ہے وہ کہنے لگے کہ میں ایک گاؤں میں اپنی بہلی کرایہ پر لے گیا وہاں رات کو ٹھہرانا پڑا۔ اول تو سب سے زیادہ ذلیل جگہ مجھے ٹھہرایا۔ مجھے اس قدر پیچ وتاب کہ بس! کھا جاؤں کچوں کو۔ مگر کہا کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ ظاہر کرتے ہوئے بھی شرم آئی کہ میں سید ہوں بس اندر ہی اندر لوٹ کر رہ گیا۔ اتنے میں مکان والے کے لڑکے نے آواز دی کہ او بہلبان کے! گھس لے لے۔ کہنے لگے کہ میں جلا ہوا تو بیٹھا ہی تھا۔ یہ سن کر بس آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہ ابے گدھے! یہ تو نے کیا کہا کہ بہلبان کے! ارے اگر ہم

بہلی چلانے لگے ہیں تو کیا ہمارے باوا بھی بہلبان ہو گئے۔ بھس لے لے، بھس لے لے۔ جا ہم بھس نہیں لیتے تیری بھی ایسی تیسی اور تیرے بھس کی بھی ایسی تیسی۔ کہنے لگے میں نے اسی وقت قسم خدا کی کھالی کہ گھر پہنچتے ہی چھوڑوں گا اس کمبخت پیشہ کو۔ چنانچہ آتے ہی بہلی اور بیل بیچ ڈالے۔

تو میر صاحب کا ذہن خواہ مخواہ اس طرف گیا کہ یہاں اضافہ مقصود ہے واقع میں اس لڑکے سے پوچھو اس کا مطلب یہ نہ تھا اھل البیت اور ٰی بمافیہ کے ''کا'' لفظ تو برائے بیت ہی تھا۔ جیسے ایک میاں جی سکندر نامہ پڑھا رہے تھے جب یہ شعر آیا۔ بزرگا بزرگی وہا بیکسم

تو اس کا مطلب اس طرح بیان کیا۔ بزرگا یہی بزرگا۔ بزرگی یہی بزرگی۔ دہا کے معنی لغت میں دیکھ کر بتائیں۔ بیکسم برائے بیت ہے آگے چل بھائی۔ تو غرض کا جو ہے یہ برائے بیت ہے لوگ اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ ان کا مقصود اس پکارنے سے کہ او بھنگی کے یہی ہے کہ او بھنگی۔ یعنی تو ایسی ذلیل قوم سے ہے اور صاحب اب بھی ایسے متکبر لوگ موجود ہیں۔

اپنے ایک عزیز ہی کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے وہ ایک دوسرے قصبہ کے رہنے والے۔ ہمارا یہ قصبہ بڑا متکبر مشہور ہے مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں۔ یہاں تکبر اتنا نہیں البتہ تیزی ہے۔ اور قصبات میں بہت تکبر ہے۔ چنانچہ یہاں سے ایک قصبہ میں جہاں وہ عزیز رہتے ہیں ہمارا ایک طالب علم کسی اپنے کام کو گیا وہ نومسلم ہے۔ وہ چمار کا لڑکا تھا۔ مسلمان ہو گیا ہے۔ وہاں جا کر اس عزیز کو معلوم ہوا کہ یہ پہلے چمار تھا پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ کہا قرآن مجید! یہ سن کر انہوں نے اسے بہت گالیاں دیں اور کہا خبردار! ابے چمار کے جو تو نے قرآن پڑھا۔ تو اور قرآن کا پڑھنا۔ ابے کہیں تو پٹے گا تو نہیں۔

تو یہ انہوں نے جناب نصیحت کی۔ بھلا کتنی دلیری اور گستاخی کی بات ہے میں نے کہا خدا تعالیٰ کافر کو چاہیں تو مومن کر دیں اور مومن کو چاہیں تو نعوذ باللہ کافر کر دیں اس کی قدرت سے ڈرنا چاہیے۔

قدرت کا کرشمہ

اس کی وہ قدرت ہے۔

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو ☆ لاوے بتخانہ سے وہ صدیق کو

یہ گلزار ابراہیم کا شعر ہے یہاں صدیق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ''انه كان صديقا نبيا'' (بیشک وہ سراپا صدق نبی تھے) وہ بت خانہ سے کعبہ میں آئے بت خانہ کیا؟ آذر کی آغوش! یا کسی بت خانہ میں پیدا ہوئے ہوں یا پرورش پائی ہو۔ مجھے

تاریخ کی تحقیق نہیں۔ مگر آذر کا آغوش بت خانہ تو تھا ہی۔ بلکہ اس کے سامنے بت خانہ کی بھی کیا حقیقت تھی۔ سینکڑوں بت خانے اس آغوش اور اس بازو ہی سے تو وجود میں آ گئے۔ بت خانہ تو کیا چیز ہے وہ تو بت گر تھا مگر خدا تعالیٰ کی وہ قدرت ہے کہ اس بت خانہ میں صدیق کو پیدا کر دیا۔

کعبہ میں پیدا کرے زندیق کو

کعبہ سے مراد مکہ ہے شعراء وغیرہ سارے شہر کو کعبہ کہہ دیتے ہیں کیونکہ کعبہ ہی کی وجہ سے تو وہ شہر ہوا ہے اور زندیق سے مراد ابوجہل ہے یعنی مکہ میں ابوجہل جیسے کافر اکفر کو پیدا کر دیا۔

اس کو فرماتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ۔

حسن زبصرہ بلال ازحبش صہیب ازروم ☆ زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومیؓ کو روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ فکر یہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے اور عجیب تصوف ہے کیا ملیامیٹ کیا ہے تکبر کو۔ فرماتے ہیں کہ حبش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پیدا کر دیا۔ یہاں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بڑا شخص پیدا ہوگا کسی کو خبر نہ تھی کہ یہاں بلالؓ پیدا ہوں گے جو محبوب اور مقبول ہوں گے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایسے کہ جو خدا کے محبوب ہیں اور ان کا اتنا بڑا درجہ ہوگا کہ ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمائیں گے کہ اے بلالؓ! تم کون سا عمل کرتے ہو کہ جب میں شب معراج میں سیر کرتا ہوا جنت میں پہنچا تو میں نے اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی کھسکھساہٹ سنی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ حضرت بلالؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے۔ نہیں! بلکہ آگے آگے جو جا رہے تھے خادم کی حیثیت سے جا رہے تھے صورتاً آگے تھے معنیً آگے نہ تھے جیسے ارجاع الضمیر قبل الذکر ہوتا ہے کہ وہاں گو مرجع موخر ہے ذکراً لیکن رتبۃً مقدم ہے تو بھائی نحو میں تائید بھی اس کی موجود ہے اور دنیا میں بھی تو بہت سے امراء ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے آگے خادم چلتے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلالؓ جنت میں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے مگر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم۔ لیکن یہ رتبہ کیا کچھ کم ہے کہ خادم کی وہ قسم بنے جو مخدوم کے آگے آگے چلتی ہے۔

تو بھلا یہ کسی کو خبر تھی کہ حبشہ میں دو کالے کلوٹے لوگوں کے درمیان ایک اس درجہ کا شخص پیدا ہو جائے گا اور کس کو خبر تھی کہ حسن بصریؒ بصرہ میں اور صہیب رومیؓ جیسے بزرگ دار النصاریٰ

میں پیدا ہوں گے۔ بھلا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ؎

حسنؒ زبصرہ بلالؓ ازجبش صہیبؓ ازروم ☆ زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجی ست

(حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومیؓ کو روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے اور عجیب تصرف ہے)

حسن تو بصرہ میں پیدا ہوں اور بلال حبش میں اور صہیب روم میں اور مکہ کی خاک میں کون پیدا ہوا ابوجہل! ہاں تو حضرت خدا سے ڈرنا چاہیے۔ اپنے ایمان پر بھی مغرور نہ ہونا چاہیے اور کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ غافل مرو کہ مرکب مردان مردرا

ہائے خوب ہی تعلیم ہے۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مردرا ☆ درسنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند

(غفلت سے مت چل کہ حق تعالیٰ کے راستے کے شیران طریق بڑے بڑے مجاہدات سے سلوک کو طے کیا ہے) اور۔

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ☆ ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(اس راہ میں ناامید مت ہوتا کہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گناہگار ایک آہ اور ایک نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

خدا کا مقابلہ

واقعی ''رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند'' یہ ہوا بھی ہے۔ منشی محمد جان مارہرہ کے جو کانپور میں رہتے تھے خود مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ مارہرہ میں ایک آزاد مشرب شخص تھا۔ کوئی عیب دنیا کا نہ تھا جو اس میں موجود نہ ہو۔ لوگ اس کی شرارتوں پر جب اسے نصیحتیں کرتے کہ بھائی خدا سے ڈرو تو وہ یہی کہہ دیتا کہ میاں تمہیں کیا۔ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں گویا ناز تھا اس کو حق تعالیٰ کی رحمت پر۔ بس حضرت لوگ تو سمجھاتے سمجھاتے مایوس ہو گئے کہ اب اس کی اصلاح نہ ہوگی لیکن ایک دن دفعتاً اس کے منہ سے یہ نکلا کہ خدا جانے میرا حال کیا ہوگا بس یہ کہتے ہی اس پر ایک حالت طاری ہوگئی۔ خدا جانے میرا کیا حال ہوگا۔ یہ تو بولا پھر بولنا بھی چھٹا۔ کھانا پینا بھی چھٹا۔ عیش آرام بھی چھٹا۔ بس نماز کے وقت تو نماز پڑھ لیتا۔ پھر سوا رونے کے اسے

اور کوئی کام نہ تھا۔اس کے رونے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ ہر چند لوگ تسلی دیتے تھے مگر کسی طرح صبر ہی نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں تیسرے دن انتقال کیا۔کوئی شک کر سکتا ہے اس شخص کے شہید ہونے میں تو اب دیکھئے یہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ☆ ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(اس راہ میں ناامید مت ہوتا کہ بہت سے رندان بادہ خوار یعنی گناہگار ایک آہ اور ایک نالہ سے منزل کو بطریق جذب طے کر لیتے ہیں)

تو کبھی کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بھنگی ہے، یہ چمار ہے۔مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کافر رابخواری منگرید ☆ کہ مسلمان بودنش باشد امید

(کسی کافر کو ذلت کی نظر سے مت دیکھنا کیونکہ ابھی ممکن ہے کہ وہ کسی وقت میں اسلام قبول کر کے حسن خاتمہ سے مشرف ہو جائے)

کسی کافر کو بھی ذلیل نہ سمجھنا چاہیے کہ شاید مسلمان ہو جائے نہ کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی ذلیل سمجھا جائے کہ یہ تو نعوذ باللہ! خدا کا مقابلہ ہے۔خدا جانے آئندہ کیا ہونے والا ہے اور ہماری قسمت میں کیا ہونے والا ہے۔اور ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

تو ان منشی جمال الدین کی حکایت میں نے بیان کی تھی اس نومسلم کے اس قول پر کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے تو اس نے مجھ سے یہ کہا کہ چونکہ مسلمانوں کی خاصیت توحید ہے اس لئے اب میں ان سے جدا نہ ہوں گا۔اب میں اسلام کو نہ چھوڑوں گا خیر! اس سے مجھے تسلی ہوئی۔

نور کے آثار

اس پر یہ حکایت یاد آ گئی تھی کہ لوگ ''نور'' چمک کو سمجھتے ہیں۔حالانکہ نور کہتے ہیں اس کو جو ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کر دے۔بس حقیقت یہ ہے نور کی۔اب اللہ نور السموت کی تفسیر میں استعارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سموت اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطہ سے خود بھی ظاہر ہے بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔

تو اب وہ شبہ نہیں رہا کہ ہم نے تو نماز پڑھی تھی کوئی نور نہیں پیدا ہوا۔ہم تو روزہ رکھتے ہیں کوئی نورانیت قلب میں محسوس نہیں ہوتی۔طاعت میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔اب یہ شبہ رفع ہو گیا

کیونکہ نور چمک دمک کا نام نہیں ہے۔ بلکہ نور وہ ہے جس کی میں نے ماہیت عرض کی کہ ظاہر لنفسہ ومظہر لغیر ہ۔ خیر عوام کیا سمجھیں اس کو لیکن اس کی علامتیں اور آثار ہیں جن سے وہ نور کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آگ دکھائی نہیں دیتی تو دھواں تو دکھائی دیتا ہے۔ دھوئیں سے تو پہچان سکتے ہیں کہ آگ موجود ہے آثار کیا ہیں اس نور کے؟

ترمذی کی حدیث ہے اس آیت کی تفسیر میں **فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام** کہ جب شرح صدر ہوتا ہے تو نور قلب میں داخل ہوتا ہے کسی نے پوچھا یا **رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما علامۃ** نور کے داخل ہونے کی کیا علامت ہے فرمایا **التجانی عن دارا لغرور والانابۃ الیٰ دار الخلود**[1]۔ دنیا سے تعلق کا کم ہوجانا اور متوجہ ہوجانا آخرت کی طرف۔ یہ علامت ہے نور قلب کی۔ تو بھائی اس علامت سے ہی سمجھ لو کہ طاعت میں نور ہے یا نہیں۔ تو طاعت میں مشغول ہونے سے یہ علامتیں پاؤ گے اور معصیت کے بعد اس کے خلاف پاؤ گے۔ اس سے معلوم ہوجائے گا کہ معصیت میں ظلمت ہے اور طاعت میں نور ہے۔ اس طرح نور و ظلمت ہونا طاعت کا اور معصیت کا تم پر منکشف ہوگا اور اگر منکشف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ کبھی خالص طاعت کو اختیار کر کے دیکھا نہیں امتحان ہی کے طور پر چندروز خالص طاعت میں گزار لو۔ پھر معصیت کے بعد جو کیفیت ہو اس کو یاد رکھ لو۔ خود فرق معلوم ہوجائے گا۔ وہی آیت صادق آئیگی جو میں نے پڑھی تھی **ھل یستوی الظلمت** ۔ ظلمات اور نور کہیں مساوی ہوسکتے ہیں۔

ذات الانوار

اب یہاں سے معلوم ہوگیا کہ رمضان المبارک کا وہ مہینہ ہے جو مجمع النور ہے اس واسطے کہ اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا جس کی شان یہ ہے کہ ہدی ہے، بینات ہے اور فرقان ہے اور ان میں سے ہر ایک صفت دلالت کرتی ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ فرقان ہونا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ فرق بین الحق والباطل انکشاف پر ہے۔ اور انکشاف نور سے ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اور ایک ہدی کا مادہ ہے وہ بھی دلالت کررہا ہے قرآن مجید کے نور ہونے پر۔ کیونکہ رستہ اسی چیز سے نظر آتا ہے جس کی شان ہو ظاہر لنفسہ ومظہر لغیر ہ۔ اس کو تو ہر شخص جانتا ہے ادھر بینات ہے جس کے معنی ہیں دلائل واضحات۔ اس کا موضع ہونا یہ بھی کاشف ہوتا ہے

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۹: ۳۹۷، ۱۰: ۲۵۵، الدر المنثور للسیوطی: ۳: ۴۴

جو مرادف ہے نور کا۔ تو قرآن مجید کی سب صفتیں ایسی ہیں جن سے اس کا نور ہونا ثابت ہوتا ہے۔

تو حاصل اس آیت کا یہ ہوا کہ رمضان المبارک ایسا مہینہ ہے جس میں ایسی نورانی چیز آئی۔ تو گویا پرانوار ہے یہ مہینہ اور ذات الانوار ہے یہ مہینہ۔ اور جب ذات الانوار ہے تو اس کا رافع الظلمات ہونا لازم ہے۔

اب رافع ہونے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک تو رافع ہونا ہے تکوینی اور ایک رافع ہونا ہے تشریعی۔ سو رفع تکوینی تو باختیار عبد نہیں اس لئے تکوینا تو خود رافع بنایا کہ اس کو مجمع الفضائل بنایا اسباب ظلمت تو اس میں مفقود کیا۔ چنانچہ شیاطین بھی اس میں قید ہوجاتے ہیں اور رفع تشریعی باختیار عبد ہے۔ اس لئے اس پر آگے تفریعاً فرمایا **فمن شهد منكم الشهر** (پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پالے) یعنی جب ایسا مہینہ ہے تو اس کو ظلمات کے رفع کا آلہ تم بھی بناؤ۔ اس طرح سے کہ اس میں خاص عبادت کرو یعنی روزہ رکھو اور اس کے انوار کو آلہ بناؤ رفع ظلمات کا۔ جس کی صورت یہ ہے کہ اطاعت اختیار کرو۔

حاصل یہ کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک لالٹین رکھی ہو بڑی مسجد میں اور یہ کہا جائے کہ اس سے کام لو۔ اور جہاں جہاں ظلمتیں ہوں وہاں لے کر جاؤ تا کہ وہ رفع ہوں یہ تھوڑا ہی ہے کہ رکھی رکھی ساری دنیا کی ظلمات کے رفع کے لئے وہ کافی ہوجائے اسی طرح تم کو بھی یہ مہینہ کیا ملا ہے گویا ایک لالٹین عطا ہوئی ہے مگر اس کو محل ظلمت میں لے بھی تو جاؤ۔ اگر کہیں نہ لے جاؤ تو بیٹھے بیٹھے ظلمت کیسے رفع ہوجائے گی۔ یوں چاہیے وہ نور ایسا ہی قوی ہو جس سے ظلمتیں بلا استعمال بھی رفع ہوسکتی ہوں مگر حق تعالیٰ نے شعاعوں کے پہنچنے کی حد تک پردے قصداً ایسے رکھے ہیں جن سے نور بدوں تصرف کے نہیں پہنچتا۔ تا کہ مکلّف کا مکلّف ہونا بھی تو معلوم ہو ورنہ اگر اس مہینہ میں اعمال ظلمانیہ پر بھی قدرت نہ ہوتی اور طاعات بالاضطرار صادر ہوتیں۔ بخلاف فرشتوں کے تو یہ بھی رفع تکوین میں داخل ہوجاتا ہے اور اس صورت میں مکلّف کا کیا کمال تھا اور اس کو کیا برکت حاصل ہوتی۔

انسان کی فرشتوں پر فضیلت

یہی ظہور کمالات وعطا برکات اس کی وجہ ہے کہ انسان کو مکلّف طاعات کا بنایا کہ **ان شاء افعل وان شاء لم يفعل** کہ ان کا اختیار مشابہ اضطرار کے ہے وہ ترک طاعات پر قادر نہیں۔ انسان کو ان پر خاص شرف دینا تھا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا تو ملائکہ نے عرض کیا کہ وہ تو کھائیں گے بھی پیئں گے بھی فاجعل لھم الدنیا ولدار الآخرۃ۔ ان کے حصہ میں دنیا کر دیجئے ہمارے حصہ میں آخرت۔ ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں۔ بھلا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور جس کو صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے دونوں کو برابر کر دوں یعنی تم کو کہ صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے اور انسان کو جن کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے کیسے برابر کر دوں۔

اب رہا یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں۔ سو اس کا حقیقی علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے باقی حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو خاص توجہ اور عنایت اور اعتنا کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یعنی خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ ان کی نوع بلحاظ مجموعہ کے ملائکہ کی نوع سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر فرد ہر فرد سے افضل ہے یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے بھی افضل ہے ولو باعتبار بعض الافراد۔ اور کیا یہ بات فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فرشتوں کو تو انسان کی خدمت سپرد کی گئی لیکن اس کو ان کی کوئی خدمت سپرد نہیں کی گئی۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ سارے کام انسان کے ملائکہ کے سپرد ہیں۔ یہاں تک کہ خود ان کی خدمت بھی اور ان کی چیزوں کی خدمت بھی۔ ان کی جس گھاس کو بیل کھاتے ہیں اس کی بھی۔ کیونکہ قوت نامیہ سے کام لینے والے وہ ملائکہ ہیں جو مدبرات ہیں ارض وسمٰوٰت کے۔ یہاں تک کہ نطفہ میں بھی ملائکہ ہی تصرف کرتے ہیں۔ جس وقت نطفہ قرار دیا۔ اسی وقت ایک فرشتہ فوراً متعین کر دیا گیا پہلے اس نے علقہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں۔ پھر مضغہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں غرض اخیر تک برابر فرشتہ تصرفات کرتا رہتا ہے۔

اطباء سمجھتے ہیں کہ قوت مولدہ کام کرتی ہے چلو بیٹھو بھی۔ قوت بیچاری کام کیا کر سکتی ہے۔ جب تک کوئی قوت سے کام لینے والا نہ ہو۔ یہ صاحب حکماء کہلاتے ہیں! یہ حکماء ہیں؟ حمقاء ہیں کہ طبیعت کو عدیمۃ الشعور بھی مانتے ہیں اور ایسے افعال بدیعہ کو بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب بہت لتاڑ پڑی کہ بھلا کوئی عدیمۃ الشعور ایسے افعال بھی کر سکتا ہے تو اخیر میں ذرا متاخرین کو ڈھیلا ہونا پڑا اور کہنا پڑا کہ ضعیفۃ الشعور ہے۔ مگر پھر بھی اعتراض باقی ہے۔ یعنی ان کے قول کا حاصل تو یہ ہوا کہ طبیعت بے عقل تو نہیں کم عقل ہے لیکن وہ اعتراض تو پھر بھی باقی ہے کہ کم عقل سے ایسے افعال بدیعہ کیسے صادر ہو سکتے ہیں بلکہ اب اعتراض اور قوی ہو گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقل کا تصرف تو ایک نوع احد پر چلتا رہتا ہے۔ جیسے مشین کہ ایک مرتبہ گھما دینے سے کام کرتی

رہتی ہے تو جو عدیم الشعور ہے وہ کام کو اتنا نہ بگاڑے گا لیکن جو کم شعور ہے وہ بہت بگاڑے گا مشین سے کام اتنا نہیں بگڑتا جتنا اناڑی ۔ ہے۔

سو واقعی ان حکماء نے یہ کیا حماقت کی بات کہی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ اور اس کے قابل ہو جاؤ کہ اللہ میاں فرشتوں سے یہ سب کام لیتے ہیں۔ پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔ ان حکماء نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ہر جگہ اعتراض بخلاف اہل حق کے جو قائل ہیں خدا کے قادر مطلق اور مختار مطلق ہونے کے ان پر کوئی اشکال ہی نہیں واقع ہوتا۔ البتہ حکماء کی طرف سے ان پر اخیر سوال یہ ہے جس پر ان کو بڑا ناز ہے کہ اختیار تو قدیم ہے پھر خاص وقت میں احد المقدورین کو ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہے۔ جواب یہ ہے کہ مرجح ارادہ ہے ۔ اس پر سوال کیا گیا ہے کہ کسی خاص وقت میں ارادہ کیوں مرجح ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ارادہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ ترجیح احد المقدورین من شاء جب یہ ترجیح اس کا ذاتی ہے خواہ یوں کہئے کہ اس کا لازم ہے اور ذات اور ذاتی کے درمیان اسی طرح ملزوم ولازم کے درمیان تخلل جعل کا محال ہے اس لئے اس ترجیح کی علت کا سوال ہی لغو ہے۔ بس بند ہو گیا ناطقہ۔ ایک اسلام نے ساری اشکالات کو حل کر دیا۔ اور وہ اصولاً وفروعاً ہر طرح سے بے غبار رہ گیا۔

انسان کی حیثیت

بہر حال تسخیر ملائکہ سے انسان کا کتنا بڑا شرف ثابت ہوا البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شرف اسی وقت تک ہے جب تک حق تعالیٰ سے اس کو تعلق ہے دیکھو! ہمارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے تو اپنے بیٹوں سے اس کی خدمت کراتے ہیں۔ حالانکہ بیٹا نسبت میں اس شخص سے زیادہ قریب ہوتا ہے مگر مہمان ہونے کی وجہ سے وہ بیٹے سے زیادہ معزز ہے لیکن اسی وقت تک معزز ہے جب تک وہ مہمان ہونے کے تعلق کو قائم رکھے ورنہ اگر اپنی کسی حرکت سے اس تعلق کو منقطع کر دیا تو پھر اسی بیٹے کے ہاتھوں جس کو خدمت کرنے کا حکم تھا جوتیاں بھی لگوائی جاتی ہیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک شخص نے چند صلحاء کی دعوت کی تھی۔ میزبان کے لڑکے نے سب کے ہاتھ دھلائے ان میں سے ایک صاحب جو مدعیان صلاح میں سے تھے آزاد سے تھے انہوں نے اس قدر نالائق حرکت کی کہ اس لڑکے کے رخسار پر محبت نفسانیہ سے ہاتھ پھیرا۔ صاحب مکان نے دیکھ لیا۔ فوراً خدمت گار کو حکم دیا کہ ان سب نالائقوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دو۔ ایک نالائق کی وجہ سے بھی بے چارے نکالے

گئے۔لوصاحب یا تو مہمان تھے بیٹا خدمت کررہا تھا یا نوکروں سے کان پکڑوا کر نکالے گئے۔

تو حق تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا مہمان کر کے بھیجا۔ اور فرشتوں کو اس کے کام میں لگا دیا۔ بقول ذوق

دنیا میں ہے جو کچھ وہ سب انسانوں کیلئے ہے ☆ آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے

لیکن یہ خدمت اور مہمانداری اسی وقت تک ہے جب تک ہم مہمانی کے اہل ہیں اور اگر مہمانی کے خلاف ذرا کوئی حرکت کی تو کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں گے اتنا فرق ہے کہ وہاں اسی وقت ذلیل کر کے نکال دیئے جاتے ہیں یہاں ایک میعاد مقرر ہے دسترخوان کے لئے۔اس میعاد تک۔گو ہم سے کیسی ہی نالائق حرکتیں سرزد ہوں ہم مہمان ہی قرار دیئے جاتے ہیں جیسے بعضے کریم النفس ہوتے ہیں کہ جب کسی نے دسترخوان پر کھانا شروع کر دیا تو کریم النفس میزبان اس کی نالائقیوں پر چشم پوشی کرتا ہے اور صبر کرتا ہے کہ اب میں کیسے اس کھاتے ہوئے کو اٹھا دوں لیکن جب میعاد ختم ہوگئی۔اور گھر سے ہو گئے باہر پھر وہ جوتے پہ جوتا۔انہیں کے ہاتھوں ذلیل کرائے جائیں گے جن سے کہ اب خدمت کرائی جارہی ہے یعنی ملائکہ سے۔بہر حال یہ ثابت ہوا کہ انسان کا کمال زیادہ تر اسی پر مبنی ہے کہ اس سے اضطراراً کام نہیں لیا جاتا۔وہ اپنے اختیار سے مجاہدہ کرتا ہے۔

ماہ رمضان کی عبادات

اس لئے رمضان کو اس کے لئے اضطراراً رافع ظلمات اعمالیہ نہیں بنایا گیا۔ بلکہ اس کو خود حکم ہوا ہے ان ظلمات کو رافع اس کو تم خود بناؤ۔یعنی اپنے اختیار سے مجاہدہ کر کے رمضان کو پرانوار بناؤ۔اس طرح سے ان انوار کو محل ظلمات میں پہنچاؤ اپنے عمل کے ذریعہ سے۔اس لئے فرمایا **فمن شهد منكم الشهر فليصمه**،تو اس طرح یہ آیت دلالت کرتی ہے حقوق رمضان کے وجوب پر۔جیسے کہ میں نے تقریر بیان کی بعد مقدمات کے۔

اس مہینہ پر علاوہ صوم کے اور بھی چند عبادتیں مشروع ہیں۔ان میں سے ہر عبادت کی حقیقت میں غور کرنے سے میرا یہ دعویٰ ثابت ہو جائیگا کہ واقع میں یہ مہینہ محل انوار ہے چنانچہ مجموعہ میں سے۔

ا: ایک عبادت ہے اس کے اندر روزہ کی جو آیت میں صریح مذکور ہے۔

۲۔ایک عبادت ہے اس کے اندر تراویح کی جس کی طرف ذکر قرآن سے اشارہ ہے

۳۔ایک عبادت ہے اس کے اندر اعتکاف کی جس کا ذکر بعد میں ہے۔

۴۔ایک عبادت ہے اس کے اندر احیاء لیالی قدر کی جس کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے۔

۵۔ایک عبادت ہے اس کے اندر کثرت تلاوت قرآن مجید کی۔ اس کی طرف بھی ذکر قرآن ہی میں اشارہ ہے۔

یہ گویا اس وقت پانچ عبادتیں ذہن میں حاضر ہیں۔ اب ہر ایک کی حقیقت میں اور ذات میں غور کرنے سے جو میں نے دعویٰ کیا ہے اس کی تائید ہوگی سب کو تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں۔

کثرت تلاوت

چنانچہ ایک عبادت ہے تلاوت قرآن مجید کیونکہ حق جل علاشانہٗ کے ارشاد سے رمضان شریف کا محل نزول قرآن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مناسبت تلاوت قرآن مجید کی رمضان شریف کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے باقی خاص رمضان المبارک میں تلاوت کی کثرت کی حدیث قولی یا فعلی میں میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن میری نظر وسیع نہیں ممکن ہے کوئی روایت ہو جو میری نظر سے نہ گزری ہو لیکن ایک سنت اس وقت میرے ذہن میں ہے اس سے استدلال کرنا کافی ہوگا۔

وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان المبارک کے مہینہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرمایا کرتے تھے۔ اور جس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ اس رمضان میں جبرئیل علیہ السلام نے دوبار دور کرایا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قرب وفات پر استدلال فرمایا یعنی معلوم ہوتا ہے میرے لئے اگلا رمضان آنے والا نہیں ہے۔ میں اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا۔ اسی لئے دو دفعہ دور کرایا گیا تاکہ اگلے رمضان کا دور بھی اسی رمضان میں ہو جائے۔

اب یہ ظاہر بات ہے کہ یہ دور جو ہر سال رمضان المبارک میں ہوا کرتا تھا غیر تراویح میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس سنت سے اور دوسرے اس حدیث سے کہ رمضان شریف میں اور دنوں سے زیادہ آپؐ اجتہاد فرماتے تھے۔ اور تلاوت ہمیشہ مطلوب ہے تو رمضان میں زیادہ مطلوب ہوگی۔ ان دونوں سے مدعا ثابت ہو سکتا ہے۔

غرض اس سے معلوم ہوا کہ ایک عبادت رمضان المبارک کی مطلوب عبادات میں سے تلاوت قرآن مجید بھی ہے اور قرآن مجید کا نور ہونا ھدًی للناس وبینات من الھدٰی والفرقان میں بیان فرما ہی دیا ہے یہی دلیل کافی ہے اس عبادت کے نور ہونے کی۔

ایک جز و رمضان المبارک کی عبادات کا روزہ ہے جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ فمن

شھدمنکم الشھر فلیصمه . (تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پالے اسے چاہئے کہ روزہ رکھے)

ترک معصیت

اب رہا روزہ کا نور ہونا۔ سو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ روزہ کس طرح سے نور ہے تو روزہ کی حقیقت دیکھنی چاہیے کہ کیا ہے حقیقت یہی ہے لذات کا ترک کر دینا، شہوات کا ترک کر دینا۔ تو لذات کے ترک سے اور شہوات کے ترک سے خود مشاہدہ ہوسکتا ہے کہ قلب کے درمیان ایک کیفیت نور کی اور انشراح کی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاصی میں دو درجے ہیں۔ ایک تقاضا اور ایک اس تقاضے پر عمل۔ اور بالفعل اور عمل کا ظلمت ہونا معلوم ہی ہے۔ باقی تقاضا گو وہ بالفعل ظلمت نہیں مگر بالقوہ ظلمت ضرور ہے اور بالقوہ شرط ہے بالفعل کی اور شرط کا فوت مستلزم ہے فوت مشروط کو۔ اور روزہ سے تقاضے میں کمی آتی ہے تو فعل میں بھی کمی آئیگی تو دونوں درجے ظلمت کے اس سے منفی ہو گئے۔ پھر نور ہونے میں کیا شبہ رہا۔ روزہ اس طرح نور ہوا۔

لیکن یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قوت کے مرتفع و منفی ہونے کے معنی اصطلاح میں ضعیف ہو جانے کے ہیں نہ کہ بالکل معدوم ہو جانا۔ اور یہ بہت کام کی بات ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ عموماً! اس وقت کے صوفیاء ترک لذات کی نسبت اور ترک تعلقات کی نسبت یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قطع کا حکم ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اصطلاحی ہیں۔ ان کو لغت پر محمول نہ کرنا چاہیے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لذات کو بالکل فنا کر دینا چاہیے اور اخلاق ذمیمہ بالکل معدوم ہو جانے چاہئیں۔ تو اس غلطی میں پڑنے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ بعد مجاہدہ کے جب دیکھتے ہیں کہ نفس میں ان چیزوں کا پھر تقاضا ہونے لگا ہے تو مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمارا سارا مجاہدہ ہی برباد گیا۔

اور مایوس ہونے سے یہ ضرر ہوتا ہے کہ پہلے جو تھوڑی بہت مجاہدہ کی توفیق تھی اس کو بھی ترک کر بیٹھتے ہیں جب اس کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے جو مواد خبیثہ میں اضمحلال ہو گیا تھا۔ وہ جاتا رہتا ہے اور پھر اس مواد خبیثہ میں جوش و خروش پیدا ہو کر معاصی کا صدور ہونے لگتا ہے۔ دیکھئے کتنا ضرر ہوا ذرا سی اصطلاح کے نہ جاننے سے تو قوت کے مرتفع ہونے کے معنی قوت میں اضمحلال ہو جانے کے ہیں۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب مکرر سمجھئے کہ روزہ میں خاصیت ہے اضمحلال داعیہ شہوت کی جس کا نام تھا قوت۔ جب قوت کا درجہ ضعیف ہو گیا تو فعلیت کا درجہ بدرجہ اولیٰ ضعیف ہو جائے گا اور معاصی سے احتراز آسان ہوگا اور طاعت کی توفیق ہوگی۔ جب معاصی سے

احتراز ہوگا جو سبب ظلمت ہیں اور طاعت کی توفیق ہوگی۔ تو ظاہر بات ہے نور پیدا ہو ہی گا۔ اس اعتبار سے روزہ بھی نور ہوا۔

ایک عبادت تھی تراویح۔ اس کا نور ہونا بھی ظاہر ہے۔ اول تو خود حدیث میں ہے **الصلوۃ نور**[1] دوسرے نور ہونا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ظلمت کو رفع کرتا ہے۔ اسی طرح نماز مرتفع کرتی ہے منکرات اور شہوات کو جیسا کہ ارشاد ہے: **ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشآء والمنکر** (بیشک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) اور منکرات وشہوات کا ظلمت ہونا ظاہر ہے۔ غرض تراویح کا نور ہونا اس طرح سے معلوم ہوا۔

جامع جمیع عبادات

ایک عبادت اعتکاف ہے۔ اس کی حقیقت ہے خلوت اور خلوت میں جو نور پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کوئی شک وشبہ نہیں۔

ایک عبادت احیاء لیالی قدر رمضان ہے۔ یہ احیاء تو سب راتوں میں عبادت ہے لیکن خود لیالی قدر کی عبادت کی فضیلت قرآن مجید میں مذکور ہے۔ **لیلۃ القدر خیر من الف شھر ، تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم**۔ (شب قدر ایک ہزار مہینہ (کی عبادت) سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے اترتے ہیں) ملائکہ اہل نور ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نور والوں کی صحبت سے نور پیدا ہوتا ہے۔ اہل اصطلاح کی صحبت سے صلاح کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اہل فسق کی صحبت سے فسق کا مادہ پیدا ہوتا ہے اہل ظلمت کی صحبت میں ظلمت ہوتی ہے۔ اہل نور کی صحبت میں نور ہوتا ہے۔ یہ خاصیت خاص ہے شب قدر کے ساتھ۔

خلاصہ یہ کہ رمضان کیا ہوا مجمع انوار ہوا۔ یوں تو سب طاعات انوار ہیں۔ مگر یہ خاصیت رمضان المبارک ہی میں ہے کہ تمام انوار اس میں جمع ہو گئے ہیں پھر اس میں جو عبادت بھی ہے اپنی کامل ہیئت کے ساتھ ہے۔ بخلاف دوسری عبادات جامعہ کے جن میں یہ بات نہیں۔

مثلاً اہل لطائف نے نماز کو جامع جمیع عبادات کہا ہے۔ اس طرح کہ نماز کے اندر نماز تو ہے ہی۔ تلاوت قرآن مجید بھی ہے۔ کھانا پینا بھی نماز کے اندر ممنوع ہے وہ گویا روزہ کے معنی ہوئے

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الطھارۃ باب: ۱، رقم: ۱۰۰، سنن الترمذی: ۳۵۱۷، سنن النسائی کتاب الزکوٰۃ باب: ۱، سنن ابن ماجہ: ۲۸۰، ۳۲۱۰

نمازی متوجہ ہوتا ہے خانہ کعبہ کی طرف، وہ گویا حج کے معنی ہوئے۔ کسی سے بولتا چالتا نہیں اور مسجد کے اندر ہی رہتا ہے۔ تو گویا نماز میں معنی اعتکاف کے بھی ہوئے۔ کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً کپڑا ہی بنایا جانماز ہی خریدی گویا معنی زکوٰۃ اور انفاق کے بھی نماز کے اندر پائے گئے۔ تو اس طرح سے بعض عبادات کے غیر رمضان میں بھی جامع الانوار ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ نماز کے اندر تو اور عبادات کے صرف معنی ہی پائے جاتے ہیں۔ اور رمضان المبارک میں ہر عبادت اپنے کامل ہیئت پر موجود ہے چنانچہ نماز کے اندر جو روزہ کی صفت پائی جاتی ہے وہ صرف ایک ساعت کے اعتبار سے ہے اور ایک ساعت کا روزہ اس کی صورت اصلی کے اعتبار سے کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اعتکاف بخلاف رمضان المبارک کے کہ اس میں جتنی چیزیں ہیں سب مستقل طور پر موجود ہیں۔ صوم ہے وہ مستقل قرآن مجید کی تلاوت ہے وہ مستقل اعتکاف ہے وہ مستقل ،لیالی قدر کی بیداری ہے وہ مستقل ۔ یہ سب مستقل ہیں۔ یہ خاصیت کسی زمانہ میں یا کسی طاعت میں نہیں ہے۔ ایسی جامعیت ہے اس کے اندر۔ اس سے آپ قدر کر سکتے ہیں کہ رمضان شریف کیا چیز ہے جب یہ ایسی چیز ہے تو جو اس کے حقوق ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہوا۔ وہ حقوق کیا ہیں؟

روزہ کے متعلق معاصی

ایک تو وہ حقوق ہیں جو مشترک ہیں تمام طاعات رمضان میں اور ایک حق ہے خاص خاص طاعات کے متعلق معاصی کا ترک کرنا۔ مثلاً روزہ کے متعلق اور معاصی ہیں نماز کے متعلق اور معاصی ہیں یہاں نماز سے مراد وہ نماز ہے جو خاص ہے جس کو تراویح کہتے ہیں جو نماز عام ہے وہ مراد نہیں ہے۔

غرض ہر ایک کے متعلق جدا معاصی ہے مثلاً روزہ کے متعلق جو معاصی ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ قسم جس سے روزہ کی حقیقت میں فرق آ جائے یعنی عدم امساک عن مفطرات الصوم یا جوان آدمی نے جس کو اندیشہ جماع کے ارتکاب کا ہو مس اور تقبیل سے احتراز نہ کیا۔ یہ بھی اس ہی کے ساتھ حکماً ملحق ہے۔

اور ایک وہ قسم جن سے روزہ کی حقیقت میں تو فرق نہیں آتا لیکن کمال میں مخل ہیں جیسے بری نگاہ سے کسی کو دیکھنا، کسی کی غیبت کرنا یا کوئی ناجائز کام ہاتھ سے کرنا یا پاؤں سے ناجائز موقع کی طرف چلنا۔ شطرنج، گنجفہ کھیلنا، گانا بجانا یا سننا یا ناچ دیکھنا وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر اقبح اور اشنع یہ ہے کہ روزہ ہی نہ رکھے۔

چنانچہ پارسال رمضان گرمی میں آیا تھا۔ اب ہر سال دس دس دن مقدم ہوتا چلا جائیگا یعنی اس سے پہلا رمضان پورے جون میں تھا۔ مگر بہتیرے لوگوں نے جوئیں ہی ماریں بیٹھکر۔ اب کا رمضان جون کے مہینہ سے دس دن پہلے شروع ہوجائے گا یعنی ۲۰ مئی سے۔ اگلے سال ان شاء اللہ اور دس دن پہلے شروع ہوگا۔ پھر ان شاء اللہ یکم مئی سے ہوگا۔ پھر اپریل میں پڑے گا۔

غرض! اب ہر سال سردی ہی کی طرف ہٹتا چلا جائے گا۔ پھر سردی کے زمانے میں ہونے لگے گا۔ اور ہر چند یہ زمانہ گرمی کا ہے جس میں اب کے سال رمضان المبارک آرہے ہیں مگر اب تک تو بفضلہٖ تعالیٰ گرمی پڑی نہیں۔ بہت ڈر رہے تھے کہ خدا خیر کرے اب کے رمضان میں بڑی گرمی ہوگی۔ مگر خبر بھی ہے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے گرمی کو سردی سے بدل دیا۔ **فاولٰئک یبدل اللہ سیئات حسنات** (تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کا نمونہ ہوگیا اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ مہینے سب گرمی کے ہیں۔ اپریل، مئی، جون۔ اپنے مہینوں کے نام اسلئے نہیں لئے کہ وہ مختلف موسموں میں واقع ہوتے ہیں اس لئے غیروں کے مہینوں کے نام لئے ہیں کہ حساب آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ تو یہ اپریل اور مئی اور جون سخت گرمی کے مہینے ہیں مگر چند سال سے میں دیکھتا ہوں کہ گرمی بھی بہت دنوں میں شروع ہوتی ہے۔ یعنی ضابطہ سے جو زمانہ گرمی شروع ہوجانے کا ہے اس وقت بھی سردی ہوتی ہے۔

غرض گرمی کا زمانہ شروع ہوجانے کے بعد بھی بہت دنوں تک سردی ہی رہتی ہے اب بھی راتوں کو دیکھئے ٹھنڈ ہوتی ہے۔ دن کو بھی اور صبح شام کو بھی۔ ایسی گرمی پریشانی کی نہیں ہوتی اب جب مئی سے کھسک کر اپریل کے اخیر عشرہ میں رمضان شروع ہوں گے تو اور سردی ہوگی۔ پھر ۱۱ اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر یکم اپریل کو اور سردی میں ہوں گے پھر مارچ میں آجائیں گے تو اور سردی ہوگی۔

غرض اب اپنے دل سے ڈر نکال دو کیونکہ سردی ہی کی طرف جارہے ہیں اور جب تک گرمی میں ہیں گرمی سے بھی نہ ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ گرمی بھی اب رفتہ رفتہ سردی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ کرلیا۔ اور میرا خیال ہے کہ عجب نہیں کچھ زمانہ کے بعد گرمی ہی بالکل جاتی رہے۔

اتلاف حق

مجھے خیال اس لئے ہوا کہ میں نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے متعلق ایک پیشین گوئی سنی ہے وہ پیشین گوئی یا تو کشف ہے یا فراست ہے کیونکہ

مولانا کا دماغ بہت صحیح تھا۔ بزرگوں کے جدا جدا حالات ہیں مولانا کو کشف سے بہت مناسبت تھی۔ گو کشف ہونا کوئی ایسے زیادہ کمال کی بات نہیں لیکن صاحب فراست بھی غضب کے تھے۔ ایسے عالی دماغ اور صحیح المزاج تھے کہ میں نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ پہلے یہ کیفیت تھی (بعد کو یہ کیفیت کم ہوگئی تھی کیونکہ ایک بار گھوڑے پر سے گر گئے تھے جس سے دماغ پر صدمہ پہنچا تھا) کہ کوئی ایک دفعہ بھی چادر اوڑھ کر دے دیتا تھا تو اسے سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ مرد نے اوڑھا ہے یا عورت نے۔ اس قدر صحیح دماغ تھا ان کے صاحبزادہ مولوی حکیم معین الدین صاحب موجود ہیں۔ انہوں نے عجیب غریب حکائتیں مولانا کی صحت دماغ کی سنائی تھیں۔

اب اس پیشین گوئی کو یا تو کشف کہئے یا فراست سمجھئے۔ میں کم سن تھا یعنی اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ اس وقت حضرت نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بھائی چند روز میں ہندوستان بھی کشمیر ہو جائے گا۔ حالانکہ اس زمانہ میں بڑی سخت گرمی پڑتی تھی مگر ممکن ہے مولانا کو خفیف فرق محسوس ہو چلا ہو۔ صاحب چند سال تک تو کچھ فرق معلوم نہ ہوا۔ البتہ مولانا کی وہ بات یاد رہی۔ پھر تو میں بھی تھوڑا بہت فرق محسوس کرنے لگا۔ اور اب تو بہت ہی فرق ہو گیا ہے جو سخت گرمی کا زمانہ ہونا چاہیے اس میں بھی سردی ہوتی ہے۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ ڈرو مت جب گرمی میں سردی ہے تو سردی میں سردا ہوگا یعنی بہت قوی سردی ہوگی۔

سردا جو میں نے اس وقت کہا اس پر یاد آ گیا ایک قصہ لطیف۔ یہاں تھانہ بھون میں کسی کے سامنے کسی نے نقل کیا کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں تو بولتے ہیں مثلاً دہی میٹھی ہے لکھنؤ میں بولتے ہیں دہی میٹھا ہے۔ تو آپ سن کر بولے کہ پورب میں کیا دہی کو دہا کہتے ہیں۔

ایک اس سے بڑھ کر ہوئی۔ میرے ایک عزیز ایک بڑے عاقل صاحب سے یہ حکایت بیان کرنا چاہتے تھے انہوں نے اس طرح تمہید اٹھائی کہ بعضے ایسے بیوقوف ہوتے ہیں کہ پوری بات تو سنتے نہیں بے سوچے سمجھے خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا کر ناحق دوسروں کے سامنے ذلیل اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے وطن کا واقعہ ہے ایک صاحب نے ایسی ہی حماقت کی تھی۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک صاحب کے سامنے یہ بیان کر رہے تھے کہ پورب میں دہی کو مذکر بولتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے پائے تھے کہ وہ مخاطب صاحب بڑے بوجھ بجھکڑ بن کر بولے کہ کیا دہا بولتے ہیں۔ اب وہ عزیز چپ کہ آگے کیا کہوں۔ انہوں نے تو اب کچھ کہنے کی گنجائش ہی

نہ رکھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ بیچ میں چپ کیوں ہوگئے پورا واقعہ تو سنایئے پھر کیا ہوا؟ عزیز نے کہا کہ اب اس حکایت کا مزہ ہی نہ رہا۔ میں اب آپ سے کیا کہوں کہ کیا ہوا۔ یہی ہوا جو اس وقت ہوا کہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ کیا دہا بولتے ہیں۔ پھر تو وہ صاحب اس قدر شرمندہ ہوئے جس کی حد نہیں کہ ناحق میں نے بیچ میں بول کر اپنی حماقت ظاہر کی۔

اسلئے میں نے یہ حکایت بیان کی کہ وہ دہی کا مذکر دہا سمجھا۔ اسی طرح میں نے سردی کا مذکر سردا بولا۔ تو سردا پر یہ حکایت یاد آ گئی تھی۔ غرض ڈرومت کہ اب کے رمضان گرمی میں آرہے ہیں۔ اطمینان رکھو ان شاء اللہ بہت آسان رہیں گے۔ اور ابھی معلوم ہوگیا کہ نصف شعبان کو جو روزہ اب کے رکھا تھا وہ بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ آپ ان شاء اللہ تعالیٰ دیکھ لیجئے گا کہ بہت ہی آسانی کے ساتھ روزہ گزریں گے۔ (چنانچہ بفضلہ بہ برکت قول حضرت اب تک نو روز سے نہایت سہولت کے ساتھ ہو چکے ہیں کیونکہ خلاف موسم بجائے گرمی کے اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے بالخصوص بوجہ بارش ہو جانے کے اتنی سردی بڑھ گئی ہے کہ تراویح میں اور نماز فجر میں چادر کی حاجت ہوتی ہے اور دن بھر ابر رہتا ہے امید ہے کہ ختم رمضان تک ان شاء اللہ یہی کیفیت رہے گی)۔

اور یوں کوئی عہدی کہے کہ چاہے سردی ہو یا گرمی ہمیں تو روزہ میں تکلیف ہی ہوتی ہے تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ روزہ ہی فرض نہ ہوتا۔ اور میں اور شکایت کرتا ہوں کہ جو یوں کہتے ہیں کہ گرمی کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا جاتا تو اگر گرمی سبب ہوتا روزہ نہ رکھنے کا تو جس وقت غلبہ ہوتا۔ گرمی کا اسی وقت کھاتے پیتے۔ میرا معمول ہے کہ میں بعد نماز فجر منزل پڑھتا ہوں جنگل کو نکل جاتا ہوں۔ میں نے پارسال رمضان میں دیکھا کہ صبح کا وقت ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور ایک صاحب بیٹھے تربوز اڑا رہے ہیں۔ بھلا فرمایئے یہ کون سا وقت تھا تربوز کھانے کا۔ کیا اس وقت گرمی ستا رہی تھی۔ کیا اس وقت پیاس کا غلبہ تھا؟ کچھ نہیں شرارت ہے۔ بدمعاشی ہے۔ غرض یہ روزہ رکھنا تو پورا اتلاف حق ہے خلاصہ یہ کہ روزے کے تو یہ حقوق ہیں۔

نماز تراویح

دوسری عبادت ہے تراویح۔ اس کی ایسی گت بناتے ہیں کہ خدا کی پناہ! اتنی بڑی نعمت اور سمجھتے ہیں کہ لو اب کم بختی آئی۔ بیس رکعتیں پڑھنی پڑیں گی۔ کوئی حد ہے اور جو کوئی حافظ ہوئے ذرا مجود پھر تو گویا قیامت کا سامنا ہے اول تو ایسے حافظ کو کوئی تجویز ہی نہیں کرتا۔ اور اگر کر بھی لیا تو جلدی

پڑھنے کی فرمائش کر کر کے اسے ایسا تنگ کرتے ہیں کہ آئندہ کے لئے وہ توبہ کر لیتا ہے کہ انہیں تو اب کبھی سناؤں گا نہیں۔ یعنی یوں چاہتے ہیں کہ صرف اٹھک بیٹھک ہو اور بیس پوری ہو جائیں۔

کانپور میں بے چارے ایک حافظ تھے جو ذرا رکوع سجدہ اطمینان کے ساتھ ادا کرتے تھے اور قومہ میں بھی کچھ دیر لگاتے تھے۔ حافظ عبداللہ مرحوم مہتمم جامع مسجد نے خود سنا کہ لوگ بعد تراویح کے اس مسجد سے نکلتے ہوئے یوں کہہ رہے ہیں۔ ارے میاں تراویح کیا ہیں قید خانہ ہے۔ بس جا کر پھنس جاتے ہیں۔ رکوع میں گئے تو رکوع ہی میں ہیں۔ سجدہ میں چلے گئے تو اب سر ہی نہیں اٹھتا۔ التحیات پڑھنے بیٹھے تو اب کسی طرح سلام ہی نہیں پھیرتے۔ جان مصیبت میں آ جاتی ہے۔

غرض یوں چاہتے ہیں مقتدی کہ امام بس التحیات ہی پڑھ کر سلام پھیر دیا کرے اور اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جو حافظ ریل ہو اور ریل بھی کون سی مال گاڑی نہیں، پسنجر نہیں، ڈاک نہیں، اسپیشل ہو اور اب اللہ بھلا کرے ایجاد کرنیوالوں کا ریل سے بھی بڑھ کر ہوائی جہاز چل گئے ہیں۔

اب تو لوگ یہ چاہیں گے کہ حافظ جہاز ہوں لیکن لوگ ابھی ہوائی جہازوں پر سوار نہیں ہوئے ورنہ ان شاء اللہ اس کی تمنا بھی کرنے لگیں گے۔ ایک حافظ تھے نابینا۔ مر گئے ہیں بے چارے۔ ان کے تیز پڑھنے کا حال کچھ نہ پوچھو بس گن گن گن گن گن شکوراً بن بن بن بن غفوراً۔ شکوراً، غفوراً کے سوا کچھ خبر نہیں کہ کیا الفاظ منہ سے نکل رہے ہیں اور یہ پتہ تو کیا چل سکتا کون سا رکوع پڑھ رہے ہیں یا کون سا پارہ ہے بس اندھا دھند آندھی کی طرح اڑے چلے جاتے تھے مگر مقتدی ان سے ایسے خوش! کہ سبحان اللہ! کیا ہلکی پھلکی تراویح پڑھاتے ہیں۔ اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی کی ترکیب بتا دوں۔ وہ یہ کہ بالکل نہ پڑھو۔ تو میں نے ترکیب ایسی بتا دی ہے کہ اس سے زیادہ ہلکی پھلکی تراویح ممکن ہی نہیں کیونکہ ہلکی پھلکی ہونے کے بھی مراتب ہیں جیسے جلدی کے مراتب ہیں جلدی کی حکایت سنئے۔

ایک نائی کو کسی اس کے ججمان نے کوئی ضروری خط دیا کہ فلاں شخص کو جا کر دے آ۔ وہ خط اس سے کہیں کھو گیا۔ تھا بڑا چالاک۔ شریر نے کیا حرکت کی کہ ایک سادہ کاغذ لے کر اور اسے ایک سادہ ہی لفافہ میں بند کر کے بس مکتوب الیہ کے پاس پہنچ گئے اور اسے دے کر کہا کہ میاں نے یہ لفافہ آپ کے نام بھیجا ہے اس نے کہا اور اس پر کچھ پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے نائی نے کہا حضور جلدی بہت تھی پتہ لکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ خیر تو کھول کر دیکھا تو اندر بھی ایک سادہ کاغذ رکھا ہوا ملا جس پر کوئی تحریر نہ تھی۔ الٹ

کر دیکھا کہ شاید دوسری طرف لکھا ہو۔ مگر ادھر بھی کورا نظر آیا۔ اب تو بڑے چکرائے۔ پوچھا میاں کچھ کہو تو آخر یہ معمہ کیا ہے کہ نہ باہر کچھ لکھا ہے نہ اندر۔ یہ خط ہی کیا ہوا۔ اس نے کہا حضور میں نے تو عرض کیا بہت جلدی تھی کچھ لکھ ہی نہ سکے۔ پوچھا کچھ زبانی کہہ دیا ہے۔ کہا حضور کہاں بہت ہی جلدی تھی۔ زبانی کہنے کی بھی فرصت نہیں ہوئی تو یہ سوا مسخرہ پن کے کیا ہوا۔ یہ کوئی جلدی تھی۔

خیر تو تمثیلی حکایت ہے جلدی کی۔ ایک حکایت دیکھی ہوئی بھی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک ملازم تھا عبداللہ۔ بڑا ہی بے وقوف تھا (پھر مزاحاً فرمایا) اور لوگ بھی اس نام کے اس وقت موجود ہیں ان میں سے کوئی مراد نہیں کہیں کسی کو شبہ ہو۔ وہ تو بے چارے مر بھی گئے۔ یہاں جتنے اس نام کے ہیں وہ تو ماشاء اللہ زندہ ہیں (جلسہ وعظ میں ایک نوجوان صاحب اسی نام کے موجود تھے۔ جو حضرت کے پر جوش خدام میں سے ہیں۔ انہیں کی طرف حضرت کا اشارہ تھا۔ انہوں نے اپنی عقلمندی کا اس طرح ثبوت دیا کہ بھرے مجمع میں آپ پکار کر فرماتے ہیں کہ نہیں میں بھی ایسا ہی ہوں پھر بعد کو بہت پچھتائے کہ واقعی مجھ سے حماقت ہوئی کیونکہ بہر صورت یہ حرکت آداب مجلس کے خلاف تھی)۔

دنیا میں بعضے بڑے ہی کم عقل آدمی ہوتے ہیں۔ ایک دن آپ گھر کی طرف سے دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اجی مولانا گھر میں سے یوں کہا ہے کوئی کام تھا جلدی کا۔ وہ گھر میں سے کہلا کر بھیجا تھا کہ جلدی جا کر کہہ آ۔ آپ دوڑے ہوئے پہنچے اور کہا مولانا یوں کہا ہے، مولانا نے جب پوچھا کیا کہا ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ اجی! میں تو بھول گیا ہوں۔ یعنی دوڑنے کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ اہتمام یہ تھا کہ جلدی جا کر خبر دوں۔ اس اہتمام میں دوسری طرف توجہ رہی نہیں اور اس خبر کو بھول گئے جو پہنچانی تھی۔

ہمارے یہاں بھی ایک طالب علم تھے عید وشاہ! مر گئے بے چارے۔ میں نے ایک دن بلا کر ان سے کہا کہ تم حافظ ظریف احمد کو جانتے ہو اس نے کہا جی ہاں جانتا ہوں۔ میں نے کہا وہاں جاؤ۔ آگے میں کہتا ہی کہ وہاں جا کر یہ کرو۔ لیکن کون انتظار کرتا ہے۔ بس یہ سنتے ہی کہ وہاں جاؤ آپ چل دیئے۔ میں نے واپس بلا کر پوچھا کہ تم چل کہاں دیئے کہا حافظ ظریف کے یہاں میں نے پوچھا وہاں جا کر کیا کرو گے۔ کہا بس چلا جاؤں گا جو حکم ہوا تھا کر دوں گا وہ عجب چیز تھے صاحب۔

تو جیسے ایک م ۔ ۔ جلدی کا یہ بھی ہے اسی درجہ ایک درجہ ہلکے پھلکے رہنے کا یہ بھی ہے کہ تراویح

پڑھے یہ نہیں بالکل۔ چنانچہ بعضے ایسا بھی کرتے ہیں۔ارے بندے خدا کے جب نام کیا تراویح کا ۔اور ایک گھنٹہ کی مشقت اٹھائی تو پاؤ گھنٹہ کی مشقت اور سہی۔اور زیادہ وقت تو اٹھتے بیٹھنے میں لگتا ہے۔اچھی طرح ادا کر کے پڑھنے میں اور گھسیٹ کر پڑھنے میں آزما کر اور گھڑی لے کر دیکھ لو۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ تفاوت نہیں نکلے گا۔

پھر افسوس ہے صرف دس پندرہ منٹ کے لئے قرآن کو بگاڑ کر پڑھا جائے اور تراویح کو خراب کیا جائے۔ پھر تراویح سے فارغ ہو کر کوئی کام بھی تو نہیں۔محض باتیں کرنے کے سوا افسوس کی بات ہے کہ تراویح کو تو یوں خراب کرو اور کھانے کو نہ خراب کرو۔ بلکہ رمضان میں تو اور مہینوں سے زیادہ لذیذ کھانے کا اہتمام کرتے ہو کہ بھنا ہوا گوشت بھی ہو، چٹنی کیلئے اچور بھی ہو، وہی بڑے بھی ہوں، پھلکیاں بھی ہوں، گھونگھنیاں بھی ہوں۔شربت بھی ہو وغیرہ وغیرہ۔ پھر شرم نہیں آتی کہ غذائے جسمانی تو اوروں سے اچھی ہو اور غذائے روحانی کو خراب کر کے کھاؤ۔سبحان اللہ! کیا اچھا فیصلہ ہے۔

اور نماز کی تحسین میں یہ بھی داخل ہے کہ اذان وقت سے پہلے نہ ہو۔ بعض مسجدوں میں رمضان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ عشاء کی اذان وقت سے پہلے دے دیتے ہیں۔بس ملاں جی نے کھانا کھایا اور اللہ اکبر پکار دیا۔ بلکہ بعض مسجدوں میں تو وقت سے پہلے نماز بھی شروع کر دیتے ہیں زیادہ اہتمام اس کو ہوتا ہے کہ تراویح سے جلدی فارغ ہو کر لیٹ جائیں۔اور لیٹنے کو یوں جی چاہتا ہے کہ پانی پیتے ہیں بے حد۔ یہ سخت غلطی ہے یعنی طباً بھی مضر ہے۔ذرا پیاس کو روک کر پانی پئیں تو تراویح بھی بشاشت سے ہوں اور قرآن بھی اچھی طرح سن سکیں۔ ہمت والوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۶۱ قرآن شریف ہر رمضان میں ختم کرتے تھے۔ ایک ختم تو روزانہ دن کو کرتے اور ایک رات کو اور ایک وہ جو ہمیشہ تراویح میں پڑھنے کا معمول تھا۔

غرض اس ایک مہینہ میں اکسٹھ قرآن شریف پڑھتے تھے تو دیکھو ایک اللہ کے بندے وہ بھی تو تھے۔

غرض تراویح کہ جو مخصوص عبادت رمضان المبارک کی ہے اس کے وہ حقوق ہیں جو میں نے عرض کئے کہ ٹھیک وقت پر بھی ہوں، رکوع سجود بھی اچھی طرح ہو، تشہد بھی اچھی طرح ہو جلدی مت کرو تلاوت جو اس میں کی جائے وہ بھی اچھی طرح ہو۔

عبادت تلاوت قرآن

ایک عبادت رمضان المبارک کی تلاوت قرآن ہے اس کے حقوق میں سے یہ ہے کہ تصحیح کے

ساتھ پڑھا جائے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اول تو اس کا اہتمام ہی نہیں ہے۔ تصحیح کا طریقہ ہی نہیں سیکھتے اور اگر طریقہ بھی سیکھ لیا تو اس پر عمل نہیں کرتے اور اگر عمل کرتے ہیں تو یاران طریقت پریشان کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے بھائی اچھی قرأت سیکھی۔ قرآن پڑھتے ہو یا جھینکتے ہو۔ کوئی کہتا ہے قرآن پڑھتے ہو یا گاتے ہو۔ کوئی کہتا ہے یہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر کیوں ادا کرتے ہو بس فرفر پڑھتے چلے جاؤ۔ نہیں معلوم یہ فرفر کیا صیغہ ہے کیا فتر ہے جو ماضی ہے اور جس کا مقصد فرار ہے بمعنی بھاگنے کے۔ محاورات میں تطابق بہت ہوتا ہے۔ اردو میں فرفر اسی کو کہتے ہیں جہاں بھاگتا ہوا پڑھا جاتا ہو۔

ایک ہمارے دوست ہیں حکیم صاحب انہوں نے تراویح میں قرآن سنانا چاہا مگر پڑھتے تھے صحیح۔ چنانچہ ولا الضالین کو جو صحیح مخرج سے ادا کیا مقتدی بگڑ گئے کہ ہم ان کے پیچھے تراویح نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ ان بے چاروں کو وہاں سے جدا ہونا پڑا۔ اب یہ مصیبت ہے کہ کوئی تصحیح کے ساتھ پڑھے تو لوگ پڑھنے نہیں دیتے ایک مخلوق پریشان کرنے لگتی ہے یعنی بعضوں نے تو یہ ستا نسخہ یاد کر رکھا ہے کہ ولا الضالین کو ولا الظالین پڑھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ آخر یہ ظ اور ض باہم متشابہ ہیں گویا دونوں الصفات ہیں پھر دونوں میں مغائرت کیسی۔ اسی طرح دوسروں نے یہ ستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ ولا الضالین کو۔۔۔ والدالین پڑھتے ہیں اور داورض کے لئے ض کو ذرا موٹا سا پڑھ دیا اور جہاں دال ہے وہاں باریک سا پڑھ دیا۔

اس موٹے باریک پر مجھے وہی حکایت یاد آتی ہے کہ لکھنو میں تھے ایک مولوی صاحب معقولی جو امامت بھی کرتے تھے۔ وہاں ایک مولوی مہدی تھی وہ بیان کرتے تھے کہ ان معقولی مولوی صاحب کی یہ عادت تھی کہ قریب قریب ہر جہری نماز کے اندر پہلی رکعت میں تو تبت اور دوسری رکعت میں قل ہو اللہ پڑھتے تھے اور وہ تھے تو مولوی مگر قرآن پڑھتے تھے بہت غلط۔ صاحب بعضے تو بہت ہی غلط پڑھتے ہیں یعنی اکثر اہل علم کو بھی تصحیح کی جانب التفات نہیں۔

بریلی میں ایک صاحب من الجنة والناس کی بجائے من الجنات والنس پڑھتے تھے۔ آپ نے یہاں کا الف وہاں جا لگایا۔ یعنی والناس میں جو الف ہے اس کو گرا کر من الجنة میں بڑھا دیا۔ ایسا ناس کیا۔ بس ان سے یہی کہنا چاہیے کہ ام بہ جنہ۔

عاملوں نے بھی تو ایسا ہی ناس کیا ہے انکا معمول ہے کہ اگر کسی کا ناس کرنا ہو تو سورۂ ناس اس طرح پڑھنے کو بتلاتے ہیں۔ قل اعوذ برب الناس ناس ناس ملک الناس ناس ناس الہ الناس ناس ناس۔

غرض ناس کے لفظ کو ہر جگہ ۳ دفعہ پڑھنے کو کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قرآن شریف اردو میں ہے کہ یہاں ناس کے وہی معنی ہیں جو اردو میں ناس کے ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ فلانے کا ناس جائے یعنی ستیاناس ہو لاحول و لاقوۃ.

تو بعض لوگ قرآن شریف کی اس طرح گت بناتے ہیں جیسے کسی بڑھیا نے باز کی گشت بنائی تھی۔ تو اسی طرح وہ ؔنو کے معقولی مولوی صاحب بھی ابی لہب کے بجائے ابی لحب پڑھتے تھے۔ مولوی مہدی کہنے لگے کہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے کہ جب دیکھو تبت یدا ابی لحب وتب کہنے لگے کہ میں نے ایک روز جا کر خلوت میں کہا کہ مولانا آپ کی اتنی بڑی تو شان ہے اور شہرت ہے۔ اور آپ کلام مجید غلط پڑھتے ہیں۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے کہا کیا غلط پڑھتا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ ابی لحب پڑھتے ہیں اور یہ غلط ہے انہوں نے کہا اور کیا پڑھوں کہا یوں پڑھا کیجئے ابی لہب۔ ادب کی وجہ سے ذرا پست آواز سے بتایا۔ یہ سن کر مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں اچھا آہستہ سے پڑھا کروں پکار کر نہ پڑھا کروں۔ سبحان اللہ! کیا خوب مطلب سمجھے۔ یہ مولوی ہیں آج کل کے۔ انہوں نے تو خود ادا کر کے ابی لہب کا صحیح تلفظ بتانا چاہا تھا۔ اور آہستہ سے اس لئے بتایا کہ بے ادبی نہ ہو آپ یہ تو سمجھے نہیں کہ بجائے حاء حطی کے ہاء ہوز پڑھنے کو کہہ رہے ہیں اور سمجھے تو یہ سمجھے کہ شاید میں بہت بلند آواز سے پڑھا کرتا ہوں آہستہ سے پڑھنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا واہ حضرت خوب سمجھے جب انہوں نے کھول کر کہا کہ بھائی ابولہب میں حا حطی نہیں ہے ہا ہوز پڑھا کرو تب کہیں ان کی سمجھ میں آیا۔ یہ مولوی آدمی ہیں صاحب جو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔

آج کل مولوی ہونا کیا مشکل ہے ایک آدھ کتاب صرف نحو کی پڑھ لی۔ کچھ قرآن حدیث کا ترجمہ دیکھ لیا۔ بس مولوی بن گئے۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسے ہی مولوی صاحب اب کے سفر میں ملے کنڈا ایک مقام ہے ضلع اعظم گڑھ میں۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں تحصیلدار۔ میں ان کا بلایا ہوا وہاں گیا تھا۔ ایک صاحب جو مولوی صاحب کہلاتے تھے ملنے آئے جو سب کچھ گزار تھے یعنی تہجد گزار اور شاید مال گزار بھی ہوں یعنی امیر بھی ہوں۔ عمر بھی بہت تھی مگر عمر بھر کسی نے ان کو خرابی قرآن مجید کے ترجمہ دیکھنے کی نہ بتائی تھی۔ حالانکہ بعضوں کے لئے ترجمہ دیکھنا حرام ہے اب لوگ ہمیں متعصب کہتے ہیں متشدد کہتے ہیں مگر ہم کیسے اجازت دیدیں۔ کیا ان تجربوں پر خاک ڈال دیں اور ایک تجربہ نہیں بہت تجربے ہیں ایک تجربہ مجھے اس وقت یاد آ گیا۔ ہاں تو ان

صاحب نے پہلے یہ آیت پڑھی یایھا الذین امنوا لاتقولوا راعنا (اے ایمان والوں تم لوگ (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور انظرنا کہہ دیا کرو) اور اس کا ترجمہ پڑھا کہ اے ایمان والو! "راعنا" مت کہو۔ پھر آپ کیا کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے وقت کیا راعنا کا لفظ چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مت کہو "راعنا"۔ تو اس آیت کا یہ مطلب آپ سمجھے۔ مجھے اس قدر حیرت ہوئی کہ جس کی انتہا نہیں کیونکہ اس سے پہلے ایسا عجیب مطلب میں نے کبھی نہ سنا تھا میں نے کہا کہ جاؤ ہم نہیں بتاتے کہ کیا مطلب ہے۔ بس مطلب یہ ہے کہ خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھ کر قرآن مجید پڑھا۔ بس ساری تلاوت کرتے رہو اور تم راعنا بھی پڑھتے رہو باقی جو مطلب ہے اس آیت کا اسے تم جیسے کوڑھ مغزوں کے سامنے کیا بیان کیا جائے اندھوں کے آگے رووے اپنی آنکھیں کھووے۔ بس خبردار جو کبھی ترجمہ دیکھا۔

تو حضرت وہ جاہل سمجھا تھا کہ ابی لہب جو چپکے سے کہا تھا تو یہ مطلب ہے کہ آہستہ پڑھا کرو۔ انہوں نے کہا مولوی صاحب ڈوب جاؤ۔ کیا خوب مطلب سمجھے۔

تصحیح مخارج کی اہمیت

تو حضرت یہ حالت ہو رہی ہے فہم کی اور بے توجہی کی جیسے چھوٹی کو موٹا کر کے پڑھ دیا تو بڑی طرح ہوگئی ایسے ہی بعض حروف کو سمجھتے ہیں کہ اگر باریک کر کے پڑھ دیا۔ تو دال ہوگئی اور اگر موٹا کر کے پڑھ دیا تو ضاد ہو گیا بس اس پر قناعت کر رکھی ہے۔

غرض اول تو تصحیح مخارج کی طلب ہی نہیں اور اگر طلب بھی ہوئی کسی کو تو یہ نہیں کہ مشق کریں۔ بلکہ علماء سے تحقیق کرنے بیٹھ جائیں کہ و لاالضالین کو ولا الظالین پڑھنا چاہیے یا و لاالدالین۔ امداد الفتاویٰ میں کوئی فتویٰ اس قدر مکرر نہ ہوگا جس قدر کہ یہ مسئلہ ہر شخص یہی ضالین والین کا سوال کرتا ہے۔ حالانکہ ض کثرت سے کلام مجید میں موجود ہے مثلاً والضحیٰ میں ہے بحث جب ہوگی تو ولا الضالین ہی میں۔ غرض اس قسم کی فضول تحقیق تو ہر شخص کرتا ہے مگر یہ توفیق کسی کو نہیں ہوتی کہ مشق کرے کیونکہ یہ فن تو مشق ہی سے آتا ہے نری تحقیق علمی سے کہیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔

ایک قاری صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ض کی صفت کیا ہے۔ کہا میاں اگر میں نے صفت بیان بھی کر دی تو اس سے کیا ہوتا ہے ض کی ہیئت اور کیفیت جو ہے وہ نرے بیان سے کس طرح ظاہر ہو جائیگی جب تک کہ اس کو ادا کر کے بھی نہ بتایا جائے پھر یہ شعر پڑھا نہایت برجستہ ے

گر مصور صورت آں دلستان خواہد کشید ☆ لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید
(اگر مصور نے اس محبوب کی تصویر بنا بھی لی مگر اس بات سے حیران ہوں کہ اسکے ناز ادا کی کس طرح تصویر بنائے گا)

سبحان اللہ! وہ جو ایک آن ہے اور ادا ہے وہ صفات مخارج کے بیان کر دینے سے کیسے معلوم ہوگی۔ وہ جو ایک لوچ ہے وہ کیسے معلوم ہوگا۔ وہ تو سماع سے متعلق ہے۔

اب کسی نے توجہ کر کے خیر مشق بھی کر لی تو اب وہ نشانہ ملامت ہے سب کا۔ مولانا فتح محمد صاحب اور ئی تشریف لے گئے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے جو اول بار فجر کی نماز پڑھائی تو بس قیامت ارے ہی رہ گئی۔ میں نے سورۂ قیامت پڑھی۔ یہ خبر نہ تھی کہ قیامت نازل ہو جائے گی۔ سلام پھیرتے ہی ایک صاحب نے اعتراض جڑا کہ **وجوہ یومئذ ناضرة الیٰ ربھا ناظرة** ۔ میں آپ نے دونوں جگہ ظ پڑھی ہے۔ مولانا نے ہر چند فرمایا کہ نہیں بھائی میں نے ایک جگہ ظ پڑھی ہے۔ ایک جگہ ض۔ مگر وہ نہیں مانا۔ مولانا حیران کہ اب اسے سمجھائیں کیسے۔ سمجھے تو وہ جو فن تجوید جانتا ہو۔ مگر مولانا نے ایک عجیب طریقہ سے اسے سمجھایا فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں نے دونوں جگہ ایک سا پڑھا تھا یا کچھ فرق تھا۔ کہا تھا تو فرق۔ خیر وہ ہٹ دھرم نہیں تھا۔ ورنہ اس کا بھی انکار کر دیتا۔ فرمایا بس اتنا ہی فرق ہے ض اور ظ ہیں۔

اور صاحب پڑھے لکھے لوگ بھی تو کثرت سے اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اور اس قدر اس پر جمود ہے کہ اگر کوئی اتباع کرنا چاہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ پھر جب اہل علم جو مصلح ہیں ان کی یہ حالت ہے تو عوام کو کیا کہا جائے۔

غرض پرستی

اسی لئے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اے عزیز! صحت کی کیا امید رکھ سکتے ہو۔ جب تمہارے طبیب ہی بیمار ہیں سچ ہی ہے واللہ بہ استثناء بعض خود اطباء ہی بیمار ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مولوی زنا کرتے ہیں یا شراب پیتے ہیں لاحول ولاقوۃ۔ مگر ایک علت ہے وہ میں بھی اپنے اندر پاتا ہوں۔ اس سے میں خود بھی بری نہیں وہ علت کیا ہے؟ غرض پرستی اور غرض پرستی وہ چیز ہے کہ۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ☆ صد حجاب از دل بہ سوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بہ دل رشوت قرار ☆ کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آئی ہنر پوشیدہ ہوا اور سینکڑوں پروہ دل کی طرف سے آنکھوں پرآ جاتا ہے جب قاضی خود فیصلہ کے وقت رشوت سے دل خوش کر رہا ہو تو ظالم اور مظلوم کی پہچان کس طرح ممکن ہوسکتی ہے)

یہ غرض وہ چیز ہے کہ جب حاکم دل میں یہ ٹھان لے کہ فلاں سے ایک ہزار روپیہ لوں گا پھر روداد مقدمہ کی اس کی آنکھوں میں الٹی ہی نظر آئیگی ۔ کے شاسند ظالم از مظلوم زار پھر وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے۔ اس غرض نے ہم کو تباہ کر رکھا ہے۔ وہ غرض مال ہے، جاہ ہے، شہرت اعتقاد ہے۔ بس اس نے ناس کر دیا۔ **الامن شاء الله منهم**۔ بس یہ ڈرتے ہیں کہ اگر حق کا اتباع کریں گے تو آمدنی کم ہو جائے گی۔ معتقد کم ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت میں وہ ہمارے کیا معتقد ہیں خود اپنے معتقد ہوئے۔ جانچ تو یہی ہے کہ ہم اتباع حق کا کریں۔ پھر دیکھیں کہ کون ہمارے معتقد رہتے ہیں کون نہیں وہ تو علماء سے یہ پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند علماء دین دریں مسئلہ۔ اور یہ الٹے ان سے پوچھتے ہیں کہ چہ می فرمایند جہلاء دنیا کہ ضاد باید خواند یا دوا و اندریں مسئلہ اندریں فتویٰ۔ جب دیکھا کہ ولا الضالین کے صحیح پڑھنے سے جہلاء ناراض ہوتے ہیں اور بداعتقاد ہوئے جاتے ہیں بس غلط ہی پڑھنا شروع کر دیا۔

اب دیکھئے علماء دین نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔ میں کہتا ہوں فتویٰ بھی نہ ہو غیرت اور شرافت کے بھی تو خلاف ہے کہ عوام سے ڈر کر حق کے اتباع کو چھوڑا جائے حق کے مقابلے میں عوام کو جوتی پر مارنا چاہیے یہ خوب سمجھ لیجئے گا کہ حق کا اتباع اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جس کی یہ شان ہو **لایخافون لومة لائم** (ملامت کرنیوالاوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے) اجی! خدا سے کام ہے مخلوق کو جھاڑو مارے۔ بس آزاد ہو کر رہے۔ بزرگوں کو تو یہاں تک آزادی حاصل تھی اور یہی ہونی چاہیے ۔

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند ☆ آرے آرے می کند با خلق و عالم کار نیست

مخلوق اگر کہے کہ تم بت پرستی کرتے ہو تو جو آزاد نہیں ہیں وہ تو اس قول کی تردید کریں گے کہ نہیں صاحب میں بت پرستی نہیں کرتا۔ میرے ایسے عقیدے نہیں ہیں اب بیٹھ کر للو پتو کرو جاہلوں کی۔ اور جو آزاد ہیں وہ کسی کے کہنے کی کچھ پروا نہ کریں گے۔ بلکہ صاف کہہ دیں گے ۔

آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

(ہاں ہاں میں کرتا ہوں مخلوق اور دنیا سے کوئی کام نہیں ہے)

ہاں ہم بت پرستی کرتے ہیں جاؤ کرلو ہمارا کیا کرتے ہو۔ کسی کے باپ کے غلام ہیں نوکر ہیں جوڈریں کسی نے کوئی تنخواہ مقرر کررکھی ہے کہ خواہ مخواہ وہیں جاؤ ہم بت پرست ہی سہی سب کے سب چھوڑ دو ہمیں۔ اور حضرت میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حق میں وہ اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حق کو قبول کر کے استغناء برتے اور یہ کہہ دے۔

ہرکہ خواہد گو بیاؤ ہرکہ خواہد گو برو ☆ دارو گیرو حاجب ودرباں دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے نہ آئے، ہمارے پاس کوئی دربان تو نہیں ہے)

تو بڑے بڑے سرکش اس کے دروازے پر ناک رگڑیں گے مگر دل کے اندر دغدغہ نہ ہو کہ سب چھوڑ دیں گے تو ہائے کیا ہوگا لاحول ولا قوۃ! مخلوق سے ڈر کر حق کو چھوڑ دینا نہایت ہی اوچھی بات ہے اور خصوص آمدنی کے لئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

دانش مند کا قلب روٹیوں کے لئے مشوش ہو! افسوس کی بات ہے اس کا تو یہ مشرب ہونا چاہیے۔

موحد چہ برپائے ریزی سرش ☆ چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید وہراسش نباشد زکس ☆ ہمیں ست بنیاد توحید وبس

(مؤحد کے پاؤں پر اگر سونے کا ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پر تلوار رکھ دو، ان کو تو نہ کسی سے امید ہوتی ہے نہ کسی سے خوف ہوتا ہے اور یہی توحید کی بنیاد ہے)

اور حضرت یہ تو ایک خاص مسئلہ کے متعلق گفتگو تھی۔ ایسے ہی تمام احکام اور اعمال میں ماہرین کو چاہیے کہ مستقل رہیں۔ جہلاء کی مرضی کے حق کے خلاف کبھی اتباع نہ کریں اگر سب ایسا کرنے لگیں تو جہلاء کا کبھی حوصلہ نہ بڑھے۔ اور جہلاء کو بھی چاہیے کہ ان سے اپنے مرض کے اتباع کے منتظر نہ رہیں۔ تو اے عوام اس مولوی کو چھوڑ و جو تم سے ڈر کر تمہارا ہم خیال ہوگیا ہے۔ وہ تو معلوم ہوتا ہے ٹٹو ہے بھاڑے کا۔ اور میرے کہنے کی بھی حاجت نہیں وہ تمہاری نظر سے خود ہی گر جائے گا۔

یہ تو ان عوام کا ذکر تھا جو علماء سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان سے اپنے مذاق کے اتباع کا انتظار کرتے ہیں اور علماء ان سے ڈر کر ان کی مرضی کا اتباع کرتے ہیں۔

اتباع کی ضرورت

بعضے عوام وہ ہیں کہ علماء سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ کتابیں اور ترجمے دیکھ کر اپنے آپ

کوعلماء سے مستغنی سمجھنے لگے ہیں کہ بدوں ماہر کے بتائے ان تک کسی کی نظر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اسی واسطے ہرامر میں شیخ اور ماہر کے اتباع کی حاجت ہے کیونکہ ایک چیز بظاہر خیر محض نظر آتی ہے لیکن ماہراس سے منع کر دیتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہ مفضی ہے الی الشر اوراس شر تک غیر ماہر کی نظر فی الحال پہنچنے سے قاصر ہے۔

پرسوں کا ہی واقعہ ہے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک استفتاء میرے پاس آیا وہ مثال ایک مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں مجھے پیش آئی۔ وہ مسئلہ تو خیر سب کو معلوم ہی ہے لیکن مجھے اس کی مثال عرض کرنا ہے کہ ہرفن میں بہت سی باریک باتیں ایسی ہوتی ہے جنہیں ماہر ہی سمجھتا ہے غیر ماہر نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ جو بات میں عرض کروں گا وہ اس سے پہلے شاید کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہوگی۔

ایک شخص نے استفتا کیا کہ میرے گھر میں کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ قریب آتا ہے تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور روزے دودھ، چلہ چھٹی میں قضا ہو جاتے ہیں پھر سال بھر تک ضعیف رہتی ہے۔ پھر وہی بچہ۔ غرض قضا روزوں کے رکھنے کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی۔ اب کیا کرے جب قضا روزے نہیں رکھ سکتی تو کیا فدیہ دیدے۔

میرے ذہن میں یہ آیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ جب تک امید رہے عودقوت اور عودصحت کی روزہ ہی رکھے فدیہ نہ دے۔ خیر یہ مسئلہ تو ہے ہی۔ مگر میرے جی میں یوں آیا کہ یوں لکھ دوں کہ بالفعل چاہے فدیہ بھی دیدے لیکن اگر کبھی صحت اور قوت عود کر آئے تو اس فدیہ کو کافی نہ سمجھے بلکہ ان روزوں کی قضا بھی کرے۔ یہ آیا ذہن میں۔ میں نے اپنے نزدیک اس میں یہ احتیاط سمجھی کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو یہ فدیہ ہی دینا کافی ہو جائے گا اور سال کے سال دیتے رہنے میں سہولت رہے گی ورنہ بہت سا جمع ہو گیا تو شاید پھر نہ دے سکے اس میں دونوں رعایتیں ہو جائیں گی کہ نفع تو بہت اور نقصان کچھ نہیں۔ نفع تو یہ کہ اگر صحت اور قوت نے عود نہ کیا تو تھوڑا تھوڑا کر کے دینے میں فدیہ آسانی کے ساتھ ادا ہو جائے گا ورنہ جمع ہو کر کثیر رقم ہو جائے گی جس کا ادا کرنا بھی دشوار ہوگا اور اگر صحت اور قوت نے عود کیا تو روزے رکھ لیے جائیں گے اور وہ فدیہ جو دیا جا چکا ہے تطوع ہو جائیگا۔ وہ گویا نفل خیرات ہو جائے گی جس کا ثواب الگ ملے گا۔ بس قریب تھا کہ یہی لکھ دوں لیکن اللہ تعالی نے سنبھالا۔ دست گیری فرمائی۔ معا شرح صدر ہوا کہ حالت عوام کی یہ ہے کہ فدیہ کو بدل سمجھتے ہیں روزہ کا۔ اگر فدیہ دیدیا تو پھر بے فکر ہو جائیں گے اور قلب میں تقاضا قضائے

صوم کا پیدا نہ ہوگا کہیں گے کہ فدیہ تو دے ہی چکے ہیں لہٰذا مجھے یہ لکھنا پڑا کہ جائز نہیں فدیہ دینا جب تک صحت وقوت سے ناامید ہی نہ ہو جائے تو دیکھئے یہاں فدیہ ظاہراً اہل علم کے نزدیک بھی فخر ہے لیکن کتنے بڑے شرعظیم کو مستلزم تھا۔ تو میں نے یہ واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا۔

بہرحال عوام کی خواہ کوئی قسم ہو سب کے ذمہ حق یہ ہے کہ اپنے کو علماء کا تابع بنادیں نہ ان سے موافقت کی توقع رکھیں نہ ان سے مستغنی ہوں اور نہ کسی حال میں ان سے مزاحمت کریں۔ پس ان کا ادب یہ ہے کہ وہ مزاحمت نہ کریں اور تمہارا ادب یہ ہے کہ اگر وہ مزاحمت کریں تو تم متاثر نہ ہو۔ تم تو نائب ہو۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

تھوڑی دیر کے لئے وجدان کی طرف نظر کر کے دیکھو! اگر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عوام مزاحمت کرتے۔ تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی خاطر سے موافقت کر لیتے۔ پھر یا تو نائب ہونے کی حیثیت سے تم بھی وہی کرو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے ورنہ نیابت کا کام چھوڑو۔

یامکن باپیل باناں دوستی ☆ یابنا کن خانہ برانداز پیل

(یاتو فیلبان سے دوستی مت کرنا یا پھر اس کے لئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تاکہ وہ مع ہاتھی کے داخل ہو) واقعی

یامکن باپیل باناں دوستی ☆ یابنا کن خانہ برانداز پیل
یامکش برچہرہ نیل عاشقی ☆ یافرد شوجامہ تقویٰ بہ نیل

(یاتو فیلبان سے دوستی مت کرنا یا پھر اس کے لئے دروازہ بہت بڑا بناؤ تاکہ وہ مع ہاتھی کے داخل ہو.... یا تو اپنے چہرہ پر عاشقوں کی ملامت نہ لگایا پھر جامہ تقویٰ کو دریائے عشق میں تر کر دو یعنی زاہد خشک کے بجائے عاشق حق بنو)

تو اس پر یہ سب گفتگو بڑھ گئی تھی کہ ماہرین سے مزاحمت کرتے ہیں غیر ماہرین، سوائے ماہرین! تم ان کی مزاحمت کی کچھ پروا نہ کرو۔ حق بات پر عمل کرو اللہ پر توکل کر کے یہ سب کلام دواوضا پر بڑھ گیا تھا۔ تو غرض تلاوت قرآن مجید میں تو یہ کوتاہیاں ہیں۔

بعض کوتاہیاں قرآن مجید کے متعلق اور قسم کی ہیں۔ چنانچہ بعضے لوگ قرآن مجید کو بے وضو چھوتے ہیں یہ بھی حرام ہے۔ بعضے رحل قرآن یا کتاب پر رکھ دیتے ہیں یہ اکثر میں دیکھتا ہوں طالب علموں کو کہ اس کی کچھ پروا ہی نہیں کرتے۔ فقہاء نے تو یہاں تک ادب ملحوظ رکھا ہے کہ

روٹیوں پر برتن رکھنے کی بھی ممانعت کی ہے کہتے ہیں کہ روٹی کے اوپر برتن رکھنا نہیں چاہیئے کیونکہ یہ رزق کی بے ادبی ہے جب روٹی کا یہ ادب ہے تو قرآن مجید کا تو بہت ہی بڑا ادب چاہیئے۔

اعتکاف کی حقیقت

اب رہ گیا اعتکاف۔ سو اس کی روح ہے خلوت اور خلوت کی حقیقت ہے ترک تعلقات۔ خود نفس رمضان میں مقتضیٰ موجود ہے ترک تعلقات کا۔ لیکن ترک تعلقات کے بھی معنیٰ سمجھ لیجئے ترک سے مراد تقلیل ہے یعنی جو تعلق غیر ضروری ہو یعنی جس کا ترک مضر نہ ہو اس تعلق کو ترک کر دے۔ چاہے وہ ضرر دنیا کا ہو چاہے آخرت کا اور جو تعلق ضروری ہو اس کو ترک نہ کرے کیونکہ جو تعلق ایسا ہے وہ مضر نہیں۔ مثلاً اپنے کمانے کھانے کے لئے دنیا میں مشغول ہونا اور اپنی ہی دنیا کا تعلق نہیں بلکہ جو تعلق دوسرے کی دنیا کا بھی ہو جس کا نفقہ اس کے ذمے واجب ہے وہ تعلق بھی مضر نہیں۔

میں نے بارہا کہا ہے اور اب پھر بانگ دہل کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کنجڑا ہو اور وہ صبح سے شام تک پکارتا ہے۔ لے لو کدو لے لو ترکاری یا کوئی پھیری والا دن بھر لے لو سوئی اور لے لو دھاگا کہتا پھرے اس کے قلب کے اندر ذرہ برابر ظلمت پیدا نہ ہوگی۔ اتنے بڑے اور لمبے چوڑے کلام اور اتنی صداؤں اور نداؤں سے بھی اس کو مطلق ضرر نہ ہوگا۔

اور ایک شخص ہے جس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل فارغ بیٹھا ہے وہ کسی سے صرف اتنا نہ پوچھ لے کہ تمہیں خبر ہے زید کہاں ہے جب کہ زید سے اس کو کچھ تعلق نہ ہو یا بلا ضرورت یہ دریافت کرلے کہ زید کب آئے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس سے ظلمت پیدا ہوگی وہ اس سے نہیں ہوگی۔ اب اس سے زیادہ میں کیا دلیل پیش کرسکتا ہوں کہ قسم کھا رہا ہوں۔ اگر یقین نہ ہو خود تمیز پیدا کر کے دیکھ لو۔ واللہ! آنکھوں سے نظر آجائیگا کہ قلب کا ناس ہوگیا۔ ظلمت نے احاطہ کرلیا۔ نورانیت برباد ہوگئی۔ انشراح غارت ہوگیا۔ وہ جو ایک تعلق مع اللہ پیدا ہوگیا تھا اس کے درمیان ایک حجاب قائم ہوگیا۔ اس واسطے کہ من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه[1]۔ جب ترک مالایعنیہ حسن اسلام ہے تو مالایعنیہ ضرور مخل اسلام ہوگا۔ اس شخص کے ایک فضول جملہ نے اسلام کی رونق کو۔ اسلام کی زینت کو۔ اسلام کے نور کو برباد کردیا۔ تو وجہ کیا کہ اس شخص کو ضرورت نہ تھی اور اس کنجڑے کو ضرورت تھی کہ لے لو کدو، لے لو ترکاری۔

---

[1] الصحیح للبخاری:۱:۱۶،۳:۳۳، الصحیح لمسلم صلوٰۃ المسافرین: ۱۷۵، سنن ابی داؤد باب: ۲۹

بس اب اس میں فرق یہ ہے کہ زاہدان خشک تو ضروریات کو ترک کرتے ہیں اور محققین صوفیاء غیر ضروریات کو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اب ان سے کوئی ضروری بات پوچھنا چاہتا ہے تو ہوں ہوں کرتے ہیں۔ چاروں طرف اشارے کرتے ہیں۔ سر ہلاتے ہیں۔ ہاتھ چلاتے ہیں۔ آنکھوں سے گھورتے ہیں۔ اب چاہے کوئی سرا سمجھے یا نہ سمجھے یا جو چاہے سمجھ لے مگر بولنے کے نہیں۔ کیونکہ جس نے عمل بتایا ہے اس نے درمیان میں بولنے سے منع کر دیا ہے۔ ارے الو۔ ضرورت کے موقع پر نماز تک میں تو بولنا جائز ہے گو نماز باطل ہو جائیگی۔ بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے یہ تیرا وظیفہ کہاں کا نکلا ہے جو نماز سے بھی بڑھ گیا۔ حماقت اور جہالت اور کچھ نہیں۔

ضرورت فقہ

حضرت یہاں سے ثابت ہوتی ہے ضرورت فقہ۔ حضرت جریج ایک عابد تھے امم سابقہ کے۔ ان کا قصہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمایا ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے ایک دن ان کی ماں آئی اور صومعہ سے باہر پکارنے لگی۔ ارے جریج! ارے جریج! جریج ان بزرگ کا نام تھا۔ وہ اس وقت نفلیں پڑھ رہے تھے۔ بیچارے بڑے گھبرائے کہ اللہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ ادھر تو ماں ہے اگر جواب نہیں دیتا تو ماں کی دل شکنی ہوتی ہے اور ماں کا دل توڑنا گناہ ہے ادھر نماز ہے اگر بولتا ہوں تو نماز جاتی ہے اور نماز کا توڑنا بھی گناہ ہے۔ بیچارے فقیہ نہ تھے ورنہ پریشان نہ ہوتے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **لو کان فقیھا لاجاب امہ**[1]

بالآخر ان کی سمجھ میں یہی آیا کہ ماں کا حق اللہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ ماں کا دل توڑنا اتنا برا نہیں جتنا خدا کی نماز کا توڑنا لہٰذا وہ نہ بولے اور نماز میں مشغول رہے۔ جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو ماں غصہ میں یہ بددعا دیکر چلی گئی کہ اللہ! جیسا یہ میرے پکارنے سے نہیں بولا اور مجھے پریشان کیا کہ میں تو اتنی دور سے اس کے دیکھنے کے اشتیاق سے آئی تھی اور اس نے میری بات بھی نہ پوچھی اسی طرح تو اسے پریشان کیجیئو! اور یہ بددعا دی کہ اے اللہ! اسے موت نہ آئے جب تک کہ یہ رنڈیوں کا منہ نہ دیکھ لے۔

بھلی مانس نے کوسا بھی تو غضب کا۔ آخر تجربہ کار تھی۔ سمجھتی تھی کہ تقدس ہی کی وجہ سے اس نے مجھ سے بے رخی کی ہے۔ خدا کرے تقدس ہی اس کا ملیا میٹ ہو جس پر اسے بڑا ناز ہے۔

بس حضرت! چونکہ ماں کا حق تھا اس وقت واقع میں کہ نماز میں بھی بولتا۔ بس اس کی دعا قبول

---

[1] لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف"

ہوگئی۔ وہاں ایک عورت تھی۔ قریب کے گاؤں میں رہتی تھی اور دیہاتن تھی آوارہ ہوگئی تھی۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہوا حرام کا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کا ہے؟ اس نے سمجھا کہ اگر اور کسی کا نام لیتی ہوں تو جھگڑا بڑھتا ہے پوچھ گچھ، لاگواہ لاؤ، شہادت دو، یہ وہ سو بکھیڑے۔ ایسے کا نام کیوں نہ لے دوں جو کوئی جھگڑا ہی نہ چلے۔ جو سب سے الگ تھلگ رہتا ہو اور جس کا کوئی حامی اور مددگار ہی نہ ہوتا کہ جلدی سے معاملہ دب دبا جائے زیادہ فضیحتی نہ ہو۔ بس جناب اس گدھی نے کیا کیا بے چارے جریج کا نام لے دیا۔ بس لوگ نام سنتے ہی بھڑک اٹھے کہ افوہ! اس کے یہ کرتوت۔

لوگوں کی یہ عادت تو ہے ہی کہ بلا تحقیق روایات کو معتبر سمجھ لیتے ہیں چنانچہ اب بھی دیکھ لیجئے۔ بالخصوص اس معاملہ میں تو تحقیق جانتے ہی نہیں۔ بس جناب لوگ اس عورت کو لے کر اس بیچارے عابد کے اوپر جا چڑھے کہ توڑ ڈالو اس کی عبادت خانہ۔ اس نے ہمیں اتنے دنوں دھوکے میں رکھا۔ خلوت خانہ توڑ پھوڑ زبردستی اس کو نکالا اور کہنے لگے کیوں نالائق تیری یہ حرکتیں۔ تجھے ہم سمجھتے تھے کہ بڑا عابد ہے بڑا زاہد ہے۔ تیرے یہ اعمال وہ سمجھ گیا کہ ماں کی بددعا قبول ہوگئی۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔

مگر حضرت! آخر مقبول بندہ تھا۔ بس فضل الٰہی کے ناز پر، کیونکہ اس طریق میں اگر کوئی گرتا بھی ہے تو اپنے درجہ سے تب بھی بالکل نہیں گر جاتا۔ گو بادشاہ بادشاہی سے معزول ہو کر وزارت پر آ جائے مگر وہ ناز اور وہ دماغ شاہی کا پھر بھی رہتا ہے۔ لڑکے سے پوچھا بتلا رے تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا فلانا چرواہا ہے جو جنگل میں فلاں جگہ رہتا ہے اب تو لوگ بڑے معتقد ہوئے اور بڑے گھبرائے۔ قدم چومنے لگے کہ للہ حضور ہماری خطا معاف فرما دیں۔ لایئے ہم آپ کا عبادت خانہ سونے کا بنا دیں، چاندی کا بنا دیں انہوں نے کہا بھائی میرا تو وہی گوندی کا جھونپڑا اچھا ہے۔ مجھے سونے چاندی کا مکان نہیں چاہیے مجھے تو اپنے اسی جھونپڑے میں پڑا رہنے دو۔

اس کو فرما کر حضور فرماتے ہیں لو کان فقیھا لاجاب امه[1]۔ اگر وہ فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو جواب دیتا۔ اور نماز کو توڑ دیتا۔ اب یہ کہ آیا یہ حکم عام ہے خواہ فرض نماز ہو یا نفل یا خاص ہے نفل ہی کے ساتھ۔ اس کا فقہا نے فیصلہ کیا ہے جیسا اس واقعہ میں ایک غیر فقیہ سے یہ حرکت صادر ہوئی ہے۔ ایسے ہی اس حدیث کو سن کر اگر کوئی غیر فقیہ ہر جگہ بولنے لگے پڑ پڑ خواہ فرض نماز ہو یا نفل تو یہ کام فقہاء کا تھا کہ انہوں نے اس کو طے کر دیا کہ یہ حکم خاص ہے نوافل کے ساتھ۔

---

[1] لم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث النبوی الشریف"

اس شرط سے کہ ماں باپ کو خبر نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے۔ فرض نماز کے دوران میں اگر ماں بھی بولے تو جواب نہ دے۔ ہاں اضطراری احوال اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے کوئی اندھا کنوئیں میں گرتا ہو سبحان اللہ! مجھے تو فقہاء کی قوت اجتہادیہ اور ملکہ استنباط پر یہ شعر آجاتے ہیں۔ واقعی حضرت دنیا کی سمجھ اور ہے دین کی اور ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ☆ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جاست ☆ نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

(جس نے اپنا چہرہ روشن کیا، حسن کا نکھار کیا، ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہوں اور جو شخص آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سکندری یعنی آداب شاہی بھی جانتا ہو..... ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہے اس راہ میں پر سر کے منڈانے والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو)

حقیقت میں یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتابیں پڑھ لیں اور فقیہ ہو گئے۔ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔

وعظ و فتویٰ کے اہل

فقیہ وہ شخص ہے جس میں خداداد ملکہ اجتہاد کا ہو۔ جو شخص ایک مسئلہ بھی نہ جانتا ہو وہ فقیہ ہوسکتا ہے اور جو شخص ایک لاکھ مسئلے جانتا ہو وہ فقیہ نہیں ہوسکتا۔ تفقہ اور چیز ہے اور ضبط جزئیات اور چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فیصلہ کر دیا ہے اور علماء نے کیا فیصلہ کیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیونکہ ہر منصب کا وہی اہل ہوسکتا ہے جو اس منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک آدھ کتاب دیکھی اور واعظ بن گئے (اور جا کر منبر سنبھال لیا۔ حضرت اس منبری کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ منصب منصب نبوت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سچے وارث ہیں وہی اس کے اہل ہیں)۔

عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی کے مطبع میں ایک ایسے ہی صاحب کا خط آیا لکھا تھا کہ میرے پاس شرح وقایہ اردو کی تو ہے اس سے فتویٰ لکھ لیتا ہوں۔ یہ شرح وقایہ کی خرابی ہے اور فلانی کتاب فلاں فن کی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو بہت فیض پہنچ رہا ہے مگر ہاں لوگ ایک فیض سے محروم ہیں یعنی طب سے۔ اب اس کو بھی جاری کرنا چاہتا ہوں کئی فیض جاری تھے ایک یہ بھی جاری کرنا چاہتے تھے۔ لکھا تھا کہ طب احسانی اردو کی بھیج دو تا کہ یہ فیض بھی جاری کر دوں۔

اب یہ تھوڑا ہی ہے کہ کتاب دیکھی اور وعظ کہنے لگے کتاب دیکھی اور نسخہ لکھنے لگے اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا ہے **لایقص الا امیر او مامور او مختال**[۱] یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں۔ ایک حاکم، دوسرے وہ جو مامور ہو یعنی جس کو حاکم اسلام نے اس کام کیلئے مقرر کیا ہو یا اہل حل وعقد نے جو حاکم کو بھی حاکم بناتے ہیں۔ یہ اہل علم کے سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل وعقد اصل ہیں اور حاکم ان کا نائب ہے یعنی جو اہل الرائے ہوں مثلاً علماء مشائخ کیونکہ یہی دین کے سمجھ دار لوگ ہیں۔ وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دیدیں یا ان کا نائب جو امیر المومنین ہے وہ کسی کو مامور کردے۔ تو یا خود حاکم یا جس کو حاکم یا ایسے علماء متفق ہو کر مامور کردیں وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔ تیسرا اگر کہے تو وہ متکبر ہے معلوم ہوتا ہے دنیا کا طالب ہے۔ چاہتا ہے کہ کچھ روپیہ کوئی رقم ہاتھ آجائے۔ اسے جائز نہیں وعظ کہنا۔

اسی طرح فتویٰ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں چاہے کتابیں بھی ختم ہو چکی ہوں۔ ہاں اپنے بزرگوں کے سامنے کسی نے یہ کام کیا ہو اور ان بزرگوں نے پسند بھی کیا ہو اس کو البتہ جائز ہے۔ یوں پھر بھی کوئی لغزش یا غلطی ہو جائے کبھی کبھار وہ اور بات ہے وہ بشریت ہے۔ تو یہ شخص ہے اہل فتویٰ لکھنے کا۔ جیسے مطب کرنے کا وہی اہل ہوتا ہے جس نے کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مطب میں نسخے لکھ لکھ کر مریضوں کا علاج کیا ہو اور اس کے علاج کو اس طبیب نے پسند کیا ہو۔ اس کے نسخے جواب دکھلائے جاتے ہیں طبیبوں کو تو اگر کوئی معاند نہ ہوگا تو وہ کہے گا کہ باقاعدہ نسخہ ہے۔

کتاب اور صحبت کا اثر اور فرق

تو جناب محض کتابوں میں کیا رکھا ہے نری کتاب بینی کا تو یہ اثر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک مولوی صاحب عظیم آباد پٹنہ کے حج کو آئے تھے۔ ان کے پاس ایک کتاب تھی جس میں حجاج کے لئے ہدایات تھیں اسے دیکھ دیکھ کر سارے کام کرتے تھے وہاں ایک شخص تھا جعفر آفندی۔ آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اسے ہندوستانیوں سے بہت محبت تھی۔ جس ہندوستانی سے بہت محبت تھی جس ہندوستانی کو دیکھتا اس سے ملتا۔ چنانچہ ان مولوی صاحب سے بھی ملا۔ علیک سلیک کی۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں کہیں یہ لکھا دیکھا تھا کہ ذرا مانگنے والوں سے بچے رہنا۔ بہت لوگ جبہ قبہ پہنے ہوئے پھرتے ہیں مگر ہوتے ہیں سائل۔ بڑے بڑے شاندار لوگ گداگری کا پیشہ کرتے

---

[۱] مسند أحمد ۲: ۱۸۳، ۴: ۲۳۳، ۶: ۲۳، ۲۷، ۲۹، مشکوٰة المصابیح: ۲۴۰، ۲۴۱، کنز العمال: ۲۹۰۱۵

ہیں مولوی صاحب کو بدگمانی ہوئی کہ یہ بھی کوئی سائل معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کچھ مانگے گا۔ آپ نے بہت بے رخی سے پوچھا کچھ کہنا ہے یہ شخص جعفر بڑا مسخرہ تھا سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے سائل سمجھا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا حضور کچھ عنایت ہو جائے۔ بہت حاجت مند ہوں بہت غریب ہوں۔ حضور چار وقت کا فاقہ ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے ڈانٹ کر کہا بے حیا، بے شرم! ایسا عمدہ لباس اور اتنا لمبا چوغہ پہن کر بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ کہتا ہے چار وقت کے فاقہ سے ہوں جھوٹا کہیں کا۔ دور ہو یہاں سے، بے حیا کہیں کا۔ غرض خوب ہی ڈانٹا۔ مگر اس نے برا نہیں مانا اور چلا گیا۔ بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ مولوی صاحب بڑے خوش کہ کیسی اچھی کتاب ہے۔ کیسے موقعوں پر کام دیتی ہے۔ بڑے مسرور کہ کیا موقع پر کتاب کام آئی۔ سبحان اللہ!

ایک دفعہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ جعفر آفندی جو وہاں ہو کر گزرے تو میں ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اب تو مولوی صاحب بڑے پریشان کہ یہ تو کوئی بڑا شخص معلوم ہوتا ہے وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئے کہنے لگے صاحب مجھے ان مولوی صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے چار وقت کا فاقہ ہے۔ اس وقت ان کی جیب میں روپے بھی بول رہے تھے اگر یہ چار آنے مجھے دیدیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ مجھے ان سے بڑی شکایت ہے۔ مولوی صاحب بے چارے ذلت کے مارے دبے جاویں۔ شرم کے مارے کٹے جاویں کہنے لگے للہ! معاف فرما دیجئے میں نے سخت گستاخی کی۔ میں نے پہچانا نہیں تھا۔ واللہ میں نے آپ کو سائل سمجھا تھا۔ وہ بولے کہ مولوی صاحب یہ تو بتائیے آپ نے مجھے سائل کیسے سمجھ لیا۔ آخر آپ نے کیا علامت مجھ میں سائل ہونے کی دیکھی کہا صاحب! میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے شاندار لوگ مکہ میں بھیک مانگتے ہیں۔ وہ بولے! مولوی صاحب! کچھ عقل سے بھی تو کام لیا ہوتا۔ صاحب نری کتاب کے بھروسے تو نہیں رہنا چاہیے کہا کتاب میں بھی دیکھتا تھا اور صاحب سچ مچ بڑے بڑے عبا اور قبا والے یہاں پر بھیک مانگتے ہوئے خود بھی دیکھ لئے تھے۔ انہوں نے پوچھا مولوی صاحب! یہ تو بتاؤ تم نے جن کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ والے تھے یا کسی ترکی ٹوپی والے کو بھی کہیں بھیک مانگتے ہوئے تم نے دیکھا کہا۔ ہاں صاحب واقعی سب عمامہ والے ہی تھے ترکی ٹوپی والا تو ان بھیک مانگنے والوں میں کوئی نہیں تھا۔ جعفر نے کہا کہ میں تو ترکی ٹوپی پہنے تھا۔ سو بتلائیے کتاب میں یہ کہاں لکھا تھا کہ صرف عمامہ والے ہی بھیک مانگتے ہیں۔ ترکی ٹوپی والے

نہیں مانگتے۔ تو صاحب! نری کتاب سے فن حاصل کرنے کا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ بھائی کتاب تو اعانت کے لئے ہوتی ہے۔ اہل مہارت کی صحبت کے بغیر بخدا اور بخدا اور بخدا جس کو فن کا حاصل ہونا کہتے ہیں۔ ہرگز میسر نہیں ہوسکتا چاہے جتنی کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اور اگر کچھ بھی نہ پڑھا ہو لیکن اہل مہارت کی صحبت اٹھاتے ہوئے ہو تو فن کا حصول ممکن ہے بلکہ کثرت واقع ہے۔

آخر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی کہ بعد کے بڑے بڑے عارف اور عالم ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ کیا وہ سب کے سب لکھے پڑھے تھے بہت کم ایسے تھے جو اصطلاحی عالم ہوں۔ ورنہ زیادہ تر تو امی محض ہی تھے چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نحن امة امية لا نكتب و لا نحسب (مسند أحمد ۲:۱۲۲)

''ہم لوگ تو ایک امی جماعت ہیں نہ ہم حساب جانیں نہ کتاب جانیں''۔

دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فخر کرتے ہیں اپنی امت کی امیت پر، تو گویا اس امت کی خاص فضیلت اُمی ہونا ہے۔ پھر باوجود اُمی ہونے کے صحابہؓ جو بینظیر تھے کہ نہ ابوحنیفہؒ ان کے برابر، نہ اویس قرنی ان کے برابر، نہ جنیدؒ ان کے برابر، نہ کوئی غوثؒ ان کے برابر، نہ کوئی قطبؒ ان کے برابر۔ تو وہ کیا چیز تھے اور وہ کیا دولت تھی جس نے ان کو سب سے بڑھا دیا تھا۔ بس یہ دولت تھی ؎

جمال ہمنشیں درمن اثر کرد

گلے خوشبوئے درحمام روزے ☆ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیرے ☆ کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم ☆ ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(میرے ہمنشیں پھول نے میرے اندر اثر ڈال دیا حمام خانہ کی خوشبودار مٹی ایک دن میرے محبوب کے ہاتھ سے مجھے ملی میں نے کہا کہ تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی ہوں لیکن کچھ مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں، میرے ہم نشین پھول نے میرے اندر اپنا اثر ڈال دیا ورنہ میں تو وہی خاک ہوں جو پہلے تھی)

بس یہ تھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس دولت ۔ کسی کی طویل صحبت تھی کسی کی کم ۔ مگر کمال سے کوئی بھی خالی نہیں رہا۔ البتہ اکملیت کے مراتب میں تفاوت تھا۔ چاہے زبان حاصل کی ہو یا نہ کی ہو۔ کمال تو ہر شخص نے حاصل کر لیا تھا۔ زبان اور چیز ہے کمال اور چیز ہے۔ اب کتابیں تو بہت سی پڑھ لیتے ہیں لیکن اہل مہارت کی صحبت میں رہنے کا بالکل اہتمام نہیں جہاں تم نے کتابیں پڑھی تھیں اگر کسی مربی کی صحبت میں اٹھائے ہوتے تو اپنے کو کبھی اہل مہارت میں سے نہ سمجھتے بھائی تم تو پہلے مربہ بنو پھر مربی بننا چند روز کے لئے اپنے آپ کو کسی مربی کی سپردگی میں دیدو۔ وہ تمہیں تاؤ دے دیکر مربہ بنائے گا۔ جب خوب گھل جاؤ گے اور مربہ بنانے والے بھی تصدیق کر دیں گے کہ ہاں اب مربہ بن گئے تب مربہ بنو گے۔ تمہارا خود ہی یہ سمجھ لینا کہ ہم اب مربہ ہو گئے ہرگز کافی نہیں کیونکہ اے مربہ! تیرے پاس کوئی ایسی مہک اور کوئی ایسا معیار نہیں جس سے تو یہ جانچ لے کہ میں مربہ ہو گیا۔ جب تیرے پاس کوئی مہک اور معیار نہیں تو تو اپنی ذات کو بلا آلہ کے دیکھے گا تو تو اپنے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس ہی سے، جو ناقص ہے اور مربی تیرے نفس کو دیکھے گا اپنے نفس سے اور وہ ہے کامل ۔ لہٰذا اس کی جانچ معتبر ہوگی اور تیری جانچ ہرگز معتبر نہ ہوگی کیونکہ اس کے پاس تو آلہ شناخت ہے اور تیرے پاس کوئی آلہ شناخت ہے نہیں۔

جیسے کوئی سیب کا مربہ بنا کر رکھے تو خود سیب یہ جانچ نہیں کر سکتا کہ میں مربہ ہو گیا ہوں یا نہیں۔ اس کے کیا دانت ہیں جو چکھ کر بتا دے گا ۔ البتہ جو مربہ بنانیوالا ہے اس کے دانت ہیں جو چکھ کر بتا دے گا وہ دانت تلے دبا کر فوراً بتا دے گا کہ ہاں ہو گیا تو تم کو ابھی کسی نے دانت تلے یا پیر تلے دبایا نہیں کہیں سڑ نہ گئے ہو کہیں کچے نہ پڑ گئے ہو۔ غرض اصل چیز تو حقیقت کمال ہے مگر زعم کمال اور دعویٰ کمال نے اسے خراب کر رکھا ہے۔

خود بینی کے مضرات

فرخ آباد میں ایک واعظ صاحب مدعی کمال کے ملے مجھ سے بیعت کی درخواست کی ۔ میں نے کہا میرے یہاں بیعت کی چند شرطیں ہیں ان میں سے ایک شرط تمہارے لئے یہ ہے کہ وعظ کہنا چھوڑ دو کیونکہ تم عالم نہیں ہو کہنے لگے صاحب! میں تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ مضامین بیان کرتا ہوں مجھے اجازت دیدی جائے میں نے کہا اگر احتیاط سے بھی بیان کرتے ہو تب بھی تمہارے نفس کا علاج یہی ہے کہ تم وعظ کہنا چھوڑ دو۔ پھر بھی بے حد اصرار کیا کہ مجھے تو اجازت ہی

دیدو۔ میں نے کہا اچھا مجھے ابھی اس میں بھی شک ہے کہ تم احتیاط کے ساتھ بیان کرتے ہو گے۔ کہنے لگے میں تو آپ ہی کی کتابیں یا حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی کتابیں دیکھا کرتا ہوں۔بس انہی کتابوں کے مضامین میرے بیان میں ہوتے ہیں۔میں نے کہا ممکن ہے تم ارتباط میں کچھ گڑ بڑ کرتے ہو یا سلسلہ ممکن ہے غلط ملاتے ہو یا ایسے عنوان سے ان مضامین کو نقل کرتے ہو کہ سننے والوں کو غلط فہمی ہوتی ہو۔اس لئے اگر تمہارا ایسا ہی اصرار ہے وعظ کہنے کی اجازت دے دینے پر تو یہ کرو کہ مجھے پہلے ایک اپنا وعظ نمونہ کے طور پر سنا دو تا کہ میں یہ تو اندازہ کرلوں کہ تم کہاں تک احتیاط برتتے ہو۔ حضرت انہیں اپنے اوپر یہاں تک عقیدہ اور دلیر اتنے کہ اس پر راضی ہو گئے اور جھٹ وعظ کہنے بیٹھ گئے کہ اچھا سن لیں۔

اول ہی میں آپ نے ایک قصہ نقل کیا کہ ایک دن چاروں صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ دعوت کے واسطے ہدیہ کے طور پر گھر میں سے شہد لائے اس شہد میں ایک بال پڑا ہوا تھا۔ چاروں صحابہ نے ایکدوسرے سے کہا کہ یہ جو بال ہے اس کی کوئی مثال سوچو یہ کس چیز کی مثال ہے چنانچہ کسی نے کچھ مثال دی کسی نے کچھ مثال پیش کی اب مجھے کو یاد نہیں کہ یہ کس نے مثال دی۔ غلط مضامین کیا یادرہتے۔ کسی نے کہا مومن کی فلاں حالت کے مشابہ ہے کسی نے کہا فلاں حالت کے مشابہ ہے۔

میں نے کہا جب وعظ ختم کر چکے کہ اچھا یہ تو بتاؤ یہ قصہ جو تم نے نقل کیا وہ کون سی کتاب میں ہے۔ میری کتاب میں ہے یا مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی کتاب میں ہے کہنے لگے یہ تو یاد نہیں رہا کہ کس کتاب میں ہے مگر ہاں دیکھا ہے کہیں۔ میں نے کہا یہ آپ کی احتیاط ہے کہ ایسا مہمل قصہ جو کسی اہل حق کی کتاب میں نہیں ہے اس کو بیان کر دیا۔اب تو سمجھ گئے کہ تم کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔مگر حضرت انہوں نے نہیں مانا برابر وعظ کہتے ہیں۔ یہ تو گوارا کرلیا کہ مجھ سے تعلق نہیں رکھا اور یہ گوارا نہ ہو سکا کہ وعظ کہنا چھوڑ دیں۔

اب کیا علاج ایسے جہل مرکب کا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جہل وہ چیز ہے کہ اگر کسی کو اپنے جہل کی خبر ہو جائے تو میں اس کو علماء میں شمار کرتا ہوں یعنی اول درجہ علم کا اپنے جہل پر مطلع ہو جانا ہے۔ جیسے صحت کا اول درجہ مرض کی اطلاع ہے موٹا مسئلہ عقل کا ہے کہ جس کو اپنے مرض کی اطلاع نہ ہوگی وہ علاج ہی نہیں کریگا۔

خدا تعالیٰ بچائے یہ خود بینی ایسی بری چیز ہے کہ حضرت حافظ اس کو کفر سے تعبیر کر رہے ہیں اور واقعی یہ ہے ہی ایسی بری چیز۔ فرماتے ہیں۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ☆ کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عشق و محبت کے راستے میں اپنی فکر، اپنی رائے نہیں چلتی، یہاں تو بس محبوب کی چلتی ہے۔ اس مذہب میں خود بینی و خود رائی کفر ہے یعنی نہایت ہی قبیح ہے)

تو دیکھا آپ نے یہ آفت نازل ہو رہی ہے حق جل علا شانہ صاف فرما رہے ہیں۔ **ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون**۔ کہیں عالم اور جاہل بھی برابر ہو سکتے ہیں۔ اب اس وقت عوام الناس نے ایک عجیب و غریب مستی اور شورش برپا کر رکھی ہے اور علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی شریک ہوں۔ خیر! عوام الناس پر تو حیرت نہیں مگر حیرت ہے علماء پر جو ان سے مغلوب ہو کر ان کے تابع ہو گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عوام الناس کے دبانے سے اور ان سے دب کر جو علماء تابع ہو گئے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کچھ قدر رہے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ علماء دل سے ہمارے موافق نہیں ہیں۔ ہم سے دب کر ہمارے تابع ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال ہے تو پھر اور کسی بات میں تابع بنائیں گے پھر اور کسی میں۔ خلاصہ یہ کہ ان کے مرید ہو جاؤ کس قدر شرم کی بات ہے۔ کاریگر یعنی مادیات اور حسیات تک کا کاریگر بھی جو اپنے کام میں ماہر ہو اس سے کوئی خلاف قاعدہ کام تو لے لو۔

ہمارے یہاں تعمیر کا کام جاری ہے۔ ایک معمار نے ایک کام کو ایک طریقہ سے بنانا چاہا مگر ہم غلط سمجھے۔ ہم نے دوسرا انداز تجویز کیا کہ نہیں اس طرح بناؤ۔ اس نے کہا صاحب یوں نہیں بن سکتا۔ ہم نے کہا تمہیں اس سے کیا بحث! جس طرح ہم کہہ رہے ہیں اسی طرح بنا دو۔ ایک دوسرا معمار تھا اس نے بھی کہا کہ ارے جس طرح مالک کہیں اسی طرح بنا دے تجھے کیا۔ بس جناب ہم سے تو بے چارہ بول نہ سکا اس پر بہت تیز ہوا اور کھڑا ہو گیا۔ کہ تو بڑا کاریگر ہے آ تو ہی بنا جو قیامت تک بھی بن سکے۔ نہایت تیز لہجہ میں اس نے کہا حالانکہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ بن ہی نہ سکتا۔ بن تو جاتا اس طرح بھی جس طرح ہم لوگ کہہ رہے تھے مگر بے کینڈے بنتا اسے اس تصور سے بھی شرم آئی کہ جو دیکھے گا پاگل کہے گا بنانے والے کو۔ گو برا کہنے والے متعین نہ ہوں۔ پھر بھی اہل کمال کو غیرت آتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ایسا کام ہو جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ یہ کسی اناڑی کا کام ہے۔ غرض جب اس نے پوری تقریر کی تب ہمیں اپنی تجویز کی غلطی معلوم ہوئی کہ واقعی ہی ٹھیک

کہتا تھا۔ ہم نے کہا بے وقوف! تو نے پہلے ہی پوری بات کیوں نہ کہہ دی تھی۔

تو میں کہتا ہوں کہ معماروں کو تو اتنی غیرت ہو اور مولویوں کو اتنی غیرت بھی نہ ہو بس وہ کیا غرض نے ساری خرابی ڈال رکھی ہے ۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ☆ صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب عرض دل میں آئی، ہنر پوشیدہ ہوا، سینکڑوں پردے حق بینی سے مانع ہو جاتے ہیں جو دل سے نکال کر آنکھوں پر چھا جاتے ہیں)

آداب ماہ رمضان

اعتکاف کے تعلق سے یہ تقریر شروع ہوئی تھی۔ غرض خلوت اور ترک تعلقات کی حقیقت محققین ہی جانتے ہیں۔ غیر محققین کو ان کا اتباع کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر فن میں جو محققین ہیں وہ عوام کو اپنا تابع بنائیں خود ان کے تابع ہرگز نہ بنیں۔ اگر اس عزم میں پختگی ہوگی تو عوام خود ان کے سامنے گردن جھکا دیں گے۔ اور ان کا اتباع کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اگر نہ کریں گے تو تمہیں کیا **لست علیھم بمصیطر**۔

ایک عبادت احیاء لیالی قدر ہے۔ اس احیاء کا موجب نورانیت ہونا مشہور و معلوم ہے خلاصہ یہ کہ رمضان المبارک کے حقوق کو جو کہ مجمع الانوار ہے پورا ادا کرو اور خلاصہ ان حقوق کا کیا ٹھہرا کہ جو احکام واجبہ ہیں ان کی پوری پابندی کرو اور جو امور منکر اور مکروہ ہیں خواہ صغائر ہوں یا کبائر ہوں بالکل چھوڑ دو۔ خواہ فضائل میں کمی رہے مضائقہ نہیں۔

غرض رمضان المبارک کی اصل عبادت تو روزہ و تراویح اور ان کی تنزیہہ ہے اور کثرت تلاوت و اعتکاف و شب بیداری اس کے متعلقات۔ ان سب کی اصل یعنی اصل الاصول وہ احکام واجبہ کی پابندی اور امور منکر و مکروہ سے اجتناب ہے اس سے آگے اپنی اپنی ہمت ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے مہمان کے سامنے جو چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں اصل چیز تو گوشت روٹی ہے باقی مربہ، اچار، چٹنی یہ زینت ہیں دستر خوان کی اور معین بھی ہیں ہضم غذا میں اور لطف افزا ہیں اور کھانوں کی۔ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کے سامنے یہ زائد چیزیں تو رکھ دے مثلاً چٹنی بھی کئی قسم کی۔ اچار بھی طرح طرح کے رکھ دے۔ مربے بھی مگر ان کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ خشکہ ہے نہ روٹی ہے، نہ گوشت ہے، جو اصلی غذا ہے اب وہ مہمان کیا کہے گا یہی کہے گا کہ کیا کھاؤں۔

مربہ کھاؤں، اچار کھاؤں، کھانے کی چیز تو ایک بھی نہیں۔ یہ تو سب لگانے کی چیزیں ہیں۔

اگر اسی طرح تم نے اپنا رمضان اس حالت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا کہ اس میں اصل چیز تو ہے نہیں۔ مگر زوائد ہیں تو وہ کیا قبول ہوگا۔ اور اگر تمہارے پاس اصل چیز تو ہے مگر زوائد نہیں، یعنی اگر دن بھر بری نگاہ سے، غیبت سے اور جتنے گناہ ہیں سب سے بچے رہو۔ اپنی آمدنی حلال رکھو۔ پھر چاہے رات کو اچھی طرح پڑ کر سو رہو۔ تہجد بھی نہ پڑھو۔ وظیفے بھی نہ پڑھو۔ مگر یہ کہ گناہ کے پاس نہ پھٹکو۔ تو تمہارا رمضان بخدا اس شخص سے اچھا ہے کہ تہجد بھی ہے، چاشت بھی ہے، وظیفے بھی ہیں۔ تلاوت بھی ہے سب کچھ ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کررہا ہے کہ غیبتیں بھی کررہا ہے، برائی بھی کررہا ہے عورتوں کو بھی تک رہا ہے لہو ولعب میں بھی مبتلا ہے لڑنا جھگڑنا بھی ہے بغض وحسد بھی ہے اس سے تمہارا رمضان ہزار درجہ اچھا ہے۔

اگر ہمت نہ ہو بہت سے سیپارے ختم نہ کرو۔ سوئے خوب پڑ پڑ کر۔ بس فرض، سنت نمازیں تو اٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ باقی آرام سے مہینہ بھر گزارو۔ مگر خدا کے واسطے گناہ کوئی نہ کرو تو یہ اچھا ہے اور اگر ہمت ہو تو گناہ کو بھی چھوڑ دو اور طاعات کو بھی لو۔ یہ تو پھر سبحان اللہ نور علیٰ نور ہے۔ اور یہ مہینہ قابل تو اسی کے ہے کہ اس میں ایسا ہی کیا جائے یعنی واجبات وفضائل سب کو جمع کیا جائے۔

حدیث میں ہے **کان رسول الله صلى الله عليه وسلم اجود من الريح المرسلة**[1]۔ یعنی رمضان شریف آتے ہی اس قدر طاعت میں مشغول ہوتے تھے جیسے ہوا چھوٹ نکلتی ہے کہ اڑی چلی جاتی ہے سلامت کے ساتھ۔

غرض رمضان کا جو مہینہ ہے اصل میں ترک دنیا کے واسطے ہے گیارہ مہینے خوب عیش وآرام میں گزارے ہیں ایک مہینہ تو بندہ خدا تھوڑی بہت مشقت اٹھالو جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

خواب را بگذار امشب اے پسر ☆ یک شبے درکوئے بے خواباں گذر

(ایک رات خواب کو اے پدر ترک کردے اور کسی اللہ کے عاشق کے پاس ایک رات گزاردے پھر دیکھ ان بے خوابوں کی گلی میں کیا لطف ہے جو رشک ہفت اقلیم ہے)

گیارہ مارہ تو سب کچھ کام کئے ایک مہینہ خدا کے کام میں رہ لو گے تو کونسا ایسا بڑا حرج ہوجائے گا۔ پھر وہ بھی اس طرح کہ اسی میں صحت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ غرض یہ مہینہ تو خاص

---

[1] المصنف لابن ابی شیبة ۹: ۱۰۲، حلیة الأولیاء ۵: ۳۶۲

ہو جائے عبادت کے لئے۔ اور اخیر درجہ یہ کہ اگر عبادت نہ ہو سکے تو گناہوں کو تو چھوڑ دو اتنا تو کرو۔

یہ مقصود تھا میرا جس کو میں بیان کر چکا۔ اور مضامین بھی ذہن میں ہیں مگر وقت بہت ہو چکا ہے اگر موقع ہوا تو میں یا اور احباب ان شاء اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے جمعوں میں عرض کرتے رہیں گے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ہمت اور توفیق دیں اعمال صالحہ کی اور ناپسندیدہ اعمال اور منکرات سے بچنے کی۔ اور ایک بات اور عرض کرنے سے رہ گئی کہ رمضان کے دن آنے سے پہلے آپس میں مل جل لو۔ اور دلوں سے رنجشوں کو دور کرلو کیونکہ معاصی سے روزہ کا اثر اور نور جاتا تو نہیں رہتا مگر بہت مضمحل ہو جاتا ہے۔

(اب ''دعا کیجئے'' سے یہاں تک کی تقریر ہاتھ اٹھائے ہوئے فرماتے رہے)

غالباً بعد ختم دعا یا دوران دعا ہی میں فرمایا کہ چونکہ اس بیان میں انوار رمضان کا ذکر ہے اس لئے اس کا نام ''رمضان فی رمضان'' مناسب معلوم ہوتا ہے رمضان جمع ہے رمیض کی جس کے معنی ہیں چمک دمک کذا فی القاموس۔ **ثم بحمداللہ الذی بنعمتہ تتم الصلحت.**

الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ بہ برکت دعا تو جہات حضرت اقدس اس وعظ کی تلبیض ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۳۸ھ یوم شنبہ بوقت چاشت شروع ہو کر آج پندرہ دن کی مدت میں ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ یوم یکشنبہ عین اذان ظہر کے وقت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کے ہاتھوں پوری کرادی حق تعالیٰ اس کو مقبول اور نافع عطا فرمائیں۔ اور صاحب وعظ کو مدت مدید تک اسی طرح فیض گستر رکھیں آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ اجمعین۔

احکام العشر الاخیرہ

ماہ رمضان کے عشرہ اخیرہ کے متعلق یہ وعظ ۲۱ رمضان ۱۳۲۹ھ بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں نماز جمعہ سے نماز عصر تک بیٹھ کر فرمایا حاضرین کی تعداد ۱۰۰ تھی۔

مولوی سعید احمد صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمَنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

شهر رمضان الذی انزل فیه القراٰن هدیً للناس وبینات من الهدیٰ والفرقان . (البقرہ:۱۸۵)

ترجمہ: ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالہ ہے منجملہ ان کتب کے جو (ذریعہ) ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل میں فیصلہ کرنیوالی (بھی) ہیں

فضیلت ماہ رمضان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے۔گزشتہ جمعہ میں رمضان کے ضروری آداب وحقوق کا بیان ہو چکا ہے۔آج رمضان کے ایک خاص جز ویعنی عشرہ اخیرہ کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے۔اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیر کے مضمون کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن غور کیا جائے تو عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولیٰ واتم ثابت ہے۔

فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے۔ سواس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان تیس دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزو میں نزول ہوا ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملالیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعیین وقت بھی ہم کو معلوم ہوجائیگی۔ سودوسری آیت میں فرماتے ہیں: **انا انزلنه فی لیلة القدر**۔ (بے شک قرآن کو ہم نے شب قدر میں اتارا ہے) پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کے نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔

رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے شب قدر رمضان میں نہ ہوتو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا۔ سواس کا جواب یہ ہے کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں تو ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہوجائے گا کہ شب قدر رمضان میں ہی ہے۔

نزول قرآن کریم

اس لئے کہ کلام مجید کا نزول دوطرح ہوا ہے۔ ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ **لولا انزل علیه القراٰن جملة واحدة کذلک لنثبت به فوادک ورتلنٰه ترتیلا**۔ یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں توان کو کوئی کتاب پوری کی پوری دفعۃً آسمان سے کیوں نہیں دی گئی۔ جس طرح موسیٰ علیہا السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ **کذلک لنثبت به فوادک** جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کے دل کی تثبیت اور اس کا محفوظ کرلینا اور سمجھ لینا آسان ہوجائے۔

واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تثبیت فواد اور ضبط وفہم بتدریج نازل کرنے میں ہوسکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہوسکتا۔ دفعۃً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعۃً نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے

بآسانی تعلیم ہو جائیگی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جائے گا۔اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاری اور یہود سے ہوئیں۔

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آئے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا۔نہ میں وقتاً فوقتاً آ کر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں۔آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جائے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔پس اس صورت میں اگر چہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو۔اور کتنے ہی غور وخوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہوسکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے،اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر وتبدل کمی بیشی کرالے جاتا ہے۔اس لئے کہ اگر چہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخہ جات لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہے۔کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفرا کی ہو اور وہ سودا کا ہیجان سمجھ جائے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جائے۔

اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدل کرنے میں ہے۔امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں۔بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزءً جزءً نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

سابقہ کتب کا نزول

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور دفعی نزول میں اس قدر نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعۃً کیوں نازل فرمایا۔جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں۔

اس لئے کتب سابقہ کا دفعۃً نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعیین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعیین مراد کے بعد کے غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعیین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بلا تعیین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے۔ بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعیین ہو جاتی تھیں۔ سو اول تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا۔ مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعیین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا۔ اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی۔ پس وہ رحمت ہوا۔ پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ کلام اللہ کا نزول دو طرح کا ہے۔ ایک نزول تو یہ ہے جس کا تدریجی کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیت **شهر رمضان الذی** میں یہ نزول مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ صرف رمضان یا لیلۃ القدر میں نہیں ہوا۔ بلکہ ۲۳ برس میں ہوا۔

عالم غیب کی وسعت

اور دوسرا وہ نزول ہے جو کہ دفعۃً ہوا اور اس آیت میں بھی مراد ہے اور یہ نزول اس عالم دنیا میں نہیں ہوا جس میں کہ نزول تدریجی ہوا ہے۔ بلکہ یہ نزول عالم غیب میں ہوا ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور یہ دونوں اس عالم کے جز ہیں۔ اور اس کے ذی اجزاء ہونے کو بعید نہ سمجھا جائے اس میں اس قدر وسعت ہے کہ یہ عالم دنیا اس سے وہ نسبت رکھتا ہے جو سوئی پر لگا ہوا ایک قطرہ سمندر سے رکھتا ہے یعنی یہ عالم دنیا اس کے سامنے مثل ایک قطرہ کے ہے اور وہ اس کے اعتبار سے مثل سمندر کے ہے۔

اہل کشف نے لکھا ہے کہ دونوں عالموں میں وہی نسبت ہے جو کہ رحم مادر اور عالم دنیا میں ہے بچہ اول رحم مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے وہ ایک عالم ہوتا ہے اور اس سے اس قدر مانوس ہوتا ہے اگر شاید وہاں سے اس کی رائے لے کر عالم دنیا میں لایا جائے تو وہ کبھی گوارا نہ کرے اور مچل

جائے۔ لیکن اگر اس کو کسی طرح وہاں سے نکال لیا جائے جیسا کہ اس طرح لایا جاتا ہے اور عالم دنیا میں وہ یہاں کی رونق، چہل پہل یہاں کی آبادی اور معمورہ دنیا کو دیکھے تو عالم رحم اس کو بالکل ہیچ اور عدم معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اہل دنیا جو کہ اس عالم میں محبوس اور اسیر ہیں۔ جنہوں نے آنکھ کھولنے کے وقت سے آنکھ بند کرنے تک اس کے سوا اور کسی عالم کو دیکھا ہی نہیں جب ان کو اس عالم کے چھوڑ دینے اور دوسرے عالم میں چلنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں ان کا دل مضطرب ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس عالم کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے۔ ہاں وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عیناً یا ذوقاً علم مکاشفہ دیا ہے اور وہ اس عالم کو مشاہدہ کر چکے ہیں تو ان کو اس کی جدائی کا نہ قلق ہوتا ہے نہ وہ اس سے گھبراتے ہیں بلکہ وہ اس عالم سے انتقال کے متمنی اور آرزومند رہتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے لوگوں کے مقابلہ میں یہ لوگ زیادہ مقبول اور صاحب کمال ہیں۔ اس واسطے کہ ان کی فضیلت یا تو اشتیاق کی وجہ سے ہو سکتی ہے یا کشف کی وجہ سے سو اشتیاق کی وجہ سے تو اس لئے یہ صاحب فضیلت نہیں کہ جب عالم غیب اور اس کے نعم ولذائذ کو دیکھ چکے ہیں پھر اس کی طرف رغبت کرنا اور اس کا مشاق ہونا کیا کمال کی بات ہے خوشنما باغیچہ کو جو شخص بھی دیکھے گا اس کی سیر کا متمنی ہوگا۔

کشف اور بزرگی

اور کشف کی وجہ سے اس لئے صاحب فضیلت نہیں کہ کشف دلیل بزرگی اور مقبولیت کی نہیں۔ اس کی بناء محض مجاہدہ اور کثرت ریاضت پر ہے اکثر ہنود کو بھی ہونے لگتا ہے اور مرنے کے بعد تو سب ہی کو ہوگا۔ البتہ اہل کشف کو اس اعتبار سے ضرور فضیلت ہے کہ دنیا میں رہ کر جو ذوق ان کو حاصل ہے دوسروں کو نہیں اور کشف کی حقیقت معلوم ہو جانے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض ناواقف لوگ جو کشف کے درپے ہوتے ہیں اور اس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کشف نہ ہونے کی صورت میں اگر عمل ہو تو وہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ چنانچہ خداوند جل وعلا جائے مدح فرماتے ہیں۔ الذین یؤمنون بالغیب (جو لوگ غیبت پر ایمان لاتے ہیں)

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا ای الخلق اعجبھم ایماناً[1]۔ یعنی تمام خلق میں سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا الملائکۃ یارسول اللہ! الخ، یعنی فرشتوں کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] مشکوۃ المصابیح: ۶۲۷۹، مجمع الزوائد للھیثمی: ۱۰: ۶۵ بلفظ آخر

فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ ہوتی جب کہ ہر وقت کلام واحکام سے مشرف ہوتے ہیں۔ صحابہؓ نے کہا کہ پھر انبیاء علیہم السلام کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھلا وہ کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت تو ان پر وحی نازل ہوتی ہے صحابہؓ نے کہا کہ پھر ہمارا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کیوں ایمان نہ لاتے۔ ہر وقت مجھے دیکھتے ہو۔ مجھ سے سنتے ہو آخر صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے جنہوں نے نہ مجھ کو دیکھا ہوگا نہ نزول قرآن کی کیفیت دیکھی ہوگی۔ محض چند لکھے ہوئے کاغذ دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مکاشفہ کی نسبت عدم مکاشفہ کی حالت زیادہ افضل اور اسلم ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مطلقاً غیر مکاشفین مکاشفین سے افضل ہیں۔ اگر اہل کشف میں اور فضائل بھی ہوں جیسے انبیاء علیہم السلام تو وہ افضل ہوں گے اور اعجب ہونا دوسری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو عالم غیب منکشف نہیں ہوا وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑتے وقت گھبراتے اور مضطرب ہوتے ہیں۔ جالینوس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرنے لگا تو یہ تمنا کرتا تھا کہ میری قبر میں ایک سوراخ رہے کہ دنیا کی ہوا آتی رہے لیکن غیر مکاشفین اگر اہل ایمان کامل ہیں تو گو ان کو طبعاً اس عالم کو چھوڑنا گراں گزرے اور وہ موت سے گھبرائیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کلنا یکرہ الموت۔ مگر مرنے کے بعد جب اس عالم کی سیر کریں گے اور اس کو دیکھیں گے اور اس کی وسعت آنکھوں کے سامنے ہوگی تو ان کی وہی حالت ہوگی جو کہ رحم مادر سے نکل کر اور عالم دنیا دیکھ کر بچے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے اور عالم دنیا کے سامنے اپنے اس پہلے عالم کو ہیچ بلکہ لاشے محض سمجھنے لگتا ہے حکیم سنائی اسی کی نسبت فرماتے ہیں۔

آسمانہاست درولایت جاں ☆ کارفرمائے آسماں جہاں
دررہ روح پست وبالاہست ☆ کوہ ہائے بلند وصحرا ہست

(روح کے ملک میں بہت سے آسمان ہیں جو اس دنیا کے آسمانوں کو چلانے والے ہیں روح کے راستے میں گڑھے بھی ہیں اور ٹیلے بھی اور بہت سے اونچے پہاڑ اور جنگلات ہیں)

لیلۃ القدر

غرض! وہ عالم جب ذی اجزاء ہے اور یہ دفعی نزول اسی عالم کے ایک جز سے دوسرے جز میں ہوا

ہے اور اسی کی نسبت کلام مجید میں ایک جگہ شهر رمضان الذی انزل فیه القران (رمضان المبارک وہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل کیا گیا) فرمایا اور دوسری جگہ انا انزلنه فی لیلة القدر (بے شک ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے) فرمایا اور مراد دونوں مقام میں نزول دفعی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا۔

تو ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کیونکہ اگر لیلۃ القدر غیر رمضان میں ہو تو کلام مجید کی آیتوں میں تعارض لازم آئے گا کہ ایک آیت سے دفعی نزول رمضان میں اور ایک جگہ غیر رمضان میں ثابت ہوگا جو کہ محال ہے اور حدیثوں سے بھی شب قدر کا عشرہ اخیرہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے پس جب شب قدر میں نزول ہوا تو عشرہ اخیرہ میں نزول ثابت ہو گیا۔ اور یہی مناسبت ہے۔ اس آیت کو عشرہ اخیرہ کے ساتھ اور رمضان کی فضیلت کے ساتھ عشرہ اخیرہ کی فضیلت بھی اس آیت سے ثابت ہوگئی اور فضیلت بھی بہت بڑی کہ اس میں قرآن کا نزول ہوا ہے کیونکہ قرآن مجید ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے جس زمانہ میں وہ نازل ہوگا وہ زمانہ بھی ضرور مبارک اور مشرف ہوگا اور اس فضیلت کی قدر کوئی عشاق کے دل سے پوچھے کہ جس زمانہ میں ان کو محبوب کے خط کی زیارت ہوتی ہے وہ زمانہ ان کے نزدیک کس قدر معزز و مشرف ہوتا ہے۔ قرآن شریف بھی کلام خداوندی ہے اور خدا تعالیٰ محبوب حقیقی ہیں۔ پس وہ زمانہ کہ جس میں محبوب حقیقی کا کلام نازل ہو۔ کیوں مبارک اور مشرف نہ ہوگا۔ مظروف کے ظرف سے ظرف کو بھی ضرور شرف ہوا کرتا ہے چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق کاے فتیٰ ☆ تو بغربت دیدہ بس شہر ہا
پس کدامی شہراز انہا خوشتر ست ☆ گفت آں شہرے کہ درو ے دلبر ست

(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا تو نے اپنے سفر میں بہت سے شہر دیکھے تو ان میں سے کون سا شہر بہتر ہے۔ عاشق نے جواب دیا کہ وہی شہر سب سے بہتر ہے جس میں معشوق موجود ہے)

دیکھو اگر کسی عاشق کو کنوئیں کے اندر وصال حبیب ہو تو وہ اس کنویں کو چمن سے بھی نہ سمجھے گا اس کے دل میں اس کنویں کی عظمت ایک پھولوں سے بھرے چمن سے بھی زیادہ ہوگی اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس زمانہ کو بھی شرف ہے اکثر وہ کسی مظروف ہی کی شرف کی وجہ سے ہے۔

جمعہ کی فضیلت

یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا دن اور ایام سے افضل ہے کیوں کہ اس دن میں ایک ایسا مظروف

موجود ہے جوکہ دوسرے ایام میں نہیں اکثر لوگ جمعہ کی فضیلت پر اعتراض کیا کرتے ہیں اورکہا کرتے ہیں کہ کیا وجہ جمعرات کو وہ فضیلت کیوں حاصل نہیں جو جمعہ کو حاصل ہے۔ وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں وہی ۱۲ گھنٹہ اس میں ہیں۔ وہی ایک دن جمعرات میں ہے وہی ایک دن جمعہ میں ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض بالکل ہی لغو ہے کیونکہ اشتراک فی الساعات اور تشابہ فی الظاہر سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو ایک کی حالت ہو وہی دوسرے کی بھی ہو۔ کیا اگر کسی شخص کی بہن اور بیوی بالکل ہم شکل ہوں اور سامان زینت میں بھی دونوں برابر ہوں تو کیا ان میں حلال وحرام کے فرق ہونے کو خلاف عقل کہا جائے گا اور کیا یہ شخص دونوں سے برابر برتاؤ کریگا اور کیا اس شخص کے دل میں دونوں کی محبت ایک قسم کی ہوگی اور جو علاقہ کشش بیوی کے ساتھ ہے وہ بہن کے یا ماں کے ساتھ بھی ہو جائیگا۔ یہ ضرور ہے کہ محبت ماں اور بہن سے ہوگی لیکن کیا دونوں محبتوں میں فرق عظیم نہ ہوگا ضرور ہوگا۔ بہن اور ماں بھی محبوب ہیں اور بیوی بھی محبوب ہے لیکن دونوں کی محبت الگ الگ ہے کبھی کسی شخص کو نہیں دیکھا گیا کہ وہ بیوی کی طرح ماں کو بھی پیار کرے یا اس کو بغل میں لینے کی خواہش کرتا ہو۔ بلکہ طبعاً اس قسم کے خیالات سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ اگر خواب میں اپنی ماں کے ساتھ صحبت کرتے دیکھ لیتا ہے تو بیدار ہو کر بے حد پریشان ہوتا ہے اور اپنے کو لعنت ملامت کرتا ہے حالانکہ تعبیر اس خواب کی بری نہیں۔

تعبیر یہ ہے کہ ایسا شخص متواضع اور منکسر المزاج ہوگا کیونکہ خواب میں معانی اپنے مناسب صورتیں اختیار کرتے اور اس میں متمثل ہوتے ہیں اس قسم کے خواب میں ماں سے مراد زمین ہوتی ہے باعتبار اپنی صفت خاکساری اور صحبت سے مراد تلبس ۔ پس یہ اشارہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو صفت خاکساری سے تلبس اور تعلق ہوگا۔ ایک بزرگ سے کسی نے یہی خواب بیان کیا انہوں نے یہی تعبیر دی۔ اگر کسی جاہل سے ایسا خواب بیان کیا جائے معلوم نہیں کیا تعبیر دے۔

اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہوتا ہے لاتحدث الالبیاً او حبیباً[1] ۔یعنی جاہل آدمی سے اپنا خواب بیان نہ کرو۔ بلکہ کسی عقل مند یا دوست سے بیان کرو کیونکہ عقل مند تم کو واقعی تعبیر سمجھ کر بتلا دے گا۔ اور تمہارا دوست اگر نہ بھی جانتا ہوگا تو خاموش ہو رہے گا گڑبڑ نہ بتلائے گا۔ بخلاف اجنبی بے وقوف یا دشمن کے کہ وہ خدا جانے کیا بتلا دے۔

---

[1] لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف"

مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک بار یہ مقولہ نقل فرمایا۔

تا آنکہ مادر خوب جفت نہ شود ☆ و بردار خودرانہ کشد عارف نہ شود

(جب تک اپنی ماں سے جفتی نہ ہو اور چھوٹا بھائی پیدا نہ ہو اس وقت تک عارف نہیں ہوتا)

کسی نے کہا کہ حضرت جزاول تو میں نے بھی دیکھا ہے دوسرا جز البتہ نہیں دیکھا۔ فرمایا بس اتنی ہی تو کسر ہے مراد جز ثانی سے نفس کا مغلوب ہو جانا ہے۔ پس باوجود اس کے کہ اس قسم کے خواب کی تعبیر ایسی حسن ہے لیکن اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہے تو بہت پریشان اور تنگدل ہوتا ہے اور بیداری میں تو کیا پوچھنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری نوع کی ہے اور بیوی کے ساتھ جو محبت ہے وہ دوسری قسم کی ہے دونوں محبتیں یکساں نہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ احادیث محبت میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے حضرت عائشہؓ کا سب سے زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری سے حضرت ابوبکرؓ کا۔ تیسری سے حضرت فاطمہؓ کا واقع میں ان میں تعارض اور اختلاف کچھ نہیں۔ سب حدیثیں مختلف درجات محبت کے اعتبار سے صحیح ہیں کیونکہ جس حدیث سے حضرت عائشہؓ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ازواج مطہرات میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور جس حدیث سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زیادہ محبوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب واحباب میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض! اشتراک فی الساعات من کل الوجہ کو موجب نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک میں دوسرے پر فضیلت بالذات ہو بالخصوص جب کہ ازدیاد برکت کی کوئی دوسری وجہ بھی موجود ہو جو حاصل ہے فضیلت لغیرہ کا۔ جیسا ہم نے بیان کیا کہ ظرف کا شرف مظروف کے شرف سے ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یوں سمجھنی چاہیے کہ وہ مظروف جس کی وجہ سے ظرف کو شرف ہوا ہے یا تو خداوند جل وعلا کا کوئی فعل ہوگا۔ یا بندے کا کوئی فعل ہوگا۔ پس اگر خدا تعالیٰ کا فعل ہے تو چونکہ افعال خداوندی میں بعض نافع ہیں اور بعض انفع۔ اس لئے اس تفاوت کی وجہ سے ان ازمنہ میں بھی تفاوت ہوگا۔ جن میں یہ افعال پائے جائیں۔ مثلاً توریت کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے اور وہ بھی نافع ہے اور قرآن کا نازل کرنا بھی فعل خداوندی ہے مگر یہ بوجہ انفعیت قرآن کے انفع ہے پس زمانہ نزول توراۃ اور زمانہ نزول قرآن میں اسی درجہ کا تفاوت ہوگا جو کہ تنزیل قرآن اور تنزیل توراۃ میں

ہے۔اور اگر وہ فعل بندہ کا ہے تو اس میں بھی یہی حالت ہے کیونکہ فعل عبد یا عبادت ہے یا معصیت ہے اور ہر ایک میں نافع وانفع وضار م ضر موجود ہیں۔ پس جس طرح کا فعل جس زمانہ میں ہوگا۔اسی طرح کی صفت زمانہ کے لئے ثابت ہوگی۔اگر کسی نافع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت آئے اور کسی انفع عبادت کا صدور ہوا تو زمانہ میں اس قسم کی برکت حاصل ہوگی۔

علیٰ ہذا اگر کسی خفیف گناہ کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے برا زمانہ ہے اور اگر کسی بڑی معصیت کا صدور ہوا تو زمانہ صدور اس کے لئے بہت برا زمانہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ آثار کا تفاوت اول اعمال کے لئے ثابت ہوتا ہے اس کے بعد اور اس کے واسطے سے زمانہ کے لئے۔ پس چونکہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا اور وہ مشرف ومعظم ہے۔اس کے شرف کی وجہ سے زمانہ نزول یعنی رمضان بھی ضرور مشرف ہوگا۔

تلاوت کی اہمیت

صاحبو! کیا مجازی محبوب کی گفتگو اور خط ملنے کا وقت تو پیارا اور عزیز ہو اور محبوب حقیقی کے کلام نازل ہونے کا وقت مشرف وممتاز نہ ہو قطع نظر اس کے کہ خدا کا کلام ہے اور اس کو انتساب ایک ذات عظیم کے ساتھ ہے۔

یہ بھی دیکھو کہ اس آفتاب کے نور نے تمہارے قلوب کو کیا روشنی بخشی ہے اور تم کو کس ضغطہ کی حالت سے نکالا ہے تمہارے اعتبار سے کیا نافع ہوا ہے ورنہ اگر اس کلام الٰہی کو صرف حق تعالیٰ سے ہی تعلق رہتا۔تم سے تعلق نہ ہوتا تو تم اس سے کیسے مستفید ہوتے۔غور کرو اگر آفتاب دنیا چند روز تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور تم اس زمانہ میں بیمار بھی ہو۔ یا مثلاً ایک ماہ تک لگا تار بارش رہے اور گھڑی بھر کو بادل نہ ہٹے تو تمہاری کیا حالت ہوگی۔

آخر یہ اس قدر پریشانی کیوں ہے محض اس وجہ سے کہ خدا نے تم کو ایک نور دیا تھا جو برائے چندے تم سے لے لیا گیا ہے۔اور پھر خدا کا فضل دیکھو کہ نور بھی کس چیز سے دیا جو کہ تم سے لاکھوں کو دور مگر اس کی شعاعیں ہیں کہ تم کو منور کر رہی ہیں اور تم طرح طرح کے فائدے اس سے حاصل کر رہے ہو۔اور اگر شعاعیں نہ ہوتیں تو گو نور آفتاب کے ساتھ پھر بھی تعلق ہوتا۔مگر چونکہ تم تک نہ پہنچتا۔اس لئے تم اس کے فیض سے محروم رہتے۔اسی طرح کلام اللہ صفت قدیم ہے کہ وہ مثل آفتاب کے ہے اور اس کے لئے کچھ شعاعیں ہیں جو تم پر فائض ہو رہی ہیں جن کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔

صاحبو! اگر آفتاب ہوتا اور یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو ہم اسکے فیض سے کس طرح فیض یاب ہوتے۔ علیٰ ہذا کلام نفسی کیلئے کلام لفظی کی شعاعیں نہ ہوتیں تو اس صفت کی فیضان سے کس طرح فیض حاصل کرتے اور چونکہ کلام اللہ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کلام مجید کی تلاوت سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ خواہ سمجھ کر پڑھا جائے یا بے سمجھے پڑھا جائے برخلاف دوسرے اعمال لسانیہ مثل دعا وذکر کے کہ اگر ان کو بے سمجھے کرو تو اس درجہ معتد بہ محبوب نہیں مگر قرآن ہر طرح مقبول ہے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے قرب کا سب سے بڑا ذریعہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا قرأت قرآن یعنی قرآن پڑھنا۔ امام صاحب نے عرض کیا بفھم او بلا فھم یعنی سمجھ کر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا بفھم او بلافھم یعنی کسی طرح ہو۔

اور کچھ مدار اس کا خواب ہی پر نہیں بلکہ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حروف صرف الفاظ ہیں۔ ان کی تلاوت بلافہم پر بھی تلاوت صادق آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بلافہم بھی قبول تام ہے گو فہم پر اتم ہوتا ہے۔

اس تقریر سے آج کل کے روشن خیالوں کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی ہوگی۔ اکثر حضرات یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کلام اللہ کو سمجھا نہیں جاتا تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ سو! ان کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ کلام مجید کا بے سمجھے پڑھنا بھی پورا فائدہ رکھتا ہے کیونکہ تلاوت قرآن میں صرف ایک یہی فائدہ نہیں کہ ہم اس کے معنی کو سمجھیں بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہم سے خدا تعالیٰ راضی ہوں جیسا بیان ہوا۔

حال وقال کا فرق

یہ بات عقل اور عادت کے موافق بھی ہے۔ دیکھو قاعدہ ہے کہ اگر مصنف کسی کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے دیکھے تو اگر چہ اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ شخص بے سمجھے پڑھ رہا ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے کلام پر توجہ کی اور اس کی قدر کی۔ مصنف کو پڑھنے والے سے ضرور محبت ہوجائے گی اور دل میں اس کی قدر ہوگی۔

حضرت مرشدنا حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک بار دہلی بازار میں جاتا تھا۔ ایک دکان پر ایک مجمع دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک شخص رسالہ دردنامہ غمناک نہایت شوق سے پڑھ

رہاتھا۔کوئی عاشق مزاج معلوم ہوتا تھا۔حضرت صاحبؒ بھی اس مجمع میں کھڑے سن رہے تھے اور طبعاً خوش ہورہے تھے کہ میرا کلام پڑھ رہا ہے اس شخص کو گو خبر نہ تھی مگر مصنف پاس تھے اور خوش تھے۔

اسی طرح ایک بار پانی پت تشریف لے جاتے تھے۔ راہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ وہ یہ رسالہ پڑھتا جاتا تھا۔ اور یہ رسالہ دردنامہ غمناک اگرچہ شاعری کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کا رسالہ نہیں ہے لیکن چونکہ درددل سے نکلا ہے اس لئے نہایت اثر رکھتا ہے واقعی از دل خیزد بردل ریزد۔ غالب کے زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ آشفتہ کے اس شعر پر۔

حال آشفتہ چہ دانی بے خبر ☆ درخیال زلف عنبر بوئے تو

(بے خبر شخص آشفتہ کے حال کو کیا جان سکتا ہے وہ تو عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں مست ہے)

آشفتہ کے استاد نے جب یہ اصلاح دی۔

حال آشفتہ پریشان ترشدہ ☆ درخیال زلف عنبر بوئے تو

(تیری عنبر جیسی خوشبو والی زلف کے خیال میں پریشان شخص کی حالت اور بہت زیادہ پریشان ہوگئی ہے)

غالب کو دونوں شعر پہنچے تو سن کر کہنے لگا کہ استاد صاحب قال ہے اور شاگرد صاحب حال ہے۔ واقعی جب دل سے کوئی کلام نکلتا ہے اور دل میں درد ہوتا ہے تو پھس پھسا کلام بھی وہ مزا دے جاتا ہے کہ ہزار چست بندشیں وہ مزا نہیں دیتیں۔ مولانا روم اپنے اس شعر میں اسی درد دل اور استغراق کو ظاہر فرما کر قافیہ وغیرہ پر اعتراض کرنیوالوں سے عذر فرمارہے ہیں۔

قافیہ اندیشم ودل دار من ☆ گویدم مندیش جز دیدار من

(میں شعر کے لئے قافیہ سوچنے لگتا ہوں تو میرا معشوق مجھ سے کہتا ہے کہ تو سوائے میرے دیدار کے کسی اور چیز کی طرف خیال مت کر)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مجھ سے کسی مقام پر شاعرانہ فروگذاشت ہوگئی تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ نکات پر نظر رکھنا توجہ الی الشعر پر موقوف ہے اور یہاں دیدار یار سے اتنی فرصت کہاں کہ ان فضول دھندوں میں وقت ضائع کریں۔

نسبت انعکاسی

صاحبو! اس تقریر میں غور کروگے تو معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے نبی کریم علیہ الصلوۃ

والتسلیم کو ملکہ شاعری نہ دینے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔ بھلا غیرت خداوندی کیوں کر جائز رکھتے کہ ان کا محبوب ومحبّ اس کی طرف سے التفات ہٹا کر دوسری چیز پر ملفت ہو۔

یہی بھید ہے کہ اکثر محققین صوفیا نے مریدوں پر متعارف توجہ دینے کے طریق کو بالکل ترک فرمادیا۔ وجہ یہی ہے کہ اس طریق توجہ میں مریدوں کے اندر کسی کیفیت کے القاء کے لئے اس قدر استغراق کرنا شرط تصرف ہے کہ بجز اس مقید القاء کے کسی طرف التفات نہ ہو اور تمام تر خیالات سے بالکل خالی ہو جائے۔ حتیٰ کہ واقعی اس وقت حق تعالیٰ کی طرف بھی توجہ کم ہو جاتی ہے۔ سو اس قدر توجہ مستغرق خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ان کو غیرت آتی ہے اور ان پر سخت گراں گزرتا ہے کہ یہ شخص خدا سے بالکل غائب ہو جائے۔

فرمایا کہ ایک ضرر شیخ کو توجہ متعارف میں یہ ہوتا ہے کہ اپنے تصرفات دیکھ کر چند روز میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ اس متعارف طریق توجہ سے شہرت ہو جاتی ہے۔ اور جس شہرت کے اسباب مقدور الترک ہوں وہ اکثر مضر ہوتی ہے۔

تیسرا یہ ضرر ہوتا ہے کہ شیخ اگر ضعیف القویٰ ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔

یہ تین ضرر شیخ کو ہوتے ہیں اور مرید کو یہ ضرر ہوتا ہے کہ وہ شیخ پر اتکال کر لیتا ہے اور خود کچھ نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی نسبت محض انعکاسی ہوتی ہے اکتسابی نہیں ہوتی اور نسبت انعکاسی کو قیام نہیں ہوتا۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ توجہ تو خود حدیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غطنی فبلغ منی الجهد سو اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس غط کو توجہ کہنا محض بے دلیل ہے اس کا حاصل صرف الصاق بالصدر مع شدت ہے نہ کہ توجہ متعارف اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بوجہ قوت ملکی توجہ میں اس قدر استغراق کی ضرورت نہ ہوئی ہو جو توجہ الی الحق کو مانع ہو۔ وذاک لایضر (اور یہ مضر نہیں)

اگر کہا جائے کہ ممکن ہے کہ منفعل کی تفاوت استعداد سے کسی وقت کمال استغراق کی ضرورت نہ ہو۔ تو جواب یہ ہے کہ فاعل کو ہر صورت میں کمال استغراق کی ضرورت ہوگی البتہ تفاوت استعداد سے منفعل میں فرق ہوگا کہ تام الاستعداد بسہولت اور جلد متاثر ہوگا اور ناقص الاستعداد بدیر متاثر ہوگا۔

فیض رسانی کی صورتیں

ہاں دوصورتیں فیض رسانی کی اور ہیں۔ایک تو ان کے اختیار سے بھی خارج ہے وہ یہ کہ ان کی ذات بابرکات کے فیوض برکات سے کہ ان کو اس طرف التفات بھی نہیں عالم مستفیض ہوتا ہے جس طرح بارش کہ اس کے برسنے پر قابل حصہ زمین میں قوت نمو پیدا ہو ہی جاتی ہے خواہ بارش چاہے یا نہ چاہے۔یا آفتاب کہ اس کے طلوع کے وقت جو چیز اس کے مقابل ہوگی ضرور منور ہوگی دوسری اختیاری ہے جیسے مریدین کے لئے دعا کرنا ان کی حال کی نگرانی کرنا شفقت سے نصیحت کرنا اس کو بھی توجہ بالمعنی اللغوی کہا جاتا ہے مگر اصطلاحی توجہ بمعنی تصرف نہیں۔ سو اس کا کچھ مضائقہ نہیں بلکہ مسنون ہے کیونکہ طریق توجہ کے ترک کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں ذات باری تعالیٰ سے غیبت ہے اور چونکہ اس دوسرے طریق میں ترک التفات الی اللہ نہیں۔ بلکہ زیادت التفات الی اللہ ہے اس لئے یہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب ہے اور گو اس وقت توجہ الی الخلق بھی ہوتی ہے مگر وہ توجہ صارف عن التوجہ الی الخلق نہیں ہے۔ بلکہ دعا کی تو حقیقت ہی توجہ الی الخالق ہے گو لنفع سہی اور یہ نفع بھی خاص مرضی حق ہے اور نگرانی و نصیحت و تعلم وغیرہ میں بھی اعتدال توجہ الی الخلق غیر مانع عن الحق ہے اور وہ بھی باذن الخالق ہے تو ہے انہماک فی الخلق وغیب عن الحق نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جس میں خدا تعالیٰ سے غیبت ہے دوسرے وہ کہ اس میں احداث التفات الی الخلق ہو۔پہلی قسم کملا کے ہاں متروک ہے دوسری قسم مطلوب و محمود ہے۔البتہ پہلی قسم کی توجہ سے اگر اپنے تصرف اور بزرگی کا اظہار مقصود نہ ہو بلکہ محض افادہ خلق مقصود ہو تو وہ جائز ضرور ہے۔ گو کملاء نے اس کو ایک باریک وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور اگر اس سے اپنے تصرف کا اظہار یا زیادت جاہ مقصود ہو تو مذموم ہے۔ پس اس کا وہی مرتبہ ہے جو غلام پہلوان اور رنجیت سنگھ کی کشتی کا۔جس درجہ میں یہ کشتی محمود و مذموم ہے بالکل اسی وجہ میں یہ توجہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ توجہ مروج فی نفسہ کوئی مطلوب و محبوب چیز نہیں ہے لیکن اگر اس کی غایت محمود ہو تو اس میں بالعرض مطلوبیۃ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔جس طرح ورزش! کہ اگر اس سے غرض محض اظہار قوت وصولت ہے تو لغو ہے اور اگر اعانت مخلوق اس کی غرض ہے تو محمود ہے پس یہ توجہ ایک مرتبہ میں تو طاعت ہے لیکن اس سے زیادہ درجہ میں وہ توجہ ہے جو کہ انبیاء اپنے اصحاب اور امت پر فرماتے تھے۔یہی انبیاء کا طریق توجہ ہے جس کا کاملین نے اختیار کیا ہے کہ اس میں وہ

خطرہ نہیں ہے جو کہ مروج طریق میں ہے اور وہ توجہ ہے خلق کی طرف جو کہ سالک کے لئے نہایت مضر ہے۔ حتیٰ کہ ابتداء میں مطلق افادہ کے ارادہ سے بھی توجہ کرنا مضر ہوا ہے۔

منصب ہدایت

ایک بزرگ کی حکایت مشہور ہے کہ اپنے ایک مرید کو مدت تک ذکر و شغل بتلاتے رہے اور اس میں تغیر و تبدل بھی کرتے رہے لیکن مرید کو کچھ نفع نہ ہوا۔ آخر مدت کے بعد اس سے یہ پوچھا کہ تم یہ ذکر و شغل کس نیت سے کرتے ہو اس نے کہا کہ حضرت یہی نیت ہے اگر کسی قابل ہو جاؤں گا تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں گا۔ شیخ نے کہا توبہ کرو یہ شرک ہے کہ ابھی سے بڑے بننے کا خیال ہے اور خلق مقصود بالنظر ہے جب اس نے اس خیال سے توبہ کی فوراً فائدہ محسوس ہوا۔ گویا افادہ کی غرض سے بھی جو کہ بظاہر محمود ہے خلق کی طرف توجہ کرنا ابتداء سلوک میں مضر ہوتا ہے۔

اس حکایت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ کامل کبھی مایوس نہیں ہوتا نہ مرید کو مایوس کرتا ہے۔ جیسا یہ شیخ مدت تک تغیر اور تبدل کرتے رہے اور نفع نہ ہونے سے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اسی کاوش میں رہے حتیٰ کہ مرض اور اس کا علاج نکال ہی لیا۔ وہ طبیب حاذق کی طرح کسی نہ کسی نئی ادھیڑ بن میں برابر لگا ہی رہتا ہے برخلاف ظاہری اور ناقص پیروں کے وہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں اور دوسرے کو بھی مایوس کر دیتے ہیں اسی پر حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

بندہ پیرخراباتم کہ لطفش دائم ست ☆ زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

(میں میکدہ کے مالک کا غلام ہوں کہ اسکی ہمیشہ مہربانی رہتی ہے جبکہ ناقص شیخ اور پابندی شریعت زاہد خشک کی مہربانی کبھی کبھی رہتی ہے)

مصرع ثانی میں شیخ سے مراد شیخ ناقص ہے بلکہ اگر کشف سے بھی کسی کی شقاوت ظاہر ہو جائے تب بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ دعا تبدل بالسعادت کی کرتے ہو۔ البتہ اگر کسی نبی کو وحی سے کسی کا ختم علی الکفر معلوم ہو جائے تو اس وقت مایوس ہونا وہ خدا ہی کے حکم سے ہے۔

نیز اسی حکایت سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ ہر شخص منصب ہدایت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ بہت سے نام کے ایسے ہادی ہیں کہ جن کی غرض ہدایت سے محض طلب جاہ ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے۔ **لایقص الا أمیر او مامور او مختال**[1]۔

---

[1] مسند احمد ۲:۱۸۳، ۴:۲۳۳، ۶:۲۳، ۲۷، ۲۹، مشکوۃ المصابیح: ۲۴۰، ۲۴۱، کنز العمال: ۲۹۰۱۵

یعنی وعظ کہنے کی ہمت وہی کریگا کہ یا تو خود امیر المومنین ہے یا امیر المومنین کی طرف سے مامور ہے یا متکبراور نفس پرور ہے۔

اس لئے کہ جب ہدایت عامہ کا کام امیر المومنین کی ذمہ داری میں ہے تو اس کو وہ خود کریگا یا خود نہ کریگا تو کسی کو اس خدمت پر مامور کریگا۔ پس جو شخص نہ یہ ہے نہ وہ ہے اور پھر بھی ایسا کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ بھی خواہ مخواہ اپنے کو پانچوں سواروں میں گنتے ہیں۔

لیکن اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب بغیر امیر یا مامور ہوئے وعظ کہنا مختال ہونے کی علامت ہے تو آج کل کے تمام وعاظ میں سے تو ایک شخص بھی امیر یا مامور نہیں تو یہ کیا یہ سب کے سب تیسری شق میں داخل ہیں۔

جواب یہ ہے کہ فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس جگہ حاکم نہ ہو وہاں اگر متقی پرہیزگار راہل الرائے مسلمان کسی ایک شخص کو کوئی منصب دیدیں تو وہ سب مل کر امیر کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اور ان کا اعطا امیر ہی کا اعطا ہوگا کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اعطاء مناصب کا اختیار جو امام کو ہے وہ بھی درحقیقت اہل اسلام ہی کو ہے اور امام بحیثیت ان کا نائب ہونے کے ان کا کام کرتا ہے کیونکہ امام کا امام ہونا تو خود اہل اسلام کے اتفاق پر ہے پس اگر وہ موجود نہ ہو تو خود ان کا فعل جائز ضرور ہوگا۔

جیسے جمعہ کی نماز کے لئے انتخاب امام کا کہ اگر امیر موجود نہ ہو اور مسلمان مل کر کسی کو منتخب کرلیں تو وہ امام صحیح ہو جاتا ہے یا ناظر وقف کو امام کی عدم موجودگی میں اہل اسلام کے انتخاب سے کسی خاص شخص کو عہدہ نظارت وقف دیا جا سکتا ہے۔ پس جب دیندار فہیم مسلمانوں نے مل کر ایک شخص کو وعظ و نصیحت کے لئے انتخاب کرلیا ہو خواہ قولاً یا حالاً تو ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز ہے۔ باقی بدوں اہل دیں اور اہل عقل کے انتخاب کے جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں اور اہل نہیں ہیں تو وہ وعظ کے رنگ میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ضروری مسائل تک سے ان کو واقفیت نہیں ہوتی اور وعظ کہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔

سہارنپور میں ایک جاہل دیہاتی نے آکر وعظ کہا۔ انداز یہ کہ آپ نے قبل از نماز پوچھا کہ یہاں آواج (وعظ) تو نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ نہیں۔ پس نماز کے بعد پکار مارا کہ ساہبو! (صاحبو!) آواج ہوگی۔ سنتیں پڑھ کر وعظ کہنے بیٹھے۔ اعوذ بسم اللہ غلط سلط پڑھ کر یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ آیتیں الٹی سیدھی پڑھ کر ترجمہ شروع کیا۔ خوبصورت ہوا اے محمد! اے محمد! اے محمد!

اگر تجھ کو پیدا نہ کرتا نہ زمین پیدا کرتا نہ آسمان نہ عرش نہ کرسی وغیرہ وغیرہ۔ پھر فرماتے ہیں بھائیو! تھکے ماندہ ہیں۔ اس واسطے آدھی آواج اب ہوئی آدھی پھر ہوگی۔ کوئی نابینا ذی علم اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے واعظ صاحب کو اپنے پاس بلا کر بٹھلایا اور پوچھا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے؟ فرماتے ہیں کہ ہماری تمثیل (تحصیل) ہے ہاپڑ۔ بس ایسے واعظ رہ گئے ہیں۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ گو لغو ہیں اور اپنی اور دوسروں کی تضیع اوقات کرتے ہیں مگر پھر بھی ان بیچاروں سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا اور اتنی گمراہی نہیں پھیلتی جتنی وہ لوگ پھیلاتے ہیں کہ آب وتاب کی تقریریں مشق کیے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ یاد ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاحات ازبر ہیں۔ حافظ کا دیوان پیش نظر ہے۔ زبان ہے کہ آب رواں کی طرح بہتی چلی جاتی ہے لیکن واقفیت اور حقیقت دیکھو تو محض ہیچ! یہی لوگ ہیں کہ ان سے امت کے اکثر افراد تباہ ہوئے اور ہو رہے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ۔

حرف درویشاں بدزد دمرددوں ☆ تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کی باتیں چوروں اور کمینہ ٹولیوں کے سامنے ایسی ہیں جیسے جاہلوں کے سامنے عملیات کا پڑھنا)

اہلیت ارشاد

یہی لوگ ہیں جن کو حدیث میں اومختال کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ غرض اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی کہ وعظ طاعت ہے۔ لیکن اگر اس میں نیت خراب ہو تو وہی گناہ ہو جاتا ہے صوفیاء نے اسی راز کو سمجھ کر ابتداء سلوک میں وعظ گوئی سے بالکل منع فرمایا ہے کہ قبل اصلاح نفس اس میں اغراض فاسدہ غالب ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہر شخص اہلیت ارشاد کی نہیں رکھتا۔ سو شیخ ہونا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! محقق شیخ کی وہ شان ہوا کرتی ہے جو اوپر کی حکایت میں مذکور ہوئی کہ کس دقیق مرض کو مرید کے سمجھ لیا جس کی نیت ذکر و شغل سے بڑا بننا اور خلق کو مطمح نظر بنانا تھا۔ پس اس طرح توجہ اگرچہ طاعت ہو لیکن وہ کاملین کے لئے طاعت نہیں۔ کیونکہ اس میں مخلوق کی طرف کامل توجہ لازمی اور ان کے حق میں غیر اللہ کی طرف التفات کرنا سخت گناہ ہے ۔

بہر چہ از دوست دامانی چہ کفراں حرف چہ ایماں

بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
(جب تجھ کو دوست سے دور رہنا ہے تو پھر کفر و ایمان برابر
ہے جب یار سے دور پڑا پھر چاہے اچھا نقشہ ہو یا برا)

تصورِ شیخ

خلاصہ یہ کہ نقش توجہ اگر چہ زیبا ہو لیکن جب کہ اس نے خدا سے ہٹا دیا تو یقیناً زشت ہے۔ اسی طرح تصورِ شیخ کا شغل بھی محققین نے اکثروں کو بتلانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ سبب یہی ہے کہ تصورِ شیخ میں مرید کی پوری توجہ شیخ کی طرف ہوتی ہے۔ ذات باری کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا اور یہ غیبت کاملین کے ہاں جرم ہے خوب کہا ہے ۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ☆ شاید کہ نگاہے کند وآگاہ نباشی
(اس بادشاہ سے ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی غافل نہ رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ متوجہ ہو اور تجھے خبر نہ ہو)

ممکن ہو کہ جب وقت یہ شخص پیر کے تصور میں مصروف ہے وہی وقت ادھر کی طرف کی توجہ کے نافع ہونے کا ہو۔ اسی کے جرم ہونے کو کہا گیا ہے ۔

ہر آں کو غافل از حق یک زماں ست ☆ درآں دم کافر است امانہاں ست
(جو تھوڑی دیر کے لئے ہی حق تعالیٰ سے غافل ہے اتنی دیر کے لئے کافر ہے اگر چہ ظاہر نہیں ہے)

کفر سے مراد فقہی کفر نہیں اصطلاحی کفر ہے اسی لئے اس سے کاملین کی طبیعت اچٹتی ہے اوران کو سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اوجھڑی کہ اس کو حلال تو ضرور کہیں گے اگر غلاظت سے صاف ہو لیکن ایک لطیف المزاج آدمی سے پوچھو کہ اس کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے۔

اور صاحبو! اصل تو یہ ہے کہ جب ایک دل میں دو خیال نہیں آسکتے۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں پھر کیوں کر کہا جائے کہ جو توجہ کہ اس میں خدا تعالیٰ کا خیال ضعیف اور مخلوق کا خیال غالب ہو۔ پھر اس کو قصداً پیدا کیا جائے، وہ مطلوب ہوگی۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب بیٹے سے جو شیخ محمود کے نام سے مشہور ہیں ملے اور مسرت کا جوش غالب ہوا تو ندا آئی کہ ۔

حب حق ہو دل میں یا حب پسر ☆ جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آخر وہ حجاب بھی مرتفع ہو گیا اور ان کا انتقال ہو گیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیٹے سے بالکل ہی محبت نہ کرے جس قدر اس کا حق شرعی ہے وہ جب حق پر غالب نہ ہو عین سنت ہے۔ پس شیخ سے بھی ایسی محبت نہ ہونی چاہیے جو کہ خدا کو بالکل بھلا دے جیسا کہ آجکل جاہل فرقوں میں متعارف ہے۔ اسی طرح بیوی بچوں سے وہ محبت نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ رہے۔

لاتلھکم اموالکم ولااولادکم عن ذکراللہ

(تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں)

الطاف خداوندی کے قربان جایئے یہ حکم نہیں فرمایا کہ اولاد سے بالکل محبت نہ کرو کیونکہ جانتے ہیں کہ محبت اولاد طبعی ہے۔ امتثال ہو نہ سکے گا اس لئے یوں فرماتے ہیں کہ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ خدا کو بھول ہی جاؤ۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو تو اس قدر مذموم ٹھہری اور جو غرض توجہ کی ہے وہ ضروری۔ پس اگر توجہ ترک کریں تو امر ضروری کا ترک لازم آتا ہے اور توجہ اختیار کریں تو امر مذموم کا اختیار لازم آتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ توجہ سے جو غرض ہے اس کا حصول توجہ ہی میں منحصر نہیں۔ کیونکہ اگر اس کا حصول اسی میں منحصر ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اسی طریق کو اختیار فرماتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اسی طریق میں اس کا انحصار نہیں ہے بلکہ دوسرا طریق بھی موجود ہے یعنی تعلیم وارشاد شفقت ودعا اور یہ طریق ایسا ہے کہ جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ کوئی اندیشہ۔

بات کہیں کی کہیں جا پڑی جو رسالہ دردنامہ غمناک کی نوعیت شعریہ کے سلسلہ میں بڑھ گئی۔

ثواب قرأت قرآن

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مصنف کے سامنے اس کے کلام کو بے سمجھے بھی کوئی شخص محبت اور ذوق وشوق سے پڑھے تو اس کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس شخص کو رسالہ دردنامہ غمناک پڑھتے سنا تو آپ بہت خوش ہوئے اسی طرح کلام خداوندی کو جب ہم پڑھیں گے تو خدا تعالیٰ سنیں گے کیونکہ خدا سے تو کوئی چیز غائب ہی نہیں۔

مایکون من نجوی ثلثۃ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم

(کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو)

اور **ماتکون فی شان وما تتلوا منه من قرآن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شهودا اذ تفیضون فیه ا ورما یعزب عن ربک من مثقال ذرة فی الارض ولافی السماء الخ**

(اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواہ کسی حال میں ہوں اور منجملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور اسی طرح اور (لوگ۔ بھی جتنے ہوں) تم جو کام کرتے ہو ہم کو سب خبر رہتی ہے جب تم اس کام کو کرنا شروع کرتے ہو اور آپ کے رب کے علم سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں)

کہ خدا سے کوئی چیز بھی آسمان اور زمین کی اوجھل نہیں ہوسکتی۔ تو خدا تعالیٰ ضرور خوش ہوں گے اور متوجہ ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ کسی طاعت پر اتنا متوجہ نہیں ہوتے جتنا قرات قرآن پر متوجہ ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ اس وقت سب لوگ سمجھ کر ہی پڑھتے تھے اس لیے اس وقت کی حالت پر یہ ارشاد ہوا ہے اس سے نہیں معلوم ہوتا کہ اگر بے سمجھے پڑھے تب بھی توجہ ہوگی۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف صرف عرب ہی کے لئے نہیں نازل کیا گیا۔ اور ساری دنیا کی زبان عربی ہی نہیں اور حدیث بشارت میں عرب کی تخصیص نہیں فرمائی گئی۔ اس کے علاوہ حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ سات آٹھ آدمی تلاوت قرآن شریف کررہے تھے۔ ان میں کچھ عربی تھے اور کچھ عجمی تھے۔ جن سے اچھی طرح پڑھتے بھی نہ بنتا تھا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سن کر ارشاد فرمایا کہ **اقرؤا فکل حسن**۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ پورے طور پر قادر نہ تھے۔ پس جب حضورؐ نے سب کو حسن فرمایا تو معلوم ہوا کہ حسن ہونے کے لئے بالکل عرب کے موافق ہوجانا ضرور نہیں بلکہ کچھ کوتاہی بھی رہے جب بھی فضیلت حاصل ہے اور لفظی اور معنوی کوتاہی میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں۔ یہ تو حدیث تھی اور لیجئے کشف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ احمد بن حنبلؒ کی حکایت پہلے مذکور ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ سب سے زیادہ کون سی طاعت سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ قرآن پڑھنے سے۔

امام احمدؒ نے پوچھا کہ سمجھ کر پڑھنے سے یا بلا سمجھے بھی ارشاد ہوا لفهم او بغیر فهم۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن شریف خواہ کسی طرح پڑھا جائے۔ وہ ضرور مفید ہے خواہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے ہو اور اس کے پڑھنے سے خدا ہم سے ضرور خوش ہونگے یعنی ہم کو ثواب وانعام واکرام ہوگا۔ کیونکہ خدا کی خوشی کے یہ معنی نہیں جو ہماری تمہاری خوشی کے معنی ہیں کہ ایک بات جی کے موافق ہوئی طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ جس کی حقیقت انفعال ہے۔ خداوند جل وعلا طبیعت اور انفعال سے بالکل پاک ہے اس پر صفات کا اطلاق غایات کے اعتبار صحیح سے ہوتا ہے۔ مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔

بہر حال قرآن کی تلاوت میں آپ نے سنا کہ کیا اجر عظیم ہے۔ افسوس ہے کہ اس اجر عظیم کو چھوڑ کر ہوا وہوس کے بندوں نے کلام اللہ کو جو کہ رضائے خداوندی کا ذریعہ تھا۔ دنیا طلبی کا ذریعہ بنالیا ہے کہ روپیہ لیکر اور مقرر کر کے قرآن سناتے ہیں۔ یہ صریح دین فروشی ہے۔

اجرت تعلیم

لیکن تعلیم قرآن کو اس پر قیاس نہ کیا جائے کیونکہ تعلیم قرآن پر تنخواہ لینا جائز ہے۔ اور اس جواز کے حنفیہ کے ہاں دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ امام شافعیؒ نے جائز کہا ہے۔ اور حنفیہ نے بوجہ ضرورت کے اس پر فتویٰ دیا ہے۔ لیکن یہ طریق بالکل کمزور ہے۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ابوحنیفہؒ کی تقلید کا التزام کر کے بلا وجہ امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کریں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ خود حنفیہ کا قاعدہ ہے کہ محبوس کا نفقہ من لہ الحبس پر ہوتا ہے۔ پس جب یہ شخص خدمت دین میں محبوس ہے اس کا نفقہ تمام اہل اسلام پر واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی قسم کی خدمت دینیہ میں مشغول ہو سب کا یہی حکم ہے بعض مسلمانوں کا دے دینا بطور فرض کفایہ کے سب کو سبکدوش کردے گا۔

رہا یہ شبہ کہ اگر یہ بحیثیت نفقہ کے دیا جاتا ہے تو تنخواہیں کیوں مقرر کی جاتی ہیں۔ کیونکہ نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ تو یہی حکم ہے مگر اس میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ عامل کہتا ہے کہ اب کے مہینہ میں میرے پچاس روپے خرچ ہوئے۔ دوسرے کہتے کہ بیس ہی ہوئے۔ جب روزانہ جھگڑے رہا کرتے تو سلسلہ تعلیم چند روز میں درہم برہم ہوجاتا۔ اس عارض کے لئے انتظاماً تعیین کی بھی اجازت ہوگی۔ جیسا کہ آب کے طاہر رہنے کے لئے اصل

میں کثیر ہونا شرط ہے۔ لیکن نظم عوام کے لئے اس کی دہ دردہ کے ساتھ تقلید کردی گئی۔ یہ تقریر بالکل اصول حنفیہ کے موافق ہے۔

البتہ یہ تقریر ہر معلم کے لئے نہ چل سکے گی۔ بلکہ وہاں ہی چلے گی جو اپنے کو خادم دین سمجھ کر کام کررہے ہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اگر موجودہ تنخواہ میں کام چل رہا ہو اور دفعۃً ترقی کی خبر آئے اور بجز ترقی کے اور کوئی مصلحت تعلق سابق کے قطع کرنے کی نہ ہو۔ پس اگر وہ شخص تعلق ترک کر کے چلا جائے تب تو سمجھنا چاہیے کہ طلب دنیا اس شخص کا اصلی مقصود ہے اور اگر ترک تعلق نہ کرے تو سمجھنا چاہیے کہ مقصود اصلی خلق اللہ کو دینی نفع پہنچانا ہے۔ معاوضہ اصل مذکور پر لیتا ہے ایک کے لئے جزاء جبس نہ ہوگا اور ایک کے لئے جزاء جبس سمجھا جائے گا۔ غرض اجرت تعلیم اس عدم جواز میں داخل نہیں۔

اجرت امامت

البتہ تراویح میں قرآن سنانے کا جو مروج قاعدہ اکثر مقام پر ہے وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے خوب فرمایا ہے ؎

دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

اور اسی طرح مردوں پر قرآن پڑھ کر دام لینے کا حال ہے کہ قرآن فروشی ہے اور ان کا قیاس تعلیم پر اسلئے نہیں ہوسکتا کہ تعلیم شعائر میں سے ہے اس خدمت کیلئے محبوس ہونا موجب جزاء ہے اور تراویح کا ختم اور ایصال ثواب یہ شعائر سے نہیں اگرچہ طاعت ہے۔ البتہ خود تراویح یا پنجگانہ نماز کی باجماعت یہ شعائر سے ہے اس کے لئے اگر مفت کا امام نہ ملے تو اجرت ٹھہرانا درست ہے۔

اس تمام تقریر سے قرآن شریف کا مشرف و معظم ہونا ثابت ہوگیا۔ پس جب ایسی معظم چیز رمضان میں نازل ہوگی تو رمضان شریف کیوں معظم و مشرف نہ ہوگا۔ قرآن کی تعریف میں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس ☆ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف حرفش راست دربر معنی ☆ معنی درمعنے درمعنے

(اے حق بات کے سمجھنے والے تو سمجھتا بھی ہے کہ قرآن کیا چیز ہے انسانوں کے پاس انسانوں کے رب کی شان دکھانے والا ہے)

دیدار خداوندی

رونما اس واسطے کہ خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بلاواسطہ تو دیکھ نہیں سکتے۔ پس کلام اللہ کو پڑھنا

گویا دیدار خداوندی سے محظوظ ہوتا ہے۔

اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ اس سے اس کی پوری حقیقت ظاہر ہوگی ایک مرتبہ ایران کے بادشاہ کے خیال میں اتفاقاً ایک مصرع یاد آ گیا۔

درابلق کسے کم دیدہ موجود (دُرِ ابلق کسی نے بہت ہی کم دیکھا ہوگا)

مصرع کہہ کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن دوسرا مصرع تیار نہ کر سکے۔ شعراء کو جمع کیا اور مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ کسی سے مصرع نہ لگ سکا کیونکہ ایک مہمل مضمون ہے آخر سب کو زنداں کی دھمکی دی۔ ان لوگوں نے پریشان ہوکر ہندوستان میں عالمگیر کے پاس خط لکھا کہ تمہارے یہاں بڑے بڑے شاعر ہیں کسی سے مصرع کہلا کر ہماری جان بچاؤ۔ چنانچہ شعراء کو وہ مصرع دیا گیا۔ لیکن مضمون ایسا بے تکا تھا کہ کسی کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ شدہ شدہ زیب النساء متخلص بہ مخفی کو بھی اس کی خبر پہنچی اس نے بھی غور کیا لیکن مصرع نہ لگ سکا۔

اتفاقاً ایک روز مسند پر بیٹھی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ آئینہ سامنے تھا کہ سرمہ کی تیزی سے آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر فوراً دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آ گیا۔

مگر اشک بتاں سُرمہ آلود (مگر معشوق نے جب سرمہ ڈال رکھا ہو تو سرمہ ملا ہوا آنسوں)

چنانچہ عالمگیر کو خبر ہوئی اور شعر پورا کر کے ایران بھیجا گیا۔ جب بادشاہ نے مصرع سنا اس کے اور تمام شعراء کے دل میں اس شاعر کی بڑی قدر ہوئی اور شاہ ایران نے عالمگیر کو لکھا کہ اس شاعر کو ہمارے پاس بھیج دو۔ عالمگیر کو جب اس پیغام کی خبر پہنچی تو بہت زچ بچ ہوا کہ اگر شاعر کو ظاہر کرتا ہوں تب بھی مشکل ہے اور انکار کرتا ہوں تو بھی مشکل ہے آخر اس نے زیب النساء سے کہا کہ تمہاری شاعری کا یہ نتیجہ ہوا۔ زیب النساء نے کہا کہ تم اس کے جواب میں میری طرف سے یہ لکھ دو کہ ۔

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ☆ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو شخص تجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)

چنانچہ یہ لکھ کر بھیج دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ مستورات سے ہے پس اس طرح ہمارا مطلوب حقیقی جس کے دیدار کے ہم متمنی ہیں۔ بوجہ اس کے کہ ہم اس کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتے اور ہم اس کو دیکھ نہیں سکتے گویا یہ فرما رہے ہیں کہ ۔

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل دربرگ گل ☆ ہر کہ دیدن میل دارددرسخن بینہ مرا

(میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوں جس طرح پھول کی خوشبو پھول کے پتہ میں چھپی ہوتی ہے جو شخص تجھ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے میرے کلام ہی میں دیکھ لے)

اور وہ سخن یہی کلام اللہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ۔

معنی درمعنے درمعنے (معنی کے اندر معنی پھر معنی)

جس قدر زیادہ پڑھتے جاؤ اسی قدر زیادہ علوم منکشف ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے لاتقفیٰ عجائبہٗ[1] اور پھر لطف یہ کہ جاہلوں کو بھی لطف آتا ہے اور عالم کو بھی مزا آتا ہے۔ صاحب ظاہر بھی جان کھوتا ہے اور صاحب باطن بھی قربان ہوتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد ☆ برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنی را

(اس کے حسن کے عالم کی بہار دل کو اور روح کو تازہ رکھتی ہے اسکی رنگت سے صورت کو پسند کرنے والے خوش ہوتے ہیں اور اس کی خوشبو سے معنی کو پسند کرنیوالے خوش ہوتے ہیں)

حظ تلاوت قرآن

اسی حدیث میں ہے لایخلق من کثرۃ الرد واقع میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ کتنا ہی سنو جی نہیں بھرتا نیا مزہ آتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ سارا لطف خوش آوازی کی وجہ سے ہوتا ہوگا تو ہم کہیں گے کہ آخر وہ لطف اور وہ ربودگی جو قرآن پڑھنے سے ہوتی ہے شعر پڑھنے سے کیوں نہیں ہوتی۔ اس میں وہ مزا کیوں نہیں حاصل ہوتا۔ اور اگر کسی کو اس میں زیادہ مزا آتا ہو تو وہ ابھی قابل خطاب ہی نہیں۔ اس کو چاہیے کہ صحت ادراک وسلامت حال پیدا کرنے کی کوشش کرے پھر موازنہ کرے۔ صاحبو! قرآن تو قرآن ہے۔ کبھی اگر مکہ میں جا کر وہاں کی تکبیر نماز میں سنو جو ایک جزو ہے قرآن کا تو معلوم ہو کہ کیا چیز ہے۔ سچ مچ اس وقت وہ تکبیر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ذبح کے وقت کی تکبیر کہ دل میں چھری نکلی چلی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو مزہ نہ آئے وہ تلاوت ترک نہ کرے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو اس وقت قرآن شریف پڑھیں گے کہ جب ہم کو مزہ آنے لگے مگر یہ خیال بالکل ہی لغو ہے۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص سے کہا جائے کہ تم مقویات کھا پی کر جلدی سے بالغ

---

[1] لم أجد الحدیث فی "موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف"

ہو جاؤ تا کہ تم کو سن بلوغ کے لطف حاصل ہو جائیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ صاحب پہلے سن بلوغ کی لذت کو میں دیکھ لوں کیسی ہوتی ہے۔ تب اس کی تدبیر کروں گا۔ فرمایئے کہ اس احمق کو کس طرح وہ لذت دکھلا دی جائے اور سوا اس کے اور کیا جواب اس کو دیا جائے گا کہ جب تم بالغ ہو جاؤ گے خود تم کو معلوم ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر اس کے حصول کی نہیں۔

اسی طرح ان نابالغ پیروں کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس لذت کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ ہمت کر کے پڑھنے لگو۔ چند روز میں جب تمہارا قلب عالم طفلی سے نکل کر سن بلوغ میں پہنچے گا خود بخود اس کو یہ لذت حاصل ہوگی البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ خاص بلوغ اس وقت حاصل ہوگا کہ تلاوت و دیگر اعمال میں ہوائے نفسانی کا دخل نہ ہو بلکہ مطلقاً اس ہوائے نفسانی کا اتباع چھوڑ دو اور اطاعت خدا و رسول میں سرگرم ہو جاؤ کہ طریقت کا بلوغ یہی ہے ۔

خلق اطفالند جز مست خدا ☆ نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(سوائے اس شخص کے جو قوم کی محبت میں مست ہے ساری مخلوق نابالغ ہے سوائے اس شخص کے جس نے خواہشات نفسانی کو چھوڑ دیا ہے کوئی بھی نابالغ کہلانے کا مستحق نہیں ہے)

ترغیب ذکر اللہ

بعینہ یہی غلطی اہل سلوک کو ہوتی ہے کہ وہ ابتداء میں یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذکر میں لذت آنے لگے اور جب لذت حاصل نہیں ہوتی تو پریشان ہوتے ہیں اور بعض اوقات ذکر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ذکر میں لذت آنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ ذکر کی زیادتی کرے جس قدر ذکر زیادہ ہوگا قلب زیادہ منقاد ہوگا۔ دوسرے خیالات کمزور پڑیں گے۔ ذکر میں خود بخود لذت حاصل ہوگی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ فن شاعری میں جو ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شعر سن لیا اور طبیعت تلملا گئی۔ ایک عمدہ بات کان میں پڑی کہ چہرہ کھل گیا۔ آخر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اور کثرت مشق سے ہوتی ہے اور ابتداء سے ہرگز یہ حالت نہیں ہوتی۔ بلکہ اول اول تو محض مشقت ہوتی ہے۔

دیکھئے بچہ کو مکتب میں بٹھلاتے ہیں۔ سبق فارسی کا پڑھاتے ہیں مارتے ہیں پکڑ بلاتے ہیں۔ اسی طرح جب سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اس کو زبان دانی و سخن فہمی کا ایسا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کلام

لطف سن کر کیسا کچھ محظوظ ہوتا ہے۔ پس کیا کسی شخص نے محض اس وجہ سے کہ ہم کو غالب اور مومن کا سا وجد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی مشق چھوڑ دی ہے یا کسی شاگرد نے اپنے استاد سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں اس وقت شاعری کروں گا کہ جب آپ کی طرح مجھے شعر میں لطف آنے لگے گا۔ صاحبو! کیا قرآن شریف کی تلاوت اتنی بھی ضروری اور مرغوب نہیں جتنی فارسی اور شاعری کی تحصیل۔

صاحبو! جس طرح اس مثال میں ظاہری کیفیات میں ایک وقت وہ تھا کہ نہ تھیں اور اب ایک وقت وہ ہے کہ علیٰ وجہ الکمال ہیں اسی طرح باطنی کیفیات بھی گو اس وقت حاصل نہیں لیکن اگر کام کیے جاؤ گے تو ایک وہ وقت بھی ضرور آئے گا کہ سب حاصل ہو جائیں گی ارشاد ہوتا ہے۔
کذلک کنتم من قبل فمن اللہ علیکم ۔

اندریں راہ می تراش وی خراش ☆ تادمے آخردمے فارغ مباش
تادم آخر دم آخربود ☆ کہ عنایت باتو صاحب سربود

(اس راستہ میں آخر دم تک تراش و خراش (محنت ومشقت) ہے فارغ مت رہ تا کہ تیرا آخری سانس آخر وقت تک شاید اللہ کی مہربانی سے کارآمد ہو جائے)

اس قسم کے مواقع پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نوراللہ مرقدۂ یہ پڑھا کرتے تھے ۔

یابم اورایانہ یابم جستجوئے می کنم ☆ حاصل آیدیانہ آید آرزوئے می کنم

(میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا رہوں گا)

جو کچھ بھی ہو تم کام کئے جاؤ۔ تمہارا کام محض طلب ہے کیونکہ تمہارے اختیار میں وہی ہے۔ ثمرہ کا ملنا نہ ملنا یہ ان کا کام ہے تم اس کے در پے نہ ہو ۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب ☆ کہ حیف باشد از وغیر اوتمنائے

(جدائی اور ملاقات کی پرواہ نہ کر، معشوق کی خوشنودی ڈھونڈھ کہ اس سے اس کے سوائے دوسری چیز طلب کرنا قابل افسوس ہے۔)

ایک دوسرے بزرگ اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں ۔

ارید وصالہ ویرید ھجری ☆ فاترک ماارید لما یرید

(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے پس میں اس کے ارادہ کو اپنے

ارادہ پر قربان کرتا ہوں اور چھوڑتا ہوں)

اور صاحبو! اگر یہ نہ کہا جائے تو کیا خدا سے بدلہ لینا ہے اگر وہ ہمارا کام نہیں کرتے تو ہم اس کا کام کیوں کریں ۔ غور کریں اگر ایک مردار بازاری عورت سے تعلق ہو جاتا ہے تو قلب پر کیا کیا صدمے گزرتے ہیں ۔ کس کس انداز سے وہ امتحان اور آزمائش کرتی ہے ۔ کتنا موقع بموقع ستاتی ہے لیکن آتش محبت مشتعل ہی ہوتی چلی جاتی ہے ۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کے امتحانات یا غمزدون سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیں ۔ تو کیا ذات باری جل مجدہٗ کی محبت اور عظمت مسلمان کے دل میں اتنی بھی نہ ہو جتنی ایک بازاری عورت کی ۔ حیف ہے ہم پر اور ہمارے اس اسلام پر ۔

عشق مولیٰ کہ کم از لیلےٰ بود ☆ گوئے گشتن بہراواولےٰ بود

(کیا مولیٰ کا عاشق لیلیٰ سے بھی کم درجہ میں ہوسکتا ہے گلی کوچوں میں اس کے لئے گشت کرنا تو اور بھی زیادہ بہتر بات ہے)

ایک عارف کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ایک روز یہ آواز آئی کہ کتنی ہی عبادت کرو کچھ قبول نہیں ۔ اس آواز کو ان کے ایک مرید نے بھی سنا ۔ دوسرا دن ہوا تو وہ بزرگ پھر عبادت کے لئے اٹھے پھر وہی آواز آئی ۔ جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو مرید نے کہا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں ادھر کوئی پوچھتا بھی نہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ گرے جاتے ہیں جب قبول ہی نہیں تو محنت سے کیا فائدہ ۔ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا ۔

توانی ازاں دل پرداختن ☆ کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس کے در پہ جا پڑوں)

کہ بھائی چھوڑ تو دوں لیکن یہ تو بتلا دو کہ چھوڑ کر کس در پر جا پڑوں ۔ اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور آواز آئی کہ ۔

قبول است گرچہ ہنرنیستت ☆ کہ جزماپنا ہے دگر نیستت

(اگر چہ تمہاری عبادت کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر ہمارے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں تو تمہاری یہ بے ڈھنگے پن کی عبادات قبول کر لی گئیں)

کہ اگر چہ تمہاری عبادت تو کسی ڈھنگ کی نہیں لیکن خیر! جب ہمارے سوا تمہارے کوئی نہیں ہے تو تم کو بھی ہم ہی لے لیں گے ۔ صاحبو! طالبین کی یہ حالت ہونی چاہیے کہ ۔

طلب گار باید صبورو حمول ☆ کہ نشنیدہ ام کیمیا گرمسلول
(کسی چیز کے طلب کرنے والے کو صبر اور برداشت کرنا چاہیے میں نے کسی کیمیا گر کو مایوس اور آبدیدہ ہوتے نہیں دیکھا)

طلب الٰہی کی ترغیب

افسوس ہے کہ طلب خدا طلب کیمیا کے بھی برابر نہ ہو کہ اس میں تو انسان سالہا سال گنوا دے مال ومتاع غارت کر دے چین وآرام کو خیر باد کہہ دے اور طلب خدا میں کچھ بھی نہ ہو سکے۔ طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ۔

بر انداز برائے دلے بارہا ☆ خورند از برائے گلے خارہا
(اپنے دل کو بار بار اس کے راستہ پر چلا پھول حاصل کرنے کے لئے تو بہت سے کانٹوں کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے) اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ۔

خوشا وقت شوریدگاں غمش ☆ اگر ریش بینندو گرمرہمش
گدایانے از پاد شاہی نفور ☆ بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند ☆ اگر تلخ بینند دم درکشند
(اس کے غم میں مبتلا رہنے والوں کے لئے بہت ہی خوش نصیبی ہے چاہے کوئی زخم لگے یا زخم کا مرہم ملے اس کے فقیر بادشاہی سے نفرت کرتے ہیں اس کی مہربانی کی امید میں گدائی ہی پر صبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مشتاق عشق کے غم کی شراب پیتے رہتے ہیں اگر کسی قسم کی تلخی بھی دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)

اور جو شخص صرف مرہم کا طالب ہو وہ طالب نہیں ہے۔ وہ بیچارے تو بجائے حصول کے امید پر ہی نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے شعر میں ہے ۔

بامیدش اندر گدائی صبور (اس کی امید پر گدائی پر بھی صبر کرنے والے ہیں)

ایک طالب کا قول ہے ۔

اگر چہ دور افتادم بایں امید خورسندم ☆ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد
(اگر چہ میں دور پڑا ہوا ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا معشوق پھر دوسری بار میرا ہاتھ پکڑ لے)

طالب وہی ہے کہ اگر ہزار اس کو کہا جائے تو دوزخی ہے تو مایوس نہ ہو اور دس ہزار مرتبہ کہا جائے کہ تو جنتی ہے تو کاہل اور سست نہ بنے اس کے طلب کی یہ حالت رہے ۔

اے برادر! بے نہایت در گہی است ☆ ہر کہ بروے می رسی بروے مایست

(اے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا نہیں کہ کسی جگہ پہنچ کر کوئی یہ کہہ دے کہ میں منزل پر پہنچ چکا ہوں، اگر تو کسی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اوپر دوسری منزل ہے)

ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ اس کو روزانہ یہ آواز آتی کہ تو کافر ہو کر مرے گا جب ایک مدت تک یہ آواز آئی تو شیخ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ دشنام محبت ہے۔ مایوس نہ ہو جانا۔ محبوبوں کی عادت ہے کہ محبّ کو چھیڑا کرتے ہیں۔ خوب کہا ہے ۔

بدم گفتی وخور سندم عفاک اللہ نکو گفتی ☆ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے بُرا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا ہے، میٹھے میٹھے سرخ ہونٹوں سے کڑا جواب بھی اچھا معلوم ہوتا ہے)

اور یہ ایک قسم کا امتحان ہے لیکن یہ ساری باتیں اس وقت برداشت ہوتی ہیں کہ دل میں خدا کی محبت پوری پوری ہو۔ پس اس کی کوشش کرو اور اس طریق کے دو امر ہیں۔ ذکر کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت، ان کے پاس آنا جانا۔ اس سے تدریجاً ماسوائے اللہ سب تمہارے دل سے نکلنے شروع ہو جائیں گے اور یہ حالت ہوگی ۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت ☆ ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

(عشق آگ کا ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو معشوق کے سوائے جو کچھ ہوتا ہے سب کو جلا دیتا ہے) اور ۔

تیغ لا در قتل غیر حق براند ☆ در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ☆ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(لفظ لا کی تلوار سے اللہ کے سوا ہر معبود کو دور کر دے پھر دیکھ اب کیا باقی رہ گیا۔ صرف الا اللہ باقی رہ گیا باقی سب کچھ چلا گیا۔ مبارک ہو اے عشق کہ تو دوسروں کی شرکت کو جلانے والا اور دور کرنے والا ہے)

ترتیب سلوک

اس تقریر سے ترتیب سلوک کی یہ نکلی کہ اول کسی صاحب محبت کو ڈھونڈ کر اس کے پاس جا پڑو

اور اس کی حسب ہدایت کام میں لگ جاؤ۔ ثمرات کے طالب نہ ہو خود بخود ہوں تو خدا کا فضل سمجھو۔ طاعت میں لذت نہ ہو تو اس کو چھوڑ و مت۔ کثرت سے ذکر کرو۔

اس میں قرآن بھی داخل ہے۔ اگر پڑھتے ہوئے طبیعت اکتانے لگے، تو اسی کی کثرت کرو۔ اگر الفاظ بھی صحیح نہ ہوں تو اپنے امکان بھر کوشش تصحیح کی کرو۔ اگر پوری کامیابی نہ ہو تو دلگیر مت ہو اسی طرح قبول ہے۔ الفاظ پر تو انہیں سے گرفت ہوگی جو الفاظ درست کر سکتے ہیں اور پھر نہیں کرتے۔ ورنہ زیادہ تر دیکھ بھال، اور چھان بین دلوں کی ہوگی۔ اگر موٹی زبان کا آدمی غلط پڑھتا ہے لیکن دل سے پڑھتا ہے تو خدا کے نزدیک یہ غلط اس صحیح سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی غرض ریایا اظہار کمال ہو۔

اس موقع پر مجھے ایک شخص کی حکایت یاد آئی۔ ایک شخص مجھ سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں کسی فقیر سے طالب ہو جاؤں۔ میں اس پر ناراض ہوا اور سمجھا دیا چند روز کے بعد پھر آیا تو میں اس سے مزاحاً کہنے لگا کہ کیوں کسی فقیر کے طالب بھی ہوئے؟ تو وہ نہایت خلوص اور سادگی سے جواب دیتا ہے کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے۔ اس کا یہ ''تیرا'' کہنا ہزاروں حضور اور جناب سے زیادہ لذت بخش تھا کیونکہ دل سے تھا۔

اس موقع پر بطور جملہ معترضہ کے ایک اور بات بھی کہہ دینی ضروری ہے کہ جس طرح نرمی علاج ہے گرمی بھی اس سے بڑھ کر علاج ہے اور یہی وجہ ہے بعضے بزرگ درشت مزاج مشہور ہو جاتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ وہ درشت مزاج نہیں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک بات کو نرمی سے سمجھایا جائے تو دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا اور نہ وہ اتنی مدت تک یاد رہتی ہے جتنا کہ بدرشتی سمجھانے سے کالنقش علی الحجر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس ڈانٹ کا یہ اثر پڑا کہ اس کا یہ تذبذب بالکل دل سے نکل گیا اور آنکھیں کھل گئیں۔ غرض غلط بولنا جو پیارا معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راعی کا قصہ مشہور ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوا محبت کے جوش میں خدائے تعالیٰ کو خطاب کر کے یہ کلمات کہہ رہا تھا ۔

تو کجائی تا شوم من چاکرت ☆ چارقت دوزم کنم شانہ سرت

(تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں تیرے پھٹے ہوئے کپڑے سی دوں اور تیرے سر کے بالوں کو کنگھی کر دوں)

وامثال ذالک ! اتفاقاً! حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرف سے گزرے۔ یہ کلمات سن کر فرمایا کہ میاں کس کو کہہ رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ خدا سے۔ حضرت موسیٰ نے ڈانٹا اور ڈانٹ کر چلے گئے۔ راعی نے جو یہ سنا تو مارے خوف کے تھرا گیا اور سخت پریشان ہوا۔ اسی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اے موسیٰ! تم نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ اسی حکایت کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ۔

زیں نمط بیہودہ می گفت آں شباں ☆ گفت موسیٰؑ باکیست اے فلاں

گفت باآں کس کہ مارا آفرید ☆ ایں زمین وچرخ ازوآمد پدید

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدے ☆ خودمسلمان ناشدہ کافرشدے

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی ☆ وزپشیمانی توجانم سوختی

وحی آمد سوئے موسیٰؑ ازخدا ☆ بندہ ماراچرا کردی جدا

توبرائے وصل کردن آمدی ☆ نے برائے فصل کردن آمدی

(اس طریقہ پر وہ چرواہا فضول باتیں کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے شخص تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے چرواہے نے کہا کہ میں اس ذات پاک سے بات کر رہا ہوں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور یہ زمین و آسمان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہائے افسوس تو برباد ہوگیا تو خود مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہوگیا۔ چرواہے نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تو نے میرا منہ سی دیا اور شرمندگی سے تو نے میری جان کو جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کیوں کر دیا تو مجھ سے ملاقات کرنے کو آتا ہے یا میرے بندوں کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے آتا ہے)

حضرت موسیٰؑ نے جو یہ سنا تو گھبرا گئے اور جلد ہی آکر چرواہے سے معافی چاہی یہاں چرواہے کی عجب حالت تھی۔ موسیٰؑ نے جب معافی چاہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ اے موسیٰؑ ایسا تازیانہ لگا ہے کہ میں بڑی دور پہنچ گیا۔ ۔

آفرین بردست وبربازوئے تو (تیرے ہاتھوں اور بزوؤں کو شاباش ہے)

اس جملہ حکایت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اگر زبان پر بوجہ کم سمجھی اور کم عقلی کے گستاخانہ الفاظ

بھی ہوں لیکن دل محبت سے معمور ہو تو الفاظ پر نظر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان فروگزاشتوں کی معافی انہی لوگوں کیلئے ہے کہ جن کو تصحیح پر قدرت نہیں ہے ورنہ اگر قدرت کے باوجود ایسا کرے تو ضرور گنہگار ہوگا۔

تفریط متعلمین

افسوس ہے کہ اس وقت اس امر کی طرف سے ایسی بے توجہی ہے کہ لوگ اس کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ پوری درسیات ختم کر جاتے ہیں لیکن ان کو قرآن پڑھنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ سمجھتے ہیں کہ صرف کی کتابوں میں صفات حروف ومخارج پڑھ لئے ہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ قرآن کا پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ خاص کسی سے اس کو نہ سیکھا جائے۔ نری درسیات سے کچھ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشق نہیں کی تو ہم کو غلط پڑھنا جائز ہونا چاہیے اور ہم کو معذور ہونا چاہیے لیکن یہ عذر ایسا ہے کہ میں نے ایک سپارہ پڑھنے والے طالب علم سے کہا کہ حاجی جی کو بلالا۔ وہ حافظ جی کو بلالایا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے؟ کہاں حافظ جی کہاں حاجی جی۔ ان کے تو حروف بھی الگ الگ ہیں۔ تو کہتا ہے جی میں نے مخارج کی مشق نہیں کی۔ تو کیا یہ عذر قبول ہوسکتا ہے؟ تو جیسا یہ شخص اس غلطی سے بچ سکتا ہے اسی طرح جب مشق ممکن ہے تو ایسے اغلاط سے ان کو بچنا ممکن ہے۔

صاحبو! یہ سب بہانے ہیں۔ بات اصلی وہی ہے کہ خدا کی محبت اور اس کا خوف دل سے جاتا رہا ہے۔ اگر آج یہ اشتہار دے دیا جائے کہ جو شخص مخارج حروف صحیح کر کے سنادے اس کو فی حرف پانچ روپے ملیں گے تو آج ہی شہر کے شہر قرأت شروع کر دیں اور کچھ نہ کچھ تصحیح کر کے انعام لینے کھڑے ہو جائیں لیکن افسوس ہے کہ خدا کی رضا کیلئے امنگ نہیں پیدا ہوتی۔ یہ تو تفریط تھی متعلمین کی۔

افراط معلمین

اب افراط سنیئے۔ بعض معلمین و مصلحین کا کہ جن سے بالکل نہ ہو سکے وہ ان کو بھی مجبور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدوں اس کے قرآن پڑھنا ہی بے فائدہ ہے۔

جیسا مشہور ہے کہ ایک پیر جی صاحب نے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ روزہ کی نیت بھی یاد

ہے۔ اس کو چونکہ خاص عبادت یاد نہیں تھی اس لئے اس نے کچھ نہیں بتلائی۔ پیر جی صاحب نے فرمایا کہ بے نیت روزہ نہیں ہوتا۔ دیکھ روزہ کی نیت یوں کیا کر بصوم غد نویت اس بے چارے نے کا ہے کو کبھی اس قسم کے الفاظ سنے تھے فوراً تو یاد نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن روزہ نہ رکھا۔ ان ہی بزرگ نے پوچھا تو یہ کہا کہ بلا نیت روزہ نہیں ہوتا اور نیت یاد نہیں ہوتی۔ غرض جو لوگ صحیح پڑھ سکتے ہیں وہ تو صحیح پڑھیں۔ اور جو لوگ اس پر قادر نہیں ان کو جس طرح وہ پڑھ سکیں جائز ہے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب ہماری آواز چونکہ اچھی نہیں اس لئے ہم نہیں پڑھتے سو ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ تحسین صورت اس کو نہیں کہتے کہ خوب راگنی سے گا کر پڑھا جائے تحسین صورت کے معنی جیسا بزرگوں سے منقول ہے یہ ہیں کہ سننے والے کو اس کی آواز سن کر یہ معلوم ہو کہ اس کے دل پر کسی باعظمت ہستی کا رعب چھایا ہوا ہے۔

فضیلت عشرہ اخیرہ

بات بہت دور جا پڑی۔ اصل مقصود یہ تھا کہ جب قرآن ایسا مشرف و معظم ہے تو جس ماہ میں اس کا یہ نزول دفعی ہوا ہے وہ بھی معظم ہوگا بالخصوص وہ عشرہ خاص ماہ رمضان کا کہ جس میں شب قدر ہے کیونکہ رمضان کو جب قرآن شریف کی وجہ سے شرف حاصل ہوا، تو رمضان کا وہ حصہ خاص جس میں نزول ہوا ہے دوسرے حصوں کی نسبت خاص کر ضرور اشرف ہوگا۔ اس لئے کہ دوسرے حصوں میں شرف اس حصہ کی بدولت آیا ہے۔ پس جب نزول شب قدر میں ہوا ہے اور شب قدر جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے عشرہ اخیرہ میں ہوتی ہے تو عشرہ اخیرہ بقیہ حصہ رمضان سے ضرور افضل ہوا۔ ایک فضیلت تو عشرہ اخیرہ کی اس نزول قرآن سے ہوئی۔

دوسری فضیلت اس کی اس سے ہے کہ اس میں شب قدر ہے۔ جس کی فضیلت کیلئے خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وما ادراک مالیلة القدر لیلة القدر خیر من الف شھر**۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے) کیونکہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر عشرہ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے یعنی ۲۱۔۲۳۔۲۵۔۲۷۔۲۹۔ اور بعض حدیثوں میں مطلق عشرہ اخیرہ بھی آیا ہے۔ دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری کی تفسیر ہے اور یا اکثر تو طاق راتوں میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جفت راتوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ نیز بعض لوگوں کو جفت راتوں کو بھی ہونا مکشوف ہوا

ہے۔ تو قوی اور تندرست لوگوں کو تو یہ مناسب ہے کہ وہ اس عشرہ کی ہر رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کریں اور ضعفا کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کم از کم طاق راتوں میں ضرور جاگ لیں۔ طاق راتوں میں سے اس وقت ایک رات تو گزر گئی اب صرف چار باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں کوشش کر کے کچھ تو ضرور جاگ لیا جائے۔

صاحبو! یہ ایسی برکت اور خیر کی چیز ہے کہ اس سے محروم ہو جانا۔ گویا تمام خیر سے محروم ہو جانا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ من حرم لیلة القدر فقد حرم الخیر کلہ[1]۔ (جو شخص لیلۃ القدر (میں عبادت کرنے سے) محروم رہا وہ خیر سے بالکل محروم رہا) لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر جاگا جائے تو تمام شب جاگا جائے اور اگر تمام شب نہ جاگا جائے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ خیال بالکل لغو ہے۔ اگر اکثر حصہ شب میں بھی جاگ لے تب بھی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر ساری رات بھی جاگ لیا جائے تو کیا مشکل ہے۔

صاحبو! رمضان شریف سال بھر کے بعد آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پچھلے سال رمضان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں رہے۔ ہم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ رمضان تک کس کس کی باری ہے۔ اس لئے اگر ایسی بڑی نعمت حاصل کرنے کیلئے کوئی ایک دو رات جاگ ہی لیا تو کیا دقت کی بات ہے۔ لیکن خیر! اگر تمام رات کی ہمت نہ ہو تو اکثر حصہ کو تو چھوڑنا ہی نہ چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ یہ اکثر حصہ اخیر شب کا تجویز کیا جائے۔ کیونکہ اول تو اس وقت تک معدہ کھانے سے پر نہیں ہوتا۔ دعا میں جی لگتا ہے۔ دوسرے حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ اخیر شب میں روزانہ اپنے بندوں کے حال پر رحمت خاص متوجہ فرماتے ہیں اس کے علاوہ اخیر شب میں ویسے بھی سکون ہوتا ہے اور اس میں ہر شب شریک ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے من لم یعرف قدر لیلة لم یعرف لیلة القدر۔ اور اس قول کی وجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر انہی راتوں میں سے کسی رات میں ہوگی تو جو شخص راتوں کی قدر کرے گا وہ لیلۃ القدر بھی پائے گا۔ جو بے قدری کر کے خواب غفلت میں گزارے گا وہ جب عادت لیلۃ القدر سے بھی محروم رہے گا کیونکہ جب سال بھر تک برابر شب بیداری کرے گا تو لیلۃ القدر میں عبادت ضرور ہو جائے گی۔ کہ انہی راتوں میں ایک رات وہ بھی ہے۔

---

[1] لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف"

بوستاں میں حکایت ہے کہ کسی شہزادہ کا ایک لعل شب کے وقت کسی جگہ گر گیا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس مقام کی تمام کنکریاں اٹھا کر جمع کریں۔ اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ اگر کنکریاں چھانٹ کر جمع کی جاتیں تو ممکن تھا کہ لعل ان میں نہ آتا اور جب ساری کنکریاں اٹھائی گئی ہیں تو لعل ضرور آ گیا ہے کسی نے اس جملہ کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

اے خواجہ چہ پرسی از شب قدر نشانی ☆ ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے میاں تو شب قدر کی نشانی کو کیا پوچھتا ہے ہر رات قدر کے قابل ہے اگر تو اسکی قدر کرے)

شب قدر کی فضیلت

لیکن خیر ایسے باہمت تو اس وقت تک کہاں ہیں کہ وہ اس گوہر بے بہا کی تلاش میں سال بھر شب بیداری کریں مگر رمضان کے عشرہ اخیرہ میں تو ضرور ہی بیدار رہنا اور عبادت کرنا چاہیے کیونکہ ان راتوں میں شب قدر کا ہونا اغلب ہے اور اگر کوئی شخص نہایت ہی کمزور اور کم ہمت ہو تو خیر وہ ستائیسویں رات کو تو ضروری ہی بیدار رہے۔ کہ وہ شب اکثر شب قدر ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اتفاق سے وہ رات شب قدر نہ بھی ہوئی۔ اور تم نے بہ گمان شب قدر اس میں عبادت کی تو ان شاء اللہ تم کو شب قدر ہی کا ثواب عطا ہوگا۔ اور یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں ہے۔ حدیث میں اس کی اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات پھر ممکن ہے کہ اس کلیہ سے کسی کی تشفی نہ ہو تو دوسری حدیث موجود ہے۔ حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں۔

الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون والاضحی یوم تضحون[1]

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک شخص نے نہایت کوشش سے رمضان کے چاند کی تحقیق کی اور اس تحقیق کی بناء پر روزے رکھنے شروع کر دیئے پھر ختم رمضان پر عید کے چاند کی اسی طرح چھان بین کی اور اس کی بناء پر عید کر لی اسی طرح عید الاضحیٰ میں بھی کیا اور چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ تینوں تحقیق خلاف واقع تھیں تو اس صورت میں دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ جس دن روزہ رکھا وہی دن عند اللہ باعتبار مقبول روزہ کا تھا۔ اور جس دن عید کی وہی دن عید کا تھا یعنی روزہ اور عید دونوں مقبول ہیں۔ پس اسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر شب قدر کی نیت سے عبادت ہوئی ہے اور اتفاق سے وہ شب قدر نہ ہوئی تو ثواب شب قدر کا مل جائے گا۔

---

[1] سنن الترمذی: ۶۹۷، کنز العمال: ۲۳۷۲۰

صاحبو! اس تقریر کے بعد تو بہت ہی آسان معاملہ ہو گیا۔ اب بھی اگر ہمت نہ کی جائے تو غضب ہے۔ یہ دوسری فضیلت تھی عشرہ اخیرہ کی۔

فضیلت اعتکاف

تیسری فضیلت اس عشرہ میں یہ ہے کہ اس میں اعتکاف مشروع ہے اور ممکن ہے کہ یہ پہلی فضیلت کا تتمہ ہو جیسا کہ بعض نے کہا کہ اعتکاف کو دوسری حکمتوں سے بھی مشروع کہا جائے۔ خیر جو کچھ بھی ہو ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو کام کرنا چاہیے۔ احکام کے حکم اور مصالح کی تلاش اور کاوش ہمارا کام نہیں۔ کیونکہ یہ علوم فکر یہ نہیں ہیں کہ سوچنے اور غور کرنے سے سمجھ میں آ جائیں گے۔ یہ الہامی علوم ہیں خدا جس کو دے اس لئے جب تک شرح صدر نہ ہو جائے اس وقت تک کسی ایک کو تعیین نہ کرنی چاہیے دونوں احتمال ہیں۔ اس اعتکاف میں دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کمال کا ہے وہ تو یہ ہے کہ بیس تاریخ کو قبل از مغرب اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر باہر نکلے۔ سو یہ تو اب ممکن نہیں ہے کیونکہ ایک دن گزر گیا۔ اور دوسرا درجہ اس سے کم ہے اور وہ یہ کہ دس دن سے کم ہو لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر درجہ کمال حاصل نہ ہو تو ناقص درجہ کے حاصل کرنے سے فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس قدر نہ ہو گی تو کچھ تو ضرور ہو جائے گی۔

صاحبو! اگر دس دن ممکن نہ ہو سکے نو دن سہی۔ اس قدر بھی نہ ہو سکے سات دن سہی۔ غرض جس قدر بھی ہو سکے اور جتنے دن بھی ہو سکے چھوڑ نا نہ چاہیے۔

ایک بہت بڑی فضیلت اعتکاف کی یہ ہے کہ معتکف کو ایام اعتکاف میں ہر وقت وہی ثواب ملتا ہے جو کہ نمازی کو نماز میں ملتا ہے دلیل اس کی یہ حدیث ہے۔ **لایزال احد کم فی الصلوٰۃ ماانتظر الصلوٰۃ**[1]۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کیا جائے تو وقت انتظار میں بھی وہی ثواب ملتا ہے جو کہ وقت ادا الصلوٰۃ میں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معتکف جب ہر وقت مسجد میں رہے گا تو اس کو صلوٰۃ کا انتظار ضرور رہے گا۔ اگر یہ سو دے گا بھی تو اس نیت سے کہ اٹھ کر فلاں نماز پڑھنی ہے۔ کوئی کام بھی کرے گا تو اس نیت کے ساتھ کہ فلاں نماز تک یہ کام ہے۔ غرض اس کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا ہر ہر حرکت صلوٰۃ کے حکم میں لکھی جائے گی۔

اس تقریر کے بعد خیال میں آتا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے **المعتکف یعتکف**

---

[1] الصحیح للبخاری: ۱: ۱۶۶، ۱۶۸، کنز العمال: ۱۹۰۸۲

الذنوب کلها ویجری له الحسنات کلها[1]۔ (معتکف تمام گناہوں سے رکا رہتا ہے اور تمام نیکیوں کا اس کو ثواب ملتا ہے) الحسنات میں الف لام عہد کا نہیں جیسا اب تک سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بنا تھی کہ اعتکاف میں خاص حسنات کا صدور ہوتا ہے کل حسنات کا صدور خلاف مشاہدہ ہے۔ بلکہ استغراق کا ہوسکتا ہے مطلب یہ ہے کہ معتکف اپنے ایام اعتکاف میں گویا ہر نیکی کر رہا ہے اس کو سب نیکیوں کا ثواب ملتا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ جب انتظار الصلوٰۃ کے حکم میں ہے اور معتکف منتظر صلوٰۃ ہے تو وہ مصلی کے حکم میں ہوا اور صلوٰۃ ام العبادت ہے تو اس کا ادا کرنے والا گویا تمام عبادتیں کر رہا ہے پس معتکف بحالت اعتکاف سب عبادتیں ادا کر رہا ہے۔ صاحبو! اس سے زیادہ اور کیا فضیلت ہوگی۔

یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ عشرہ اخیرہ میں ایک فضیلت اعتکاف سے ہوئی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعتکاف میں جو فضیلت آئی ہے وہ عشرہ اخیرہ کی وجہ سے کہ زمانہ افضل میں عبادت کی زیادہ فضیلت ہوتی ہے لیکن یہ ہم کو کچھ مضر نہیں کیونکہ کبھی زمانہ میں بالذات ہی فضیلت ہوتی ہے جیسا کبھی بالغیر بوجہ اس کے مظروف کے ہوتی ہے۔ جیسا مشروع میں بیان ہوا بعد حکایت گفت معشوقے بعاشق۔ الخ کے۔ پس غرض خواہ اعتکاف میں عشرہ کی وجہ سے فضیلت ہو یا عشرہ میں اعتکاف کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں اعتکاف کی فضیلت ثابت ہے ہم کو اس کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کرید کی ضرورت نہیں کسی نے خوب کہا ہے ۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ☆ گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(نصیبہ اگر مدد کرے تو میں اس کے دامن کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لوں اگر وہ اپنی طرف کھینچ لے تو بڑی خوشی کا مقام ہے اور اگر میں اسے اپنی طرف کھینچ لوں تو یہ بھی میرے لئے عزت کی بات ہے)

صاحبو! چار دواؤں کا مرکب آپ کے مرض کو مفید ہے آپ کو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اس تفتیش کی ضرورت نہیں کہ اس دوا سے اس میں قوت بڑھی یا اس دوا سے۔ اس میں یہ تفتیش دوسرے کا کام ہے جو اس فن کو من حیث الفن حاصل کرے مریض کا کام صرف استعمال ہے ۔

کار کن کار بگذر از گفتار ☆ کاندریں راہ کار باید کار

قدم باید اندر طریقت نہ دم ☆ کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(کام کرو باتیں کرنے کا کام چھوڑ دو کہ اس راستہ میں صرف کام ہی کام چاہیے، اس راستہ میں کام

---

[1] لم اجد الحدیث فی "موسوعة أطراف الحدیث"

کے لئے قدم چاہیے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں کہ بغیر عمل باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے)

یہ فضیلت تو اس عشرہ کے ساتھ خاص تھی اب ایک اور مضمون عام جو اس عشرہ اخیرہ کے ساتھ بھی چسپاں ہے بیان کیا جاتا ہے۔

فضیلت خدمت والدین

وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ کے مجمع میں فرمایا رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ[1] صحابہؓ یہ الفاظ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کون شخص؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک تو وہ شخص کہ اپنی زندگی میں بوڑھے ماں باپ کو پائے اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے کی قید اس لئے بڑھادی کہ اگر ماں باپ خود جوان ہیں تو اول تو وہ اس کے محتاج نہیں ہوں گے جیسے اس کے پیر ہاتھ چلتے ہیں۔ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے ہیں۔

دوسرے ان کی خدمت سے دل بھی نہیں گھبراتا۔اس لئے اگر ان کی کچھ خدمت بھی کر دی تو کچھ بڑی بات نہیں بخلاف بوڑھے ماں باپ کے کہ وہ اسکے محتاج ہوتے ہیں اور چونکہ اکثر قوی بالکل کمزور ہو جاتے ہیں خود کچھ بھی نہیں کر سکتے اور اکثر کام مرضی کے موافق نہیں ہوتے تو تنگ مزاج بہت ہو جاتے ہیں۔اس لئے ایسے ماں باپ کی خدمت کرنا بوجہ ان کی معذوری کے ضروری اور ان کے تنگ مزاجی سے تنگ ہو جانا اور نافرمانی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔مگر اکثر آدمی تنگ ہونے لگتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانہ طفولیت و عالم احتیاج کو بھول جاتا ہے کہ اس وقت والدین نے کیسے کیسے ناز اٹھائے ہیں اگر وہ یاد رہیں تو بڑا نفع ہو۔

ایک بنئے کی حکایت مشہور ہے اس نے اپنے بڑھاپے میں ایک مرتبہ اپنے ایک لڑکے سے دریافت کیا کہ بھائی یہ دیوار پر کیا چیز بیٹھی ہے۔صاحبزادہ اول تو اس سوال پر دل میں بہت خفا ہوئے کہ اس لغو سوال کی آپ کو ضرورت ہی کیا تھی۔مگر خیر تہذیب سے کام لے کر بتلا دیا کہ ابا جان کوا ہے۔بنئے نے پھر پوچھا کہ بھائی! یہ دیوار کیا چیز ہے؟ صاحبزادہ نے کہا کہ ابھی تو بتلا دیا تھا کہ کوا ہے۔تیسری بار اس نے پھر پوچھا کہ تو صاحبزادہ نے بگڑ کر جواب دیا کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے چپکے پڑے رہو۔اس پر بنئے نے اپنا بھی کھاتا منگوایا اور کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادہ دیکھو! تم نے ایک سو بار مجھ سے اپنے بچپن میں یہی سوال کیا تھا۔اور میں نے ہر مرتبہ محبت سے جواب

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب البر و الصلة: ۱۰، مشکوٰۃ المصابیح :۴۹۱۲، الدر المنثور للسیوطی ۴: ۱۷۲

دیا تھا۔ تم دو ہی بار میں گھبرا گئے۔ لیکن شاید کوئی شخص یہ کہے کہ صاحب بوڑھوں کی تنگ مزاج سے ناگواری تو امر طبعی ہے اگر اس پر بھی باز پرس ہے تو سخت مشکل کی بات ہوگی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ امور طبعیہ پر خدائے تعالیٰ نے کہیں باز پرس نہیں فرمائی۔ باز پرس امور اختیاریہ میں ہے۔ کلام مجید اس شبہ کا خود ازالہ فرما رہا ہے پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے **ربکم اعلم بمافی نفوسکم ان تکونوا اصلحین فانہ کان للا وابین غفوراً۔**

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جائے اس میں معذور ہو لیکن خدائے تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے۔

صاحبو! ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ اس میں ہر ہر بات کے وہ وہ مخفی پہلو لئے گئے ہیں کہ دوسرے سے مربوط ہیں مگر افسوس ہے لوگ کلام اللہ کو رسمی طور پر پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک شخص تو رغم انفہ کا محل یہ ہوا۔ دوسرا وہ جس کے سامنے میرا نام آئے اور وہ درود نہ پڑھے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

تیسرے وہ شخص کہ رمضان آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اس نے اپنی مغفرت نہ کرائی یعنی ایسے عمل اور توبہ نہ کر لی جس سے گناہ معاف ہو جاتے۔ ایک دوسری حدیث میں بھی مغفرت سے رمضان کے تعلق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

ھو شھر اولہ رحمۃ واوسطہ مغفرۃ واٰخرہ عتق من النیران۔[۱]

(یہ وہ مہینہ ہے (جس کا پہلا دھاکہ) رحمت دوسرا (دھاکہ) مغفرت اور آخری (دھاکہ) دوزخ سے آزادی ہے)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینہ سراپا رحمت و مغفرت ہے۔ پس اس میں انسان اپنی مغفرت کا سامان کرے اور مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ نیک عمل کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغفرت کی تحصیل امر اختیاری ہے چنانچہ خدا تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں:

[۱] الترغیب والترھیب للمنذری: ۲:۹۵

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموات والارض اعدت للمتقین ، الذین ینفقون

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کو متقی لوگوں کے واسطے تیار کیا گیا ہے۔ تو جو شخص اس راستے پر چلے اور مقرر شدہ قانون پر عمل کرے گا وہ مغفرت کو حاصل کریگا۔ جو شخص ایسا نہ کرے گا محروم رہیگا ۔ پس معلوم ہوا کہ مغفرت کا حاصل کرنا خود ہمارے اختیار میں ہے اور اگر ہم چاہیں اس کو حاصل کر سکتے ہیں کہ متقی بن جائیں۔

بے علم واعظوں کی غلطی

اس موقع پر بے علم واعظوں کی غلطی کا بیان کرنا بہت ضروری ہے کہ وعظوں میں کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات بالکل بے پرواہ ذات ہے۔ وہ چاہے تو ایک نکتہ میں بخش دے اور چاہے تو ایک نکتہ میں جہنم بھیج دے اور یہ بات ایسے طور سے کہتے ہیں جس سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون نہیں۔ بلکہ یوں ہی اناپ شناپ بے تکے طور پر جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین سننے سے اکثر لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور عبادت ریاضت سب چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کس نکتہ پر اچانک پکڑ ہو جائے اور ساری محنت برباد ہی جائے۔

اسی طرح اکثر لوگ خوب جی بھر کر معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر شدہ قانون ہی نہیں ایک نکتہ پر عذاب ثواب کا مدار ہے تو اپنی خواہشات کو کیوں ترک کریں اور خواہ مخواہ کی مصیبت کیوں اختیار کریں ممکن ہے اسی میں سے کوئی نکتہ پسند آجائے کہ اس پر نوازش ہو جائے گویا کارخانہ خداوندی اینادنگر کی سلطنت ہے کہ جہاں سارے کام بے ڈھنگے ہی ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ چیلہ گرو سفر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے نام پوچھا تو اینادنگر معلوم ہوا۔ جس کے معنی ہیں بے اتفاقی کا شہر، اشیاء کا نرخ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اناج سے لے کر گھی دودھ تک ہر ہر چیز سولہ سیر روپیہ کی ملتی ہے۔

یہ سن کر چیلہ تو بہت خوش ہوا کہ خوب گھی دودھ کھا کر فربہ ہوں گے مگر گرو نے کہا کہ بھائی اس جگہ قیام مناسب نہیں۔ یہ شہر تو بہت ہی بے تکا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے میں کچھ امتیاز ہی نہیں۔ مگر چیلہ نے اصرار کیا۔ آخر رہ پڑے۔

چند روز میں سیر کرتے کرتے عدالت کی طرف پہنچے دیکھا کہ ایک مقدمہ راجہ صاحب کے

اجلاس میں درپیش ہے اورلوگوں کا ہجوم ہے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کوئی چور مدعی ہے مہاجن مدعاعلیہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ ہم دونوں چوری کرنے اس کے گھر گئے۔ نقب لگایا۔ میرا رفیق اندر جانے لگا تو دیوار اوپر سے آپڑی مرگیا قصاص چاہتا ہوں۔ مدعاعلیہ سے بازپرس ہوئی کہ وہ دیوار ایسی کیوں بنائی گئی۔ اس نے کہا معمار سے پوچھئے بنانے والا وہ ہے۔ وہ بلایا گیا اس نے کہا گارہ دینے والے سے پوچھا جائے۔ اس کو بلایا اس نے کہا کہ سقہ نے پانی ڈال دیا جس سے گارہ پتلا ہوگیا۔ اس کو بلایا اس نے کہا سرکاری ہاتھی جھپٹا ہوا آتا تھا۔ خوف سے پانی زیادہ نکل پڑا۔ فیلبان کو بلایا۔ اس نے کہا ایک عورت آتی تھی پازیب سے پہنے اس کی جھنکار سے ہاتھی دوڑ پڑا۔ عورت کو بلایا۔ اس نے کہا سنار نے ایسا ہی باجا ڈال دیا۔ اس کو بلایا وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ حکم ہوا کہ پھانسی دیدی جائے۔ پھانسی کے لئے لے چلے۔ جب اسے پھانسی پر چڑھایا تو پھانسی کا حلقہ اس کے گلے سے بڑا نکلا۔ لوگوں نے آکر راجہ صاحب سے عرض کیا کہ حلقہ اس کے گلے سے بڑا ہے۔

راجہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو کسی موٹے آدمی کو پھانسی دیدو۔ غرض موٹے آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ اتفاق سے مجمع بھر میں اس چیلے سے زیادہ موٹا کوئی نہ نکلا آخر اسی کو تجویز کیا گیا۔ اب تو چیلہ صاحب بہت گھبرائے اور گرو سے کہا کہ خدا کے لئے بچاؤ۔ اس نے جواب دیا میں نہ کہتا تھا یہاں رہنا اچھا نہیں آخر نتیجہ دیکھا۔

آخر گرو نے یہ تدبیر نکالی کہ پھانسی کے وقت خود بڑھ کر کہا کہ صاحبو! اس کو پھانسی نہ دو، مجھ کو دیدو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ اس وقت میں نے جوتش میں جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس وقت جو شخص پھانسی دیا جائیگا وہ سیدھا بیکنٹھ میں جائیگا۔ راجہ صاحب نے جو یہ سنا تو بڑھ کر فرمایا کہ اچھا جب ایسی بات ہے تو ہم کو پھانسی دیدو تا کہ جنت ہمیں حاصل کرلیں۔ چنانچہ راجہ صاحب کو پھانسی دیدی گئی۔ خس کم جہاں پاک صادق ہوا۔

تو ان نیم واعظوں کے ایسے بہانوں سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی بھی دوسرا اندھیر نگر ہے۔

صاحبو! یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ہر کام کا ایک قانون مقرر ہے۔ ثواب کا بھی ایک قانون ہے۔ عذاب کا بھی ایک قانون مقرر ہے ثواب کا کام تو یہی ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے وسارعوا الآیۃ یعنی تقویٰ حاصل کرو اور مغفرت وجنت لے لو۔ تو معلوم ہوا کہ مغفرت ورحمت کا لینا بالکل ہمارے اختیار میں ہے اور نہ اگر اس کو اختیار میں نہ مانا جائے تو سارعوا کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کیونکہ تکلیف مالا یطاق محال ہے اور خلاف نص ہے اور یہاں امر ہوا مسارعت الی

المغفرت کا تو ضرور وہ تحت الاختیار ہے۔ پس جب رمضان کی رحمت اور مغفرت کا حاصل کرنا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کی تحصیل کی کوشش کرو اور اس وعید رغم انفہ کے مصداق نہ بنو۔

توبہ کی ترغیب

اگر یہ خوف ہو کہ توبہ ٹوٹ جائیگی اور گناہوں سے باز نہ رہ سکیں گے تو ہمت نہ ہارو۔ کیونکہ پھر توبہ کر لینا۔ دیکھو! اگر ایک کپڑا پھٹ جاتا ہے تو اس کو بالکل پھٹا ہوا نہیں چھوڑتے کہ سینے کے بعد پھر پھٹ جائیگا بلکہ سی کر پھر کام میں لاتے ہیں۔ پس یہی حالت توبہ کی ہے کہ محض اس کے ٹوٹنے کے احتمال سے اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس وقت پھر توبہ کر لینا چاہیے باب توبہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ اگر دن میں سو دفعہ بھی توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کر لو۔ مایوس نہ ہو جاؤ خوب کہا ہے۔

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی باز آ ☆ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ☆ صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

(پھر آؤ پھر آؤ تم جس حالت میں ہو چلے آؤ اگرچہ کافر ہو یا آتش پرست ہو یا بت پرست ہو چلے آؤ ہمارا یہ دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے (اگر سو مرتبہ توبہ توڑ چکے ہو جب بھی چلے آؤ)

بلکہ اسی ترک توبہ ہی کی وجہ سے ہم کو معاصی پر زیادہ اجرت ہوگئی ہے کیونکہ جو شخص توبہ کرتا رہے گا۔ اس کے دل میں عظمت خداوندی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہے گی۔ یہ بڑا سبب ہے معاصی سے رک جانے کا برخلاف اس شخص کے جو کبھی توبہ نہ کرے گا۔ وہ خدا کو بالکل بھول جائے گا اور جب اس کی عظمت پیش نظر نہ ہوگی تو کچھ بھی اس سے ہو جائے بعید نہیں۔

ختم قرآن پر شیرینی

یہ مضمون اس عشرہ اخیرہ کے متعلق تھا اور ایک بات اس کے متعلق یاد آئی۔ چونکہ بعض لوگوں کو اس کی ضرورت ہوگی اس لئے اس کا بیان کر دینا بھی اس مقام پر مناسب ہے۔ بات اگرچہ بہت پرانی ہے اور بہت دفعہ لوگوں کے سامنے تقریراً و تحریراً پیش ہو چکی ہے مگر چونکہ اکثر لوگوں نے اس کو دل سے بھلا دیا ہوگا۔ اس وقت پھر اعادہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس عشرہ میں اکثر مساجد میں قرآن شریف ختم ہوگا۔ اس میں اکثر لوگ پڑھنے والوں کو کچھ دیا کرتے ہیں۔ سو یہ لینا چھوڑ دو۔ دوسرے اکثر مساجد میں ختم کے دن شیرینی تقسیم ہوتی ہے اس میں جو گڑبڑ ہوتی ہے سبھی جانتے ہیں اور ان گڑبڑوں کی وجہ سے جو شرعی قباحتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کو بھی متعدد مرتبہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت ان کے دہرانے کا وقت ہے نہ چنداں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اس کے مفاسد پر نظر کر کے اس کو بھی چھوڑ دو۔

دیکھو! اس کی بدولت بیچارے بعض غرباء پر سخت بار ہو جاتا ہے۔ اس انتظام کے متعلق بعض غریب جلاہوں نے شکریہ میں یہ کہا کہ ہم بہت ممنون ہیں۔ کیونکہ ہم کو چندہ دینے کی مصیبت سے بچالیا۔ معلوم ہوا کہ لوگوں پر چندہ لینے سے بار ہوتا ہے بتلایئے یہ کیونکر جائز ہوگا۔ بعض رئیسوں نے مجھ سے کہا کہ آپ غریبوں کو منع کیجئے لیکن امیروں کو منع کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ خیال بالکل لغو ہے اس لئے کہ اگر امیروں نے چھوڑ دیا تو غریبوں کو چھوڑنا کچھ مشکل نہیں۔

بعض مساجد ایسی بھی ہیں کہ ان میں چندہ سے شیرینی تقسیم نہیں ہوتی لیکن وہاں دوسری خرابیاں ہوتی ہیں مثلاً ریاء و نمود کے لئے تقسیم کرنا۔ عوام الناس اور بچوں کے ہجوم سے مسجد کی بے حرمتی ہونا۔ لڑکوں کا حصہ مانگنے میں بلاوجہ پٹنا۔ غرض اس قسم کی بہت سی خرابیاں ہیں کہ زیرک آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے۔

ایک مرتبہ بریلی میں قرآن سنانے کا اتفاق ہوا۔ ختم کے روز میرے بھائی نے تقسیم شیرینی کے لئے کہا۔ میں نے منع کیا لیکن انہوں نے کہا کیا مضائقہ ہے ان کا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو خود ان خرابیوں کا مشاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ میں خاموش ہو رہا شب کو شیرینی تقسیم کی گئی۔ اور انہوں نے اپنے اہتمام سے خود تقسیم کی۔ لوگوں کے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعد تقسیم خود کہا کہ آپ کی رائے بہت صائب تھی۔ واقعی یہ خرافات کبھی نہ کرنے چاہئیں اور اس کا احساس ان کی دانش مندی کی دلیل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود خرابیاں سمجھ جانے کے بعد اپنے خیال سے باز نہیں آتے اور اس کو نہیں چھوڑتے۔

یہ احکام تھے اس عشرہ اخیرہ کے متعلق۔ ان سب کو یاد رکھنا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ ان پر پورے طور پر عمل ہو جائے اور جو لوگ مجمع میں حاضر نہیں ہیں ان کو بھی پہنچا دینا چاہیے اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائے۔

اللهم تقبل منا امين بحرمة جاه سيد المرسلين.

تطہیر رمضان

اصلاح منکرات رمضان کے متعلق یہ وعظ ۲۱ شعبان ۱۳۱۹ھ کو محلّہ ٹھیٹھرہ میں بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا حاضری تخمیناً ۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

یایها الذین امنوا کتب علیکم الصیام الخ

حسنات وسیئات

بوجہ قرب رمضان شریف مناسب ہے کہ کچھ احکام اس کے بیان کردیئے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے۔ اس کے تو بیان کی ضرورت نہیں اور ایسے ہی تراویح سنت مؤکدہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ اس کے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ البتہ ضروری مضمون یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس مہینہ میں کچھ منکرات بڑھادیئے ہیں۔ اور وجہ اس کی یا تو عدم علم ہے یا قصور علم یا جانتے ہیں مگر احتیاط نہیں کرتے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ اللہ میاں نے اس مہینہ میں ان چیزوں کو بھی حرام کردیا جو پہلے حلال تھیں کیا یہ اس بات پر دال نہیں کہ جو چیز ہمیشہ سے حرام ہے اس میں شدت زیادہ ہوجائیگی۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے علت بیان کی روزہ رکھنے کی لعلکم تتقون ، روزہ اس واسطے ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ اب ہر شخص غور کرے کہ قبل رمضان میں اور رمضان میں کچھ فرق اس کی حالت میں ظاہر ہوا۔ اس نے نظر بد کو یا غیبت کو چھوڑ دیا یا نہیں۔ سو کچھ نہیں دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ کسی باب میں بھی کمی نہیں ہوئی۔ اب رہا کھانا سو اس کے بھی وقت بدل دیئے مقدار میں کچھ تغیر نہیں

کیا۔ غرض یہ کہ شارع علیہ السلام کا تو مقصود یہ تھا کہ منکرات میں کمی ہو۔ مگر لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا ۔اہل تحقیق تو کھانے تک میں بھی کمی کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں بہ نسبت شعبان کے۔ مگر اس کی مقدار کچھ معین نہیں ہوسکتی ہے۔ جتنا شعبان میں کھاتے تھے اس سے کم کر دیا۔ بعض نے صرف بقدر لایموت کھا کر روزہ رکھا۔ جب ہی تو کچھ اثر پایا۔ ہمیشہ اچھی طرح کھایا ایک مہینہ عبادت ہی کے واسطے سہی۔ حاصل یہ کہ ان لوگوں نے اکل میں بھی کمی کر دی مگر یہ بات مندوب (مستحب) خواص کیلئے ہے یہ ہر شخص سے نہیں ہوسکتا ہے مگر معاصی تو چھوڑو۔ خیر کھانے کے لئے جواز کا مرتبہ تو ہے معاصی کے واسطے تو جواز بھی نہیں۔ ہم برخلاف اس کے دن بھر معاصی میں مشغول رہتے ہیں۔ بلکہ بعضے تو عصیان میں اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔

اسی کو دیکھ لیجئے کہ صبح کی نماز اس مہینہ میں اپنے وقت پر ہوتی ہے یا نہیں۔ اس نماز کی تو وقت سے تاخیر کرنے کی عادت ہوگئی ہے بہتیروں کی تو قضا ہوتی ہے۔ اور قضا بھی ہو تو اس قدر تاخیر تو ہوتی ہے جس سے جماعت فوت ہو جائے خوش ہیں۔ کہ ہم نے روزہ رکھ لیا۔ بڑا تعجب ہے کہ نماز کو چھوڑ دیا روزہ کیا کفایت کرسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اس قدر بڑھا دیا کہ دس ضعف ثواب کا وعدہ فرما دیا اور ہم اس قدر گناہ کرتے ہیں کہ حسنات باوجود اتنے بڑھائے جانے کے بعد بھی سیئات کے برابر نہیں ہوتیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حسنات کی تعداد بڑھی ہوئی رہتی۔ اس کو بھی جانے دیجئے برابر تو رہتی کہ پھر بھی حسنات بموجب سبقت رحمتی علیٰ غضبی (میری رحمت میرے غصہ پر غالب آ گئی) کے غالب ہو جاتیں اور جب باوجود اضعافاً مضاعفہ ہونے کے بھی نیکیاں گناہوں کے برابر نہیں ہوئیں بلکہ گناہ بڑھا رہتا ہے تو پھر کیا حشر ہونا ہے۔

اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اگر ہمیشہ ہم کو اس پر قادر نہیں کہ معاصی کو گھٹا دیں تو رمضان میں تو ایسا کر لیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینہ تک رہتا ہے جو کوئی اس میں کوئی نیکی بتکلف کر لیتا ہے اس کے بعد اس پر بآسانی قادر ہو جاتا ہے۔ اور کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب کر لے تمام سال بآسانی اجتناب کرسکتا ہے اور اس مہینہ میں معصیت سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ محرک کی قید ہو جانے کی وجہ سے۔ اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل مفقود ہی ہو جائیں کیونکہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے اس مہینہ میں

وہ معصیت کرائے گا۔ مگر ہاں کم اثر ہوگا کیونکہ ایک ہی محرک رہ گیا۔ اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارہ کرلی جائے تو کوئی بات نہیں۔ غرض! اس میں ہر عضو کو گناہ سے بچایا جائے۔

زبان کے گناہ

ایک زبان ہی کے بیس گناہ ہیں جیسا کہ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ایک ان میں سے کذب ہے جس کو لوگوں نے شیر مادر سمجھ رکھا ہے اور کذب وہ شے ہے کہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں اور پھر اس کو مسلمان کیسا خوشگوار سمجھتے ہیں ذرا سا بھی لگاؤ کذب کا ہوجائے بس معصیت ہوگئی۔

یہاں تک کہ ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا نے ایک بچہ سے بہلانے کے طور پر یوں کہا کہ یہاں آؤ چیز دیں گے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ آجائے تو کیا چیز دو گے۔ انہوں نے دکھایا کہ یہ کھجور ہے میرے ہاتھ میں۔ فرمایا کہ اگر تمہاری نیت میں کچھ نہ ہوتا تو یہ معصیت لکھ لی جاتی۔

حضرت! کذب یہ چیز ہے۔ خیر یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ اگر اس سے احتراز نہ ہوسکے تو کذب مضر سے تو بچنا چاہیئے اور پھر روزہ میں۔

دوسرا گناہ زبان کا غیبت ہے لوگ یوں کہا کرتے ہیں کہ میاں ہم تو اس کے منہ پر کہہ دیں۔ منہ پر عیب جوئی کروگے تو بہت اچھا کروگے اور پیچھے تو ظاہر ہے جیسا اچھا ہے بلکہ اگر منہ پر برا کہوگے تو بدلا بھی تو پاؤ گے وہ شخص تمہیں برا کہہ لے گا یا اپنے اوپر سے اس الزام کو دفع کرے گا۔ پیچھے برائی کرنا تو دھوکے سے مارنا ہے یاد رکھو! جیسا کہ دوسرے کا مال محترم ہے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ آبرو ہے چنانچہ جب آبرو پر آبنتی ہے تو مال دولت کیا چیز ہے جان تک کی پرواہ نہیں رہتی۔ پھر آبروریزی کرنیوالا کیسے حق العبد سے بری ہوسکتا ہے مگر غیبت ایسی رائج ہوئی ہے کہ باتوں میں احساس بھی نہیں ہوتا کہ غیبت ہوگئی یا نہیں۔ اس سے بچنے کی ترکیب تو بس یہی ہے کہ کسی کا بھلا یا برا اصلاً ذکر ہی نہ کیا جائے کیونکہ ذکر محمود بھی اگر کیا جائے کسی کا تو شیطان دوسرے کی برائی تک پہنچادیتا ہے اور کہنے والا سمجھتا ہے کہ میں ایک ذکر محمود کررہا ہوں اور اس طرح ایک خیر اور ایک شر مل جانے سے وہ خیر بھی کالعدم ہوگئی۔ اور حضرت اپنے ہی کام بہتیرے ہیں پہلے ان کو پورا کیجئے دوسروں کی کیا پڑی۔ علاوہ بریں غیبت تو گناہ بے لذت بھی ہے اور دنیا میں بھی مضر ہے جب دوسرا آدمی سنے گا تو عداوت پیدا ہوجائیگی۔ اور پھر کیا ثمرات اس کے ہوں گے۔ اسی طرح زبان کے بہت گناہ ہیں سب سے بچنا ضروری ہے۔

افطار علی الحرام

ان کے علاوہ ایک گناہ جو خاص روزہ کے متعلق ہے افطار علی الحرام ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس مہینہ میں حلال کا کھانا بھی ایک وقت میں حرام ہوگیا اور پھر دن بھر تو اسے لوگ چھوڑے رہیں اور شام کو حرام سے افطار کریں۔ اور دراصل بعض لوگوں نے خبط میں ڈال دیا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ رزق حلال تو پایا نہیں جاتا سوائے اس کے کہ دریا میں سے مچھلی شکار کر کے کھائی جائے یا سبزی کھا کر یا گھاس چر کر پیٹ بھر لیا جائے اور کچھ قصے اس کے متعلق مشہور کئے ہیں۔

وہ ایک بزرگ کا قصہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان کا بیل لڑتے لڑتے دوسرے کے کھیت میں چلا گیا تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا کہ نہ معلوم دوسرے کے کھیت کی مٹی جو میرے بیل کے کھر میں لگ کر بلا اجازت چلی آئی کون سے دانہ میں شامل ہوگئی ہو۔

اگر یہ قصہ ہوا ہے تو وہ صاحب حال ہے دوسروں کے لئے ان کا فعل حجت نہیں ہوسکتا۔ قصداً اتنا مبالغہ کرنا تقویٰ کا ہیضہ اسی کو کہتے ہیں جب اتنے شبہ کو بھی حرام میں داخل سمجھا جائے گا اور اس سے بچنا ظاہر ہے کہ مشکل ہے تو گمان یہ ہوگا کہ حرام سے بچنا مشکل ہے پس سب حراموں میں مبتلا ہو گئے اور حلال کو بالکل چھوڑ ہی دیا۔

میں کہتا ہوں کیا کنز وہدایہ بالکل لغو ہی ہیں۔ جب یہی بات ٹھہری کہ حلال کا وجود ہی نہیں تو ناحق اتنا بسط کیا۔ صرف اتنا کافی تھا کہ الحلال لا یوجد ہر گز نہیں جس پر کنز وہدایہ فتویٰ دے دیں۔ وہ حلال ہے میں کہتا ہوں کیا سب علماء حرام خور ہیں۔

ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحبؒ ان کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ان کو مال حرام دھوکے سے بھی کھلا دیتا تھا تو قے ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر بھی وہ دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں ضرور ہے ورنہ وہ کیا کھاتے تھے۔ اگر فرض کیجئے کہ مال حرام ہی کھاتے تھے تو طبیعت کو یہ نفرت نہیں ہوسکتی یا یہ کہ ہمیشہ قے ہی کیا کرتے ہوں گے تو کھانا فضول ہے۔

غرض! دنیا میں حلال بھی ہے حرام بھی ہے جو مسائل دریافت کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے مگر لوگ پوچھتے ہی نہیں اور یہ فساد پیدا کا ہے سے ہوا کہ لوگوں نے پوچھنا چھوڑ دیا۔ جو جی میں آیا کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے عادی ہو گئے۔ اب جو کسی نے منع کیا تو اس کا چھوڑنا نہایت دشوار معلوم ہوا۔ بس کہہ دیا کہ میاں یہ لوگ تو خواہ مخواہ بھی حلال کو بھی حرام ہی کہا کرتے ہیں۔ ان کی تو غرض یہی ہے کہ مال نہ بڑھے

اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے کہ مال نہ بڑھے اور مسلمانوں کو ترقی نہ ہو۔ بس ہوتے ہوتے یہ ذہن میں جم گیا کہ ان کے یہاں تو سب چیز حرام ہی ہے حلال کا وجود ہی نہیں جو حلال تھا وہ بھی حرام ہی سمجھنے لگے اور اس خوف سے مفتی کے پاس جانا چھوڑ دیا کہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے کس معاملہ کو حرام بتا دیں یا حلال بتا دیں تو ہماری خاطر سے ہی شاید کہہ دیں اور فی نفسہ حرام ہی ہوگا کیونکہ حلال کا تو وجود ہی نہیں۔

سو یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس کو مفتی مباح کہے وہ عنداللہ مباح ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

شیطان کے جال

شیطان کے بہت سے جال ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ سب حرام ہے۔ پھر بعض لوگ حرام وحلال میں خواہ مخواہ شبہ کر کے حلال کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب اس میں وسوسہ ہے تو چھوڑ ہی دو۔ چاہے مفتی کتنا ہی کہے کہ یہ حلال ہے مگر وہ اس کے چھوڑنے ہی کو اولیٰ سمجھتے ہیں۔ نہیں! اس فعل میں کچھ حرج نہیں جو مباح ہے۔ اہل علم سے پوچھ لو کہ کوئی وجہ اس میں اباحت کی بھی ہے یا نہیں۔ جس سے وہ منع کریں۔ اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت باندھو اور اگر نفس کم ہمتی ہی کرے تو اس سے یوں کہو کہ یہ جو حکام وقت کے احکام ہیں ان کو کس طرح مانتا ہے اس کو بھی حاکم حقیقی کا حکم سمجھ کر مانو۔ پھر دوسرے لوگ بھی ان شاء اللہ تم سے معارضہ نہ کریں گے۔

میرا ہی خود قصہ ہے کہ کبھی زیور بنواتا تو چونکہ چاندی کے واسطے روپیہ دینے سے ربوا لازم آ جاتا ہے۔ اس لئے جب کبھی زیور بنوانے کا اتفاق ہوتا۔ میں چاندی دوسری جگہ سے خرید کرا سے دیدیتا۔ دو ایک مرتبہ تو اس نے کہا کہ روپیہ دیدو پھر تول کر حساب کر دینا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ میرے دین کے خلاف بات ہے۔ بس اس نے اس کو خوشی سے منظور کر لیا۔

تو لوگ سب مان جاتے ہیں۔ آدمی پکا چاہیے اور اللہ میاں کی طرف سے اسباب ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خیال کر لیجئے کہ حاکم جب کسی امر شاق کا حکم دیتا ہے تو اس پر مامور کی اعانت بھی کیا کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ دل کو مضبوط کر واور اس پر عزم کر لو کہ ہم کوئی کام بلا پوچھے نہ کریں گے۔

رزق میں برکت کے معنی

ہاں اس پوچھنے سے بعض صورتیں عدم جواز کی بھی نکلیں گی۔ اور اس میں آمدنی کبھی کم ہو جائے

گی۔تو خوب سمجھ لواور تجربہ کرلو کہ اس کم ہی میں برکت ہو جائیگی اوراس کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آ کر دو من اترے ممکن تو ایسا بھی ہے۔

ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ مسجد بنوا رہے ہیں اور ایک تھیلی میں روپے رکھے تھے اور کام شروع کیا۔ جب ضرورت ہوتی اس میں ہی سے ہاتھ ڈال کر نکال لاتے۔ یہاں تک کہ سب کام بن گیا۔ حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں۔ بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں۔

وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں مقدمات میں لاطائل (بیکار) تکلفات میں ضائع نہ جائے جو کچھ آئے تمہاری ہی ذات پر صرف ہو۔ چاہے تھوڑا ہو اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو۔ اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی۔ مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرت اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں ۔

بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیرپا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور ہیں خیال کیجئے اس لفظ کو!

ایک بادشاہ کے سامنے کوئی چیز لے جایئے اور وہ اس کی نسبت منظور و عدم منظوری کچھ ظاہر نہ کرے مگر اس میں کوئی عیب نہ نکالے اور خازن کو حکم دیدے کہ رکھ لو۔ تو لے جانے والے کے دماغ آسمان پر پہنچ جائیں گے اور سناتا پھرے گا کہ بادشاہ نے ہمارا ہدیہ رکھ لیا اور اللہ میاں کے یہاں ہم لوگ اپنے اعمال لے جاتے ہیں اور ذرا ان اعمال کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کس قابل ہیں۔

ہم اور ہماری نمازیں

ایک نماز ہی کو لے لیجئے۔ اس وقت نظیر کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں اللہ میاں سے باتیں کرنے کو اور کرتے ہیں کس سے گاؤ خر سے۔ یا یوں مثال دیجئے کہ ایک بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے اپنے غلام کو دربار میں حاضری کی اجازت دی۔ بلکہ یوں کہئے کہ زبردستی طلب کیا۔

(ہم لوگ ایسے بھلے مانس تو کاہے کو ہیں کہ حاضری کی اجازت سے ہی دربار میں پہنچنے کو غنیمت سمجھیں) زبردستی بلائے ہوئے بلکہ پا بہ زنجیر ہو کر دربار میں پہنچے اور کام ہم سے کیا ہے کہ بادشاہ کو ان پر رحم آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے دربار میں کچھ گفتگو کرے کہ درباریوں اور تمام رعایا میں ان کی عزت ہو جائے اپنا کچھ نفع مقصود نہیں۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تر بر بندگان جو دے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ اُن پر جود و سخاوت کروں) ہائے ۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ اُن پر جود و سخاوت کروں)

اللہ میاں کا کیا نفع ہے ہمارے پیدا کرنے یا عزت دینے سے۔ خیر! ان حضرت نے کیا مکافات کی اس بلانے کی کہ پہنچتے ہی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر بادشاہ تو کم ظرف نہیں ہے۔ اس گستاخی پر نظر نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے اپنے خادموں کو کہ اس بے وقوف کی انگلیاں کانوں سے نکال دو بلکہ ہاتھ باندھ دو کہ پھر انگلیاں کانوں میں نہ دے سکے اور منہ اس کا ہماری طرف کر دو اور جلدی سے کچھ شفقت آمیز کلمات زبان سے فرمانے لگا کہ ایک دفعہ تو اس کے کان میں پڑ جائیں۔

دیکھیں تو معلوم کیسے نہیں ہوتا۔ مگر یہ قسم کھا کر چلے ہیں کہ الٹا ہی کریں گے جھٹ سے پھر انگلیاں کانوں کی طرف بڑھائیں مگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے جلدی سے اس خوف سے کہ کہیں محبوب کا کلام کان میں پڑ جائے اس جگہ سے بھاگ اصطبل میں گھوڑے کے پاس جا چھپے۔ وہاں آدمی پکڑنے کے لئے پہنچا گدھے کے پاس جا چھپے۔ غرض ایک گھنٹہ بھر یہی کیفیت رہی کہ یہ بھاگا کئے اور بادشاہ کے نوکر بلکہ خود بادشاہ۔ اللہ اکبر! ان کے پیچھے پھرا کیا۔ مگر انہوں نے وہی کیا۔ جو شامت اعمال سے ہونا تھا۔

اب فرمایئے کہ یہ شخص کس سزا کا مستحق ہے۔ یا بادشاہ کو اس پر رحم آنا چاہیے یہ تو اس قابل ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی یہ حرکت اس نے کی ہے تو توہین بادشاہ کے جرم میں اس کو لے لیا جائے

اور دربار کی حاضری کی کبھی اجازت نہ ہو۔اب آپ اپنے معاملہ کو اللہ میاں کے ساتھ دیکھ لیجئے کہ ادھر سے تو حاضری کی اجازت ہر وقت یعنی نفل نماز کے لئے اجازت ہے جب چاہو پڑھو (باستثناء تھوڑے سے وقتوں کے) مگر ہمیں توفیق نہیں ہوتی کہ اس اجازت کو غنیمت سمجھیں یہاں تک کہ پکڑ کر بلانے کی نوبت پہنچی یعنی فرض نماز کا وقت آیا۔ نہایت کاہلی کے ساتھ گرتے پڑتے پہنچے۔ برا بھلا وضو کیا اور بہ اکراہ نیت نماز کی یعنی سامنے باتیں کرنے کو کھڑے کئے گئے۔ کھڑے ہوتے ہی منہ ایسا پھیرا کہ کچھ خبر نہیں صرف الفاظ زبان پر جاری ہیں دھوکا دینے کے واسطے آداب شاہی بجالا رہے ہیں یعنی **سبحانک اللھم** (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے) پڑھا۔ اللہ میاں نے اس منہ پھیرنے پر نظر نہ کی اور کلام شروع کیا۔ چنانچہ **الحمد لله رب العالمين** (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار ہیں) پر جواب ملنا حدیثوں میں آیا ہے۔ ذرا سی بھنک کان میں پڑتے ہی ایسے بھاگے کہ سیدھے گھر آ کر دم لیا۔ کبھی بیوی کے پاس، کبھی بچوں کے پاس، کبھی مکان میں۔ کبھی طویلہ میں پھرا کئے۔ مراد اس سے خیالات کی جولانی ہے۔

غرض یہی مسخرا پن کیا کئے یہاں تک کہ بمشکل تمام دربار کی حاضری ختم تک پہنچی یعنی سلام پھیرا۔ بڑی خیر ہوئی۔ بادشاہ کی ہم کلامی سے بچ گئے۔ جانے وہ کاٹ کھاتا یا کیا کرتا تھا (یہ خبر نہیں کہ کیا کرتا اور کیا ہوتا اور یہ کیا پاتے)

صاحبو! اب ان گستاخوں کی سزا وہی ہونی چاہیے تھی یا نہیں جو مثال میں میں نے عرض کی کہ اگر ایک دفعہ بھی ہم ایسی نماز پڑھتے تو کبھی اللہ میاں کے یہاں ہم کو گھسنے نہ دیا جاتا اور فوراً دربار سے نکلتے ہی گرفتاری اور حبس دوام کا روبکار جاری ہو جاتا۔ مگر سنیئے! کہ اللہ میاں سے کیا روبکار جاری ہوا **وكان سعيكم مشكورا** (اور تمہاری کوشش (جو دنیا میں کرتے تھے) مقبول ہوئی)۔ اس نے دربار میں آ کر اتنی دیر کی مصاحبت کو بہت اچھی طرح انجام دیا۔

مرجانے کی بات ہے اچھی طرح تو جیسے انجام دی وہ ہم بھی خوب جانتے ہیں اور جو وہاں حاضر تھے انہوں نے بھی خوب دیکھا بلکہ حاضرین کے سامنے شرم رکھنے کے واسطے فرماتے ہیں **فاولئک يبدل الله سيئاتهم حسنات** (پس ایسے لوگوں کے اللہ تعالیٰ گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں) گویا یہ بے وقوف ہے کتنی ہی گستاخیاں کیں مگر ہم اس آنے کو حاضری ہی میں لکھے لیتے ہیں اور اس کی وہی عزت کی جائے جو باقاعدہ آنے والے کی کی جاتی ہے۔ اب

فرمایئے! کہ اگر ایک مرتبہ ایسا معاملہ بادشاہ کسی کے ساتھ کرے تو کیا دوبارہ اس شخص کی ہمت پڑسکتی ہے کہ پھر اسی طرح وحشیانہ طریق سے دربار میں جائے ہرگز نہیں۔ بلکہ سر سے پیر تک خجالت کے پسینہ میں غرق ہو جائے گا۔ مگر ہم ایسے احسان فراموش ہیں کہ ایک دو دفعہ کیا معنی سینکڑوں بار بلکہ ہر روز پانچ بار یہی جفا کاری کرتے ہیں۔ مگر ادھر سے مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان لنگڑے لولے اعمال (بلکہ اعمال کیسے کہا جا سکتا ہے بداعمالیوں) میں بھی کمی اور کوتاہی ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے محرمات کی طرف میلان ہے۔

صاحبو! ذرا شرماؤ اور عمل کرو اور حرام سے بچو۔ خاص کر رمضان کے مہینہ میں یہ منکرات تو روزہ کے ہوئے۔

تراویح کی منکرات

اب ایک عمل اور ہے خاص رمضان کا۔ جیسے دن کا عمل روزہ ہے ایسے رات کا عمل قیام ہے۔ اس میں یوں خبط کر دیا کہ تراویح کی بیس رکعت گنتی میں تو پوری کر لیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں توریت پڑھی جاتی ہے یا انجیل پڑھی جاتی ہے یا تو شروع کا حرف سمجھ میں آتا ہے یا رکوع کی تکبیر۔

ایک حافظ کا قصہ ہے کہ قرآن شریف پڑھتے پڑھتے جہاں بھولے وہاں کچھ اپنی تصنیف سے پڑھ دیا بڑی تعریف ہوتی رہی مدتوں کہ ان کو کہیں متشابہ بھی نہیں لگتا لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

صاحبو! اللہ میاں کو دھوکا مت دو۔ بیس رکعتیں گنا کر ذرا ڈھنگ سے بھی تو کرو۔

ایک یہ ظلم ہوتا ہے کہ حافظ مقتدیوں کو بہکاتا ہے اس طرح سے کہ قراۃ کو اتنا طول دیتا ہے کہ کوئی ٹھہر ہی نہ سکے پانچ پانچ سیپارہ ایک ایک رکعت میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں بشرا ولاتنفروا ویسروا ولا تعسروا[1] خوش خبری سناؤ اور نفرت مت دلاؤ اور آسانی کرو اور تنگی میں مت ڈالو۔

شبینہ کی بدعات و منکرات

ہاں ایسا ہی شوق ہے تو تہجد میں پڑھو جتنا چاہو اور اس میں اور جس کا جی چاہے شریک ہو جائے۔ مگر اس میں بھی امام کے علاوہ تین سے زیادہ جماعت میں نہ ہوں۔ کہ فقہاء نے مکروہ کہا ہے کیونکہ پھر نفل میں فرض کا سا اہتمام ہو جائے گا۔

[1] الصحیح للبخاری ۵:۳۰۳،۲۰۵،۸:۳۶،۹:۸۷،الصحیح لمسلم کتاب الجهاد:۷، کتاب الأشربة: ۷۱

بعضے لوگ ایک ہی شب میں ختم کرتے ہیں جسے شبینہ کہتے ہیں اس میں تو کئی بدعتیں ہیں۔ غور کر کے دیکھ لیجئے کہ اس میں نیت صرف نمود کی ہوتی ہے کیا امام اور کیا مہتمم اور کیا سامعین۔ امام تو داد ملنے کے امیدوار رہتے ہیں کہ جہاں سلام پھیرا اور لوگوں نے منہ پر تعریف کر دی تو خوش ہو گئے ورنہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔ حدیث شریف میں منہ پر تعریف کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ اس کے منہ میں خاک جھونک دو۔ اور امام صاحب کے قلب پر بھی اثر ہوتا ہی ہے اور اسی تعریف کرانے کو بعضے امام تو لقمہ بھی نہیں لیتے۔ اسی وجہ سے کہ لوگ کہیں گے کہ اچھا یاد نہیں اور مہتمم تو سامعین میں شامل نہیں ہوتے۔ چائے پانی سے ہی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

میں پوچھتا ہوں کہ شبینہ سے چائے پانی مقصود ہے یا قرات وسماعت قرآن ایک شے میں البتہ چائے سے مدد مل جاتی ہے سماعت اور قرات میں۔ مگر جب ذریعہ مقصود میں مخل ہو جائے تو ذریعہ کہاں رہا۔ اور یہ بھی جانے دیجئے مہتمم صاحب کو تو یہ ثابت کرنا منظور ہے کہ ہمارے یہاں فانی مسجد سے اہتمام اچھا رہا۔ بس چائے پانی اچھا رہا مگر اصل شی تو اچھی نہیں رہی۔

رہے سامعین تو انصاف سے کہہ دیجئے کہ وہ قرآن شریف سننے کے لئے آتے یا نماز کے ساتھ دل لگی کرنے کو۔ کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے ہیں، کچھ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی کچھ لوگ بیٹھ بھی نہ سکے تو نیت توڑ کر لیٹے لیٹے سُن رہے ہیں اور کریں بھی کیا۔ بیچارے گھنٹوں تک کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں اور بعضے جو اپنے اوپر جبر کر کے کھڑے بھی ہیں تو امام کی زلتوں کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ وہ خواہ کیسی ہی غلطی کرتا چلا جائے بتلا نہیں سکتے کیونکہ حرج ہو گا اور قرآن شریف ختم سے رہ جائیگا۔ اور بعضے تو یہ غضب کرتے ہیں کہ خارج صلوٰۃ سے لقمہ دیئے جاتے ہیں اس صورت میں اگر امام نے لیا تو نماز سب کی فاسد ہوئی اور نہ لیا تو وہ غلطی اگر مغیر معنی ہیں تو یوں نماز فاسد ہوئی۔ اب ان سامعین کا گھنٹوں سے اپنے اوپر جبر کرنا بالکل ضائع گیا۔ علیحدہ علیحدہ بیٹھ کر سننا اور یہ برابر ہوا۔ اور تکلیف مفت میں ہوئی۔ غرض لقمہ لینے کی صورت میں بھی معصیت ابطال عمل کی لازم آئی۔ اور نہ لینے سے بھی نماز فاسد ہوئی۔ اب سب صورتوں کو ملا کر آپ ہی کہہ دیجئے کہ نماز ہے یا کھیل۔ احکام ظاہری کے لحاظ سے بھی تو نماز صحیح نہ ہوئی خشوع وخضوع کا تو ذکر ہی کیا۔

ایک خرابی شبینہ کی یہ بھی ہے کہ اکثر نفل کی جماعت لازم آتی ہے کیونکہ بعض ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو تراویح کی جماعت میں کرتے ہیں کیونکہ سب مقتدیوں سے نہیں ہوسکتا کہ اول

سے آخر تک شریک رہیں اور اسی کو تراویح رکھیں اس لئے تراویح علیحدہ پڑھ لیتے ہیں پھر نفلوں میں اس کو پڑھتے ہیں اور نفلوں میں نماز مکروہ ہے۔

غرض! بہت سے منکرات اس شبینہ میں لازم آتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض حفاظ اپنا پڑھنے کے بعد مغالطہ دینے آتے ہیں۔ یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سننے کو آئے ہیں اور یہ بے ادبی نہیں ہے اور ایسے ہی بہت سے بدعات ہیں۔

ہاں اگر شبینہ میں ختم ہی مدنظر ہے (مگر اخلاص کو غور کر لیجئے گا) تو امر حسن ہے۔ اس میں اعلان کی ضرورت نہیں تا کہ ریا وسمع سے خالی رہے۔ جتنی ہمت ہو قرآن شریف پڑھو۔ امام کو گڑبڑ میں نہ ڈالو۔ اور سب منکرات مذکور سے بچو۔

ایک بدعت رمضان میں یہ ہے کہ نامحرم حفاظ گھروں میں جا کر عورتوں کو محراب سناتے ہیں۔ اس میں چند قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اجنبی مرد کی آواز جب وہ خوش آوازی کا قصد کرے عورت کے لئے ایسی ہے جیسے اجنبی عورت کی آواز مرد کے لئے۔ اور رواج یہی ہے کہ خوش آواز مرد تلاش کئے جاتے ہیں اور حافظ صاحب بھی مردوں کی جماعت میں تو شاید سادہ سادہ ہی پڑھتے ہیں یہاں خوب بنا بنا کر ادا کرتے ہیں۔ سو عورتوں کے لئے جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے اپنی اپنی الگ پڑھیں اور کچھ ضرورت محراب سننے کی نہیں ہے۔ اگر حافظ ہیں تو فرادیٰ فرادیٰ اپنی تراویح میں ختم کر لیں اور اگر حافظ نہیں ہیں تو الم ترکیف سے پڑھ لیں اور ناظرہ جتنا ہو سکے پڑھ لیا کریں۔ کیوں روپیہ خرچ کر کے گناہ مول لیا جائے۔

اجرتاً قرآن خوانی

دوسری بدعت اس میں استیجار علی العبادۃ ہے یعنی حافظ صاحب سے اجرت دیکر قرآن شریف پڑھوایا جاتا ہے اور استیجار علی العبادۃ حرام ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبر پر حافظ کو مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بھی استیجار علی العبادۃ ہے۔

اس پر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کیا ہو گیا ہے علماء کو میت کا ثواب ہی بند کر دیا۔ ہم کہتے ہیں اس کا ثواب ہی نہیں پہنچتا پھر بند کیا کر دیا۔ کیونکہ ثواب پہنچنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اول عمل خیر کرنے والے کو ثواب ملتا ہے پھر اس کو اختیار ہے جسے چاہے بخش دے۔ جیسے اپنا مال جسے چاہے دیدے اور یہاں خود کو ہی ثواب نہیں ملا تو بخشا ہی کیا۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن شریف کا پڑھنا ثواب کی بات ہے اور اجرت لینا گناہ۔ تو ایک معصیت اور ایک ثواب ہو گیا تو ثواب پہنچ جائے گا اور گناہ ہمارے ذمہ رہ جائے گا۔ پھر ہم توبہ کر لیں گے تو یہ عمل حسن رہ گیا۔ تو ہم کہیں گے انما الاعمال بالنیات[1] (بیشک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) قاری کی نیت دیکھ لیجئے کہ استحصال مال ہے نہ ثواب۔ پھر ثواب کہاں جب اسی کو ثواب نہ ملا تو دوسرے کو کیا بخشے گا۔

لوگ یہاں کہتے ہیں کہ یہ استیجار علی العبادۃ نہیں کیونکہ ہم کوئی مقدار مقرر نہیں کرتے جو ہمارے مقدر میں ہے وہ پہنچتا ہے سبحان اللہ! المعروف کالمشروط۔ جو بات مشہور ہوتی ہے اس میں ٹھہرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کسی طرح معلوم ہو جائے کہ یہاں کچھ نہ ملے گا وسط رمضان ہی میں حافظ صاحب چھوڑ کر بیٹھ رہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ مقصود حافظ کو اجرت ہی ہے ختم سے بحث نہیں۔ اگر کوئی شخص خالی الذہن ہو اور اس جگہ رواج بھی دینے کا نہ ہو تو جو کچھ ہدیہ قبول کیا جائے اس میں کچھ حرج نہیں۔ بلکہ ان کو ان کی ضرورت کے موافق بطور ہدیہ دیدیا کرو اور چونکہ اس طرح سے دینے کی عادت نہیں اسی وجہ سے ان کی نیتوں میں فساد پیدا ہو گئے اگر بلا سوال وحیلہ ان کو دے دیا جایا کرے تو یہ نوبت کاہے کو آئے۔

ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ پڑھنے گئے کھانا مقرر نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک موت ہو گئی۔ اوروں کے لئے تو غمی تھی۔ مگر اس بیچارے کے لئے عید کا دن آ گیا۔ ان کا کھانا چالیس دن کے لئے مقرر ہو گیا غنیمت سمجھا۔ جب چلہ قریب ختم پہنچا تو فکر ہوئی کہ پھر وہی فاقہ آتا ہے۔ اتفاق سے چلہ ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک اور موت ہو گئی۔ ان کے ایک چلہ کا سامان اور ہو گیا۔

غرض! اسی طرح کئی موٹے موٹے یکے بعد دیگرے لڑھک گئے۔ ان طالب علم کو چاٹ لگ گئی اور ہر وقت انتظار میں رہنے لگے کہ کسی طرح کوئی مرے۔ ایک روز ایک شخص نے کہا یہ طالب علم سارے محلّہ کو اسی طرح کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کر دو۔ کہیں اس طرح بھی اللہ میاں پہنچا دیتے ہیں۔

غرض! یہ نوبت بدنیتی کی کاہے سے پہنچی۔ صرف مستحقین کی خبر نہ لینے سے۔ یوں تو کبھی سالن بھی ڈھنگ سے نہ ملے ہاں جمعرات کے دن حلوے آ جائیں گے اور جو کوئی جمعرات کی تخصیص سے منع کرے تو برا معلوم ہوگا۔

---

[1] الصحیح للبخاری:۱:۲،۸:۱۷۵، ۹:۲۹، سنن أبی داؤد: ۲۲۰۱ ، سنن الترمذی:۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطهارة ب: ۵۹

صاحبو! کیا آٹھ دن کا کھانا ایک دن کھا سکتے ہو۔ طالب علم غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ ہفتہ بھر تک تو فاقہ کراؤ اور ایک دن اتنا لا کر رکھ دو کہ کھا نہ سکے۔ چاہیئے کہ ان کی خدمت کر دی جایا کرے تا کہ ان کی نیت نہ بگڑے۔ لوگوں نے اس کو تو بالکل چھوڑ ہی دیا۔ اور سبب اس کا یہ ہے کہ خادمان دین کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں اس لئے نہ ان کی کچھ وقعت ہے نہ خدمت۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی رواج ہو گیا کہ موذن وہی ہوتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو۔ لولے، لنگڑے، اپاہج جو کسی کام کے نہ رہیں وہ موذن بن جاتے ہیں پھر کوئی خبر نہیں لیتا۔ اس وجہ سے نیتیں بگڑ گئیں۔

ایک میت کا چادرا کسی نے ایک فقیر کو دیدیا تھا۔ موذن کو جو خبر لگی تو فوراً پہنچے کہ واہ صاحب میرا حق اس کو دیدیا۔ خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اس میں بھی ہمارا حق اوروں کو دیدیتے ہو۔

بے شک یہی بات ہے، بہت انتظار کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے مگر اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ ایک پورے محلّہ کا قصور ہے کیوں یہ نوبت پہنچائی اگر ہم لوگ مقرر کر لیں کہ گیارہ مہینوں میں اپنے کپڑوں کے ساتھ ایک کپڑا ان کو بھی بنا دیں اور جہاں آپ کھاتے ہیں کبھی کبھی ان کی بھی دعوت کر دیا کریں اور اپنے خرچ کے روپوں کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ روپیہ نکال دیا کریں۔

غرض! غیر رمضان میں ان کی برابر خبر گیری کرتے رہا کریں۔ پھر رمضان شریف میں ان سے سوال کیا جائے کہ قرآن شریف سنا دیجئے تو کیا نہیں سنا دیں گے ضرور اور بخوشی منظور کر لیں گے۔ اس میں استیجار علی العبادۃ وغیرہ کی کوئی قباحت لازم نہ آئے گی۔

غرض! اجرت پر حافظ سے قرآن شریف پڑھوانا جائز نہیں اور ایسے ہی عورتوں کو گھروں میں سنانا مناسب نہیں۔ میں کہتا ہوں جب عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکا گیا ہے تو عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف مباعدت ہے مردوں اور عورتوں میں اور یہاں اختلاط لازم آتا ہے۔ کیا حاجت ہے عورتوں کو قرآن ختم سننے کی۔ جب شارع علیہ السلام ہی کی طرف سے لازم نہیں کیا گیا تو ان کے ذمہ کچھ ضرور نہیں ہے۔ بس الم تر کیف سے پڑھ لیا کریں۔

ایک خرابی اور ہوتی ہے کہ جب ایک جگہ حافظ عورتوں کے سنانے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے تو سارے محلّہ سے عورتیں آ کر جمع ہوتی ہیں اور اس میں خروج بلا ضرورت ہے اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **المراۃ عورۃ**[1] عورت چھپانے کی چیز ہے۔

---

[1] سنن الترمذی: ۱۱۷۳، کنز العمال: ۴۵۰۴۵، الدر المنثور للسیوطی ۵: ۱۹۶

چراغاں کی بدعت

ایک بدعت رمضان شریف میں چراغوں کی کثرت ہے ختم کے روز۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں شوکت اسلام ہے۔ ہم کہتے ہیں رمضان میں ہی اظہار شوکت اسلام کی ضرورت ہے یا باقی تمام مہینوں میں بھی۔ تو ہمیشہ چراغ بہت سے جلایا کیجئے۔ یا یوں کہئے کہ اور دنوں میں اسلام کے چھپانے کا حکم ہے۔

خوب جان لیجئے کہ شوکت اعمال صالحہ ہی میں ہے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ سنا ہوگا کہ جس وقت شام کو گئے ہیں اور نصاریٰ کے شہر کے پاس پہنچے تو کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے تھے اور سواری میں اونٹ تھا۔ اس پر بھی خود سوار نہیں تھے۔ غلام سوار تھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں اظہار شوکت کا موقع ہے کم سے کم گھوڑے پر سوار ہو جایئے آپ نے بہت اصرار سے منظور کر لیا جب سوار ہوئے تو گھوڑے نے کودنا، اچھلنا شروع کیا۔ آپ فوراً اتر پڑے کہ اس سے نفس میں عجب پیدا ہوتا ہے (اللہ اکبر! کیا پاکیزہ نفس حضرات تھے اپنے قلب کا خیال ہر وقت رہتا تھا) اور اظہار شوکت کے جواب میں فرمایا۔ نحن قوم اعزنا الله بالاسلام۔ ہم وہ قوم ہیں کہ اسلام سے ہی ہماری عزت ہے۔

چراغوں سے کہیں شوکت ہو سکتی ہے۔ شوکت اسلام تو اسلام ہی سے ہے۔ اسلام کو کامل کرو۔ میں کہتا ہوں ٹٹول کر دیکھ لو دلوں کو کہ اگر کوئی اور شخص تمہارے سوا مساجد کی زینت کر دے تو تمہیں ویسی خوشی ہوگی۔ جیسی کہ اس بات سے ہوتی کہ ہم نے اپنے خرچ یا اہتمام سے زینت کی ہے غور کر لیجئے کہ نہ ہوگی۔

بس معلوم ہوا کہ صرف اپنا نام جتانے کیلئے ہے۔ ورنہ اظہار شوکت تو دونوں حالت میں برابر تھا۔ پھر ایک صورت میں فرحت کم کیوں ہوئی اور اس سے تو یہ روپیہ باذن مالک اگر موذن کو دے دیا جاتا تو اولیٰ تھا۔ مگر اس کو کیوں دیتے نام کیسے ہوتا کیا یہ اسراف نہیں ہے؟

میں کہتا ہوں اسراف کے معنی ہیں صرف المال بلا غرض محمود۔ اور غرض کئی طرح کی ہوتی ہے اول غرض رفع ضرورت ہے۔ یعنی ہر چیز کو اس مقدار پر اختیار کرنا کہ اس سے کم میں نہ ہو سکے۔

لباس کی اغراض

مثلاً لباس کہ درجہ اول اس کی غرض کا رفع ضرورت ہے۔ یعنی ستر اور یہ غرض ٹاٹ سے بھی

حاصل ہوسکتی ہے دوسری غرض آسائش ہے۔ یہ لباس میں ٹاٹ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ سردی کے موسم میں تھوڑی روئی کے لحاف سے بھی حاصل نہیں ہوتی جب تک کافی روئی نہ ہو شریعت میں اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ تیسری غرض آرائش ہے اور یہ بھی شریعت میں جائز ہے **ان اللہ جمیل ویحب الجمال**[1]۔ پس آرائش مباح ہے اور اس میں طبائع مختلف ہوتی ہیں۔

بعضوں کو غرض تو آرائش سے تحدیث بالنعمت یعنی خدا تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوا کرتی ہے۔ اور یہ محمود ہے اور بعضوں کی غرض آسائش ہے یہ ہوتی ہے کہ محتاج لوگ اس کی وسعت کو دیکھیں اور اپنی حاجت کا سوال کریں (جیسا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے) وہ یہ کہ اللہ میاں کو اچھا معلوم ہو اور اس سے اچھی کوئی غرض نہیں ہوسکتی۔ دکھایا بھی جائے تو اللہ میاں کو۔

ایک غرض مباح ہے آرائش سے۔ وہ یہ کہ اپنے ہی نفس کو لذت وفرحت ہو۔ اس میں بھی کوئی کچھ حرج نہیں۔ یہ غرض صرف مال کی تو محمود ہیں۔ اور اغراض میں سے ایک غرض مذموم بھی ہے اور وہ ریا ونمائش ہے۔ تو جان لو کہ اول تو نفس ریا ہی جائز نہیں۔ پھر اس کثرت چراغ کے متعلق ایک دوسرا مقدمہ اور قابل نظر ہے۔

وہ یہ کہ معصیت کو معصیت سمجھ کر کرنا اہل ہے اس سے کہ معصیت کو دین سمجھ کر کیا جائے تو چراغ ریاء کے لئے جلائے جاتے ہیں اور ریا معصیت ہے پھر یہ لوگ اس کو دین اور ثواب سمجھتے ہیں تو کتنی سخت بات ہوئی یہ قباحتیں ہیں روشنی میں۔

علاوہ بریں اہتمام کرنے والے تو روشنی ہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نماز میں ان کا دل نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات جسمی شرکت بھی نہیں ہوتی۔ اس روز کی تراویح ان کو معاف ہوجاتی ہے کہیں صفوں کے بیچ میں پھرتے ہیں۔ کہیں ایک صف سے دوسری صف میں جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی گردنوں کو پھلانگے گا اس کو پل کی طرح ڈال دیا جائے گا قیامت کے روز کہ مخلوق اس پر سے ہو کر گزرے گی۔

اتنے احکام کی مخالفت لازم آتی ہے روشنی میں۔ میں کہتا ہوں قرآن شریف اور احادیث کے احکام کیا اس لئے کہ بت پرست اس پر عمل کریں یا نصاریٰ عمل کریں اور مسلمان اپنے ہاتھوں میں لے کر بس فخر ہی کرلیا کریں۔ کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں شکایت

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الإیمان: ۱۴۷، مسند أحمد ۴: ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۵۱، ۲۳۱، مشکوٰۃ: ۵۱۰۸

فرمادیں۔ یارب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجورًا۔ قرآن کوصاف اپنے گھروں میں رکھنااورزبان سے پڑھنا کافی نہیں بلکہ جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو بھی دیکھواوردل پراثر ڈالو۔

ختم کی مٹھائی کے منکرات

ایک منکر ختم کے دن شیرینی کا تقسیم کرنا ہے اوراس کا منکر ہونا خلاف ظاہر ہے مگر میں سمجھائے دیتاہوں۔ یہ مٹھائی اگرایک شخص کی رقم سے آتی ہے تواس کا مقصود ریاء واشتہار وافتخار ہوتا ہے۔اوراگر چندہ سے ہوتی ہے تواس کی تحصیل میں جبر سے کام لیاجاتا ہےاور جبر جیسا ایلام بدن سے ہوتا ہے۔ایسا ہی ایلام قلب سے بھی۔ جب دوسرے کودبایا شرمایا توجبر میں کیا شبہ رہا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا حکم اسی غصب کا سا ہے جولاٹھی کے زور سے ہو۔ اللہ میاں ! اس تھوڑے ہی میں برکت دیتے ہیں جورضا وخوشی کے ساتھ دیاجائے۔اسکا خیال بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔اکثر مسجدوں کے لئے بھی لوگوں سے محصل کی وجاہت کے ذریعہ سے وصول کرتے ہیں۔ پھراس میں بھی بعضے محض فضول زینت کے لئے جس کی ممانعت آئی ہے اگرچہ اپنے ہی مال سے ہو ہاں ! آرائش بالطبع کسی قدر ہوتو مضائقہ نہیں۔ اوراس کی توکسی درجہ میں ضرورت ہی نہیں کہ لوگوں سے غصب کرکرکے آرائش میں خرچ کیاجائے۔ مسجد چھپر کی بھی ادائے نماز کے لئے کافی ہے بلکہ جومقصود ہے یعنی خشوع وہ چھپر میں پکی مسجد سے کچھ کم نہیں ادا ہوتا۔ بلکہ اس کے تونقش ونگار میں ہی خیال بٹ جاتا ہےاوروہ اس سے محفوظ ہے۔توجب اصل مقصود ہی حاصل نہ ہواتو یہ تزئین کیا کریگی۔

ایسا ہی حال ہے مٹھائی میں کہ اس میں بھی کہیں جبر کہیں تفاخر ہوتا ہےاوراس کا امتحان یوں ہوسکتا ہے کہ اگروسط صلوٰۃ میں آدمی زیادہ جمع ہوجائیں تو مٹھائی کی فکر پڑجاتی ہے نمازیوں کوبھی اور مہتمین کوبھی۔ مہتمین کوتواپنی آبرو کی پڑجائے اورنمازیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب ایک ایک بتاشہ ہی ملے گا۔خشوع توکوسوں دورگیا مٹھائی کیا آئی کہ اتنے گناہ چپکالائی۔

علاوہ بریں اکثر عام بےنمازلوگ آتے ہیں اورتعجب نہیں کہ بعضے جنب بھی ہوں۔ پھرلوگ باتیں کرتے اورمغالطے دیتے ہیں اورلغویات بکتے ہیں۔غیبتیں کرتے ہیں اورایک دوسرے کاظلم سمیٹتے ہیں۔

یہی حال ہے مولودشریف کی مٹھائی کا۔ بعضے لوگ اس میں عرب کے فعل سے حجت پکڑتے ہیں میں کہتاہوں کہ اول توکسی کا فعل حجت نہیں۔ پھرتم اپنے فعل کوان کے فعل پرقیاس بھی نہیں

کر سکتے۔ ان کی تو ایسی بے تکلف عادت ہے کہ جب کچھ آدمی رہ جائیں اور مٹھائی ختم ہو جائے کہہ دیتے ہیں خلاص یعنی ہو چکی جس کی ان کو یہاں کی طرح سے آبرو وغیرہ کی فکر نہیں ہوتی جس کو پہنچ گئی پہنچ گئی نہ پہنچے تو کچھ خیال نہیں۔ پس کہاں تمہارا فعل اور کہاں ان کا فعل ؎

کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر ☆ گرچہ ماند درنوشتن شیر وشیر

(نیک لوگوں کے کاموں کو اپنی طرح گمان نہ کرو اگرچہ شیر اور شیر (دودھ) ایک طرح لکھے جاتے ہیں)

میں کہتا ہوں شیرینی کی ایجاد کی وجہ اصل میں اظہار مسرت ہے "شکراً للہ علیٰ حصول النعمۃ"۔ لیکن مباح میں ایک منکر منضم ہو جائے بلکہ مستحب میں بھی تو اس کا ترک ضروری ہے اور اس سے تو بہتر یہ ہے کہ محتاجوں کو دیدیا جائے۔ جو روپیہ مٹھائی میں صرف ہوتا ہے محتاج کی خبر گیری بالاتفاق امر حسن ہے۔ تمام زمانہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہ ہوگا اور نہ منکرات لازم آئیں گے جو نماز میں مخل تھے۔

شیرینی میں فی نفسہ کچھ حرج نہیں۔ بلکہ حرج اس ہیئت میں ہے۔ بلکہ اس ہیئت کے ساتھ بھی فسادات دور ہو جائیں۔ فساد لازم بھی فساد متعدی بھی اور اس کے لئے پچاس برس سے کم میں کافی نہیں سمجھتا جب کہ اصلاح کا سلسلہ برابر جاری رہے اور اصلاح میں اس وقت یہ کافی نہیں کہ خاص لوگ منکرات سے بچ جائیں۔ کیونکہ عوام اپنے فعل کے لئے اسی کو سند گردانیں گے اور عوام سے جلدی ازالہ منکرات کی توقع نہیں پس اس وقت اصلاح یہ ہے کہ یہ عمل بالکل ہی ترک کر دیا جائے اور پھر اصلاح عقیدہ کا سلسلہ جاری رہے۔ جب عام طور سے عقیدے درست ہو جائیں تب میں بھی اجازت دیدوں گا لیکن اب تو بس ترک ہی کرایا جائے گا۔ غور کر لیجئے اور لاتقربوا الصلوٰۃ کا قصہ نہ کیجئے۔ جہاں شیرینی کا جواز ہے وہاں ان منکرات کی حرمت بھی ہے اور جب تک دونوں جمع ہیں حرمت ہی کو ترجیح ہوگی۔

یوم عید کی بدعت

منجملہ اور رسوم کے ہمارے قصبات میں ایک یہ رسم ہے کہ عید کے دن سحری کے وقت اذان فجر کا انتظار کرتے ہیں اور اذان کے وقت کہتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ پھر کچھ کھاتے ہیں تو ان کے نزدیک اب تک رمضان ہی باقی تھا۔ شوال کی پہلی رات بھی گزری اور ان کے یہاں ابھی روزہ ہی ہے۔ حدیث شریف میں تو افطر الرؤیۃ ہے اور ان کے یہاں ایک شب اور گزرنا چاہیے۔

کوئی یہ نہ کہے کہ ''افطر الرؤیۃ'' پرتو عمل ہوگیا۔ چاند دیکھ کر افطار کرلیا تھا۔ اب رات میں کھانا نہ کھانا اوراذان کے وقت کھانا اپنا فعل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انکار اکل یا عدم اکل پر نہیں۔ بلکہ یہاں عقیدہ میں فساد ہے۔ چنانچہ اس کو روزہ کھولنے سے تعبیراس کی دلیل ہے۔ اورزیادت فی الدین نہیں تو کیا ہے؟ ایسے موقع پر تو بالقصد رسم توڑنے کے لئے فجر سے پہلے ہی کھانا چاہیئے۔

بعض کا خیال یوں ہے کہ عقیدہ بدل دو اور درست کردو لیکن اعمال کے بدلنے میں عام مخالفت ہوتی ہے۔ اگر عمل باقی رہے جو کہ مباح ہے اورعقیدہ درست ہوجائے تو کیا حرج ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ثابت ہوتا ہے تجربہ سے کہ جیسا کہ عقیدہ کو اثر ہے عمل میں ایسا ہی اس کا عکس بھی ہے۔ ایک مدت تک میں اس خیال میں رہا کہ علماء کیوں پیچھے پڑے ہیں نکاح ثانی کے۔ جائز ہی تو ہے کیا کیا نہ کیا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ حرج صدر سے نہیں نکلتا مگر عمل کو ایک مدت تک بدل دینے سے۔ اس لئے رسوم میں عمل کی تبدیلی بھی ضروری ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عید کی شب میں کھانا فرض ہے بلکہ اخراج حرج کے لئے ایسا کرنے سے ضرور ماجور ہوگا۔ اس کی نظیریں حدیث شریف میں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ منع فرمادیا بعضے روغنی برتنوں میں نبیذ بنانے سے پھر فرماتے ہیں۔ **کنت نهيتكم عن الدباء والحنتم فانبذوا فيها فان الظرف لايحل شيئا ولا يحرم**[1]۔ یعنی پہلے میں نے منع کردیا تھا۔ اب اس میں نبیذ بنایا کرو۔ اور علت ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ برتن نہ کسی چیز کو حرام کرتا ہے اور نہ حلال کرتا ہے۔ پھر باوجود اس کے بھی منع فرمادیا تھا۔ صرف وجہ یہ تھی کہ لوگ شراب کے عادی ہیں۔ تھوڑے سے نشہ کو محسوس نہ کرسکیں گے۔ اوران برتنوں میں پہلے شراب بنائی جاتی تھی۔ اس لئے خمر سے پورا اجتناب نہ کرسکیں گے اور گنہگار رہوں گے۔ پس پورے اجتناب کا طریقہ یہی ہے کہ ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے مطلقاً روک دیا جائے۔ جب طبیعتیں خمر سے بالکل نفور ہوجائیں اور ذرا سے نشہ کو پہچاننے لگیں تو پھر اجازت دے دی جائے۔

اسی طرح ان رسموں کی حالت ہے کہ ظاہری اباحت دیکھ کر لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں اوران منکرات کو پہچانتے نہیں جو ان کے ضمن میں ہیں تو اس کے لئے اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ سوائے اس کے کہ چندروز اصل عمل ہی کو ترک کردیں۔ اور یہ بات کہ اصل عمل باقی رہے اور منکرات

---

[1] المصنف لابن ابی شیبۃ ۳:۳۴۴

عام طور سے دور ہو جائیں سو ہمارے امکان سے تو باہر ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے یہ طریقہ اختیار فرمایا تھا تو ہم کیا ہیں۔ اس کے سوا اور تدبیریں اختیار کرتے پھریں۔ اور جب ایک تدبیر عقلاً بھی مفید معلوم ہوتی ہے اور نقلاً ثابت ہو چکی تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اس سے عدول کیا جائے۔

سویوں کی تخصیص

ایک رسم عید کے دن ایک کھانے کی تعیین کی ہے کہ سوئیاں ہی پکائی جاتی ہیں۔ اس میں ایک مصلحت ہے جس کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس کی تیاری میں زیادہ بکھیڑے کی ضرورت نہیں اور دن کو عید کا کام کاج ہوتا ہے اور مستحب ہے کہ کچھ کھا کر عیدگاہ کو جانا۔ اس لئے سہل الحصول چیز کو اختیار کر لیا۔ بعد ازاں دوست احباب کے یہاں بھیجنے کا رواج ہو گیا۔ اس کی نظیر میں تہادی الی العروس کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہوا ہے۔ یوں کہتے ہیں کہ جیسے دولہا کے پاس خوشی کا دن دیکھ کر ہدیہ بھیجنا مستحسن ہے اسی طرح عید کا دن بھی خوشی کا ہے احباب کے پاس کیوں نہ تحفے بھیجے جائیں۔

میں کہتا ہوں کہ مقیس علیہ ہی دیکھ لیجئے کہ ہر چند کہ تہادی الی العروس فی نفسہ موجب زیادتی محبت ہے لیکن واللہ بطریق رسم بھیجنا بغض کو بڑھاتا ہے تجربہ اس پر دال ہے ہاں خلوص کے ساتھ بھیجنے سے محبت بڑھتی ہے جیسا کہ دو دوست آپس میں ہدیہ کبھی کبھی بھیج دیا کریں اور رسم سے تو محبت بڑھتی نہیں۔ محبت اور خلوص کا جو اعلیٰ فرد ہے اسی کو دیکھئے کہ رسم کو دخل دینے سے کیا حقیقت اس کی رہ جاتی ہے اور وہ فرد وہ محبت ہے جو پیر و مرید میں ہوتی ہے کہ ایسی کہیں دو شخصوں میں نہیں پائی جاتی کہ جان سے زیادہ عزیز مرید کے نزدیک شیخ ہوتا ہے اور مال تو کیا چیز ہے اور کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں نذر گزارا کرتے ہیں اور اس سے خلوص بڑھ جاتا ہے مگر جب اسی نذر کو رسم قرار دیدیا تو دیکھ لیجئے کہ زمانہ کی پیری مریدی کا کیا حال ہے۔ خلوص تو کیسا جس جگہ پیر صاحب پہنچ گئے مرید اپنے آپ کو چھپانے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ چندہ کی فہرست آ پہنچے دعائیں مانگنی پڑتی ہیں کسی طرح پیر صاحب جلدی ٹلیں۔ اب فرمایئے کہ فی نفسہ تو شیخ کو ہدیہ دینا موجب محبت تھا یہاں موجب بغض کا ہے سے ہو گیا صرف رسم سے۔

میرے ایک دوست کا قصہ ہے کہ ایک مدت تک انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس خط نہیں بھیجا۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو کہا میں اس عرصہ میں خالی ہاتھ تھا۔ فکر میں ہوں

کچھ روپیہ کہیں سے مل جائے تو عریضہ لکھوں۔ میں نے کہا اس خیال میں مت پڑو۔ اب تو ضرور بلا ہدیہ خط بھیجو۔ اب دیکھ لیجئے کہ ایک عرصہ تک اس خیال نے ان کو استفادہ سے روک دیا۔ فی نفسہٖ حسن ہو مگر قید رسم سے قبح آ گیا۔

ایسے ہی عید کے دن کے ہدایہ ہیں۔ اور اگر غور کیجئے گا تو ان ہدایہ کو قرض پایئے گا کیونکہ دیتے وقت یہ ضرور نیت ہوتی ہے کہ اس کے یہاں سے بھی آئے گا اور اگر ایک مرتبہ نہ آئے تو ادھر سے بھی بند ہو جاتا ہے اور ہدیہ کی تعریف میں بلاعوض کی شرط ماخوذ ہے پس یہ ہدیہ بھی نہ رہا۔ پھر قرضدار ہونے سے یا قرضدار کرنے سے کیا فائدہ۔

وعظ کا خلاصہ

حاصل یہ کہ جن اعمال میں فساد ہے ان اعمال سے ہی اجتناب چاہیئے۔ ذرا سی خوبی کو دیکھ کر بڑے بڑے منکرات میں پڑ جانا عقل سے بعید ہے۔ اب بیان ختم کرتا ہوں اور اصل مقصود کا خلاصہ پھر مختصراً اعادہ کرتا ہوں کہ روزہ رکھا۔ مگر پیٹ حرام سے بھرا اور دن کو بھی غیبت وغیرہ میں مبتلا رہے تو یہ روزہ کس شمار میں ہے۔

حاصل یہ کہ روزہ کے آداب سیکھو اور عورتوں کو بھی سکھلاؤ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم من صائم (الحدیث) یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے اور قیام اللیل کرنے والے وہ ہیں کہ ان کی بھوک اور پیاس کی طرف اللہ میاں کو کچھ حاجت نہیں۔ اور آداب کے موافق اگر ختم کرلیا تو اس کے حق میں فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشفعان یعنی روزہ ونماز دونوں شفاعت کریں گے۔ پس اس شخص کے ساتھ دو محافظ ہوں گے عذاب سے بچانے کے لئے۔ پھر آپ کہہ سکتے کہ جس کے دو محافظ سرکاری موجود ہوں کیا اس کی نجات نہ ہوگی۔

خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام

عصم الصنوف

سہولت صوم کے متعلق یہ وعظ اخیر جمعہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ کو مسجد خانقاہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹے میں بیان فرمایا۔ حاضری تقریباً ایک ہزار کی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمَنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

کلو اواشربوا هنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیة

ترجمہ: اور حکم ہوگا کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے ایام گزشتہ یعنی قیام زمانہ دنیا میں کئے ہیں۔

نامہ اعمال

یہ ایک آیت ہے سورۂ حاقہ کی۔ جس کے محمل مفسرین کے کلام میں مختلف ہیں۔ میں نے ایک محمل کو اختیار کرلیا ہے جو اس وقت کے اور اس حالت موجودہ کے مناسب ہے۔ اس لئے میں ایک ہی محمل کو بیان کروں گا اور چونکہ مقصود دوسرے دلائل سے بھی ثابت ہے اس لئے دوسرے محمل کا احتمال جو کہ طالب علمانہ احتمال ہے۔ مضر نہیں۔ یہ دفع دخل مقدر ہے۔ اب میں آیت کی تفسیر اسی محمل کے موافق بیان کرتا ہوں۔ جو میں نے اختیار کیا ہے اور اسی سے اس کا مناسب مقام ہونا بھی معلوم ہو جائیگا۔ اس آیت سے اوپر ذکر ہے نامہ اعمال کا کہ قیامت کے دن کسی کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا اور کسی کے بائیں ہاتھ میں اور ساتھ ساتھ ہر شخص کا حال بھی مذکور ہے کہ جس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا اس کا کیا حال ہوگا اور جس کے بائیں ہاتھ

میں دیا جائیگا اس کا کیا حال ہوگا۔

یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے ان دونوں کے درمیان میں ہے اور اس کے اوپر اس شخص کا حال ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیا جائے گا چنانچہ ارشاد ہے: **فاما من اوتی کتابه بیمینه فیقول هاؤم اقرأو کتابیه انی ظننت انی ملق حسابیه.** یعنی وہ نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیئے جانے کے بعد لوگوں کو بلائے گا کہ آؤ میرا نامہ اعمال پڑھو۔ مجھے تو یقین تھا کہ ایک دن حساب بھی ہونے والا ہے اس قول کے بیان کرنے کے بعد حق تعالیٰ اس کی جزا بیان فرماتے ہیں:

فهوفی عیشة راضیه فی جنة عالیة قطوفها دانیه، کلوا واشربوا هنیئاًم بمااسلفتم فی الایام الخالیه.

''کہ وہ شخص نہایت چین میں ہوگا۔ بلند جنت میں ہوگا۔ جس کے میوے نزدیک ہیں (یعنی جھکے ہوئے ہیں جن کے توڑنے میں کوئی دشواری نہیں پھر ارشاد ہے کلوا واشربوا الخ کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پیو بعوض اس کے کہ تم نے ایام خالیہ میں کیا ہے۔

چونکہ ایام خالیہ کی تفسیر مختلف ہے اس لئے میں ابھی اس کا ترجمہ نہیں کرتا۔ بلکہ تحقیق بیان کرنے کے بعد ترجمہ کروں گا۔

کھانے پینے کی رعایت

پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اکل وشرب (کھانے پینے) کا ذکر مستقل طور پر کیوں کیا۔ حالانکہ **فهوفی عیشة راضیه** (وہ شخص نہایت چین میں ہوگا) میں یہ بھی داخل ہو چکا تھا تو اس افراد بالذکر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کھانے پینے کا سب سے زیادہ عاشق ہے اور اس کے سوا جتنی مستیاں ہیں وہ سب اسی کے تابع ہیں مثلاً اگر کسی شخص کو جو کسی عورت یا امرد پر عاشق ہو چار پانچ دن کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اس سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ روٹی اور پانی لائیں یا عورت اور امرد کو بلائیں۔ تو وہ اس وقت روٹی اور پانی ہی کی درخواست کریگا۔ اور عورت اور امرد کے عشق کو بھول جائیگا۔ اسی طرح اور سارے مطلوبات کو دیکھ لیا جائے تو سب کا مدار اسی پر ہے چنانچہ اسی کیلئے نوکری اور ملازمت کی جاتی ہے اور اسی کے لئے تیری میری غلامی کی جاتی ہے بعض دفعہ آدمی اس سے گھبرا کر یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ یہ دوزخ کہاں کا لگ گیا۔ مگر پھر بھی اس دوزخ کے بھرنے سے چارہ نہیں۔ ایک وقت بھرنے کے بعد پھر دوسرے وقت کے لئے فکر ہے کہ شام کو اسے کس چیز سے بھرا جائے گا۔

اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔

حق تعالیٰ کی توجہ

واقعی اپنے ساتھ حق تعالیٰ کے برتاؤ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس کرم کے ساتھ تربیت فرماتے ہیں ہمارے اور مربی ہیں اول تو ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو اپنی اغراض کو صاحب حاجت کی اغراض پر مقدم رکھتے ہیں۔ البتہ والدین اس سے کس قدر مستثنیٰ ہیں کہ وہ اولاد کے جذبات کی بے غرضانہ رعایت کرتے ہیں۔ گو بعض دفعہ وہ بھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ چونکہ کسی چیز سے مغلوب نہیں ہیں وہ تو بندہ کے ساتھ بالکل اسی کے جذبات کی رعایت سے معاملہ فرماتے ہیں۔

بھلا غور تو کیجئے کجا حق تعالیٰ کجا بندہ۔ ان کی عظمت کا مقتضا تو یہ تھا کہ وہ بندہ کے ساتھ داشتہ داشتہ معاملہ کرتے۔ مگر نہیں وہ نہایت درجہ توجہ فرماتے ہیں حالانکہ عقل تو اس کو بھی تجویز نہیں کر سکتی کہ حق تعالیٰ بندہ کے اوپر کچھ بھی توجہ فرمائیں کیونکہ توجہ ہوتی ہے مناسب سے۔ اور بندہ کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات سے کیا نسبت؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کو تو اتنی بھی نسبت نہیں کہ حق تعالیٰ کا علم بھی اس کو ہو سکے۔ حالانکہ علم ومعرفت تعلق کا ادنیٰ درجہ ہے مگر ہم میں یہ بھی مفقود ہے۔ انسان کو ذات وصفات الٰہیہ کی کنہ تو کیا معلوم ہوتی ان کا پورا انکشاف بالوجہ بھی نہیں ہوتا۔ جب بندہ کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں تو بتلایئے توجہ کا داعی کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ بس حق تعالیٰ کو بدوں کسی داعی اور سبب ہی کے ہمارے حال پر توجہ ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم ☆ بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان سے نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ ان پر جود وکرم کروں)

پھر توجہ بھی معمولی نہیں بلکہ اس درجہ کی توجہ کہ کسی کو بھی اتنی توجہ نہیں اور جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ ماں باپ کی توجہ بھی اس کی نظیر نہیں کیونکہ ماں باپ بالکلیہ مستغنی نہیں۔ ان کو بھی اولاد کی کسی قدر احتیاج ہے اور وہ اولاد کی پرورش میں اپنے بہت سے منافع مدنظر رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ بالکل مستغنی ہیں۔ ان کو کسی کی ذرہ برابر بھی احتیاج نہیں۔

اب بتلایئے اگر حق تعالیٰ اپنی شان استغنا کے موافق ہم سے معاملہ فرماتے تو کیا کوئی اس

کا تحمل کر سکتا تھا ہر گز نہیں۔ بلکہ وہ تو ایسا معاملہ فرماتے ہیں کہ جس میں بالکل بندہ ہی کے جذبات کی رعایت ہوتی ہے۔ تو یہ کس قدر رحمت وکرم ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ اپنی شان استغناء کے مناسب معاملہ نہیں فرماتے۔ بلکہ بالکل ہمارے جذبات کی رعایت سے معاملہ فرماتے ہیں۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ حاکم ہماری ذرا سی خاطر کر دے اور ہم کو اپنے پاس ہی بٹھلا دے تو اس کا بار بار شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور دنیا بھر میں اس کی مدح اور اس پر فخر کرتے پھرتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کی توجہ اور عنایات کے ساتھ کچھ بھی قدر کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے گویا حق تعالیٰ کچھ ان کا قرضہ ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ قرضدار کا بھی شکریہ ادا کر لیا جاتا ہے کہ اس نے ہمارا قرضہ دبایا نہیں جلدی ادا کر دیا۔ یہاں اتنا بھی نہیں۔

صاحبو! یہ حالت بہت افسوسناک ہے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

جنت کا کام

حق تعالیٰ نے کلوا واشربوا (کھاؤ اور پیو) فرما کر ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے اور غایت درجہ کی رعایت فرمائی ہے ورنہ ان کی شان کا مقتضا یہ تھا کہ اکل وشرب کا بالکل ذکر نہ فرماتے کیونکہ حق تعالیٰ خود اس سے منزہ ہیں اور ہمارے افعال میں بھی یہ فعل ادون ہے۔ اسی لئے سب کے سامنے اس کے ارتکاب سے شرم آتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ سب کے سامنے کپڑا پہننے سے شرم نہیں آتی۔ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ عطا واخذ سے شرم نہیں آتی۔ مگر کھانے پینے سے شرم آتی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے نقص کا کام ہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ومریم علیہما السلام کی نسبت کانا یأکلان الطعام (وہ دونوں کھانا کھاتے ہیں) فرمایا یتغوطان ویبولان (اور وہ دونوں بول وبراز کرتے ہیں) نہیں فرمایا کیونکہ اکل وشرب ان کا جد امجد ہے جو بول وبراز کرے گا وہ پہلے کھائے پئے گا بھی ضرور۔ تو اکل وشرب ہی سبب ہے بول وبراز کا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے سبب کو بیان فرما دیا کہ اس سے مسبب پر خود دلالت ہو جائے گی۔ صریح نہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ قرآن میں تہذیب کی بہت رعایت کی گئی ہے اسی لئے بول وبراز کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ سبب کے ذکر سے اس پر دلالت کر دی گئی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں تو اکل کو بول وبراز سے مفارقت ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ اکل بول وبراز سے مفارق نہیں۔ بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ بول وبراز اکل سے مفارق نہیں۔

دوسرے یہاں گفتگو اکل وشرب فی الدنیا میں ہے اور دنیا میں طرفین سے تلازم ہے اور یہاں عیسٰی ومریم علیہما السلام کے متعلق دنیا ہی میں اکل طعام کا ذکر ہے۔ پس اس سے بول وبراز پر کنایہ صحیح ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ اگر اس طعام کے بعد بول وبراز دنیا میں بھی نہ ہوتا جب بھی اکل وشرب صفات نقص سے ایک تو اس لئے ہے کہ۔

ابروباد ومہ وخورشید وفلک درکارند ☆ تاتو نانے بکف آری وبہ غفلت نہ خوری

(ابروہوا' چاند وسورج سب کام میں مصروف ہیں تاکہ تو ایک روٹی بھی ہتھیلی پر رکھ کر غفلت سے نہ کھائے)

یعنی اس میں احتیاج سب سے زیادہ ہے سارے عالم کو چکر لگانے کے بعد انسان کی غذا حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ خود شہادت حالیہ اس کے ادون ہونے پر دال ہے کہ انسان اس کو خود حقیر سمجھتا ہے اور دوسروں کے سامنے کھاتے پیتے سے ایسا شرماتا ہے گویا کوئی عیب کا کام کر رہا ہے۔

ہر عیب کہ سلطان بہ پسند د ہنرست (جس عیب کو بادشاہ بھی پسند کرے وہ عیب ہے)

تو ایسی ادنٰی چیز کا ہماری خاطر سے ذکر فرمانا نہایت ہی شفقت کی دلیل ہے اب اس کا ذکر فرمانے کے بعد ان کے ذکر فرمانے سے اس کے دناءت بھی مبدل بہ شرف ہوئے یعنی جب سرکار نے اس کو پسند فرمالیا اور کلوا واشربوا (کھاؤ اور پیو) فرمادیا تو اب یہ عیب شرف کو پہنچ گیا۔

ہمارے ایک دوست مولوی احمد علی صاحب مرحوم جب کھانا کھانے بیٹھتے تو رفقاء سے کہا کرتے تھے کہ آؤ جنت کا کام کرلو یعنی کھانا کھالو۔ لوگ پوچھتے کہ حضرت! یہ جنت کا کام ہے یا دنیا کا تو کہتے ہیں کہ میاں دنیا کا کام تو نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ہے اور کھانا پینا تو جنت ہی کا کام ہے کہ وہاں سوائے اس کے اور کچھ کام نہ ہوگا۔ نہ نماز ہوگی نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ۔

تو اب یہ عیب ایسا مقبول ہوا کہ جنت کا کام ہوگیا۔ مگر یہ سب اسی عنایت کا نتیجہ ہے جو حق تعالٰی کو بندوں کے حال پر ہے کہ وہ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں اسی لئے اکل وشرب کو باوجود اس کے کہ ہمارے نزدیک بھی عیب کا کام ہے مگر چونکہ ہم اس کے عاشق ہیں اور اس کے بدوں ہم کو چارہ نہیں حق تعالٰی نے جنت میں بھی رکھا اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مستقلاً فرمایا۔ ورنہ اگر وہ اپنی شان کے موافق ہم سے معاملہ فرماتے تو اکل وشرب کا ذکر قرآن میں نہ ہوتا۔

ایام خالیہ

پس ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت میں اصحاب الیمین سے کہا جائے گا **کلوا واشربوا ھنیئًا بمااسلفتم فی الایام الخالیہ**، (جوتم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کہ کھاؤ پیوان اعمال کے عوض میں جوتم نے ایام خالیہ میں کیے ہیں۔ایام خالیہ کی ایک تفسیر ابن عدی وبیہقی نے وہ نقل کی ہے جو پہلے سے میرے دل میں تھی اوراسی کی بناپر میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تھا۔مگر مجھے تلاش تھی کہ اس کی تائید سلف کے کلام سے بھی مل جائے۔بدوں تائید سلف کے میں قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر بھی گوارانہیں کرتا۔تفسیر بالرائے سے ڈرلگتا ہے۔ہاں نکات ولطائف بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔کیونکہ وہ تفسیر میں داخل نہیں۔بلکہ امرزائد کی قبیل سے ہیں۔

بہرحال مجھے تلاش تھی کہ ایام خالیہ سے میں نے جوسمجھا ہے اس کی تائید منقول سے مل جائے۔اول اورتفاسیر دیکھیں جلالین وغیرہ مگرکسی میں اس کی موافقت نہ ملی۔پھراخیر میں درمنثور میں تلاش کیا تو اس میں ابن منذروابن عدی اوربیہقی کی تخریج سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن رفیع نے **بمااسلفتم فی الایام الخالیہ** (جوتم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کی تفسیر میں فرمایا ہے:

> **ھوالصوم** (وہ روزہ ہے) **(قلت وعزاہ القمی فی تفسیر الیٰ مجاھد والکلبی قالا ھی ایام الصیام قال القمی فیکون الاکل والشرب فی الجنۃ بدل الامساک عنھما فی الدنیا اھ** (کھانا پینا جنت میں دنیا میں کھانے پینے سے رکنے کابدل ہوجائے گا) (ص۳۴ج۲۹)

اگر یہ تائید نہ ملتی تو بڑی فکر ہوتی اور مجھے کوئی دوسری آیت تلاش کرنا پڑتی۔مگردل اسی کے بیان کو چاہتا تھا کیونکہ اول ذہن میں یہی آئی تھی اوراس کے متعلق ہی ایک خاص مضمون ذہن میں بھی آگیا تھا۔مگرخدا کاشکر ہے کہ تائید مل گئی اور مجھے دوسری آیت تلاش کرنا نہ پڑی۔

اب سنیئے کہ مشہورتفسیر تو ایام خالیہ کی ایام ماضیہ ہے اورمیرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ایام خالیہ سے مرادوہ ایام ہیں جوطعام وشرب سے خالی تھے یعنی ایام صیام، چنانچہ سلف کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوگئی۔دوسرے عقلی طورپر یہ ظاہر ہے کہ جزامناسب عمل ہواورنصوص میں غورکرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اورصوفیاء نے تواس کوکشفی طورپر بیان کیا ہے۔اس قاعدہ سے بھی صوم کاعوض اکل وشرب ہی ہوناچاہیے۔اب میں مقصود کو بیان کرتاہوں۔

آسان عبادت

میرا مقصود اس وقت یہ بیان کرنا ہے کہ روزہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نہایت سہل ہے اور اس آیت میں لفظ خالیہ اس پر دلالت کررہا ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ اس کی تفسیر خلوعن الطعام ہے اور ظاہر ہے کہ خلو صفت عدمیہ ہے جس سے اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ صوم عبادت عدمیہ ہے نہ کہ وجودیہ۔ دوسری عبادات صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ و ذکر وغیرہ وجودی اور فعلی ہیں۔ان میں کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔حج میں تو بہت ہی بڑا کام کرنا پڑتا ہے کہ دور دراز کا سفر ہوتا ہے اور نماز میں ارکان کثیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں اور مردوں کو تو مسجد میں بھی جانا پڑتا ہے ورنہ نماز ناقص ہوگی کیونکہ ترک جماعت پر وعید آئی ہے۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ایک غیر مقلد کی عادت تھی کہ وہ گھر سے اپنے کھیت پر جو ذرا دور تھا جاتا تو وہاں پہنچ کر نماز میں قصر کرتا اور گھر پر آ کر پوری نماز پڑھتا۔کسی نے کہا بندہ خدا تمہارا کھیت تو گھر سے نزدیک ہے مسافت سفر تو نہیں ہے جو تم وہاں قصر کرتے ہو۔تو اس نے جواب دیا کہ مسافت سفر کی کیا ضرورت ہے۔قرآن میں تو اذا ضربتم فی الارض (جب تم زمین پر سفر کرو) آیا ہے جس کے معنی سیر فی الارض ہیں اور یہ مفہوم کھیت میں جانے پر بھی صادق ہے۔ایک حنفی عالم نے اس کا خوب جواب دیا۔کہا پھر تو تم کو ہمیشہ قصر ہی کرنا چاہیے کیونکہ گھر سے مسجد تک آنے پر بھی "ضرب فی الارض" (زمین پر چلنا) صادق ہے اس کا غیر مقلد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

غرض! اور عبادات میں تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کی حقیقت وجودی ہے اور روزہ میں کچھ نہیں کرنا پڑتا کیونکہ اس کی حقیقت عدمی ہے کہ اس میں صرف بعض اشیاء کو ترک کرنا ہے۔ مگر یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مطلق ترک کو عبادت نہ سمجھا جائے اور نہ میرا یہ مقصود ہے بلکہ جس ترک کے ساتھ قصد مطلق ہو جس کو فقہاء کف سے تعبیر کرتے ہیں وہی عبادت ہے اور ترک اصلی جو عدمی محض ہے وہ عبادت نہیں ہے ورنہ ہر ساعت میں ہر شخص بے انتہا حسنات کا فاعل ہوگا۔ کیونکہ ہر آن و ہر ساعت میں انسان عمل تو ایک ہی کرسکتا ہے اور اس کے سوا تمام افعال کا تارک ہی ہوتا ہے تو پھر چاہیے وزن اعمال کی ضرورت ہی نہ رہے کیونکہ ہر حال میں مومن کے لئے تو غلبہ حسنات ہی ہوا کرے گا اور یہ لازم خلاف نصوص ہے نصوص سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن بعض مسلمانوں کے حسنات غالب ہونگے۔اور بعض کے سیئات اور بعض کے حسنات وسیئات مساوی ہوں گے۔اور ترک اصلی کے عبادت ماننے پر ان صورتوں کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا۔بلکہ صرف ایک

ہی صورت کا تحقق ہوگا کہ سب کے حسنات ہی غالب ہوں۔

سلب قدرت گناہ

دوسرے یہ کہ نصوص سے ہر عمل کے شرعاً معتبر ہونے میں ارادہ ونیت کا شرط ہونا معلوم ہو رہا ہے حدیث میں ہے **الاعمال بالنیات**[1] (تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔ اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ترک اصلی عبادت نہ ہو کیونکہ اس میں نیت وارادہ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترک اصلی نعمت بھی نہیں وہ انعام حق ضرور ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ہم کو ہزاروں گناہوں سے بچا رکھا ہے گو ہم نے بچنے کا ارادہ نہیں کیا مگر بے ارادہ کے بھی گناہوں سے محفوظ رہنا اس کے نعمت ہونے میں شک نہیں اور اس نعمت کا ہم کو شکریہ ادا کرنا چاہیے یہ میں نے اس لئے کہہ دیا تاکہ اس نعمت کی بے قدری نہ کی جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ نعمت ہونا اور چیز ہے طاعت ہونا اور بات ہے۔

میں ترک اصلی سے طاعات وعبادت ہونے کی نفی کر رہا ہوں، نعمت ہونے کی نفی نہیں کر رہا۔ اور ترک اصلی تو نعمت کیوں نہ ہوتا جس میں گناہوں کی طرف التفات ہی نہیں نہ فعلاً نہ ترکاً۔ میں تو ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی بڑی نعمت ہے کہ ارادہ معصیت کے بعد گناہ کی قدرت سلب کر لی جائے کہ بندہ گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر کر نہیں سکتا۔ گو مجھے اس مسئلہ کی تحقیق نہیں کہ ارادہ کے بعد اگر گناہ پر قدرت اور قدرت کے بعد میں اس کا ارتکاب بھی ہو جائے تو اس کے گناہ میں اور ارادہ میں جازمہ مجردہ عن الفعل کے گناہ میں فرق ہے یا مساوات ہے۔ ظاہراً تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق ہے مساوات نہیں ہے لیکن اگر مساوات بھی ہو جب بھی سلب قدرت فعل نعمت ہے کیونکہ ارادہ جازمہ کے بعد ناکامی ہونے سے انسان کو ندامت سخت ہوتی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ ہی گناہ کا قصد کیا۔ اس حالت میں وہ جلدی ہی اپنے ارادہ سے توبہ کر لیتا ہے بخلاف اس شخص کے جس کو ارادہ کے بعد کامیابی ہو جائے کہ وہ ارادے پر نادم نہیں ہوتا۔ بلکہ اول اول تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ تک لذت گناہ کی مستی میں منہمک رہتا ہے۔ اس کو توبہ کی توفیق بہت دیر میں ہوتی ہے۔ اور بعض کو عمر بھر بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ سلب قدرت گناہ بھی نعمت ہے پھر عدم التفات کیوں نہ نعمت ہوگا۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۱:۲،۸:۱۷۵،۹:۲۹، سنن أبی داؤد ۲۲۰۱، سنن الترمذی ۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطهارة ب: ۵۹

پس ترک اصلی میں جو ہم ہزاروں گناہوں سے بچے ہوئے ہیں۔نعمت تو ضرور ہے مگر قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت نہیں اور یہ گفتگو بھی قانون کی تحقیق ہے باقی یہ حق تعالیٰ کا فضل وانعام ہے کہ وہ کسی کو ترک اصلی پر بھی ثواب دیدیں کیونکہ فضل وانعام کسی قانون کا پابند نہیں۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حشر میں ایک شخص کو سیئات کے عوض میں گن گن کر حسنات دی جائیں گی۔تو یہ اور بات ہے مگر یہ قانون نہیں۔قانون قاعدہ وہی ہے کہ معصیت پر عذاب ہو۔اور ترک اصلی پر ثواب نہ ہو۔مگر قانون تو ہمارے واسطے ہے حق تعالیٰ تو قانون کے پابند نہیں ہیں۔وہ بطور فضل کے جو چاہیں کریں مگر یہ ضرور ہے کہ خلاف قانون کے عمل کم ہوگا زیادہ عملدرآمد قانون ہی کے موافق ہوگا لہٰذا یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ فضل محتمل کے بھروسہ پر عمداً قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہاں اگر کسی سے قانون کی خلاف ورزی ہو چکی ہو۔تو وہ محض قانون پر نظر کر کے مایوس بھی نہ ہو۔بلکہ فضل پر نظر کر کے خدا کی ذات سے امید رکھے کہ ان شاءاللہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔اور گزشتہ سے توبہ واستغفار کرنے کی ہمت کرے اور آئندہ کے لئے پابندی قانون کا پورا اہتمام کرے۔

بہر حال قانون یہ ہے کہ جس ترک میں ارادہ کا کچھ دخل نہ ہو وہ اطاعت نہیں۔بلکہ طاعت وہی ترک ہے جس میں ارادہ کا بھی کچھ دخل ہو۔

نیت صوم

چنانچہ روزہ کی حقیقت جو ترک ہے وہ بھی ترک محض نہیں بلکہ ترک بالارادہ ہے چنانچہ اگر کوئی روزہ کی نیت نہ کرے تو دن بھر فاقہ کرنے اور پیاسا مرنے سے وہ صائم نہ ہوگا۔اسی لئے صحت صوم کے لئے نیت شرط ہے۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب روزہ میں نیت بھی ضروری ہے اور بدوں نیت کے روزہ نہیں ہوتا تو پھر صوم عدمی نہ ہوا۔بلکہ دیگر عبادات کی طرح وہ بھی وجودی ہو گیا۔کیونکہ نیت امر وجودی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تم ذرا معقولیوں سے تو دریافت کرو کہ وہ مرکب من الوجودی والعدمی کی نسبت کیا کہتے ہیں۔وہ یہی کہتے ہیں کہ عدمی اور وجودی سے مرکب عدمی ہوگا کیونکہ مجموعہ احسن کے تابع ہوتا ہے۔

اگر تم یہ کہو کہ ہم تو خود عاقل ہیں گو معقولی نہیں ہیں اس۔لئے ہم معقولیوں کی بات نہیں سننا چاہتے جب تک ہماری عقل میں نہ آئے تو دوسرا جواب یہ ہے کہ نیت روزہ کی حقیقت میں داخل نہیں۔بلکہ وہ

اس کی شرط اور اس سے مقدم ہے۔ چنانچہ جن ائمہ کے نزدیک طلوع فجر کے بعد نیت جائز نہیں۔ اور رات ہی کو نیت کرنا لازم ہے ان کے نزدیک تو ظاہر ہے کہ نیت جز و صوم نہیں ورنہ تقدم لازم نہ ہوتا۔ باقی جن کے نزدیک مطلقاً رات سے نیت کرنا شرط نہیں ان کے نزدیک بھی نیت صوم سے مقدم ہی ہے مگر ان حضرات نے اکثر اجزائے صوم پر مقدم ہونے کو دلیل سے بمنزلہ تقدم علی الکل کے قرار دیا ہے۔ چنانچہ نصف النہار کے وقت یا اس کے بعد نیت کرنا ان کے نزدیک بھی لغو و غیر معتبر ہے۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ دن بھر روزہ کی نیت کا رہنا تو ضروری ہے اور بقاء نیت بحکم نیت ہے تو نیت صوم سے مقدم نہ ہوئی۔ بلکہ مقترن ہوئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ مسائل شرعیہ خود کر رہے ہیں کہ بقاء نیت و اقتران ارادہ صوم کے لئے شرط بلکہ محض تقدم نیت شرط ہے حقیقتاً یا حکماً۔ پھر روزہ شروع ہو جانے کے بعد اگر بدوں فطر حسی یہ پختہ قصد بھی کرلے کہ میں روزہ نہیں رکھتا تب بھی روزہ باقی رہتا ہے۔

اس سے صاف ثابت ہوا کہ اقتران نیت شرط نہیں صرف تقدم کافی ہے البتہ اگر روزہ شروع ہونے سے پہلے نیت توڑ چکا ہو تو اس کا یہ اثر ہوگا کہ روزہ شروع نہ ہوگا۔ اور یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ نیت شطر صوم نہیں بلکہ محض شرط ہے پس یہی کہنا غلط ہے کہ صوم عدمی اور وجودی سے مرکب ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس کی حقیقت تو عدمی ہے البتہ اس حقیقت عدمیہ کا اعتبار ایک وجودی شرط پر موقوف ہے۔

اعمال وجودیہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ روزہ عدمی ہے اور اس کی حقیقت ترک ہے تو اب دیکھنا چاہیے کہ اعمال وجودیہ شاق ہوتے ہیں یا عدمیہ اس میں عقل سے فتویٰ تو معلوم ہوگا کہ اعمال وجودیہ ہی شاق ہیں۔ اعمال عدمیہ میں کیا دشواری ہے۔ اس لئے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ فعل سے ترک اہون ہے۔

اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ روزہ میں تو لوگ رو دیتے ہیں اور بڑی مصیبت معلوم ہوتی ہے اور نماز میں کیا دشواری ہے خاص کر ہماری ولایتی نماز میں جس کی مثال مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھڑی سے دیا کرتے تھے کہ ہماری نماز ایسی ہے جیسے گھڑی اور تکبیر تحریمہ ایسی ہے جیسے گھڑی میں کوک (چابی) بھرنا تو جیسے وہ کوک بھرنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے اور کوک ختم ہو جانے پر بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت و رکوع و سجود ہم سے خود بخود صادر ہوتے رہتے ہیں کیونکہ مشق ہو چکی ہے اور سلام کے اوپر نماز خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

اس مشق پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک انگریز حاکم کی پیشی میں دو سررشتہ دار تھے۔ جن میں ایک نمازی تھا۔ ایک بے نمازی۔ حاکم دونوں کو نماز کے وقت ایک گھنٹہ کی چھٹی دیا کرتا تھا۔ نمازی تو نماز پوری کر کے آتا اور بے نمازی ادھر ادھر ٹہل کر حقہ پان کھا کر آ جاتا۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ بے نمازی جلدی واپس ہوگا تو ایک دن حاکم نے اس سے کہا کہ تم بہت جلدی واپس آ جاتے ہو اور دوسرا دیر میں آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نماز نہیں پڑھتے تو اس نے کہا نہیں حضور نماز تو میں بھی پڑھتا ہوں۔ مگر میں جلدی پڑھتا ہوں اور وہ دیر میں۔ کیونکہ میرے آباؤ اجداد تو کئی صدیوں سے نمازی ہیں۔ تو مجھے نماز کی خوب مشق ہے۔ اور یہ دوسرا سررشتہ دار نیا نمازی ہے اس کو نماز اچھی طرح یاد نہیں۔ سوچ سوچ کر پڑھتا ہے اس واسطے دیر لگاتا ہے۔

خیر! اس نے تو یہ جواب فوراً گھڑا تھا مگر ہماری حالت یہی ہے کہ ہم کو نماز کی مشق ہوگئی ہے۔ اس لئے سوچنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس اللہ اکبر کہا۔ اور سارے ارکان خود بخود ادا ہونے لگے۔ تو ایسی نماز میں کیا مشقت ہے۔ اور روزہ میں تو ایسی مشقت ہے کہ آج کل تو بوجہ رمضان کے سردی میں آنے کے زیادہ تعب محسوس نہیں ہوتا۔ مگر چند روز پہلے جب گرمی میں رمضان آتا تھا تو یہ حالت تھی کہ میں نے خود جنگل میں ایک شخص کو صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس سے پہلے دیکھا کہ کھیت میں بیٹھا ہوا تربوز کھا رہا ہے۔ میں نے اس کو ملامت کی کہ بندہ خدا صبح سے ہی روزہ توڑ دیا ہے۔ کہنے لگا کہ گرمی میں رکھا نہیں جاتا۔ میں نے کہا جب گرمی ہوتی اور تجھ سے روزہ نہ رکھا جاتا اسی وقت توڑ دیا ہوتا کہ اس وقت ظاہر میں تو ایک عذر ہوتا۔ اب ٹھنڈے وقت توڑنے میں تیرے پاس کیا عذر ہے۔ مگر وہ غالباً منتظم تھا کہ جو کام بعد کو کرنا پڑے گا اسے پہلے ہی کر لیا جائے ایک قسم انتظام کی یہ بھی ہے۔

چنانچہ ایک شخص سفر کو چلا۔ چلتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھنے لگا کہ اماں کچھ منگانا ہے میں سفر میں جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہاں سے ایک ہنڈیا مٹی کی لیتے آنا شاید جھنجانہ جاتا ہوگا کیوں کہ وہاں کی ہنڈیاں اچھی ہوتی ہیں۔ آپ نے ماں کی فرمائش کو یاد رکھا اور ایک ہنڈیا خریدی اور گھر کو چلا۔ جب گاؤں قریب رہ گیا سوچا کہ ماں اس ہنڈیا کو لیکر کیا کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس میں دال وغیرہ پکائے گی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہ کالی ہو جائے گی پھر پھوٹ جائے گی تو جو کام اتنی مدت میں ہوگا میں اس کو ابھی نہ کر دوں۔ یہ سوچ کر ڈھیلوں کو چولہا بنایا۔ ہنڈیا میں پانی بھر کر چولہے پر رکھا۔ پتے جمع

کر کے اس کے نیچے جلائے۔ جب وہ کالی ہوگئی کسی پتھر پر دے ماری اور پھوڑ دی۔

جب گھر پہنچے ماں نے ہنڈیا مانگی تو کہا جی ہاں میں ہنڈیا لایا ہوں۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم اسے کیا کرتیں۔ کہا میں اس میں دال سالن پکاتی۔ کہا پھر کیا ہوتا۔ کہا پھر وہ چند روز کے بعد خراب ہوجاتی۔ کہا پھر کیا ہوتا۔ کہا پھر پھوٹ جاتی۔ صاحب زادہ بولے بس بس جو کام تم اتنے عرصہ میں کرتیں۔ میں نے ایک ہی دن میں کر دیا۔ اور سارا قصہ نقل کر دیا۔ تو وہ صبح صبح تربوز کھانے والا بھی ایسا ہی منتظم تھا کہ دوپہر کے بعد جو کام کرنا پڑے گا اس کو صبح ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔

روزہ اور نماز میں آسانی

غرض ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ آسان نہیں بلکہ دشوار ہے اور تم اس کو آسان کہہ رہے ہو تو جواب یہ ہے کہ یہ دشواری بوجہ ایک عارض یعنی امتداد کے ہے کہ گرمیوں کا دن بہت بڑا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزہ میں امتداد ہو جاتا ہے اگر کہیں نماز اتنی ممتد ہو جائے جس کو آپ آسان کہتے ہیں تو پھر نانی یاد آجائے۔ چودہ گھنٹے تک تو کوئی کیا نماز پڑھے گا۔ اگر کہیں تراویح میں ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔ تو لوگ گھبرا جاتے ہیں کانپور میں ایک مسجد سے نکلتے ہوئے بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ تراویح کیا ہے قرنطینہ ہے۔ یہ تو تراویح کا حال ہے۔

شبینہ میں تو کچھ پوچھئے ہی نہیں کیا حال ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی روزہ کے برابر ممتد نہیں ہوتا۔ پانچ چھ گھنٹے میں شبینہ پڑھنے والے قرآن ختم کر لیتے ہیں۔ مگر وہ پانچ چھ گھنٹے مقتدیوں کو پانچ مہینے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہاں بھی شبینہ کا رواج تھا۔ بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ اب تو رواج نہیں رہا۔ کیونکہ چھپنے ہی سے لوگوں کو فرصت نہیں۔ شبینہ کون سنے۔ اس گڑبڑ کو دیکھ کر میں نے شبینہ کی مخالفت کی۔ کیونکہ لوگوں کو یہاں شوق تو تھا نہیں محض نام و نمود مقصود تھا کہ ہم نے ایک رات میں قرآن سنا۔ حالت یہ تھی کہ مقتدی پڑے ہوئے ہیں اور امام کھڑا ہوا پڑھ رہا ہے۔ پھر وہ بھی ایسا تیز پڑھتا تھا کہ قرآن بھی بہت کم سمجھ میں آتا تھا۔ اور سمجھانے کی اس کو ضرورت ہی کیا تھی جب سننے اور سمجھنے ہی والے نہ ہوں۔ کیونکہ مقتدی تو اکثر لیٹے ہوتے تھے۔ باقی جن مقامات پر لوگوں کو قرآن سننے کا شوق ہے اور یہ نہیں چاہتے کہ امام گڑبڑ کر کے قرآن ختم کر دے وہاں میں شبینہ کو نہیں روکتا۔ چنانچہ پانی پت میں اس کا اب تک رواج ہے۔ وہاں کے لوگوں کو میں منع نہیں کرتا کیونکہ ان کو شوق ہے بشرطیکہ تراویح میں ہو۔

یہاں تو یہ حالت تھی کہ ایک حافظ صاحب شبینہ میں پلنگ پر لیٹے ہوئے امام کو لقمہ دے رہے تھے۔ جس سے ساری رات کی محنت ہی ضائع گئی۔ کیونکہ یہ لقمہ مثل لقمہ طعام کے مفسد صلوٰۃ ہے۔ اور ایک شبینہ میں قرآن ختم ہونے سے پہلے صبح ہوگئی اور صبح صادق کے بعد کاذبین نے شبینہ پورا کیا۔

تو معلوم ہوا کہ نماز میں سہولت اسی وقت تک ہے جب تک امتداد نہ ہو اور امتداد کے ساتھ تو وہ روزہ سے بھی اشد ہے کیونکہ روزہ میں وہ پابندیاں نہیں جو نماز میں ہیں۔ روزہ اپنی ذات میں سہل ہی ہے۔ ہاں زیادت امتداد سے دشوار ہو جاتا ہے۔

روح صوم

رہا یہ کہ جب روزہ میں مشقت نہیں تو پھر اس میں ثواب ہی کیا ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ثواب مشقت ہی سے ہوا کرے اور بدوں اس کے ثواب نہ ہو۔ دوسرے تجربہ یہ ہے کہ روزہ میں گو جاڑوں ہی کا روزہ ہو اور گو دن بھی چھوٹا ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ مشقت ضرور ہوتی ہے۔ گو ہم سحر میں کتنا ہی پیٹ بھر لیں۔ اور یہ میں اسلئے کہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں کو جواب دینا مقصود ہے جنہوں نے سحری میں پیٹ بھر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اس سے روح صوم باطل ہو جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مبطل روح صوم ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس سے منع فرماتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول زور و عمل سے روزہ میں منع فرمایا ہے کہ وہ بھی مبطل روح صوم ہی ہیں مفسد ظاہر صوم نہیں۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہیں مفسدات کو بیان نہیں فرمایا جس سے صورت صوم باطل ہوتی تھی بلکہ ان امور سے بھی تعرض فرمایا ہے جن سے روح باطل ہوتی تھی تو اگر شبع سے حقیقت صوم باطل ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی ضرور متنبہ فرماتے۔ مگر حدیث میں کہیں اس سے ممانعت نہیں ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نافع و ضار دینی سے ہم کو مطلع فرما دیا ہے اور قسم کھا کر فرمایا ہے کہ کوئی چیز نافع نہ تھی۔ جس سے میں نے تم کو مطلع نہ کیا ہو اور کوئی چیز مضر نہ تھی جس سے منع نہ کیا ہو۔ پس ان حضرات کے قول کا ایک جواب تو یہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم کو بھی مسلم نہیں کہ سحری میں پیٹ بھر کے کھانے سے روزہ میں مشقت نہیں ہوتی۔ بلکہ ضرور ہوتی ہے۔ خواہ سحری میں کتنا ہی کھالو تب بھی وقت معتاد پر کھانے کی طلب ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کھانا نہ ملنے سے کسی قدر کلفت ہوتی ہے اگر کسی کو اس

کا احساس نہ ہوتو وہ بیمار ہے اپنا علاج کرے گرمی کے روزہ میں تو کھانے سے زیادہ پانی کی طلب ہوتی ہے۔ پیاس بھڑکتی ہے اور سردی کے روزہ میں بھوک زیادہ لگتی ہے اور اس کا مقتضا یہ ضرور تھا کہ سردی کے روزہ میں ضعف زیادہ ہو مگر دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے ضعف زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

روزہ دار اور مشغولیت

بہرحال روزہ میں مشقت بھی ہے مگر وہ امتداد عارض یا مخالفت عادت کی وجہ سے ہے۔ فی نفسہ اس کی حقیقت میں کوئی ایسی بات داخل نہیں جو موجب مشقت ہو۔ کیونکہ روزہ میں کوئی عمل تلاوت قرآن یا ذکر وغیرہ ضروری نہیں اگر کوئی دن بھر سوتا رہے روزہ ہو جائے گا۔ ہاں اس طرح سونا حرام ہے جس سے نماز فوت ہو اور نماز کے وقت بیدار ہونے کی امید نہ ہو اور اگر ایسا کسی نے کیا بھی تب بھی نماز فوت کرنے کا تو گناہ ہوگا مگر روزہ پھر بھی صحیح ہے یا کوئی شطرنج کھیلتا رہے جب بھی روزہ فاسد نہ ہوگا گو شطرنج کا گناہ ہوگا۔ تو فی نفسہ روزہ خود آسان ہی ہوا۔ جس کا راز یہ ہے کہ اس میں کوئی عمل نہیں کرنا پڑتا۔

امتداد وغیرہ کی وجہ سے جو بعضوں کو روزہ لگتا ہے تو اس کے بارے میں بھی تجربہ یہ ہے کہ تذکرہ کرنے سے روزہ زیادہ لگتا ہے کہ آج تو بہت گرمی ہے۔ آج پیاس زیادہ ہے آج کا روزہ بہت سخت ہے۔ اور اگر اس بات کو ذہن سے بھلا دیا جائے کہ آج ہمارا روزہ ہے اور اس کا تذکرہ بھی نہ کیا جائے اور کسی ایسے کام میں لگ جائے جس میں مشغولی زیادہ ہو تو پھر باوجود امتداد کے بھی روزہ زیادہ نہیں لگتا۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے یہی حالت ہر غم افزاء واقعہ میں ہے کہ اس کے تذکرہ سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور قطع تذکرہ سے غم ضعیف ہو جاتا ہے۔

اس تقریر سے ایک بڑا اشکال حل ہو گیا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصہ میں فرمایا ہے۔ **فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم ولاتخافی ولا تحزنی انا رادوہ الیک وجاعلوہ من المرسلین.** ”کہ جب تم کو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور کچھ خوف و غم نہ کرنا ہم ان کو تمہارے پاس واپس کر دیں گے اور ان کو رسول بنائیں گے“۔

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ خوف وحزن تو امر غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ کے ساتھ تکلیف متعلق نہیں ہوتی۔ کیونکہ نص میں ہے **لایکلف الله نفساً الا وسعها** (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) تو پھر یہاں **لاتخافی ولاتحزنی** (نہ ڈرنا

اور نہ اندیشہ کرنا) بصیغہ نہی کیوں فرمایا گیا جس میں خوف وحزن سے ممانعت ہے حالانکہ امر و نہی امور اختیاریہ سے متعلق ہوتی ہے نہ کہ غیر اختیاریہ سے۔

اس کا جواب وہ ہے جو میری تقریر سے ابھی معلوم ہوا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خوف وحزن عادتاً تو غیر اختیاری ہے مگر بقاء اختیاری ہے کہ تذکرہ وتذکر سے بڑھتا اور عدم تذکر سے گھٹتا ہے۔ پس یہاں **لاتخافی و لاتحزنی** کا مطلب یہ ہے کہ خوف وحزن کو لے کر نہ بیٹھنا۔ اور اس کا بار بار تذکرہ اور خیال نہ کرنا کہ اس سے غم بڑھے گا۔ عورتیں اس بات کو خوب جانتی ہیں کیونکہ ان میں تذکرہ بہت ہوتا ہے اسی لئے ان کا غم برسوں ہوتا ہے اور مردوں میں تذکرہ کم ہوتا ہے ان کا غم بہت جلد کم ہو جاتا ہے اور چار دن میں گویا مفقود ہو جاتا ہے۔

والدین کی محبت

اسی لئے بعض عورتیں مردوں کو سنگدل سمجھتی ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے مرد سنگدل نہیں بلکہ قوی دل ہے۔ سنگ دل ہونا اور ہے اور قوی دل ہونا اور ہے۔ سنگ دل کہتے ہیں بے رحم ظالم کو اور قوی دل کہتے ہیں بہادر کو۔ اور تجربہ ہے کہ شجاع ہمیشہ رحمدل ہوتا ہے سنگ دلی اکثر بزدلوں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ترک شجاع ہیں مگر نہایت رحم دل ہیں جن کی رحم دلی مشہور ہے۔ اور ہندوستان کی بعض قومیں نہایت بزدل ہیں۔ مگر اس کے ساتھ سنگ دل کنغک بھی ہیں۔ یعنی خود غرض! پس عورتیں مردوں سے زیادہ رحمدل نہیں ہیں بلکہ ضعیف القلب ہیں اور مرد سنگدل نہیں بلکہ قوی القلب ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں جو مشہور ہے کہ اولاد سے ماں کو محبت زیادہ ہوتی ہے باپ کو کم۔ چنانچہ ماں کی ممتا مشہور ہے اور تقریباً مرد بھی سب اس کو تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ اور ایک مجمع نسواں میں تو اس پر اتفاق ہو گیا تھا۔ اور قریب تھا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہو جائے مگر ایک سات آٹھ سال کی لڑکی نے جس کے متعلق وہم بھی نہ تھا کہ یہ بھی اس کمیٹی کی ممبر بننے کے لائق ہے بولی کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ اولاد سے محبت ماں کو زیادہ ہوتی ہے اور باپ کو کم۔ میں اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ میرے نزدیک اولاد کی محبت تو دونوں کو برابر ہوتی ہے مگر چونکہ اولاد ماں کے پاس زیادہ رہتی ہے تو زیادہ رہنے کے حصہ کی محبت ماں میں بڑھ جاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ماں کے پاس زیادہ نہ رہے باپ کے پاس زیادہ رہے تو اس کی محبت باپ کو ماں سے زیادہ ہوگی۔ چونکہ اس نوعمر لڑکی نے بات پتہ کی کہی اور دلیل کے ساتھ کہی اسلئے کوئی اس کو رد نہ کر سکا۔ اور وہ اتفاق باطل ہو گیا۔

پس نہ عورتیں محبت میں مردوں سے زیادہ ہیں نہ رحم دلی میں (اور حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کو ماں سے زیادہ رحیم فرمایا ہے اس کا صدق رحمت للعوارض سے بھی ہو سکتا ہے۔۱۲منہ) اوران کو جو زیادہ مدت تک غم رہتا ہے اس کا راز یہ ہے کہ یہ تذکرہ واقعہ کا عرصہ تک رکھتی ہیں اسی سے حق تعالیٰ نے ام موسیٰ علیہما السلام کو منع فرمایا ہے۔ آگے ایک شغل بتلا دیا کہ بجائے واقعہ غم کو یاد کرنے کے تم دوسری بات کا تصور کرتی رہنا وہ کیا **انا را دوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین** ۔کہ خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم اس کو واپس بھیجیں گے اوران کو رسول بنائیں گے۔ تو اس امر کا تصور کرتی رہو کہ دیکھئے حق تعالیٰ کس طریق سے اور کس طرز سے ان کو واپس کرتے ہیں اور اسی خیال میں رہنا کہ بس اب آئے اور آج آئے یا کل آئے۔ اس خیال کو رفع غم میں بڑا دخل ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم ☆ کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس امید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑ لے)

یہ تو بیچارہ شاید ہی پر خوش ہے اور جس کو **انا رادوہ الیک** کا تصور تعلیم کیا گیا ہو جس میں ''ان'' اور جملہ اسمیہ سے تاکید ہے اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہونا سب سے بڑھ کر تاکید ہے وہاں تو خوشی کا کیا حال ہوگا۔

عدم التفات اور خوف وحزن

یہاں سے معلوم ہوا کہ خوف وحزن کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو اس کا تذکرہ نہ کرے اس کا سبق روزمرہ نہ پڑھا کرے۔ دوسرے یہ کہ اپنے ذہن کو اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرے اور کسی اور بات کی طرف لگائے۔ اسی سے صوفیا نے کام لیا ہے۔ وساوس کے بارے میں کہ سالکین کو جو خطرات ووساوس پیش آیا کرتے ہیں اس کے علاج میں وہ عدم التفات ہی کی تعلیم دیا کرتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ والتفات نہ کرو چاہے کفر ہی کے وسوسے کیوں نہ ہوں اور یہی علاج حدیث میں بھی آیا ہے مگر اہل ظاہر اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ عارفین ہی نے سمجھا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں حدیث متفق علیہ ہے۔ **یاتی الشیطن احدکم فیقول من خلق کذا من خلق کذا حتی یقول من خلق ربک فاذابلغه فلیستعذ باللہ ولینته**[۱]۔ (تم میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آئے گا پس کہے گا کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے

---

[۱] البداية والنهاية: ۱: ۲۰، صحيح أبو عوانة: ۱: ۸۲

پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے بنایا یہاں تک کہ کہے گا تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے اور چاہئے کہ وہ اس وسوسہ سے دور ہو جائے)

یہاں ولینتہ صیغہ امر ہے جس میں انتہا کا امر ہے اگر اس سے مراد انتہاعن الوسوسہ ہے کہ اس وسوسہ سے رک جائے تو لازم آئے گا۔ کہ وسوسہ امر اختیاری ہو حالانکہ وسوسہ امر غیر اختیاری ہے اور اگر یہ مراد نہیں تو پھر کیا مراد ہے۔

عارفین کہتے ہیں کہ ولینتہ سے مراد انتہاعن الالتفات ہے کہ اس کی طرف التفات نہ کرے اور التفات امر غیر اختیاری ہے اس سے معلوم ہوا کہ عدم التفات کو دفع وساوس میں خاص دخل ہے۔ یہ تو حدیث سے استدلال تھا۔ آگے تجربہ شاہد ہے کہ عدم التفات سے بڑھ کر اس کا کوئی علاج نہیں اور جتنی تدابیر کی جاتی ہیں سب سے وسوسہ کو اضافہ ہی ہوتا ہے کیونکہ ان تدابیر میں اس طرف التفات ہوتا ہے کہ ہم وسوسہ کو دفع کرنا چاہتے ہیں اور اتنا التفات بھی غضب ہے۔ بس التفات کے وقت یہ حال ہوتا ہے کہ۔

تڑپوگے جتنا جال کے اندر ☆ جال گھسے گا کھال کے اندر

وسوسہ کی مثال تار برقی جیسی ہے کہ اس کو نہ تو پکڑنے کے واسطے ہاتھ لگاؤ نہ ہٹانے کے واسطے ہاتھ لگاؤ۔ بلکہ اس سے دور ہی رہو۔ جو لوگ وسوسہ کی طرف التفات کرتے ہیں ان کو غلطی یہ پیش آتی ہے کہ وہ وسوسہ کو مضر سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہم سے وساوس پر مواخذہ ہوگا۔ اس لئے ان پر غم سوار ہو جاتا ہے اور وہ اس سے عدم التفات پر قادر نہیں رہتے۔ حالانکہ نص صریح موجود ہے **لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا** (کسی شخص کو اللہ تعالیٰ اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور ظاہر ہے کہ وسوسہ کا نہ آنا قدرت سے خارج ہے۔

دوسری حدیث میں تصریح ہے کہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وساوس کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **ذاک صریح الایمان**۔ (یہ صریح ایمان ہے) اس سے زیادہ اور کیا اطمینان چاہتے ہو۔

بعض لوگوں کو ایک آیت سے دھوکا ہوا ہے۔ **ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید**۔ (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور ہم اسکی رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں)

کہ اس سے بظاہر وسوسہ پر مواخذہ ہونا مفہوم ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور محاورہ قرآنیہ میں یہ لفظ نعلم مواخذہ اور وعید پر دلالت کرتا ہے۔ کثرت سے ایسی آیتیں وارد ہیں اور عام محاورہ بھی اس کے موافق ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ مجھے تمہاری حالت خوب معلوم ہے۔ یعنی ٹھہرے رہو تم کو سمجھوں گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذرا اس آیت کے اوپر نظر کرو اور سیاق وسباق کو ملا کر دیکھو اور یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ کسی آیت کی تفسیر محض اس آیت کے الفاظ کو دیکھ کر نہ کرو۔ بلکہ سیاق وسباق کو ملا کر تفسیر کیا کرو بغیر اس کے تفسیر معتبر نہیں۔ اسی سے بہت جگہ غلطی واقع ہوتی ہے۔

چنانچہ بہت لوگوں کو آیت **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المؤمنین سبیلا**۔ پر اسی لئے یہ اشکال ہوا ہے کہ ہم تو مسلمانوں پر کفار کا غلبہ مشاہدہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کا بھی جواب یہی ہے کہ تم نے سیاق کو نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے یہ مضمون ہے **فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ** کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد ارشاد ہے **ولن یجعل اللہ للکافرین** الخ مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ آخرت میں کفار کو مسلمانوں پر غلبہ نہ ہوگا۔ اس میں مطلق سبیل کی نفی کہاں ہے جو اشکال کیا جائے۔

ایسے ہی یہاں بھی سیاق وسباق کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ کا مقصود معاد کو ثابت کرنا ہے جس کے لئے شرط ہے کمال قدرت اور کمال علم۔

قرب حق

تو اوپر کمال قدرت کا ذکر تھا کہ ہم نے آسمان کو اس طرح پیدا کیا زمین کو اس طرح بنایا اور اس میں درخت ونباتات پیدا کئے۔

اب کمال علم کو ثابت کرتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم کو ان وساوس پر بھی اطلاع ہے جو قلب انسان پر گزرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وساوس نہایت خفی چیز ہیں۔ جب ہم کو ان کا بھی علم ہے تو ہمارا علم نہایت کامل ہے تو اس سے وعید ومواخذہ پر دلالت کہاں ہوئی؟ بلکہ محض کمال علم پر دلالت ہوئی۔ اس لئے آگے بھی سزا کا ذکر نہیں۔ بلکہ قرب کا ذکر ہے **ونحن اقرب الیہ من حبل الورید**۔ کہ ہم انسان کے رگ گردن سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔ یہ دلیل ہے علم کامل کی۔

رہا یہ سوال کہ **اقرب من حبل الورید** کیسے ہیں یہ ایک مستقل سوال ہے سو اس کا حقیقی

جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من حبل الورید (رگِ گردن سے) کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا اقرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ حبل الورید ذی علم نہیں ہے۔ جس سے اقرب ہونا اقربیۃ فی العلم پر دال ہے بلکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کی کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ حق تعالیٰ کیفیت سے منزہ ہیں ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجوار کی فرع ہے۔ اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے۔ اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا۔ مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی۔ البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے۔

اناللہ کی تعلیم

بہرحال وساوس سے بے التفاتی برتنا تجربہ سے صوفیاء کی بھی تعلیم ہے۔ اب ایک سوال اور پیدا ہوگا۔ وہ یہ کہ اگر کسی نے وساوس کو دفع کرنے کے لئے ان کی طرف التفات کیا اور اس التفاوت سے وساوس کو ترقی ہوگئی تو اس شخص پر مواخذہ عائد ہوگا یا نہیں؟

اس کے متعلق عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ اس پر مواخذہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے اختیار سے وسوسہ بڑھا ہے اور یہاں سے معلوم ہوگا کہ عقل آپ کی خیرخواہ نہیں بلکہ بدخواہ ہے اور خیرخواہ شریعت ہی ہے جس کو آپ دشوار سمجھتے ہیں۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

آزمودم عقل دوراندیش را ☆ بعدازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں عقل دوراندیش کو آزما چکا ہوں بعد میں اپنے آپ کو دیوانہ یعنی احکام شریعت کا متبع بنالیا)

(دیوانگی سے مراد اتباع احکام شرع بدوں تفتیش علل ہے) چنانچہ شریعت کا فتویٰ اس موقع میں یہ ہے کہ اس شخص سے مواخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت بری نہ تھی گو اس نے التفات قصداً کیا اور التفات سے وسوسہ بڑھ نہ جائے گو طریق دفع میں اس نے غلطی کی مگر نیت دفع ہی کی تھی رضا بالوسوسہ کے ساتھ اس نے التفات نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ زاہد تو بعض دفعہ قصداً جلب غم کرتا ہے اور عارف قصداً جلب غم نہیں کرتا۔ ہاں بلا قصد کے اگر غم پہنچ جائے تو وہ اس کو لذائذ سے بڑھ کر قبول کرتا ہے مگر قصداً طالب غم اور جالب غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ عارفین نصوص واشارات نصوص سے یہ سمجھے ہیں کہ غم کو بڑھانا یا طلب کرنا شرعاً مطلوب نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **یرید الله بکم الیسر ولایرید بکم العسر**۔ (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتے) اور حدیث میں ہے **من شاق شاق الله علیه**[1] (جو شخص دشوار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دشوار بنا دیتے ہیں)

دوسرے عارفین نے **الذین اذا اصابتھم مصیبة قالوا انالله وانا الیه راجعون**۔ (وہ لوگ ایسے ہیں جب ان پر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ایسے میں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کے مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم وتسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم کو بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول تو انالله کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین ومتعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے۔ اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں۔ عارفین کی تو اسی سے تسلی ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں بلکہ اصل مالک اور اصل موجود حق تعالیٰ ہیں۔ دنیا وآخرت دونوں انہیں کے ہیں۔ ان کو اختیار ہے کہ جب چاہیں کسی کو دنیا میں رکھیں۔ اور جب چاہیں آخرت کی طرف بلا لیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوں۔ اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو۔ اب اگر کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟

اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں۔ ایک دنیا ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلا لیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔ وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک

---

[1] سنن أبي داؤد كتاب الأقضية ب: ۳۱، سنن الترمذي: ۱۹۴۰، سنن ابن ماجة: ۲۳۴۲

ہیں۔تم گڑبڑ کرنے والے کون ہو؟

عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہوگئی۔مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تقلیل وتسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں۔جہاں ہمارا عزیز گیا۔اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدرآباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کردیا۔دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔نظام نے اس کو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے تجھے بھی عنقریب یہیں بلالیا جائے گا۔اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی۔تو یہاں انا اللہ و انا الیہ راجعون۔کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو۔بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اسلئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڈھا روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے حضرت نے فرمایا کہ دیکھو کیسی عجیب بات ہے ایک قیدی قید سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا رو رہا ہے کہ ہائے یہ قید سے کیوں نکل رہا ہے۔پھر فرمایا تم بھی ایک دن اسی طرح قید سے چھوٹ جاؤ گے۔میں نے دل میں کہا کہ اور بیوی کو چھڑانے آؤ تم بھی منگوائے گئے۔

موت مثل شادی

واقعی عارفین دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں اور ان کو یہاں سے نکلتے ہوئے وہی خوشی ہوتی ہے جو قیدی کو جیل خانہ سے نکلتے ہوئے ہوتی ہے، عارف کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں)

اور یہ نری شاعری نہیں ہے معیار سے دیکھ لو اگر اس کلام سے دل پر اثر ہوتا ہے تو یہ سچا کلام ہے ورنہ شاعری ہے۔اب اس کو ہر شخص خود دیکھ لے کہ اہل حقیقت کے کلام میں فرق ہے یا نہیں۔یقیناً فرق ہے عارف کے کلام کا قلوب پر خاص اثر ہوتا ہے یہی اس کی علامت ہے کہ ان کے کلام میں شاعری نہیں۔بلکہ سچا کلام ہے آگے فرماتے ہیں۔

نذر کردم کہ گر آید بسرایں روزے ☆ تا در میکدہ شاداں وغزل خوان بروم

(میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش وخرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)

آخر یہ خوشی کس چیز کی ہے۔ اسی کی کہ وہ دنیا سے جانے کو جیل خانہ سے نکلنا سمجھتے ہیں ایک بزرگ نے مرض وفات میں وصیت کی تھی کہ ہمارے وصال کے بعد ہمارے جنازہ کے ساتھ ایک شخص یہ شعر پڑھتا ہوا چلے ؎

مفلسا نیم آمدہ درکوئے تو ☆ شیئا للہ اجمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما ☆ آفریں بروست برباز وئے تو

(آپکے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقے میں کچھ عنایت کیجئے..... ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے۔ آپ کے دست وبازو پر آفرین ہے)

ان کو کوئی تو خوشی تھی جو مرتے ہوئے یہ بے فکری تھی۔ اسی واسطے اولیاء اللہ کے وصال وموت کو عرس کہا جاتا ہے جس کے معنی شادی کے ہیں کیونکہ ان کے لئے موت مثل شادی کے ہے۔ اہل عرس کو اس معنی کی خبر بھی نہیں وہ بدوں سمجھے ہی عرس کرتے ہیں۔ اس لیے حدود شرعیہ سے تجاوز کرتے ہیں جو خود ان شادی والوں کی خوشی کے بھی خلاف ہے۔ بہر حال موت کا دن خوشی کا دن ہے غم کا دن نہیں۔

اولیاء اللہ کے لئے تو خوشی کا دن ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مجرم مسلمان کے لئے بھی خوشی کا دن ہے کیونکہ دنیا مصیبت کدہ ہے تو جو شخص مرتا ہے اس کی مصیبت کے دن کٹ رہے ہیں۔ اب آخرت میں جا کر اس کو راحت کاملہ حاصل ہوگی۔ اور اگر گنہگار مسلمان کو کچھ دن جہنم میں رہنا پڑے تو وہ بھی راحت ہے کیونکہ مسلمان کے لئے جہنم میں جانا تزکیہ ہے عذاب نہیں ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کفار کی بابت فرماتے ہیں۔ **ان الذین یشترون بعھد اللہ وایما نھم ثمناً قلیلاً اولئک لاخلاق لھم فی الاخرۃ ولایکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیمۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم.** (یقیناً جو لوگ حقیر معاوضہ لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اور مقابلہ اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ آخرت میں نہ ملے گا نہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھیں گے قیامت کے دن اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا)

یہاں کفار کی نسبت ولایزکیھم (اور نہ ان کا تزکیہ کریں گے) فرمایا ہے اور وعید میں مفہوم مخالف بالاتفاق معتبر ہے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے جہنم کا دخول تزکیہ کے طور پر ہوگا۔ جیسے یہاں حمام

کا دخول تنظیف کے لئے ہوتا ہے۔ گو اس میں کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی خوشی زائل نہیں ہوتی۔ دیکھئے مسہل اور آپریشن میں کیسی تکلیف ہوتی ہے بعض لوگ رونے لگتے ہیں مگر خوش بھی ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس آپریشن کا انجام صحت و راحت ہے۔

اسی طرح گنہگار مسلمان کو بھی موت پر خوش ہونا چاہیے اور یہ سمجھ لے کہ اگر جہنم میں جانا بھی ہوا تو تزکیہ اور آپریشن کے لئے جانا ہوگا جس کا انجام راحت و عافیت ہے۔ ہاں کافر کے لئے کچھ خوشی نہیں کیونکہ اس کے واسطے جہنم تزکیہ نہیں۔ بلکہ دائمی قید خانہ ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارة اعدت للکفرین**۔ (پس بچو تم اس آگ سے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے) اس میں بھی مسلمان کو بشارت ہے کہ جہنم تمہارا گھر نہیں ہے نہ تمہارے واسطے بنایا گیا۔ بلکہ وہ تو کافروں کا گھر ہے انہی کے واسطے بنایا گیا ہے۔ مگر عصاۃ مسلمین **من تشبه بقوم فهو منهم**[1] (جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں شمار کیا جائے گا) کے جرم میں پکڑے گئے کہ یہ دنیا میں بعض اعمال کفار جیسے کرتے تھے تو چند دن ان کے گھر میں رہنا پڑے گا۔

خوشی، غم اور عارف

اب یہاں ایک سوال وارد ہوگا کہ جب موت فی نفسہٖ خوشی کی چیز ہے کیونکہ جیل خانہ سے رہائی ہے۔ تو پھر چاہیے کہ اپنے کسی عزیز کی موت پر رویا بھی نہ جائے۔ بلکہ خوش ہونا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں جن لوگوں نے صرف اسی پہلو کو دیکھا وہ تو ایسے موقع پر خوش ہی ہوئے ہیں۔ چنانچہ بعض اولیاء سے منقول ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مرنے پر ہنستے تھے اور ذرا بھی نہیں روئے مگر عارف اس کے ساتھ دوسرے پہلو پر بھی نظر کرتا ہے یعنی حق اولاد و حق اقربا پر وہ اپنی اولاد یا عزیز کی موت پر روتے بھی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اولاد کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس کے مرنے پر رویا جائے اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتے ہیں کہ دل میں راضی رہتے ہیں۔

نیز ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ تمام جذبات کا اور اسی طرح صفات حمیدہ کا بقاء ان کے استعمال سے ہوتا ہے اور صفات حمیدہ میں سے ایک صفت رحم بھی ہے۔ اگر اس کا استعمال ہوتا رہا تو یہ باقی رہے گی ورنہ فناء ہو جائے گی اور استعمال کی صورت یہ ہے کہ کسی اپنے

---

[1] سنن أبی داؤد: ۴۰۳۱، مسند أحمد ۲: ۵۰، ۹۲، المصنف لابن أبی شیبة ۵: ۳۱۳، کنز العمال: ۲۴۶۰۰، مشکوٰة المصابیح: ۴۳۴۷

متعلق پر کلفت وارد ہو۔ اور یہ بات اپنے اختیار سے خارج ہے بلکہ قصداً کلفت وارد کرنا جائز بھی نہیں تو حق تعالیٰ کبھی کبھی عارف کے کسی عزیز کو مصیبت یا موت دیتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگتی ہے تا کہ صفت رحم مستعمل ہوتی رہے۔ اس وقت عارف گو ظاہر میں روتا ہے اور اس کے دل پر بھی اثر ہوتا ہے مگر عقلاً راضی اور خوش ہوتا ہے کیونکہ اس واقعہ کی حمیت اسے منکشف ہو چکی ہے کہ اس سے میری تربیت منظور ہے کہ صفت رحم فنا نہ ہو بلکہ باقی رہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ عارف جامع اضداد ہوتا ہے۔ وہ خوشی اور غم دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور ناواقف تو ایسے موقع میں پریشان ہو کر یہ کہہ ڈالتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ ☆ بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ ڈالا ہے پھر کہتے ہو کہ ہوشیار رہ کہ دامن تر نہ ہونے پائے)

اور یہ شعر ترجمہ ہے ایک عربی شعر کا

القاہ فی الیم مکتوفاوقال لہ ☆ ایاک ایاک ان تبتل بالماء

(اس کو گہرے دریا میں جکڑ کر ڈال دیا اور اس سے کہا دیکھ پانی میں نہ بھیگ)

علامہ شعرانی نے لکھا ہے کہ اس شعر کا پڑھنا حرام ہے کیونکہ اس میں اعتراض ہے حق تعالیٰ پر کہ وہ تکلیف مالایطاق دیتے ہیں حالانکہ نص میں اس کی نفی ہو چکی ہے **لایکلف اللہ نفسا الاوسعھا** (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اور جن دو چیزوں کے جمع کو یہ محال سمجھتا ہے اور پریشان ہو کر ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ (گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ ڈالا ہے)

کہتا ہے یہ اس کی کوتاہ نظری ہے۔ اگر ذرا آنکھیں کھول کر دیکھتا تو معلوم ہوا جاتا کہ شفاخانہ کا ایک معمولی دنیادار مریض بھی ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے اور اس معترض کے قول کو غلط کر رہا ہے کیونکہ وہ اپریشن کے وقت چیختا چلاتا بھی ہے اور نشتر سے کانپتا بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی خوش بھی ہے کہ بعد میں ڈاکٹر کو فیس اور انعام بھی دیتا ہے۔

اب بتلاؤ اگر یہ آپریشن سے خوش نہ تھا تو ڈاکٹر کو انعام کس چیز کا دیتا ہے اور اگر تکلیف نہ تھی تو روتا چلاتا کیوں تھا۔ بس معلوم ہوا کہ وہ عقلاً خوش تھا اور طبعاً غمگین تھا۔ تو خوشی اور غم دونوں جمع ہو گئے۔

یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ روزہ میں گرانی تذکرہ واستحضار سے بڑھ جاتی ہے پھر اس پر موسیٰ علیہ

السلام کی والدہ کا قصہ درمیان کیا گیا تھا کہ ان کو حق تعالیٰ نے لاتخافی و لاتحزنی (نہ خوف کرنا اور نہ غمگین ہونا) میں تذکرہ واستحضار حزن ہی سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ مسئلہ متفرع کیا تھا کہ عارفین نے وساوس کے علاج میں بھی اسی قاعدہ سے کام لیا ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ پھر یہ مسئلہ بیان کیا تھا کہ عارف قصداً جلب غم نہیں کرتا۔ اس پر گفتگو طویل ہوگئی۔

تذکرہ کا اثر

اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ روزہ فی نفسہٖ بھی اور امتداد سے بھی گراں نہیں ہے۔ بلکہ عارضی تذکرہ سے اس میں گرانی پیدا ہوجاتی ہے۔ پس تم روزہ میں شدت کا تذکرہ نہ کیا کرو۔ اور کسی ایسے کام میں لگ جایا کرو جس میں زیادہ مشغولی ہو کہ روزہ کی طرف دھیان ہی نہ جائے۔ اور اس قسم کی باتیں نہ کرو کہ آج گرمی بہت ہے۔ پیاس زیادہ ہے کیونکہ تذکرہ مصیبت سے مصیبت بڑھ جاتی ہے۔ تذکرہ وہ چیز ہے کہ بعض لوگوں نے ہمارے وطن ہی میں تذکرہ ہی سے ایک ثقہ شخص کو جو کہ بزرگوں سے گوناگوں تعلقات رکھتے تھے ایک مردار پر عاشق کر دیا تھا کیونکہ محبت جیسے دیدار سے ہوتی ہے تذکرہ سے بھی ہوجاتی ہے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں ۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ☆ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(عشق دیدار سے نہیں پیدا ہوتا بسا اوقات یہ محبت تذکرہ سے بھی پیدا ہوجاتی ہے)

پھر اس شخص نے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے مشورہ کیا کہ میں اس عورت سے نکاح کرلوں یا نہیں؟ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہرگز نکاح نہ کرو تم شریف خاندانی ہو اور وہ بازاری عورت ہے۔ اس سے نسل پر برا اثر پڑے گا اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے یہ مشورہ دیا کہ نکاح کرلو۔ مولانا اس شخص کی حالت سے متاثر ہوگئے۔ اور یہ سمجھے کہ اس کی یہ بے قراری جب ہی زائل ہوگی جب کہ اس سے نکاح کرلے گا۔ اس واسطے مولانا نے نسل کی خرابی پر نظر نہ کی۔

فضائل وہبیہ

کامل الاخلاق دونوں تھے اور دونوں اس کی حالت سے متاثر ہوئے۔ مگر ایک غالب علی الاخلاق تھے۔ ایک مغلوب عن الاخلاق تھے اور یہ امر غیر اختیاری ہے اور گو کمال یہ ہے کہ سالک غالب علی الاخلاق ہو مگر یہ کمال غیر اختیاری ہے اس لئے اس میں ایک کو دوسرے پر رشک نہ

کرنا چاہیے۔ اور نہ یہ تمنا کرنا چاہیے کہ کاش میں بھی فلاں کی طرح غالب الاخلاق ہوتا۔ بعض بعض سالکین تربیت السالک میں دوسروں کے احوال دیکھ کر رشک کیا کرتے ہیں کہ کاش ہم کو بھی ایسے احوال پیش آئیں جیسے ان کو پیش آتے ہیں۔ مگر یہ نقص ہے عارف کو رشک نہ کرنا چاہیے کیونکہ احوال غیر اختیاری ہیں اور امور غیر اختیاریہ کا فیصلہ خود نص میں مذکور ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم علىٰ بعض** کہ تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر (بلا دخل ان کے کسی عمل کے محض وہبا) فوقیت بخشی ہے آگے اس کی علت بیان فرماتے ہیں کہ فضائل وہبیہ غیر اختیاریہ کی تمنا ممنوع کیوں ہے۔ **للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن** اس لئے کہ مردوں کے واسطے ان کے اعمال کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ (یعنی مدار نجات قانوناً یہی اعمال ہیں) جن میں کسب واختیار کو دخل ہے۔ امور غیر اختیاریہ کو اس میں دخل نہیں۔ اسی لئے **مما اكتسبوا** (ان اعمال سے جو کئے ہیں) فرمایا **مما فضلوا به** (اسی سے جس سے وہ فوقیت دیئے گئے) نہیں فرمایا۔

اور اعمال اختیاریہ میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو فضائل کسبیہ میں کوشش کر کے دوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کرلو۔ باوجود اس پر قادر ہونے کے فضائل خاصہ وہبیہ کی تمنا محض ہوس اور فضول ہے ۔ پھر فضائل وہبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں عادۃ اللہ میں تغیر نہیں ہوتا جیسے مرد ہونا، شریف ہونا یا نبی ہونا۔ ان کے لئے تو دعا بھی جائز نہیں کہ کوئی عورت مرد ہونے کی یا جلاہا سید ہونے کی یا امتی نبی ہونے کی کرنے لگے ایسی دعا بھی ناجائز ہے۔ اور ایک قسم وہ ہے جس میں عادۃ اللہ میں تغیر ہوتا ہے۔ مگر بعد استقامت علی الشرع کے تو ایسے امور وہبیہ کی تمنائے محض تو محض ہوس ہے۔ ہاں! اس طرح دعا کرنا جائز ہے۔ کہ وہ ان اعمال کو اختیار کرے جن پر حصول وہب کا ترتب عادۃً ہوتا ہے پھر ان امور وہبیہ کیلئے دعا کرے۔ اسی کا ذکر ہے **واسئلوا الله من فضله** (اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کرو) میں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ایسے کمالات کے لئے جائز ہے جن میں فی الجملہ بطریق مذکور عمل کو دخل ہے۔

آگے اور ارشاد ہے **ان الله كان بكل شيء عليما**۔ کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ اس میں جواب ہے ان لوگوں کو جو کہا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بہت دعا کی مگر قبول نہیں ہوئی جواب کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تمہارے لئے ان

احوال وکمالات وہبیہ کا حصول مصلحت نہ ہو یا دیر میں حاصل ہونا مصلحت ہو۔

احوال وکیفیات

دوسری بات سالکین کو اور بھی یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ جن پر احوال وکیفیات کا ورود زیادہ ہوتا ہے۔ان کو خطرات بھی زیادہ پیش آتے ہیں۔ پس آپ نے ان کی ایک چیز کی تمنا تو کرلی دوسری کی بھی تو تمنا کرو اور خطرات کی تمنا نہ تم کرسکتے ہو اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ جن پر بلا درخواست کے خطرات وارد ہوتے ہیں ان کی امداد بھی بہت کی جاتی ہے اور تم درخواست کر کے خطرہ مانگو گے تو نہ معلوم تمہارا کیا انجام ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عارفین بڑے مزے میں ہیں۔ ہاں ہاں! بے شک ان کو مزہ بھی ایسا حاصل ہے جو کسی کو نصیب نہیں اور اس وقت وہ جوش میں آکر یوں بھی کہتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ☆ کہ ناز برفلک وحکم برستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں)

مگر دوسرے وقت وہ صاحب الم بھی ایسے ہیں کہ کوئی الم ان کے الم کے برابر نہیں۔ واللہ! بعض اوقات ان پر ایسی حالت گزرتی ہے جس کو کوئی بیان نہیں کرسکتا۔ اس وقت وہ ان لوگوں کو جو انہیں مزے میں سمجھتے ہیں اور ان کے احوال وکمالات کی تمنا کیا کرتے ہیں یوں خطاب کرتے ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی حالت کی کیا خبر جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

کہ میاں تم کو تو ابھی تک کانٹا بھی نہیں لگا اس لئے ہمارے احوال کی تمنا کرتے ہو۔تم کو ہماری حالت کی کیا خبر ہے کہ کیسی کیسی تلواریں ہمارے سر پر چل رہی ہیں۔ مگر یہ الم قہر کا الم نہیں بلکہ محبت کا الم ہے جو لذیذ ہے کیونکہ ان کو عین حالت الم میں محبوب کی توجہ عنایت کا بھی انکشاف ہوتا ہے جس پر نظر کر کے وہ یوں کہتے ہیں ؎

بجرم عشق تو ام می کشند غوغائیست ☆ تو نیز برسر بام آ عجب تماشا ئیست

(تیرے عشق کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور غوغائی ہیں تو بھی برسر بام آ عجب تماشائی ہے)

اس الم کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو بچھڑا ہوا محبوب مدت کے بعد آجائے اور بے خبری میں

پیچھے سے آکر دفعۃً عاشق کو دبانے لگے اور ایسا زور سے دبائے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اول اول تو عاشق کو تکلیف ہوگی اور وہ کہے گا کہ یہ کون قاتل آ گیا۔ مگر جب معلوم ہوگا کہ محبوب دبا رہا ہے تو وہ اس وقت خوش ہو کر کہے گا ؎

درد از یار ست و درماں نیز ہم ☆ دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم
(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی اس پر دل فدا ہے اور جان بھی)

اور کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ☆ دل فدائے یار دل رنجان من
(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جانب پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے دوست پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اس وقت اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو تکلیف ہوتی ہو تو لاؤ تمہیں چھوڑ کر رقیب کو دبالوں تو وہ کہے گا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو جو تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ ان پر خنجر آزمائی کریں)

تو عارفین کو الم بھی سب سے زیادہ ہے مگر ان کو تلخی الم میں بھی لذت آتی ہے اور اس کی زندہ نظیر دہلی کا حلیم ہے جس کی مرچوں کی تیزی سے تکلیف ہوتی ہے آنکھوں اور ناک منہ سے پانی بھی بہتا ہے اور سی سی بھی کرتے جاتے ہیں مگر لذت بھی ایسی ہے کہ چھوڑتے نہیں۔

اسی طرح تمبا کو کھانے والے یوں چاہتے ہیں کہ خوب تیز اور کڑوا ہو۔ مگر باوجود تلخی کے ان کے نزدیک پھر لذیذ ہے۔ حتیٰ کہ ایک دکاندار نے تو غضب کیا کہ اس سے ایک خریدار نے تمبا کو مانگا۔ اس نے دکھایا خریدار نے کہا کہ یہ تو کڑوا نہیں اس سے بھی کڑوا دکھلا۔ اس نے دوسرا دکھلایا۔ خریدار نے اس سے بھی کڑوا مانگا تو وہ کہتا ہے بس جی اس سے کڑوا اللہ کا نام (توبہ توبہ)۔

تو اس کے نزدیک کڑوا ہونا ایسا محبوب تھا کہ نعوذ باللہ خدا کے نام کو اس سے زیادہ کڑوا کہنے لگا وہ دکاندار اس بات سے کافر نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے نزدیک کڑوا ہونا صفت کمال تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اس سے کمال تر اللہ کا نام ہے۔ مگر الفاظ بہت واہیات ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تذکرہ سے مصیبت بڑھ جاتی ہے۔ پھر اس پر ایک قصہ یاد آ گیا تھا کہ ایک صالح شخص کو محض تذکرہ سے لوگوں نے ایک مردار کا عاشق بنا دیا۔ پھر مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مشورہ کا ذکر آ گیا تھا کہ ایک بزرگ نے تو نکاح کا مشورہ دیا ایک نے منع کیا۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ ایک غالب علی الاخلاق تھے۔ ایک مغلوب علی الاخلاق تھے۔ اور یہ امر غیر اختیاری ہے۔ اس پر امور وہبیہ کے احکام کی تفصیل چل پڑی تھی۔

روزہ اور گرانی

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ روزہ میں فی نفسہٖ گرانی نہیں ہے۔ عوارض سے اس میں گرانی آ جاتی ہے ورنہ اگر دشواری ہے تو اکل میں ہے۔ ترک اکل میں کیا دشواری ہے۔ وہ تو عدمی ہے اس عدمیت کی طرف کو نص میں اشارہ فرمایا ہے۔ **کلوا واشربوا هنیئا بمااسلفتم فی الایام الخالیه** کہ قیامت میں روزہ داروں کو کہا جائے گا کہ کھاؤ پیو ایسے اعمال کے عوض میں جو تم نے ایسے ایام میں کئے تھے۔ جن میں تم کو کچھ کام کرنا نہیں پڑا۔ بلکہ یوں ہی خالی بعض اشیاء کے تارک رہتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ ترک اکل میں کچھ کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ کھانے میں کام کرنا پڑتا ہے۔

مگر ایک پیر جی جو بہت کھاتے تھے ان کے نزدیک البتہ کھانا اتنا آسان تھا کہ وہ کہتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے بس منہ میں رکھا۔ اور نگل لیا، رکھا اور نگل لیا۔ لیکن یہ لوگ تو شکمی کاشتکار ہیں یا شکمی زمیندار۔ ان سے اس قوت میں بحث نہیں۔ یہاں حقیقت میں کلام ہو رہا ہے۔ اور حقیقت میں ترک اکل دشوار نہیں۔ بلکہ اکل دشوار ہے۔ بعض دفعہ کھانے سے موت آ گئی ہے۔

خود ہمارے قصبہ میں ایک قصہ ہو گیا کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میرے گھر میں باہر سے اندر ایک جنازہ آ رہا ہے وہ بڑا پریشان ہوا کہ اس کا کیا مطلب ہے اگر کوئی گھر میں مرنے والا ہے تو جنازہ گھر سے باہر جانا چاہیے۔ یہ الٹا معاملہ کیسا کہ باہر سے گھر میں جنازہ آیا۔ پھر اگلے ہی دن یہ قصہ ہوا کہ ان کے بھائی ایک ولیمہ کی دعوت میں گئے اور وہاں کھانا کھاتے ہوئے ان کے گلے میں لقمہ اٹکا جس سے سانس بند ہو گیا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ لوگ پانی لانے کو دوڑے۔ پانی کے آتے آتے ان کا کام تمام ہو گیا۔ پھر وہاں سے جنازہ گھر میں لایا گیا۔ تاکہ غسل و کفن کیا جائے اس وقت یہ معلوم ہوا کہ باہر سے جنازہ آنے کا یہ مطلب تھا۔

تو کھانے میں تو ایسے قصے بہت ہوئے ہیں کہ کھانا موت کا سبب ہو گیا اور نہ کھانا موت کا سبب

بہت کم ہوتا ہے۔ ہاں اگر عدم اکل ممتد ہو جائے تو عارض امتداد کی وجہ سے موت کا واقع ہو جانا ممکن ہے۔ فی نفسہ عدم اکل سبب موت نہیں بخلاف اکل کے کہ وہ بعض دفعہ خود سبب موت ہو جاتا ہے خواہ پھندا لگ جائے یا بدہضمی ہو جائے۔ پھر سب باتوں سے قطع نظر کر کے عقل کا فیصلہ دیکھا جائے تو عقل یہی فیصلہ کرتی ہے کہ فعل سے ترک فعل اہون ہے۔ اس لئے اکل دشوار ہے اور ترک اکل سہل ہے۔

عقل کے اس فیصلہ میں شریعت نے بھی موافقت کی ہے کہ ایک سہل عمل کو عبادت مشروعہ کر دیا۔ مگر اس کے بعد تعجیل افطار و تاخیر سحور کے بارے میں شریعت نے عقل کے فتویٰ سے موافقت نہیں کی۔ کیونکہ اس میں عقل سے فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ تو یہ ہوتا کہ فطر میں تاخیر اور سحور میں تعجیل افضل ہے تا کہ ترک اکل کا زمانہ زیادہ ہو جس سے مجاہدہ کا تحقق کامل ہوگا۔ اور عقل تعجیل فطر و تاخیر سحور کو بے صبری اور حرص پر محمول کرتی کہ جب دن بھر روزہ سے رہے تو ایسی بھی کیا بے صبری ہے کہ غروب شمس کے ساتھ ہی کھانے پر پڑ گئے۔ ذرا وقار و سکون سے اطمینان کے ساتھ افطار کرنا چاہیے مگر شریعت خود ہی بدوں کسی کے پوچھے فتویٰ دیتی ہے کہ تعجیل فطر و تاخیر سحور میں ثواب زیادہ ہے۔

ہائے اس پر کوئی وجد نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔ کیا یہ خدا کے ذمہ ہے کہ وہ آپ کے جذبات کی رعایت کریں آخر خدا کے ذمہ یہ بات کیوں ہے؟ آپ نے کیا کمال کیا ہے جس کی وجہ سے آپ پر یہ عنایات کی جائیں۔ اگر تم اپنے کمالات بیان بھی کرو گے تو وہ سب کے سب خدا ہی کے عطا کردہ نکلیں گے۔ کہیں تو ہارو گے کیونکہ سلسلہ غیر متناہی محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کو خود ہی آپ سے محبت ہے آپ کا کوئی کمال اس کو مقتضی نہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

مانبودیم وتقاضا مانہ بود ☆ لطف تو ناگفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف و کرم ہمارے بے کہے ہوئے کو سنتا تھا)

ماہ رمضان اور زیادتی رزق

صاحبو! اگر کوئی عاقل فلسفی روزہ کو مشروع کرتا تو یقیناً وہ یہی حکم کرتا کہ جس حکمت کے لئے روزہ مشروع ہو رہا ہے۔ اس کا مقتضا یہی ہے کہ افطار میں تاخیر اور سحر میں تعجیل کی جائے تا کہ مجاہدہ کامل ہو۔ مگر شریعت اس کو منظور نہیں کرتی۔ وہ تعجیل افطار و تاخیر سحور ہی کو کمال صوم بتلاتی ہے۔ نیز فلسفی یہ بھی کہتا کہ سحری میں کم کھانا چاہیے ورنہ مجاہدہ ناقص ہوگا۔ وہ روزہ ہی کیا ہوا جس کے لئے

رات کوخوب پیٹ بھرلیا گیا۔ مگر شریعت کہتی ہے کہ کم کھانا افضل نہیں ہے اور جن صوفیا نے کم کھانے کو افضل کہا ہے یہ ان کی رائے ہے۔ اور ہر رائے قبول نہیں ہوا کرتی۔ اور میں بے تامل کہتا ہوں کہ ان حضرات کی اس رائے کا منشا محض اتباع عقل ہے اتباع نقل نہیں۔ ورنہ کوئی حدیث دکھلائی جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ بھر کے کھانے کو مضر صوم بتلایا ہو۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ حدیث کے اشارہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں مومن کو زیادہ کھانا چاہیے۔ اور میں اشارہ کا لفظ بھی احتیاطاً کہہ رہا ہوں ورنہ حدیث تو قریب بصراحت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

شهر یزاد فیه رزق المؤمن۔ کہ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے اب بتلاؤ یہ زیادت کھانے کے واسطے ہے یا دھرنے کے واسطے ہے۔ جب حق تعالیٰ اس مہینہ میں رزق بڑھاتے ہیں تو چاہیے کہ اس مہینہ میں اور مہینوں سے زیادہ کھایا جائے اور فرماتے ہیں:

هو شهر المواساة[1] کہ یہ مہینہ ہمدردی کا ہے

مشاہدہ ہے کہ رمضان میں خود بخود دل تقاضا کرتا ہے کہ احباب اور دوستوں کو بھی کچھ بھیجا جائے جس کے گھر میں کوئی نئی چیز پکتی ہے وہ افطار کے وقت اپنے دوستوں کو بھی کھلانا چاہتا ہے۔ کسی کے ہاں سے پھلکیاں آتی ہیں۔ کوئی جلیبی بھیجتا ہے کوئی کباب بھیجتا ہے کوئی پھل اور میوہ جات بھیجتا ہے۔

اب بتلاؤ کیا ان نعمتوں کو نہ کھائیں؟ جب خدا تعالیٰ نے یہ چیزیں کھانے کے واسطے بھیجی ہیں ہم کسی سے مانگنے نہیں گئے تھے۔ تو یہ صاف اس کی علامت ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہی ہمارے واسطے **من حیث لا یحتسب** بھیجی ہیں تو ان کو نہ کھائیں اور اٹھا کر دھر دیں۔ حضرت اگر کوئی بادشاہ آپ کو امرود دے اور آپ یہ کہیں کہ میں تو زاہد ہوں میوے نہیں کھایا کرتا تو گردن نپے گی۔ ایسے ہی یہاں زہد بھگارنا اور حق تعالیٰ کی بھیجی ہوئی نعمتوں کو نہ کھانا خلاف ادب ہوگا۔

اسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی حقیقت واضح ہوگئی جو حدیث میں ہے۔ **کان یاکل اکلا ذریعا**۔ کہ آپ جلدی جلدی کھایا کرتے تھے۔ اس کو بعض بدتہذیب لوگوں نے خلاف تہذیب کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس بدذات نے تو صرف اس فعل ہی کو دیکھا ہے یعنی جلدی کھانے کو۔ اور اس ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کھانا دینے والے پر پہنچی ہوئی تھی۔ اگر یہ شخص اس ذات مقدس کے مشاہدہ کے لاکھویں حصہ کے برابر بھی معظم ذات کو دیکھ لیتا تو یہ

---

[1] الترغیب والترہیب للمنذری: ۲: ۹۴

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تیز کھاتا۔

بتلاؤ اگر ایک بادشاہ تم کو امرود دے تو کیا اس کو وقار اور متانت سے اس طرح کھاؤ گے جس سے استغناء ظاہر ہو یا فوراً ہی شوق ورغبت ظاہر کر کے جلدی جلدی کھاؤ گے اسی کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے اس جملہ میں کہ **اکل کما یاکل العبد**[1] یعنی میں تو اس طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھایا کرتا ہے

صاحبو! جو لوگ وقار و متانت وتکبر سے کھانا کھاتے ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہیں ان پر کھانے کے وقت ذات حق کی تجلی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ استغناء کے ساتھ کھاتے ہیں اور جس پر ذات حق کی تجلی ہوگی وہ یقیناً سراپا احتیاج اور سراپا غلام بن کر کھانا کھائے گا۔ اس کے ہاتھ سے اگر لقمہ گر پڑے گا تو فوراً صاف کر کے کھالے گا اور ہرگز اس کو پڑا ہوا نہیں چھوڑے گا۔

دیکھو! اگر بادشاہ نے تم کو ایک پھل دیا ہو اور تم اس کے سامنے قاشیں کر کے کھا رہے ہو اور ایک قاش زمین پر گر جائے تو کیا تم اس کو زمین پر ہی چھوڑ دو گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ عطیہ شاہی کی عظمت کر کے فوراً زمین سے اٹھا کر کھالو گے۔ یہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کھانا کھا رہے تھے اس وقت ایک عجمی رئیس بھی آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ آپؓ کے ہاتھ سے ایک لقمہ گر گیا تو آپؓ نے اس کو صاف کر کے کھالیا۔ خادم نے کہا کہ یہ عجمی لوگ اس فعل کو معیوب سمجھتے ہیں ان کے سامنے یہ فعل مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تو حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا **اترک سنة حبیبی لھولاء الحمقاء** کہ کیا ان بے وقوفوں کی وجہ سے میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ چھوڑ دوں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

ایک دفعہ خود مجھے یہ قصہ پیش آیا کہ ریل میں ایک مسلمان رئیس میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے ان کے ہاتھ سے ایک بوٹی نیچے کے تختہ پر گر پڑی۔ تو ان حضرت نے اس کو بوٹ سے بنچ کے نیچے کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اور میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا اسی بوٹی کو اٹھا کر پانی سے دھو لیجئے اور دھو کر مجھے دیجئے میں اس کو کھاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے اس کو دھویا اور دھو کر کہنے لگے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کو کھالے تو اجازت ہے۔ میں نے کہا ہاں اجازت ہے۔ تو خواجہ صاحب نے خود کھالی۔ وہ رئیس بعد میں کہتے تھے کہ اس عملی تنبیہ کا میرے اوپر

---

[1] کنز العمال: ۴۰۷۰۷، ۴۰۷۰۸، تفسیر البغوی ۵: ۹۵

ایسا اثر ہوا کہ میں کٹ کٹ گیا اور اس دن سے میں نے کبھی گرے ہوئے لقمہ کو زمین پر نہیں چھوڑا بلکہ صاف کر کے کھالیتا ہوں۔

تو حضرت یہ زہد آپکو ہی مبارک ہو کہ حق تعالیٰ تو رمضان میں قسم قسم کی نعمتیں بھیجیں اور طرح طرح کے کھانے بھجوائیں اور آپ کہیں میں تو زاہد ہوں۔ میں تو زیادہ نہیں کھا سکتا۔ ہمارا مذاق تو یہ ہے

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ☆ خاک برفرق قناعت بعدازیں

جب حق تعالیٰ رمضان میں رزق بڑھاتے ہیں اور نئے نئے کھانے بھجواتے ہیں تو ہم کو بھی اپنی خوراک بڑھانا چاہیے اور میں انشراح کیساتھ کہتا ہوں کہ پیٹ بھر کر کھانا سحری میں ہرگز مضر صوم نہیں اور جن صوفیانے اس کو مبطل روح صوم کیا ہے وہ اس قول میں فلسفیت کے رنگ سے مغلوب ہو گئے ہیں۔

بہر حال یہ دوسری آسانی ہے روزہ میں کہ شریعت نے دن بھر کھانا پینا بند کر کے یہ نہیں چاہا کہ ترک اکل ممتد ہو۔ بلکہ تعجیل افطار کو مستحب کہا کہ غروب ہوتے ہی افطار کردو۔ اب دیر نہ لگاؤ اور سحری میں تاخیر کو مستحب کہا کہ جتنا وقت کھانے کا دیا گیا ہے اس کو پوری طرح وصول کرو اور سحری دیر کر کے کھاؤ تا کہ ترک اکل ممتد نہ ہو پھر اس کی بھی اجازت دی ہے کہ سحری میں خوب کھاؤ کم کھانے کی ضرورت نہیں اور کمال یہ ہے کہ روزہ اس پر بھی مجاہدہ ہے کہ جو مقصود مجاہدہ سے ہے وہ اب بھی حاصل ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اتنی آسانیوں کے بعد یہ مجاہدہ سہل ہوگا نہ کہ دشوار۔

اب ان احکام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو راحت ہی دینا چاہتے ہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ جب وہ روزہ میں اتنی آسانیاں کر رہے ہیں جس سے مقصود ہی مجاہدہ ہے تو اور احکام میں تو جن میں شان مجاہدہ بھی غالب نہیں ہے کس قدر آسانیاں ہوں گی۔

آخر یہ حق تعالیٰ کی محبت نہیں تو اور کیا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر تو اور عبادات روزہ سے آسان ہو گئیں۔ اصل یہ ہے کہ حیثیات آسانی کی مختلف ہیں اور میرا مقصود اس تقریر سے صرف اس وسوسہ کا دفع کرنا ہے کہ ان کو سب سے مشکل سمجھتے ہیں اور یہی وسوسہ دفع صوم ہو جاتا ہے اور عبادات کا من کل الوجوہ سہل ثابت کرنا مقصود نہیں۔

مصائب کی حکمتیں

اس پر شاید تم یہ کہو کہ احکام تشریعیہ میں تو بے شک ایسی ہی آسانیاں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ہم سے بہت محبت ہے مگر تکوینیات میں تو یہ حالت ہے کہ کبھی بیماری ہے کبھی پھوڑا

پھنسی نکل رہا ہے۔کبھی طاعون ہے۔کبھی ہیضہ ہے۔کبھی اولاد کا صدمہ دیتے ہیں کبھی بیوی اور ماں، بہن کے مرنے کا۔ کسی کے بدن میں کیڑے پڑ گئے ہیں کسی کو دمہ یا سل اور دق کی تکلیف دی جا رہی ہے۔ محبت تو جب ہوتی کہ تکالیف تکوینیہ بھی نہ آیا کرتیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی محبت ہی ہے مگر اس میں ماں کی محبت کا رنگ نہیں ہے۔ بلکہ باپ کی محبت کا رنگ ہے باپ کی محبت یہی ہے کہ جب لڑکا شرارت کرے تو چار ادھر لگائے اور چار ادھر۔ حضرات ان مصائب سے حق تعالیٰ ہم کو مہذب بنانا چاہتے ہیں۔ تا کہ گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ ہم لوگ اپنے اعمال بد سے اپنے آپ کو تباہ کرنے میں کسر نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ ان سزاؤں سے ہم کو راستہ پر لگا دیتے ہیں اور دماغ درست کر دیتے ہیں۔

پھر حدیث میں آتا ہے کہ دنیا کے مصائب سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں ہے کہ بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کو کوئی خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجہ عالیہ کو پالیتا ہے۔

اب بتلایئے یہ مصائب و متاعب تکوینیہ محبت حق سے ناشی ہیں یا نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں اہل مصائب کو ثواب کثیر ملتا ہوا دیکھ کر اہل نعم کہیں گے۔ یالیت جلودنا قرضت بالمقاریض فنعطی مثل ما اوتوا (اوکما قال)۔ کہ اے کاش! ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں تا کہ آج ہم کو بھی یہ درجات ملتے تو۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ تو آپ کو سلطنت اور بادشاہت دینا چاہتے ہیں اور آپ روتے ہیں کہ ہائے مار دیا ہائے ذبح کر دیا۔ آپ کی وہی مثال ہے جیسے ایک چمار کا لڑکا بگولے میں لپٹ کر اڑ گیا۔ اور ایک راجہ کے محل کی چھت پر جا پڑا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ آدمی آسمان سے کیونکر آ گرا۔ راجہ نے پنڈتوں کو بلایا۔ انہوں نے آ کر کہہ دیا کہ یہ غیبی انسان ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کو بھیجا ہے اس کی تعظیم کرنا چاہیے۔ یہ سن کر راجہ نے کہا کہ پھر میری لڑکی جوان ہو گئی ہے اور اس کے لئے بہت جگہ سے پیغام آ رہے ہیں۔ میں نے کسی جگہ کو منظور نہیں کیا۔ میری رائے یہ ہے کہ اسی آسمانی لڑکے کو شاہی حمام میں لے جا کر اچھی طرح غسل دیا جائے اور نہایت قیمتی لباس پہنا کر لایا جائے۔ اس کو جو حمام میں لے جانے لگے تو اس نے رونا چلانا شروع کیا کہ مجھے کہاں لے جاتے ہو اور جب

حمام میں اس پر گرم گرم پانی ڈالا گیا تو اور زیادہ چلایا پھر لباس قیمتی لایا گیا تو بہت ہی چیخا اور کسی طرح خاموش نہ ہوا۔ اطباء کی رائے ہوئی کہ شہزادی کو اس کے سامنے لایا جائے شاید اس کو دیکھ کر مانوس ہو شہزادی سامنے آئی تو اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں اور پہلے سے زیادہ چلانے لگا۔

پھر وزراء کی رائے یہ ہوئی کہ یہ آسمان سے ابھی تازہ آیا ہے۔ زمین کے آدمیوں سے اس کو وحشت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب یہ ہم سے مانوس ہو جائے گا۔ پھر شادی کا انتظام کیا جائے گا۔ آخر کار اسے چھوڑ دیا گیا تو وہ سیدھا اپنے وطن میں اپنی ماں کے پاس پہنچا اور رو رو کر سارا قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ میں اس طرح اڑ گیا۔ پھر مجھے بہت سے آدمی پکڑ کر لے گئے اور سب نے مجھے طرح طرح سے مارنا چاہا میرے اوپر تتا تتا یعنی (گرم گرم) پانی ڈالا میں جب بھی نہ مرا میا۔ پھر میرے سامنے دہکتے دہکتے انگارے لائے (یہ جواہرات کی گت بنائی۔ میں جب بھی نہ مرا میا۔ پھر میرے سامنے ایک ڈائن کو لائے تا کہ مجھے کھالے۔ (یہ شہزادی کی گت بنائی)۔ میں جب بھی نہ مرا میا۔

تو جیسے اس احمق نے ساری قدر و منزلت اور عروج و راحت کو مصیبت اور سامان موت سمجھا۔ ایسا ہی ہم لوگ حق تعالیٰ کے امتحانات وابتلاءات کو مصیبت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ حقیقت میں غایت عروج و راحت کا سبب ہیں۔ اور یہ حکمتیں تو آخرت میں جا کر منکشف ہوں گی۔

حضرات! دنیا میں بھی عارفین کو ان مصائب کی حکمتیں بکثرت منکشف ہوتی ہیں۔ جن سے وہ مصائب ہی نہیں رہتے۔ بلکہ نعم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک صحابیؓ کا پاؤں کسی صدمہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ ان کو اس کا کچھ غم تھا کچھ دنوں کے بعد حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان لڑائی چھڑی اور دونوں طرف کے لوگوں نے ان صحابیؓ کو اپنا شریک کرنا چاہا تو انہوں نے دونوں سے عذر کر دیا کہ میں تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوں اس وقت وہ اپنی اس بیماری پر خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے

الحمد لله الذی طهر یدی من هذه الدماء باذهاب رجلی.

''کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے پیر لے کر میرے ہاتھ اس محترم خون سے پاک رکھے۔''

اور میں سچ کہتا ہوں کہ اگر انسان مصائب و بلیات کی حکمتیں سوچا کرے تو اس کو اکثر مصائب کی حکمتیں دنیا ہی میں منکشف ہو جائیں گے۔ پھر وہ مصائب ہی نہ رہیں گے بلکہ نعمتیں بن جائیں گی۔

سہل احکام

بہر حال تکوینی صعوبتوں کی حکمتیں تو نظری بھی ہیں۔ مگر تشریعی سہولتوں کی حکمتیں تو اس قدر بدیہی بلکہ حسی ہیں کہ ان میں بجز محبت حق کے دوسرا خیال ہی نہیں کیا۔ بدوں محبت کے احکام بھی سہل ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں!

پھر افسوس ہے کہ ایک طبیب پر اعتماد کر کے تو آپ کو مسہل اور آپریشن بھی گوارا ہے اور خدا پر اعتماد کر کے یہ سہل سہل احکام بجالانا بھی گوارا نہیں۔ بلکہ ان میں سوال کیا جاتا ہے کہ اس حکم میں کیا مصلحت ہے اور فلاں حکم کی کیا حکمت ہے اور روزہ کی کیا فلاسفی ہے نہ معلوم یہ فلاسفی کون سا لغت ہے۔ اگر تم کو اعتماد نہیں نہ ہو حق تعالیٰ کو تو تم سے محبت ہے اس لئے وہ تمہاری اصلاح و تکمیل کے واسطے برابر احکام بیان فرماتے رہیں گے اور بہت سے احکام کی حکمت بھی نہیں بتلائیں گے۔ کیونکہ شفیق باپ اپنے بچہ کو حکمتیں نہیں بتلایا کرتا۔ بلکہ جس کام میں اس کی مصلحت دیکھتا ہے اس کا امر کیا کرتا ہے چاہے بیٹا حکمت سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر وہ سعادت مند ہے اور باپ کے احکام کی تعمیل کرنے لگا تو عمل کے بعد اس کو خود ہی ان احکام کے مصالح و حکم معلوم ہو جائیں گے۔

اسی طرح احکام شرعیہ کی مصالح و حکم دریافت کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ پہلے حکمتیں معلوم کرو پھر عمل کرو۔ بلکہ تم عمل شروع کر دو۔ عمل ہی سے تم کو حکمتوں کا علم بھی ہو جائے گا۔

پس حق تعالیٰ کی ایک تو بڑی عنایت یہ ہے کہ ہمارے واسطے سہل احکام تجویز کئے ہیں۔ پھر عنایت پر عنایت یہ ہے کہ ان سہل احکام میں بھی اگر ہم پر کچھ گرانی تھی تو اس گرانی کے بھی رفع کرنے کا اہتمام فرما دیا ہے اور تسہیل در تسہیل کر دی ہے چنانچہ نماز کے متعلق ارشاد ہے وانھا لکبیرۃ کہ بے شک نماز گراں ہے اس میں محض بندوں کے جذبات کی رعایت ہے کہ جس آسان بات کو وہ گراں سمجھتے تھے حق تعالیٰ نے بھی ان کی رعایت سے اس کو گراں تسلیم کر لیا ہے۔ ورنہ ان کو یہ بھی حق تھا کہ ہمارے جذبات کی رعایت نہ فرماتے۔ بلکہ حقیقت کو واضح کر کے ہمارے اس خیال کی غلطی ظاہر کر دیتے کہ تم جو نماز کو گراں کہتے ہو غلط ہے۔

مگر قربان جایئے ان کی رحمت کے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ یوں فرمایا کہ بھائی ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نماز گراں ہے۔ مگر سب کو گراں نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں پر آسان بھی ہے آگے ان لوگوں کی صفات مذکور ہیں جن میں ہم کو تعلیم دی گئی ہے کہ اگر تم بھی ان صفات کو حاصل

کرلو گے تو تم پر بھی نماز گراں نہ رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں **الا علی الخاشعین الذین یظنون انھم ملقوا ربھم وانھم الیہ راجعون**۔ اس میں اس گرانی کی تسہیل ہے جس کا حاصل یہ ہے خشوع حاصل ہو جانے کے بعد نماز گراں نہ رہے گی۔ اور تحصیل خشوع کا طریقہ یہ بتلایا کہ تم لقاء رب کا استحضار رکھو اور موت کا دھیان رکھو اس سے خشوع حاصل ہو جائیگا۔

اسی طرح روزہ کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ فی نفسہٖ سہل ہے۔ مگر حق تعالیٰ پھر بھی عنوان حکم ہی میں اس کی تسہیل کا اہتمام فرماتے ہیں۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔

''کہ تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔''

اس عنوان میں تسہیل صوم کا پورا اہتمام ہے کہ روزہ کا حکم سن کر یوں مرے جاتے ہو۔ یہ کوئی تمہارے ہی واسطے مشروع نہیں ہوا۔ بلکہ تم سے پہلوں پر فرض تھا۔ آگے انبیاء کی تسہیل ملاحظہ ہو کہ نمازیں اول اول پچاس فرض ہوئی تھیں۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ پچاس وقت کی فرض ہوئی تھیں یا پچاس رکعتیں تھیں یا پچاس شفعات تھے اس کی تفصیل روایات میں نہیں ہے اس لئے سب احتمالات جاری ہیں کہ پچاس وقت کی نمازیں فرض ہوئی ہوں یا پچاس رکعات یا پچاس شفعات خیر! جو کچھ بھی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پچاس نمازوں کا حکم لے کر واپس ہوئے تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپؐ پر اور آپ کی امت پر کیا فرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پچاس نمازیں فرض فرمائیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے محمد! آپؐ کی امت ضعیف ہے میں نے بنی اسرائیل کا تجربہ کیا ہے جو کہ آپ کی امت سے قوی تھے وہ اس سے بھی آسان احکام کو نہ نباہ سکے۔ آپ حق تعالیٰ سے تخفیف کی درخواست کیجئے۔

حضرت موسیٰ کے افسوس کی حقیقت

یہاں سے ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ قصہ معراج میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت عروج میں موسیٰ علیہ السلام پر گزرے اور سلام وغیرہ کر کے آگے بڑھے تو موسیٰ علیہ السلام رونے لگے کسی نے پوچھا کہ آپؑ کیوں روتے ہیں تو فرمایا کہ میں اسلئے روتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں اور یہ میرے سامنے جوان لڑکے ہیں مگر ان کی امت جنت میں میری امت سے زیادہ داخل ہوگی۔

اس پر بعض جہلاء کو شبہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہوا یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کی کوتاہی پر حسرت وافسوس ہوا کہ انہوں نے میری ویسی اطاعت نہ کی جیسی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریگی (**قلت او بکی تحسرا علی مافات منه من رؤیته تعالیٰ مع تمنیه ایاها وتشرف بها محمد صلی الله علیه وسلم فی الاسراء والله تعالیٰ اعلم ۱۲**) اوران جہلاء کے خیال کی تردید خود واقعہ معراج ہی میں موسیٰ علیہ السلام کے اس دوسرے واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ اگر معاذ اللہ! ان کو حسد ہوا ہوتا تو وہ تخفیف کی درخواست کیلئے کیوں کہتے۔ بلکہ وہ پچاس کے حکم سے خوش ہوتے کہ اچھا ہے ان کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہوں تاکہ وہ نباہ نہ سکیں اور جنت میں زیادہ نہ پہنچیں۔ مگر نہیں انہوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال پر نہایت شفقت فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار تخفیف کی درخواست کرائی۔ یہاں تک کہ اخیر میں پانچ نمازیں رہ گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اس میں بھی تخفیف کی درخواست کی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس میں بار بار مراجعت کرنے سے شرما گیا ہوں اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی

امضیت فریضتی وخففت عن عبادی هن خمس وهی خمسون

کہ میں نے اپنا فریضہ بھی پورا کر دیا اور بندوں سے تخفیف بھی کر دی یہ پانچ نمازیں ہیں اور حقیقت میں یہ پچاس ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بمنزلہ دس نمازوں کے ہے۔

اسی وقت سے یہ قاعدہ مقرر ہوا ہے کہ ایک حسنہ (اس میں تنبیہ تھی ایک عالم کی غلطی پر جنہوں نے اسی باب میں اپنے وعظ میں کہا تھا کہ رمضان میں ایک فرض شریف ستر فرضوں کے برابر ہے اور ایک نیکی دس گنی ہوتی ہے اور پانچ اوقات کی نماز پچاس نمازوں کے برابر معراج میں ہو چکی ہے تو پچاس کو پچاس میں پھر ستر میں ضرب دیا تو ایک لاکھ پچاس ہزار حاصل ہوئے پھر اس کو جماعت کے ثواب میں ضرب کیا تھا اور کئی لاکھ تک پہنچایا) پر دس کا ثواب ملے گا پہلے یہ قاعدہ نہ تھا جن صاحبوں نے **الحسنة بعشر امثالها**[۱] کی تضعیف کو تضعیف لیلۃ المعراج سے علیحدہ سمجھا ہے یعنی یہ سمجھا کہ لیلۃ المعراج میں جو پانچ نمازوں پر پچاس کا وعدہ ہوا ہے۔ ایک تضعیف تو یہ ہے

[۱] سنن النسائی کتاب الصیام ب: ۷۵، مسند أحمد ۲: ۲۳۴، ۴۱، سنن الدارمی ۲: ۳۱۴، کنز العمال ۲: ۳۹۸

کہ پھر ان پچاس میں عشر امثال کی تضعیف الگ ہوگی۔انہوں نے صحیح نہیں سمجھا۔

تو دیکھئے انبیاء علیہم السلام کی بھی تسہیل وتخفیف کا کتنا اہتمام ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی محبت کا اثر ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام میں جو شفقت ورحمت ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی شفقت ورحمت کا ظل ہے۔

روزوں میں تخفیف

اب یہاں سے ایک بات اور سمجھئے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے نمازوں میں تو تخفیف کی درخواست کی اور اس وقت آپ کو معلوم ہوگیا کہ میری امت پہلے لوگوں سے کمزور ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس سے تخفیف کی درخواست کر کے پانچ کرالیں لیکن روزہ کا عدد تیس سے تین نہیں کرایا۔

اس سے صاف میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یعنی اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا کچھ دشوار نہیں ورنہ ایک تجربہ ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بھی تخفیف کی ضرور درخواست کرتے اور تیس دن کے تین کرالیتے اور اگر عدد بھی کم نہ کراتے تو کم از کم کیفیت ہی میں تخفیف کرالیتے۔اس طرح سے کہ رمضان کے روزہ کو مشکل کشا علیؓ کے روزہ جیسا بعض جہلا رکھتے ہیں جو صبح سے دوپہر کو ہوتا ہے۔خیر غنیمت ہے کہ ان جاہلوں نے حضرت علیؓ کے روزہ کو خدا کے روزہ کے برابر نہیں کیا اس کے علاوہ ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ حضرت علیؓ کا روزہ کسی بندہ ہی کے کہنے سے کھلتا ہے خود نہیں کھول سکتے چنانچہ دوپہر کو ایسے روزہ دار تیری میری خوشامد کیا کرتے ہیں کہ اللہ کے واسطے تم زبان سے کہہ دو کہ روزہ کھول دے اور مذاقی لوگ کچھ دیر تک ان کو تنگ کیا کرتے ہیں کہ ہم تو نہیں کہتے۔

واقعی ان بدعات کا بدعت وجہل ہونا خود ان کی حالت سے ظاہر ہے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ دوسرے کے کہنے سے روزہ کھولا جائے اور کہنا اس طرح کا جس میں خوشامدیں کی جائیں اور زبردستی دوسرے سے کہلوایا جائے۔

غرض! روزہ کے کم منفصل یعنی عدد میں یا اس کی کم متصل یعنی مقدار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تخفیف نہ کرانا باوجودیکہ نماز میں آپ نے بہت تخفیف کرائی ہے اس بات کی مستقل دلیل ہے کہ صبح سے شام تک روزہ رکھنا اور سال بھر میں ایک مہینہ کے روزے رکھنا کچھ بھی دشوار نہیں۔ بلکہ آسان ہے پس اس قسم کی تخفیف تو روزہ میں نہیں ہوئی۔البتہ اور تغیرات اور تبدیلیاں ہوئی

ہیں۔ مثلاً ابتدائے اسلام میں سو جانے کے بعد سحری کھانا حرام تھا۔ چاہے کوئی عشاء کے بعد متصلاً ہی سو جائے بعد میں اس کو منسوخ کیا گیا اور صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت دی گئی۔

ایک سہولت روزہ میں یہ رکھی گئی کہ نماز میں تو جمع صوری سفر کی حالت میں جائز ہے اور سال میں ایک دن جمع حقیقی بھی جائز ہے عرفات ومزدلفہ میں مگر روزہ کے اندر جمع نہیں یعنی دو روزوں کے درمیان افطار بھی نہ ہو۔ یہ وصال کہلاتا ہے سو یہ امت پر حرام ہے۔

تو یہ آسانیاں ہیں روزہ میں۔ اس کے بعد غور کیجئے کہ عرف یہ ہے اور آج کل عرفیات کو عقلیات کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہم بھی بطور حجۃ الزامیہ کے اس قاعدہ کو برتتے ہیں کہ اگر کوئی محبوب یا حاکم اپنے محب اور محکوم کو کوئی بہت ہی آسان کام بتلائے تو اس کی تعمیل نہ کرنا سخت عتاب کا سبب ہوتا ہے کیونکہ مشکل اور دشوار کام میں سستی ہونا تو ایک درجہ میں عذر بھی ہے لیکن سہل اور آسان کام میں سستی کرنے کا کیا عذر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا

اس قاعدہ پر غور کرکے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے روزے نہ رکھنا سخت عتاب وجرم کا سبب ہے اسی لئے حدیث شریف میں ہے: **رغم انف رجل ذکرت عنده فلم یصل علی رغم انف رجل ادرک رمضان فلم یغفرله رغم انف رجل ادرک والده اواحد هما الکبر عنده فلم ید خل الجنة**[1] (او کماقال) (ترجمہ وتشریح آگے خود وعظ میں ہے)

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناک رگڑ جائے یہ ذلیل ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی شخص پر بددعا کر سکتے ہیں جس کا جرم بہت سنگین ہو اور ان تینوں شخصوں کا جرم اسلئے سنگین ہے کہ انہوں نے نہایت سہل اور آسان کام میں کوتاہی کی ہے۔

اس پر شاید کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے تو ہم کو بے فکری ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے دعا کر رکھی ہے کہ جس کو میں بددعا دوں اس کے حق میں میری بددعا کو قربت وصلوٰۃ وزکوٰۃ ورحمت بنادیا جائے تو آپ کی بددعا ہی دعا ہوکر لگتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گو آپ کی بددعا دعا ہوکر لگے مگر اس سے بے فکری نہایت بھدا پن ہے کیونکہ یقیناً بددعا غصہ میں ہوا کرتی ہے تو جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے وہ حضور صلی

---

[1] سنن الترمذی: ۳۵۴۵، مسند أحمد ۲: ۲۵۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۹۲۷۵

اللہ علیہ وسلم کے غضب وغصہ کا محل ضرور ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ناراض ہوں۔ یقیناً کوئی عاشق اپنے محبوب کی ناراضی اور غصہ کا تحمل نہیں کرسکتا گو اس کا انجام سزا بھی نہ ہو۔ بلکہ عشق کا مقتضی تو یہ ہے کہ سزا گوارا ہوتی ہے مگر محبوب کا غصہ اور ناراض ہونا گوارا نہیں ہوتا۔

دوسرے آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ جس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ میری بددعا کو دعا بنادیا جائے وہ کون سی بددعا کے متعلق ہے وہ خاص ہے۔ اس بددعا کے ساتھ جو بطور بشریت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل جائے ہر بددعا کے لئے یہ درخواست عام نہیں اور اس کا قرینہ خود اس حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **اللھم انما انابشر اغضب کمایغضبون فایما عبدا ذیتہ او شتمتہ اولعنۃ فاجعلھا لہ زکوۃ ورحمۃ وقربۃ تقربہ بھاالیک**[1] (اے اللہ میں بشر ہی ہوں غصہ ہوتا ہوں جیسے بندہ غصہ کرتے ہیں پس جس بندہ کو میں تکلیف پہنچاؤں یا اُس کو برا کہوں یا اس پر لعنت کروں تو اسکو زکوٰۃ اور رحمت اور قربت اس کیلئے کردیجئے تاکہ اسکے ذریعہ سے وہ آپ کا قرب حاصل کرے)

اس میں اول ہی لفظ انما انا بشر موجود ہے جو اس کا قرینہ ہے کہ اس کے بعد جو مضمون ہے وہ کسی ایسے امر کے متعلق ہے جس کا منشا بشریت ہے ورنہ یہ لفظ فضول ہوگا۔ پس جو بددعا تشریع سے ناشی ہو اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ بھی زکوۃ ورحمت وقربت ہو اور حدیث رغم انف رجل الخ میں جو بددعا ہے وہ بشریت کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بطور تشریع سے ہے کیونکہ بشریت کے طور پر جو بددعا ہوتی ہے وہ کسی معین شخص یا معین جماعت پر ہوا کرتی ہے جب کہ اس کی طرف سے کوئی امر ناگوار ظاہر ہوا ہو۔ اور اس حدیث میں عام الفاظ کے ساتھ بددعا ہے۔

نیز اس کا سبب ورود سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بددعا کی ہے اس وقت کسی کی طرف سے کوئی امر ناگوار پیش نہ آیا تھا۔ بلکہ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھنے کے لئے منبر پر جارہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درجہ پر قدم رکھا فرمایا آمین۔ پھر دوسرے درجہ پر پیر رکھ کر فرمایا آمین۔ پھر تیسرے درجہ پر تشریف فرما ہو کر فرمایا آمین۔ صحابہؓ کو حیرت ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آمین آمین تین مرتبہ

---

[1] المغنی عن حمل الأسفار للعراقی ۳:۱۶۷، إتحاف السادة المتقین ۸:۱۷

کس بات پر فرما رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ جب میں نے منبر کے ایک درجہ پر پیر رکھا تو انہوں نے کہا: **رغم انف رجل ذکرت عندہٗ فلم یصل علیک**[1] یعنی اس شخص کی ناک رگڑ جائے اور وہ ذلیل وخوار ہو جائے جس کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجے۔

میں نے کہا آمین۔ دوسرے درجہ پر میں نے پیر رکھا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا

رغم انف رجل ادرک رمضان ولم یغفرلہ (سنن الترمذی: ۳۵۴۵)

یعنی وہ شخص بھی ذلیل وخوار ہو جائے جس نے رمضان کو پایا اور سارا رمضان گزر گیا اور اسنے اپنی مغفرت نہ کرائی۔

میں نے کہا آمین۔ تیسرے درجہ پر میں پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا: **رغم انف رجل ادرک والدہٗ اواحد ھماالکبر عندہٗ فلم یدخل الجنۃ.** (مسند أحمد ۲: ۳۴۶)

وہ شخص بھی ذلیل ہو جائے جس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھا ہو گیا ہو۔ اور وہ اس کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔ میں نے کہا آمین۔

تو یہ بددعا تو وہ ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر آمین فرمائی۔ اس میں یہ احتمال بالکل نہیں ہوسکتا کہ بشریت کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کی ہوگی۔ پس یہ معمولی بددعا نہیں۔ اس سے بہت ڈرنا چاہیے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بشریت کے طور پر غصہ میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے بددعا نکلے گی وہ تو بدوں قصد وارادہ کے صادر ہوگی اور ایسی بددعا وبددعا تو خود ہی قبول نہیں ہوتی۔ جس کے ساتھ قصد وارادہ متعلق نہ ہو۔ تو پھر اس کے متعلق اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کے لئے یہ درخواست کی کہ اس کو زکوۃ ورحمت قربت بنادیا جائے۔

اہل اللہ کے کلمات

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ادنیٰ غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کی زبان سے جو نکل گیا وہی ہو گیا خواہ ارادہ سے نکلا ہو یا بے

---

[1] سنن الترمذی: ۳۵۴۵، مسند أحمد ۲: ۲۵۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۹۲۷۵

ارادہ کے۔ میرے ایک دوست کہتے تھے کہ پہاڑ میں میں نے ایک جسم دیکھا کہ اس کا بعض حصہ پتھر ہے اور بعض لکڑی ہے اور بعض کچھ اور ہے اور مشہور یہ ہے کہ ایک بزرگ پہاڑ میں چلے جا رہے تھے۔ کسی چیز کی ان کو ٹھوکر لگی۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ لکڑی ہے؟ تو اس کا کچھ حصہ فوراً لکڑی ہو گیا۔ پھر فرمایا یا پتھر ہے؟ تو کچھ حصہ فوراً پتھر ہو گیا پھر فرمایا یا لوہا ہے؟ تو کچھ حصہ فوراً لوہا ہو گیا۔

غرض! جو ان کی زبان سے ہوتا گیا وہی ہوتا گیا۔ حالانکہ ان کا مقصود محض استفسار تھا۔ بددعا یا دعا مقصود نہ تھی۔ اولیاء اللہ کے عجیب عجیب حالات ہیں اور ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ بلکہ خود ایک شخص ہی کے حالات مختلف ہوتے ہیں کبھی کچھ ہے کبھی کچھ، مولانا فرماتے ہیں۔

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست ☆ ور بجہل آئیم ما زندان اوست

گر بخواب آئیم مستان وئیم ☆ ور بہ بیداری بدستان وئیم

(اگر علم تک ہماری رسائی ہو جائے تو یہ بھی ان ہی کا ایوان ہے کہ درجہ علم ان ہی کے تصرف سے عطا ہوا ہے اور اگر جہل میں مبتلا رہیں تو یہ ان ہی کا زندان ہے یعنی حق تعالیٰ کا تصرف ہے کہ جہل کے زندان سے نہیں نکلے۔ اگر سو رہیں تو ان ہی کے بے ہوش کئے ہوئے ہیں اور اگر جاگ اٹھیں تو بھی ان ہی کی گفتگو میں ہیں یعنی یہ قوت بیانیہ ان ہی کی عطا کی ہوئی ہے) اور۔

درتر دود ہر کہ او آشفتہ است ☆ حق بگوش او معما گفتہ است

(یعنی جو شخص کسی تردد میں پریشان ہو رہا ہے گویا حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ کہہ دیا ہے)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے یہ دعا کی ہے **اللھم ادر الحق معه حیث دار**[1] یہ عجیب دعا ہے یوں نہیں فرماتے کہ **اللھم ادر علیا مع الحق حیث دار** یعنی اے اللہ! علیؓ کو حق کے ساتھ کر دے بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ حق کو علیؓ کے ساتھ کر دے کہ جدھر یہ رخ کریں حق بھی ادھر ہی رخ کرے اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کبھی علیؓ سے خطا بھی ہو جائے تو اسباب ایسے پیدا کر دیئے جائیں جن سے وہ خطا ثواب ہو جائے۔ مثلاً حضرت علیؓ کسی پر عتاب کریں اور وہ اس وقت محل عتاب نہ ہو تو ان کے عتاب کے بعد اسباب ایسے پیدا ہو جائیں جن سے یہ شخص محل عتاب ہو جائے اور حضرت علیؓ کا عتاب انجام کار صحیح ہو جائے۔ مگر یہ فضیلت جزئیہ ہے کلیہ نہیں۔

رہا یہ کہ فضیلت کلیہ کسے حاصل ہے تو یہ نصوص سے معلوم کرو۔ اور مرزا مظہر جان جاناں کو حضور

---

[1] العلل المتناھیۃ ۱:۲۵۴

صلی اللہ علیہ وسلم سے بھلا کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مگر ان میں محبوبیت کی یہ شان تھی کہ جس سے آپ کو ایذا پہنچتی یا کچھ ناگواری پیش آتی تو اس پر کچھ نہ کچھ ضرور وبال آتا۔ اسی لئے آخر میں آپ نے لوگوں سے ملنا بالکل ترک کر دیا تھا بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت لوگ بہت شوق سے زیارت کو آتے ہیں اور محروم ہو کر رنجیدہ واپس جاتے ہیں تو فرمایا میں کیا کروں لوگ بدتمیزی بہت کرتے ہیں۔

مرزا مظہر جانجاں رحمہ اللہ کی لطیف المزاجی

حضرت کے نزدیک تو تقریباً سارے ہی بے تمیز تھے کیونکہ آپ نہایت لطیف المزاج تھے جیسا کہ آپ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ شاہ دہلی آپ کی زیارت کو حاضر ہوئے اتفاق سے بادشاہ کو پیاس لگی۔ اس وقت کوئی خادم موجود نہ تھا۔ بادشاہ نے خود اٹھ کر صراحی سے پانی پیا اور پانی پی کر حضرت سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو کوئی خدمت گار جناب کیلئے بھیج دوں۔ مرزا صاحبؒ نے فرمایا کہ بس معاف کیجئے وہ خدمتگار بھی آپ ہی جیسا ہوگا۔ آپ کو خود تو تمیز ہے ہی نہیں۔ پانی پی کر کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا جس سے میرے سر میں درد ہوگیا۔

اور سنیئے کہ حضرت کے ایک مرید نے ایک دفعہ عرض کیا کہ میں عرصہ سے حاضر خدمت ہوتا ہوں۔ آج تک حضرت نے مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کچھ فرمائش کریں اور میں اس کو پورا کروں۔ فرمایا میاں فرمائش کی کیا ضرورت ہے۔ تم محبت سے مل لیتے ہو جی خوش ہو جاتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ آپ فرمائش کریں فرمایا بہت اچھا مگر برا تو نہیں مانو گے؟ اس نے کہا میری کیا مجال جو حضرت کی فرمائش سے برا مانوں۔ خصوصاً جب کہ میں خود درخواست کر رہا ہوں۔ فرمایا تم سال میں دو دفعہ آیا کرتے ہو اگر ایک دفعہ آیا کرو تو اچھا ہے۔ کیونکہ تم کھاتے بہت ہو۔ تمہارا کھانا دیکھ کر میرے پیٹ میں ایسی گڑبڑ ہوتی ہے کہ بدوں مسہل لئے چین نہیں آتا۔ اور سال میں ایک بار مسہل لینا تو آسان ہے دوبار مشکل ہے۔

وہ بے چارہ مرید دم بخود رہ گیا ہوگا کہ میں نے اچھا اصرار کیا فرمائش پر۔ مگر عاشق کو تو اس سے بھی خوشی ہوتی ہے کہ محبوب کی تکلیف کا حال تو معلوم ہوگیا۔ آئندہ اگر وہ سال میں ایک بار بھی آیا ہوگا تو کھانے میں بہت احتیاط کی ہوگی۔ تو کچھ ٹھکانہ ہے اس نزاکت کا کہ زیادہ کھائے کوئی اور پیٹ میں گڑبڑ ہو مرزا صاحب کے۔

اور سنیئے! ایک دفعہ آپ صبح کو جو مجلس میں بیٹھے تو آنکھیں سرخ تھیں خدام نے وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ سردی کی وجہ سے رات نیند نہیں آئی۔ مجلس میں ایک بڑھیا بھی موجود تھی اس نے پکار کر کہا کہ بھائیو! حضرت کے لئے دولائی کا انتظام میں کروں گی۔ اور لوگ فکر نہ کریں۔ چنانچہ اس نے اس روز دولائی تیار کی اور عشاء کے بعد تیار کر کے لائی۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ میرے اوپر ڈال دو۔ وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو جو اٹھے تو آنکھیں پھر سرخ تھیں۔ خدام نے پوچھا کہ آج بھی سردی لگی فرمایا کہ نہیں سردی تو نہیں لگی مگر لحاف میں نگندے ٹیڑھے تھے اس وجہ سے طبیعت کو الجھن رہی اور نیند نہ آئی۔

بھلا رات کو اندھیرے میں نگندوں کے ٹیڑھے ہونے کا احساس بجز مرزا صاحب جیسے لطیف المزاج کے کسی کو ہوسکتا ہے نیز ایک دفعہ اور آپ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ خدام نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ چار پائی میں کان تھی (یعنی نقص مثلاً ٹیڑھا پن، اونچ نیچ)۔ مگر مرزا صاحب کو وہ اتنی معلوم ہوئی کہ رات بھر نیند نہ آئی۔

مقام مرزا مظہر جان جاناں

تو ظاہر ہے کہ ایسے لطیف المزاج کے نزدیک دنیا میں تمیز دار کتنے آدمی ہوں گے یقیناً بہت کم۔ تو آپ نے فرمایا کہ لوگ بے تمیزی بہت کرتے ہیں جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے اس شخص کو کچھ تکلیف پہنچ جاتی ہے جس کی بے تمیزی سے مجھے تکلیف پہنچی ہو اور اس بارے میں میری دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ تو اب میں نے مخلوق کی مصلحت اسی میں دیکھی کہ ان سے ملنا چھوڑ دوں۔ تو میں تو انہی کی خیر خواہی کرتا ہوں۔ مگر لوگوں کو اس خیر خواہی کی خبر نہیں۔

اللہ اکبر! کیا شان محبوبیت تھی کہ حالانکہ مرزا صاحب زبان سے کچھ کسی کیلئے بددعا نہ کرتے تھے صرف قلب کو تکلیف ہوتی تھی۔ اس پر بھی ایک گونہ گرفت ہوتی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت رحمت

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو خود ہی سمجھ لو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج دینے والے کا کیا انجام ہوگا۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا قول موجود ہے انی اری ربک یسارع فی ھواک کہ میں دیکھتی ہوں کہ حق تعالیٰ آپ کی خواہش پورا کرنے میں بہت جلدی فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ شان تھی۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ☆ می دہد یزداں مراد متقیں

(تو جو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں حق تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کرتے ہیں)

جب متقین کی یہ شان ہے تو رئیس المتقین صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہوگی خود ہی سمجھ لو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کسی کے حق میں بددعا کا نکلنا معمولی بات نہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو جو میری زبان سے نکلے وہی نہ ہو جائے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بددعاؤں کے متعلق جواز راہ بشریت غصہ میں بے ارادہ نکل جائیں حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ ان کو لوگوں کے حق میں دعا بنادیا جائے پھر غایت رحمت یہ ہے کہ یوں فرماتے ہیں کہ اس کو مدعو علیہ کے لئے زکوٰۃ بنادیجئے کہ وہ پہلے سے زیادہ آپ کا مقرب ہو جائے۔ لیکن جو بددعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریعی طور پر قصداً کی ہو اس کا یہ حکم نہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں جو بددعا ہے وہ تشریعی ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

ذلت اور عذاب جہنم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رغم انف رجل الخ یعنی ذلیل ہو جائے وہ شخص اس میں نہایت سخت بددعا ہے کیونکہ ذلت وہ چیز ہے جو عذاب جہنم سے بھی اشد ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ محشر میں جب مخلوق کھڑی کھڑی پریشان ہو جائے گی تو مومن اور کافر سب مل کر انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ کہ حق تعالیٰ سے شفاعت کردو کہ ہمارا حساب وکتاب ہو کر جلد فیصلہ ہو جائے۔ حالانکہ کفار کو اپنا معذب ہونا اور خالد فی النار اس وقت منکشف ہو جائے گا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **اسمع بهم وابصر يوم ياتوننا لكن الظالمون اليوم فى ضلل مبين.** (کیسے کچھ شنوا اور بینا ہو جائیں گے لیکن آج یہ ظالم دنیا میں کس غلطی میں ہیں)

پھر کفار فیصلہ کے متمنی کیوں ہوں گے ان کے لئے تو بظاہر میدان حشر ہی غنیمت تھا۔ مگر پھر بھی محشر میں رہنا ان کو جہنم میں رہنے سے بھی زیادہ شاق ہوگا جس کی وجہ یہ ہے کہ محشر میں رسوائی بہت سخت ہوگی۔ تو کفار اس وقت عذاب نار کو عار پر ترجیح دیں گے جب ثابت ہو گیا کہ ذلت نہایت سخت چیز ہے تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رغم انف فرمانا بڑی سخت بددعا ہے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس عمل پر یہ بددعا کی گئی ہے وہ بھی نہایت سنگین ہے۔

سنگین گناہ

مگر ظاہر میں ترک صلوٰۃ علی الرسول وترک رعایت رمضان وترک خدمت والدین۔ زنا اور سرقہ

اور سود کی طرح تو سنگین گناہ نہیں معلوم ہوتے۔ مگر ان پر ایسی بددعا وارد نہیں۔ غور کرنے سے وجہ صرف یہی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ امور اس لئے سنگین ہیں کہ ان میں نہایت سہل و آسان احکام کا ترک ہے تو جو شخص اتنے آسان کاموں میں سستی کرتا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصہ آتا ہے۔

کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ عرف یہی ہے کہ سہل و آسان کام کے ترک پر غصہ زیادہ آیا کرتا ہے۔ روزہ کی سہولت تو اوپر مذکور ہو چکی اور درود کی سہولت بھی واضح ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر صلی اللہ علیہ وسلم کہہ لینا کیا مشکل ہے۔

پھر فقہاء نے اس میں اتنی سہولت اور کر دی کہ ایک مجلس میں ایک ہی بار درود پڑھنا فرض ہے۔ اس کے بعد پچاس دفعہ بھی اگر آپ کا نام مبارک زبان پر آئے یا کان میں پڑے تو بار بار درود فرض نہیں۔ ہاں محبت کا مقتضا یہ ہے کہ ہر بار صلی اللہ علیہ وسلم کہو۔

والدین کی خدمت اسلئے آسان ہے کہ ان کی خدمت کرنے میں احتیاط سے زیادہ تو کوئی کام ہی نہیں۔ نہ تمام مال مانگا جاتا ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے ابدأ بنفسک کہ اول اپنے اوپر مال کو خرچ کر دو۔ ابدا ئین تعول۔ پھر جن کا نفقہ تمہارے ذمہ واجب ہے ان پر خرچ کرو یعنی بیوی بچوں پر۔ پھر والدین و دیگر محارم کا نفقہ ہے کہ اپنے اہل وعیال سے جو فاضل ہو اس کو والدین وغیرھم پر خرچ کرو۔ پھر بوڑھوں کی فرمائش ہی کیا ہوتی ہے۔ ایک غریب دم ہے۔ تھوڑی سی امداد میں ان کا جی خوش ہو جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی نہ کچھ زیادہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ ایک دو روٹی میں اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ تو اس کی خدمت کچھ بھی مشکل نہیں۔ کھانے پینے پہننے کا زمانہ تو جوانی میں ہے۔ بڑھاپے میں کچھ لطف بھی نہیں رہتا۔ نہ پہننے کو جی چاہے نہ کھانے کو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب کا یہ مصرع کہ ''جوانی گئی زندگانی گئی'' سن کر جوانی میں ہم کو خیال ہوتا تھا کہ جوانی کے جانے سے زندگی کیونکر جاتی رہے گی۔ آخر بڑھاپے میں بھی تو زندگی رہتی ہی ہے۔ مگر بڑھاپا آنے کے بعد مشاہدہ ہو گیا کہ حاجی صاحب نے سچ فرمایا تھا۔ واقعی ؎ ''جوانی گئی زندگانی گئی''

اب کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ بس یوں جی چاہتا ہے کہ ہر وقت پلنگ پر لیٹے رہو۔ تو بتلایئے ایسے شخص کی خدمت کیا دشوار ہے جس کا دل دنیا سے سرد ہو چکا ہے۔ یہ تو ان احکام کی وجہ سہولت الگ الگ تھی۔

سہولت اور طبیعت

اب ایک وجہ سہولت ایسی بتلاتا ہوں جو ان تینوں میں مشترک ہے۔ بلکہ تمام احکام شرعیہ میں

مشترک ہے وہ یہ کہ ان احکام ثلثہ کی بلکہ تمام احکام شرعیہ کی حالت یہ ہے کہ وہ تقاضائے طبیعت کے موافق بھی ہیں۔ صرف حدود میں طبیعت منازعت کرتی ہے۔ مگر یہ منازعت بھی بے جا ہے۔ کیونکہ ہر کام کیلئے حدود کا ہونا ضروری ہے بدوں حد کے کوئی شے مستحسن نہیں خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ حدود شرعیہ سے آگے ہلاکت ہے۔ پھر تو ان حدود میں منازعت کرنا بھی بہت ہی بے جا ہے۔

بہر حال اگر طبیعت کچھ منازعت کرتی ہے تو حدود میں کرتی ہے۔ ورنہ احکام شرعیہ فی نفسہا محل منازعت نہیں ہیں۔ بلکہ وہ تو عین تقاضائے طبعی کے موافق ہیں اور اگر کہیں طبیعت کے کسی حکم سے موافقت نہ ہو تو اس عدم موافقت کا سبب حقیقت کا معلوم نہ ہونا ہے بعد علم حقیقت کے ضرور طبیعت کو اس حکم کا خود تقاضا ہوگا۔

یہاں سے معلوم ہوگا کہ احکام شرعیہ کی مخالفت سے دنیا کی بھی بے حلاوتی ہے کیونکہ یہ مخالفت کرنے والا خود اپنی طبیعت کے خلاف کام کر رہا ہے اور اس سے بڑھ کر کیا بے حلاوتی ہوگی کہ طبعی تقاضا کو مردہ کیا جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مطیعین کی زندگی شاہانہ زندگی ہے کہ ان کا ہر کام طبیعت کے موافق ہے۔

اب سنیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود پڑھنا تقاضائے طبیعت کے بالکل موافق ہے۔ اگر کسی کو حضورؐ کا محسن ہونا ہی معلوم نہ ہو۔ وہ اگر درود کو طبیعت کے موافق نہ سمجھے تو نہ سمجھے۔

درود شریف کی اہمیت

مگر اس علم کے بعد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محسن ہیں اور سب سے بڑے محسن ہیں خود بخود یہ تقاضا ہوگا کہ حضورؐ کے احسان کا بدلہ کریں۔ جس کا اقل درجہ یہ ہے کہ کم از کم آپ کو دعا ہی دیں مگر خود دعا کیسے دیں۔ ہم کو آپؐ کے درجہ کا کما حقہ علم ہی نہیں۔ اس حالت میں خود تصنیف کر کے دعا کرنے میں سخت بے دابی کا اندیشہ تھا کیونکہ اس وقت ہماری دعا و ثنا ایسی ہوگی کہ۔

شاہ را گوید کسے جولا ہہ نیست ☆ ایں نہ مدح است اوّمگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولاہا نہیں یہ اسکی تعریف نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے)

اور اسی لئے اپنی رائے سے تفاضل جائز نہیں جس میں درجہ تفاضل خود تصنیف کرے ہاں جو فضائل منصوص ہے ان سے تفاضل جائز ہے کیونکہ وہ تمہاری طرف منسوب نہ ہوگا بلکہ شارع کی

طرف منسوب ہوگا۔ اس میں بے ادبی کا اندیشہ نہیں اور محققین نے تو تفاضل میں اولیاء سے بھی ممانعت کی ہے کیونکہ تفاضل کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ یہ فیصلہ کرانے والا دونوں کے مقامات سے واقف ہو اور ایک ولی کا پورا حال دوسرے ولی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ہم جیسوں کو۔

اسی لئے ہمارے ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو مثل مشہور ہے "ولی را ولی می شناسد" صحیح نہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ "ولی را نبی می شناسد و نبی را خدا می شناسد"

اب بتلائیے کہ اندر سے تو دل تقاضا کر رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کا بدلہ کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا دیں مگر اندیشہ بے ادبی کی وجہ سے دعا بھی نہیں دے سکتے۔ ایسے وقت میں جو آیت **صلوا علیه و سلموا تسلیما** نازل ہوئی ہوگی۔ تو مشتاقین کا دل کیسا ٹھنڈا ہوگا کہ الحمدللہ ہم کو اپنے محسن کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا تو یہ حکم کس قدر سہل ہے کہ بالکل جذبات طبیعت کے موافق ہے۔

پھر عقل کا مقتضا تو یہ تھا کہ درود پڑھنے پر ثواب نہ ملتا کیونکہ اس کو تو خود تمہاری طبیعت ہی چاہ رہی تھی تو درود پڑھ کر تم نے اپنے دل کو ٹھنڈا کیا۔ اپنی طبیعت کا تقاضا پورا کیا۔ پھر ثواب کس چیز کا مانگتے ہو۔ مگر یہ شریعت کی رحمت در رحمت ہے کہ باوجودیکہ اس کے سب احکام تقاضائے طبیعت کو پورا کرنے والے ہیں۔ مگر ان پر ثواب کا بھی وعدہ ہے تا کہ ثواب کو سن کر اور زیادہ سہولت ہو جائے۔ چنانچہ درود پر ثواب بھی ملتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے حق تعالیٰ اس پر دس بار صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں (یعنی رحمت خاص فرماتے ہیں) اور دس نیکیاں اس کو ملتی ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ دس گناہ معاف ہوتے ہیں۔

یہ صلہ دانت گھسائی ہے انسان اللہ میاں سے دانت گھسائی بھی وصول کرتا ہے ورنہ واقع میں درود میں اس کو ثواب کا کیا حق تھا۔ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان تھوڑا ہی کیا ہے جو ثواب کا استحقاق ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود کی کیا احتیاج ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ چنانچہ خود نص میں ارشاد ہے **ان اللہ وملائکته یصلون علی النبی**۔ اس میں خود اشارہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تمہارے درود کی ضرورت ہے نہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کا درود کافی ہے اور مخلوق میں سے مقدس جماعت ملائکہ

کا درود کافی ہے۔ باقی تم کو جو صلوٰۃ وسلام کا امر کیا گیا ہے اس میں تمہارے لئے یہی بات کافی تھی کہ تم کو اس کام میں شریک کرلیا گیا جو خدا تعالیٰ اور ملائکہ کرتے ہیں اور ثواب مزید برآں۔
مرزا مظہر جان جاں رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کفایت صلوٰۃ حق کو ایک قطعہ میں خوب ظاہر فرمایا ہے۔

خدا در انتظار حمد ما نیست ☆ محمد چشم برراہ ثنا نیست
محمد حامد حمد خدا بس ☆ خدا مدح آفرین مصطفیٰ بس

یعنی نہ حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار ہے حضور کو خدا تعالیٰ کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے حضور کی حمد کافی ہے۔
بس اب ہم جو حق تعالیٰ کی ثنا یا حضور کی نعت کرتے ہیں۔ اس سے مقصود اپنا ہی فائدہ ہے اسی کو آگے فرماتے ہیں کہ جیسا اپنا فائدہ مدنظر ہے تو بس مناجات کرلو۔

مناجاتے اگر خواہی بیاں کرد ☆ بہ بیتے اکتفا خواہی تواں کرد

(اگر کوئی مناجات بیان کرنا چاہتے ہو تو ان دو بیتوں پر اکتفا کرو)
آگے کیا اچھی مناجات ہے ۔

محمد از تو می خواہم خدا را ☆ الٰہی از تو حب مصطفیٰ را

کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہم خدا کی محبت مانگتے ہیں اور اے اللہ! آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مانگتے ہیں۔ بس خدا نے دیا رسولؐ اور رسولؐ نے دیا خدا یعنی خدا کا پتہ دیا۔ تو خدا سے رسول کی محبت مانگو اور رسول اللہ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت مانگو۔ یہ مناجات کافی ہے۔

دانت گھسائی

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے جذبہ شکر کو پورا کرتے ہیں۔ اب اس پر ثواب ملنا یہ محض دانت گھسائی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس دانت گھسائی پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ڈھاکہ میں ایک پیرزادہ صاحب اپنے باپ کے مریدوں میں گئے۔ ایک رئیس نے ان کی دعوت کی اور دعوت کے بعد پچاس روپے نذرانہ میں دیئے۔ پیرزادہ نے روپے پھینک دیئے کہ کیا ہم اس لائق ہیں ہمارا نذرانہ دوسو روپیہ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے حکایت سن کر کہا کہ دعوت کے بعد نذرانہ پر اتنا تکرار کیسا؟ ایک ظریف نے کہا کہ یہ دانت گھسائی ہے کیونکہ لقمہ چبانے میں دانت تو گھستا ہی ہے۔ بنگالہ میں جو عالم

یا درویش کسی کی دعوت قبول کر لیتا ہے کھانے کے بعد دانت گھسائی کا نذرانہ بھی ضرور لیتا ہے۔ اسی لئے اس پر تکرار بھی ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ان پیروں کا ظلم ہے مگر حق تعالیٰ سے تو انسان دانت گھسائی ہمیشہ لیتا ہے اور چونکہ وہ بڑے کریم ہیں اور ان کے خزانہ میں کمی نہیں اور وہ خوش ہو کر دیتے ہیں اس لئے اللہ میاں سے دانت گھسائی لینے کا مضائقہ نہیں۔ مگر اس کو اپنا حق نہ سمجھو محض ان کا فضل و کرم سمجھو۔

رعایت جذبات

مجھے رعایت جذبات پر کہ اللہ تعالیٰ نے احکام میں ہمارے جذبات کی کیسی رعایت فرمائی ہے۔ ایک بات اور یاد آئی جو مجھ سے لڑکیوں نے ترجمہ قرآن کے درس میں پوچھی تھی۔ میں ان کو سورۂ برات کا ترجمہ پڑھا رہا تھا جب یہ آیت آئی۔

یضاھؤن قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انی یؤفکون.

''خدا ان مدعیان فرزند مسیح وعزیر کو تباہ کرے یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں۔''

تو ایک لڑکی نے سوال کیا کہ یہ تو کوسنا ہے اللہ میاں جب سب کچھ کر سکتے ہیں پھر وہ کیوں کوستے ہیں؟ یہ سوال اس سے پہلے کسی نے مجھ سے نہ کیا تھا۔ نہ کسی کتاب میں اس کا جواب دیکھا تھا۔ مگر الحمدللہ کہ سوال کے ساتھ ہی معا میرے دل پر جواب القا ہو گیا۔

میں نے کہا کہ اللہ میاں تو کوسا نہیں دیتے مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ تو اوپر جو یہود و نصاریٰ کا حال مذکور ہے اس کو قرآن میں پڑھ کر یا سن کر انسان کو غصہ آتا ہے جس سے کوسنا منہ سے نکلنے کو ہوتا ہے۔ مگر قرآن پڑھتے ہوئے غیر قرآن داخل کرنا ادب کے خلاف تھا اس لئے انسان اپنے اس جذبہ کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے خود ہی کوسنے کا مضمون بڑھا دیا۔ تاکہ پڑھنے والے کو اپنا جذبہ دبانا نہ پڑے اور وہ دل کھول کر اس تقاضا کو پورا کر لے اور یہ کہہ دے **قاتلھم اللہ انی یؤفکون**. (اللہ انکو ہلاک کرے کدھر بہکے جاتے ہیں)

واقعی اس جواب کے بعد جو قرآن پر نظر کی جاتی ہے تو جابجا رعایت جذبات کی نظیریں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ **عسی** اور **لعل** حق تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے اس میں بھی ہمارے جذبات ہی کی رعایت ہے کہ جہاں ہم لوگ اپنے محاورہ میں **عسی** و **لعل** کہتے ہیں وہاں حق تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا گو حق تعالیٰ کا علم کامل کے لحاظ سے وہاں ان اور لام تاکید کا موقع تھا اور یہ

رعایت ایسی ہے جیسے بچہ کے ساتھ ابا جان بھی پانی کومم اور روٹی کو روتی کہنے لگتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب ایک دوسرا قصہ ہے وہ یہ کہ میں نے ایک مسماۃ (یہ حضرت مولانا کی اہلیہ کبریٰ ہیں۔ زادالله فی درجا تهاورفع فی الجنة منزلتها ورزقها فی الدنیا عیشة طیبة بقیة سویة آمین ۱۲ ظ) سے آیت والارض جمیعاً قبضته یوم القیامة والسموت مطویت بیمینه، کا ترجمہ پڑھاتے ہوئے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے جو یہاں فرمایا ہے کہ زمینیں سب اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہوں گی اور آسمان داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس کی حقیقت تو مراد نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ مٹھی سے اور اعضاء سے پاک ہیں۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی قدرت کے تحت میں ہونگی۔ مگر قبضہ کی تعبیر میں جو اختلاف ہے کہ جب زمین کے ساتھ قبضہ اور سموات کے ساتھ یمینہ کا عنوان اختیار کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے ایک ہی عنوان کافی تھا۔

یہ سوال بہت دقیق تھا۔ مگر اس کا جواب اس مستورہ نے عجیب حیرت انگیز دیا کہا کہ یہاں حق تعالیٰ نے ہماری عادت کے موافق کلام فرمایا ہے اور عادت یہی ہے کہ ہم چھوٹی چیز کو مٹھی میں لیتے ہیں اور بڑی کو ہاتھ میں بدوں مٹھی بند کئے لے لیتے ہیں۔ پس چونکہ زمین آسمان سے چھوٹی ہے اس لئے وہاں قبضہ فرمایا ہے اور آسمان بڑا ہے اس کے لئے یمینہ فرمایا۔ مجھے یہ جواب بہت پسند آیا۔ چنانچہ میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو لکھ دیا ہے تو یہ بھی وہی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے۔

مفسرین نے بھی افراد ارض اور جمع سموت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ اس میں ہمارے جذبات کی رعایت ہے کہ تعدد سموت تو اذہان عامہ میں پہلے سے تھا تعدد ارض لوگوں کے ذہن میں نہ تھا تو حق تعالیٰ نے بھی ان کے ذہن کو مانوس کرنے کے لئے سارے قرآن میں ارض کو بصیغہ مفرد اور سموات کو جمع استعمال کیا ہے۔ البتہ تعدد ارض کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ایک مقام پر اس طرح مقصوداً ظاہر فرما دیا۔ الله الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلهن. یہ تو درود کے متعلق کلام تھا کہ وہ طبعی تقاضا کے موافق ہے۔

روزہ میں رعایت جذبات طبیعہ اس طرح ہے کہ جیسے کھانے کا ہم کو تقاضا ہوتا ہے ایسے ہی بعض دفعہ نہ کھانے کا بھی تقاضا ہوتا ہے۔ انسان سال بھر کھاتے کھاتے تھک جاتا ہے تو طبیعت

خود تقاضا کرتی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے کھانا چھوڑ دیا جائے۔

خدمت والدین میں رعایت جذبات اس طرح ہے کہ جس شخص کو ماں باپ کا ماں باپ ہونا معلوم ہوگا۔ اس کا دل خود تقاضا کرے گا کہ ان کی خدمت کرے۔ ان کے احسان کا بدلہ کرے۔ اوران کی تکلیف سے اس کا دل خود ہی کڑھے گا اور اندر سے طبیعت میں تقاضا پیدا ہوگا کہ ان کو آرام دیا جائے خصوصاً بڑھاپے میں جب کہ وہ کمزور ہوجاتے ہیں ان کے عجز وماندگی پر زیادہ ترس آئے گا۔ اس وقت گو محبت ویسی نہ رہے جیسے جوانی کے عالم میں تھی کیونکہ جوانی میں والدین کے کمالات سامنے تھے ان کی گفتگو عاقلانہ تھی وہ اولاد پر خرچ بھی کرتے تھے ان کے نفع ونقصان کا لحاظ کرتے تھے اوران باتوں سے اولاد کے دل میں ان کی محبت بڑھتی تھی۔ بڑھاپے میں بعض دفعہ والدین کے ہوش وحواس درست نہیں رہتے۔ الٹی پلٹی باتیں کرنے لگتے ہیں اور کمانا یا اولاد پر روپیہ لگانا بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اس وقت بعض لڑکوں کو والدین سے محبت نہیں رہتی مگران کے حال پر رحم اور ترس تو ضرور آتا ہے اس رحم کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ان کی خدمت کی جائے۔

محبت اور رحمت کا نباہ

یہاں سے معلوم ہوا کہ محبت کا نباہ دواماً نہیں ہوتا ہاں رحمت کا نباہ دواماً ہوسکتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے زوجین کے متعلق فرمایا ہے **وجعل بینکم مودة ورحمة۔ مودة سے رحمت** کو اسی لئے بڑھایا کہ زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کی تو یہ حالت ہے کہ

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمے ماند (اگر رہے تو ایک رات رہے دوسری رات نہ رہے)

اور کسی کو بہت ہی محبت رہے گی تو جوانی تک رہے گی۔ بڑھاپے میں محبت وعشق باقی نہ رہے گا۔ ہاں شفقت ورحمت باقی رہے گی۔ اسی لئے شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے ایک ذاکر کی اس شکایت پر کہ اب ذکر میں پہلے جیسا مزہ نہیں آتا۔ فرمایا تھا کہ تم کو خبر نہیں پرانی جورواماں ہوجاتی ہے یعنی اب اس کے ساتھ ویسی محبت ہوجاتی ہے جیسی ماں سے ہوا کرتی ہے بوجہ خدمت وغیرہ کے جس کا حاصل وہی رحمت ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہوگیا کہ یہ تین امور جن کا اس حدیث میں ذکر ہے نہایت سہل ہیں اور طبعی امور ہیں اوران میں کوتاہی کرنے پر عتاب بھی اسی لئے زیادہ ہے کہ ان میں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ وہی کام کرنا ہوتا ہے جس کو طبیعت خود چاہتی ہے پھر بھی سستی کی جاتی ہے۔

ان اعمال کے متعلق ایک عجیب نکتہ ہے کہ ان تینوں میں ایک تو حق العبد خالص ہے یعنی خدمت والدین۔ اور ایک حق اللہ خالص ہے یعنی صوم رمضان اور ایک حق العبد و حق اللہ سے مرکب ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا درود کا حق العبد ہونا فقہاء نے سمجھا ہے اور اس پر دو مسئلے متفرع کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوتاہی کرنے کا گناہ صرف توبہ سے معاف نہ ہوگا کیونکہ یہ حق العبد بھی ہے۔ بلکہ اس کی تلافی توبہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے سے ہوگی۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کوتاہی ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے توبہ بھی کرے اور آئندہ درود کی خوب کثرت کرے یہاں تک کہ دل گواہی دے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے ہوں گے۔

درود کی فضیلت

دوسری تفریع یہ کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ درود ایسی طاعت ہے جو کبھی رد نہیں ہوتی کیونکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے درخواست ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کے محبوب ہیں اور محبوب کے لئے جو درخواست کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم بادشاہ سے شہزادہ کے متعلق ایسی بات کی سفارش کریں جو بادشاہ اس کے لئے خود ہی کرنے والا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی سفارش کیوں رد ہونے لگی۔

درود میں بھی حق تعالیٰ سے ایسی ہی سفارش کرتے ہو کیونکہ درود کا حاصل یہی تو ہے کہ یا اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام نازل فرمایئے اور یہ کام تو حق تعالیٰ بدوں ہمارے کہے خود ہی کر رہے ہیں۔ چنانچہ نص میں ہے ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی (بے شک اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں) پھر ہمارے کہنے کو وہ کیونکر رد کریں گے۔ اس لئے درود کا قبول ہونا یقینی ہے وہ رد نہیں ہوتا۔ اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے درود کی۔

غرض اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق کی جملہ اقسام میں سے ایک ایک فرد بیان فرما دیا ہے کہ ایک نوع میں فلاں اسہل ہے اور دوسری تیسری نوع میں فلاں فلاں عمل اسہل ہے اس لئے ان میں کوتاہی کرنا سخت جرم ہے۔

مغفرت کا سامان

میں روزہ ہی کے بیان پر کلام کو ختم کرتا ہوں کہ روزہ نہایت آسان ہے اور اب تو بہت ہی آسان ہے کیونکہ صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ اگر یہ بیان شروع رمضان میں ہوتا تو اس وقت

تیس روزے باقی ہوتے اب تو تین ہی باقی ہیں اور بعض جگہ کے اعتبار سے تو اس سے بھی کم ہیں۔ کیونکہ بعض مقامات پر شنبہ کی پہلی ہوئی ہے۔ اس حساب سے آج ۲۸ تاریخ ہے ان کے حساب پر تو پیر کو عید ضرور ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے یہاں ثبوت کافی سے یہ خبر نہیں پہنچی اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے یہاں پیر کو عید کا ہونا ضروری نہیں صرف محتمل (پھر یہاں بھی عید پیر کو ہوئی ۔۱۲۔ ظ) ہے۔ بہر حال ہمارے حساب میں غایت سے غایت تین دن رمضان کے باقی ہیں۔ ان تین دنوں میں جو کچھ کرنا ہو کرلو اور اپنی مغفرت کرالو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرلو چاہے عید کے بعد ہی ٹوٹ جائے مگر خدا کے لئے اس وقت تو عمر بھر کے لئے توبہ کر لینا ۔ ایسا نہ ہو کہ توبہ میں حد لگا دو کہ رمضان تک کیلئے توبہ کرتے ہیں کہ اس سے توبہ باطل ہو جائے گی۔ توبہ کی صحت کے لئے یہ تو ضرور نہیں کہ وہ عمر بھر ٹوٹے ہی نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ توبہ کے وقت عمر بھر کے لئے گناہوں کے چھوڑنے کا عزم کر لیا جائے۔ ۔ تو اس وقت عزم کر لینا کیا دشوار ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس حدیث کی وعید سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ رمضان میں گناہوں سے پختہ توبہ کر لی جائے اور توبہ کچھ مشکل نہیں بہت آسان ہے یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کوئی حدیث کے ترجمہ سے یہ سمجھا ہو کہ رمضان میں مغفرت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ رات بھر جاگنا پڑے گا۔ یا تین دن میں قرآن ختم کرنا پڑے گا۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ لازم نہیں یہ تو مستحب ہیں۔ لازم صرف یہ ہے کہ گزشتہ گناہوں سے توبہ کرلو اور رمضان بھر معاصی سے رکو۔ بس اس طرح تم اس حدیث کی وعید سے بچ جاؤ گے۔

ہاں فضائل حاصل کرنا چاہو تو اس کے لئے شب بیداری کی بھی ضرورت ہے لیلۃ القدر کا ایک محل باقی ہے یعنی ۲۹ کی رات اس میں جس قدر ہو سکے شب بیداری کرلو۔ لیلۃ القدر کے متعلق حدیث میں ہے: من حرمھا فقد حرم الخیر کلہ. "جو شب قدر سے محروم رہا وہ بڑی خیر سے محروم رہا"

مگر یہ عصیان نہیں صرف حرمان ہے۔ اس لئے اس حدیث سے میرے پہلے کلام پر نقض وارد نہیں ہوتا۔ جہاں میں نے کہا تھا۔ کہ رغم انف رجل انسلخ رمضان ولم یغفر لہ کی وعید سے بچنے کے لئے شب بیداری کی ضرورت نہیں بلکہ حدیث من حرمھا فقد حرم الخیر کلہ سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ حرمان سے بچنے کے لئے شب بیداری کی ضرورت ہے اور وہ بھی تمام رات کے جاگنے پر موقوف نہیں بلکہ اکثر لیل کی بیداری سے بھی حرمان رفع ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء

اور صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لینا بھی شب بیداری کے برابر ہے تو اس سے بھی حرمان رفع ہو جائے گا۔ لیجئے اب تو دونوں حدیثوں کی وعید سے بچنا آسان ہو گیا۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ بیان

خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ رمضان کا جتنا حصہ باقی ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اس میں اپنی مغفرت کا سامان کر لینا چاہیے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

ضمیمہ

بعد میں نماز کے وجودی اور شاق ہونے اور روزہ کے عدمی اور سہل ہونے کی ایک تائید فروع فقہیہ سے بھی ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ اگر نماز میں کوئی فعل مفسد صلوٰۃ نسیان سے صادر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اور اگر روزہ میں کوئی فعل نسیاناً ہو جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ اور اس کی وجہ یہی لکھی ہے کہ نماز کی ہیئت مذکر ہے اس لئے نسیان عذر نہیں اور روزہ کی ہیئت مذکر نہیں اسلئے نسیان عذر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مذکر ہونا ہیئت نماز کا بوجہ اس کے وجودی ہونے کے ہے اور مذکر نہ ہونا صوم کا بوجہ اس کے عدمی ہونے کے ہے اور وجودیت کے لئے شاق ہونا اور عدمی کے لئے سہل ہونا لوازم طبیعہ سے ہے۔ نیز اگر صوم اپنی حقیقت میں شاق ہوتا تو اس کا شاق ہونا ہی مذکر ہونے کیلئے کافی تھا اور لازم منتفی ہے۔ پس ملزوم یعنی مشقت باعتبار الحقیقہ بھی منتفی ہے۔

التہذیب

مجاہدہ قیام رمضان کے متعلق یہ وعظ ۲۹ شعبان ۱۳۳۴ھ بروز جمعہ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹہ میں بیان فرمایا۔ حاضری قریباً ۲۰۰ تھی۔ محمد عبداللہ گنگوہی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قد افلح من زكها وقد خاب من دسها (الشمس:۹،۱۰)

ترجمہ: یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کرلیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو (یعنی نفس کو) دبادیا۔

تزکیہ کے معنی

یہ دو آیتیں ہیں سورۂ والشمس کی۔ ان آیتوں میں جناب باری تعالیٰ نے فضیلت بیان فرمائی ہے تزکیہ نفس کی اور مذمت فرمائی ہے اس کے اہمال کی اور تزکیہ نہ کرنے کی۔ تزکیہ چونکہ لفظ مشہور ہے اس لئے میں نے بھی لفظ تزکیہ ہی استعمال کیا۔ تزکیہ لغت میں کہتے ہیں میل کچیل سے کسی شے کو صاف کر لینے کو اور یہ ظاہر ہے کہ جیسی شے ہوگی اسی طرح کا اس کا تزکیہ ہوگا۔ مثلاً کپڑا یا برتن یا بدن اگر آلودہ نجاست و میل کچیل ہے تو اس کا تزکیہ یہی ہے کہ پانی سے اس کی تطہیر و تنظیف کر لی جائے اور مکان میں اگر کوڑا کرکٹ جمع ہے تو اس کا تزکیہ یہ ہے کہ اس میں جھاڑو دی جائے۔ غرض! جس قسم کی شے ہے ویسا ہی اس کا تزکیہ ہوگا اور ظاہری گندگی سے پاک کرنا تزکیہ ظاہری ہوگا۔

تزکیہ باطنی

باطنی نجاست سے صفائی کرنا تزکیہ باطنی ہوگا۔ ہر چند کہ آیت میں معنی عام بھی لے سکتے ہیں لیکن چونکہ تزکیہ ظاہر کو سب جانتے ہیں۔ اسلئے میں تزکیہ باطنی ہی کو ذکر کروں گا خواہ اس کو یہ سمجھا جائے کہ مدلول آیت کا یہی ہے یا یوں سمجھا جائے کہ جزو مدلول ہے۔

وجہ اس میری تخصیص کی یہ ہے کہ تزکیہ ظاہری کی طرف سے اس قدر بے التفاتی نہیں ہے جس قدر کہ لوگوں کو تزکیہ باطنی سے ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں سے تزکیہ ظاہری کا تعلق ہے ان میں سے بعض سے بچنا طبعی امر ہے اور بعض سے شرعی مثلاً قارورات سے اپنے بدن یا کپڑے کو بچانا امر طبعی ہے۔ یہاں طبع کا اقتضا ہے کہ ان چیزوں سے بچو اور بعض نجاست وہ ہیں کہ ان کو شریعت نے نجاست قرار دیا ہے۔ جیسے منی نکلنے سے تمام بدن کا تزکیہ کرایا ہے اور حیض ونفاس سے بھی تمام بدن دھلوایا ہے۔ بہر حال تزکیہ ظاہری خواہ طبیعت کی وجہ سے یا شریعت کے اتباع سے ہو اس کا اہتمام اور اس کی ضرورت کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور جانتے ہیں اور ان سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

بخلاف تزکیہ باطنی کے کہ بعض تو اس کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں وہ اس کی طرف سے بے التفاتی کرتے ہیں۔ ایسے افراد تو بہت پائے جائیں گے جو شراب سے بچیں گے پیشاب سے محترز ہوں گے۔ اگر کہیں چھینٹ لگنے کا احتمال بھی ہوگا تو تمام کپڑا ہی دھو ڈالیں گے لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ ان کا تقویٰ اکل وشرب میں بھی پایا جاتا ہو۔ چنانچہ رشوت کا مال کھا جائیں گے۔ سود کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے۔ قرض لے کر نہ دینے کو ریاست کا جزو سمجھیں گے۔

ہاں ظاہری وضع درست کرلیں گے۔ داڑھی لمبی ہے پاجامہ ٹخنوں سے اوپر کرتا نیچا ہے تاکہ اتقیاء میں شمار ہو کر اعتبار بڑھ جائے۔ اور نیز اس میں نفس کو بھی کلفت نہیں ہوتی اور جن امور میں نفس کو مشقت ہوتی ہے جیسے کسی کی زمین دابی ہوئی ہے اس کو چھوڑ دینا۔ رہن کی آمدنی نہ کھانا یا جن امور میں جاہ کی کچھ کمی ہوتی ہے جیسے کسی غریب آدمی کو ستایا تھا۔ اس سے خطا معاف کرانا ایسے امور کا کچھ بھی اہتمام نہیں۔ تزکیہ کی یہ قسم ایقاع میں بہت قلیل ہے۔ بہت کم افراد کو اس کا اہتمام ہے اور ان میں سے اگر کسی کو اہتمام بھی ہے تو ان ہی چیزوں کا ہے جن کا معصیت ہونا۔ بہت مشہور اور ظاہر سے بھی کچھ متعلق ہے۔ باقی جو تزکیہ غیر مشہور اور محض متعلق باطن کے ہے اس کا کسی درجہ

میں بھی اہتمام نہیں ہے الا ماشاء اللہ!

حاصل یہ ہے کہ نجاسات باطنہ سے بچنا یہ تزکیہ باطنی ہے اور اسی کو آیت کا مدلول قرار دیتا ہوں۔

تزکیہ نفس

چنانچہ جناب باری عز اسمہٗ ارشاد فرماتے ہیں قد افلح من زکھا ،یعنی بے شک کامیاب ہوا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا۔ اول بیان کیا گیا تھا کہ جس قسم کی شے ہوگی اسی طرح کا اس کا تزکیہ ہوگا۔ پس نفس کا پاک کرنا پانی سے نہ ہوگا اور نیز ظاہری نجاست سے بچنا بھی مراد نہیں اس لئے کہ ضمیر نفس کی طرف راجع ہے اور نفس پانی سے پاک نہیں ہوتا۔ ہاں اس معنی کو پانی موثر ہوسکتا ہے کہ تطہیر ظاہری یعنی بدن دھونے کا اثر نفس پر ہوتا ہے۔

چنانچہ امام غزالیؒ نے اس کی تصریح کی ہے اور گو دلیل اس پر قائم نہیں کی مگر وہ اس کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ دیکھو جب آدمی غسل کرتا ہے یا وضو کرتا ہے۔ تو باطن میں ایک ایسا انشراح اور شگفتگی پاتا ہے جو پہلے نہیں تھی۔ ایک دن ایسا لو کہ پانچوں نمازیں اس میں وضو کر کے پڑھی ہوں اور دوسرا دن ایسا لو کہ ایک وضو سے سب نمازیں پڑھی ہوں۔ پہلے دن میں زیادہ نور اور انشراح اور شگفتگی پائیگا اور دوسرے میں ایک قسم کی پژمردگی اور نور کی کمی دیکھے گا۔

اور لیجئے! استنجا کرنے کے بعد اور وضو سے پہلے باطن میں ایک خاص حالت ہوتی ہے کہ وہ نہ نور ہے نہ ظلمت۔ ایک خلو کی سی کیفیت ہوتی ہے اور وضو کے بعد غور کیجئے کہ ایک نور ہوگا اور طبعیت تازہ ہوگی اور کسل اور کدورت بالکل دور ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات اسی وقت سمجھ میں آئی۔ وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں تو عجب نہیں ہے کہ یہ انشراح اور نور جو وضو کے بعد ہر مومن کو محسوس ہوتا ہے یہ اسی کا اثر ہے۔ اس لئے کہ گناہ سے ظلمت، کدورت اور سیاہی کا قلب پر ہوجانا تو حدیث سے معلوم ہوتا ہی ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک دھبہ سیاہ لگ جاتا ہے حتیٰ کہ گناہ کرتے کرتے سیاہی قلب کو محیط ہوجاتی ہے۔ پس جب کہ گناہ سے ظلمت ہوتی ہے تو وضو سے گناہ معاف ہوکر اس ظلمت میں کمی ہوتی ہے اس لئے اس کا احساس ہوتا ہے اور اسی کی خبر دی گئی ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔

اعمال شرعیہ کی خاصیت

سبحان اللہ! اعمال شرعیہ کی عجیب خاصیت ہے کہ ان میں اخلاص اگرچہ کم ہو لیکن وہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اسی واسطے تو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **مثل الذین ینفقون اموالھم ابتغآء مرضات اللہ و تثبیتا من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فاتت اکلھا ضعفین۔ فان لم یصبھا وابل فطل.** ''یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی طلب کرنے کے واسطے خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک ٹیلے پر ایک باغ ہو۔ اس پر زور کی بارش ہو۔ پس اس باغ نے دو چند پھل دیا اور اگر بارش سخت نہ پہنچے تو شبنم ہی کافی ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے اس مثال میں مسلمانوں کے قلب کو ایک صالح زمین قرار دیا ہے اور اعمال صالح مثل تخم کے ہیں اور اس قلب کو ایسی قابل زمین قرار دیا ہے کہ اگر اخلاص جو بجائے بارش ہے کافی مقدار میں نہ ہو تو تھوڑا سا اخلاص جو بجائے شبنم کے ہے وہی کافی ہو جائے گا۔ اور ادنیٰ درجہ کہ دس گنا حسنات ہے اس کو میسر ہو جائے گا۔ پس اگر پورا اخلاص نہ ہو مگر ریا بھی نہ ہو جیسی ہماری حالت ہے کہ نہ ریا ہوتی ہے نہ اخلاص۔ مساوات سی ہوتی ہے تو ان شاء اللہ امید ہے کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔

اس مقام پر تنبیہ کیلئے ایک بات ضروری یاد آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ آدمی تواضع میں آ کر کہتا ہے کہ ہماری کیا نماز، کیا روزہ اور اپنے ان اعمال کو حقیر سمجھتا ہے۔ کہتا تو ہے یہ تواضع کے لئے۔ لیکن بعض اوقات یہ بات حجود نعمت کی طرف مفضی ہو جاتی ہے۔

یادرکھو جس قدر تم یہ کرتے ہو یہ بھی نعمت ہے۔ اس پر شکر کرنا چاہیے اور آگے کو ہمت کرنا چاہیے۔ ہم تو اس کے بھی مستحق نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی وضو اور ایسی ہی نماز کی توفیق دے۔ یہ بھی ان کا فضل ہے ان شاء اللہ حق تعالیٰ کے یہاں اعمال قدر کے ساتھ دیکھے جائیں گے اور مراتب علیا نہ سہی عذاب جہنم سے تو ان شاء اللہ امید ہے کہ نجات ہو جائے گی۔ مراتب علیا تو بڑے لوگوں کو مبارک ہوں۔ ہم تو بخدا اس پر راضی ہیں کہ ہم کو سزا سے خلاصی ہو جائے۔ پس ان اعمال کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔

کید نفس

بہت سے لوگ اس انتظار میں ہیں کہ نماز جب پڑھیں گے جب کہ حضور قلب ہوگا۔ ہم

کیا نماز پڑھیں۔ دل تو ہمارے دنیا کے بکھیڑے بھر رہے ہیں۔ جب قلب پاک وصاف ہوگا اس وقت نماز پڑھیں گے۔

یادرکھو! یہ نفس کا بڑا کید ہے۔ ظاہر میں تو تواضع ہے مگر واقع میں یہ تکبر ہے اس لئے کہ جوحالت اور جو وقت اس نے اپنے لئے نماز کا تجویز کیا ہے اس وقت کی نماز کو یہ سمجھا ہے کہ یہ نماز اس دربار کے لائق ہے۔ حالانکہ ہم عمل کرتے کرتے ہزاروں بار بھی مرمر کر زندہ ہو جائیں جب بھی ہم ناقص ہیں اور ہمارے اعمال اس وقت بھی ناقص ہی ہیں کسی طرح اس قابل نہیں ہیں کہ اس بارگاہ میں پیش ہوں۔ ہم اور ہمارے اعمال ہر وقت ناقص ہی ہیں۔ ہمارا اپنے اعمال کو ناقص سمجھنا ہی کمال ہے۔ پس اس حالت میں جب کہ یہ اعمال ناقص ہیں اور یہ شخص بھی ان کو ناقص سمجھتا ہے نقص ان میں کم ہے اور جو حالت اس کو مطلوب ہے اور اس کے حصول کے وقت یہ ان اعمال کو کامل سمجھے گا تو اس وقت کے اعمال نقص میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ناقص تو دونوں ہی حالت میں ہیں لیکن اس کے کامل سمجھنے نے نقص کو اور بڑھا دیا ہے۔ مریض اپنی نماز کو ناقص سمجھتا ہے اور تندرستی کی حالت میں نماز کو کامل سمجھتا ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس لئے مقصود تو مٹنا ہے اور غایت تذلل ہے جہاں یہ معنی پائے جائیں گے وہی کمال ہے۔

توفیق نعمت

ہماری نماز اور ہمارا روزہ ایسا ہے جیسے مولانا ارشاد فرماتے ہیں ۔

ایں قبول ذکر توازرحمت است ☆ چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(یہ آپکا ہمارا ذکر قبول فرمانا رحمت ہی سے ہے جیسے مستحاضہ کی نماز رخصت کی بناء پر قبول فرماتے ہو)

حق تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائی ۔

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتی تو سخت مصیبت ہوتی)

اگر یہ نماز بھی نہ ہوتی تو کیا کر لیتے اور کیسی سخت مصیبت کا سامنا ہوتا۔ چنانچہ بعض دفعہ کسی عارض کی وجہ سے اس ناقص نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے یا بالکل فوت ہو جاتی ہے تو کیسا غم سوار ہوتا ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود ☆ چوں زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

اس وقت اس ناقص عمل ہی کی قدر ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر بالکل بھی توفیق نہ ہوتی

تو کیسی مصیبت تھی۔ بہرحال یہ نماز روزہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اگر تھوڑا سا بھی خلوص ہوگا تو نجات کے لئے کافی ہے جیسے نفقات کے مثل میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ شبنم ہی کافی ہے۔

اب یہاں پر یہ شبہ ہوگا کہ جب اپنی نماز کو کافی اور سہل سمجھا تو یہ تو کبر ہے بات یہ ہے کہ ایک صورت سے کبر نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اپنے کو تو بے قدر سمجھے اور یہ جانے کہ میں اس نعمت کے قابل نہ تھا اور نماز کو بے قدر نہ جانے۔ گو اس کو کاملین کے درجہ کی نہ جانے لیکن یہ سمجھے کہ میں ایسی نماز کے بھی قابل نہ تھا۔ اس کی توفیق ہو جانا یہ بھی میری مقدار سے کہیں زیادہ ہے اس طور سے شکر اور تواضع دونوں جمع ہو جائیں گے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو نہایت بھوک لگ رہی ہو اور کہیں سے کچھ نہ ملتا ہو اور اتفاق سے کسی نے روکھی روٹی دیدی تو وہ اس کا بہت ممنون ہوگا۔ اس کی قدر کریگا لیکن اس کو دوسروں کی نعمتوں پلاؤ زردے سے کم بھی جانے گا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھے گا کہ میرے لئے تو یہی پلاؤ وقورمہ ہے اگر یہ بھی نہ ہوتی تو ہلاک ہی ہو جاتا۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ طاعات کے درمیان یہ خاصہ ہے کہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

دعویٰ کی ممانعت

تو اس اعتبار سے طہارت ظاہرہ سے بھی نفس کا تزکیہ ہوتا ہے کیونکہ اولاً جسم کا تزکیہ ہو اور بواسطہ اس کے نفس کا اور اسی طرح دیگر اعمال سے بھی تزکیہ نفس کا ہوتا ہے گو بواسطہ سہی۔ اور تزکیہ بلاواسطہ مراد لیا جائے تو آیت میں صرف تزکیہ باطنی مراد ہوگا۔

بہرحال آیت کا مدلول عام لیا جائے یا خاص مگر میرا مقصود یہاں پر وہ اعمال ہیں جن سے تزکیہ بلاواسطہ ہوتا ہے۔

بیچ میں ایک شبہ کو بھی دفع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ شبہ عامیانہ ہے لیکن آج کل مصیبت یہ ہے کہ ہر شخص مجتہد ہے اگر ترجمہ اردو قرآن وحدیث کے دیکھنے کا شوق ہے یہ شوق تو برا نہیں لیکن ہر کام کی تدبیر ہوتی ہے اور قاعدہ دنیا میں یہ ہے کہ ہر کام کا ایک استاد ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی استاد سے یہ ترجمہ پڑھیں اپنی رائے کو دخل نہ دیں۔ شبہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں تو تزکیہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ایک مقام پر ارشاد ہے فلاتزکوا انفسکم (اپنے نفسوں کو پاک مت سمجھو) تو بظاہر یہاں تزکیہ سے نہی ہے تو اس سے اردو ترجمہ دیکھنے والے

کو جب کہ اس کو علم نہ ہو سخت حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیا بات ہے۔

بات یہ ہے کہ تزکیہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پاک کردن و پاک گفتن جہاں فضیلت بیان فرمائی ہے وہاں تو معنی اول مراد ہیں اور جہاں نہی ہے وہاں معنی ثانی۔ اس لئے کہ باب تفعیل کا خاصہ یہ بھی ہے کہ ماخذ کو اپنی طرف منسوب کرنا۔ پس جہاں نہی ہے وہاں یہی معنی مراد ہے حاصل یہ ہے کہ نفس کو پاک تو کرو لیکن اس کرنے کے بعد اس کو پاک مت کہو اور ناپاک سمجھو۔

خلاصہ یہ ہے کہ کردار کی تاکید ہے اور گفتار سے تحذیر ہے ۔

کارکن کاربگذر از گفتار ☆ کاندریں راہ کار باید کار

(کام کرو کام صرف باتیں کرنا چھوڑ دو، اس راستہ میں کام کرنا ہی منزل پر پہنچاتا ہے)

حضرت شیخ شیرازی فرماتے ہیں ۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم ☆ کہ اصلے ندارد دمی بے قدم

(طریقت میں قدم رکھنا مفید ہے صرف باتیں کرنا کارآمد نہیں ہے)

نرے دعوے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کام کرنا چاہیے۔ ایک بزرگ وحدۃ الوجود کے بارہ میں فرماتے ہیں ۔

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائی ☆ واحد دیدن بودنہ واحد گفتن

(لفظوں میں اللہ کی وحدانیت کا اظہار کر کے مغرور نہ ہو جاؤ اس لئے کہ ہر چیز میں اللہ کی وحدانیت کا مشاہدہ کرنا ہی حقیقت وحدانیت ہے نہ کہ صرف زبان سے واحد کہنا)

یعنی وحدۃ الوجود واحد دیدن ہے واحد گفتن نہیں ہے یعنی توحید بمعنی وحدۃ الوجود وہ ایک حالت ہے وہ کوئی مضمون علمی نہیں ہے جس پر وہ حالت گزرتی ہے وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے پس غرض فلا تزکوا انفسکم (اپنے نفسوں کو پاک مت سمجھو) میں دعویٰ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ قرینہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں ھو اعلم بمن اتقی (وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے)۔ اگر پاک کرون کے معنی ہوتے تو اعلم نہ فرماتے پس دعویٰ کی ممانعت ہے۔ واقعی اگر آدمی غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کی بھی پاکی حاصل کرے حق تعالیٰ کی درگاہ کے لائق کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ جو طاعات زبان سے ادا ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ زبان ایسی چیز ہے کہ اس سے ہم جو چاہیں اور جس قدر چاہیں عمل ہو سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کے وہ

حقوق بھی ادا نہیں ہوتے اور ہماری تو کیا ہستی ہے سید الحامدینؐ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ **لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک**[1] (میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا بس آپ کی وہی تعریف ہے جو آپ نے خود کی ہے)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ☆ زہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ☆ ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(اے اللہ آپ خیال و قیاس و گمان اور وہم سے برتر ہیں اور جو کچھ لوگوں نے بیان کیا اور جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا ہے اس سے آپ برتر ہیں دفتر تمام ہو گیا اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہم ایسے پہلے ہی وصف رہے ہیں۔)

اور ایک بزرگ کہتے ہیں۔

نہ گردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا ☆ کہ می بالد بہ خود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا
(تیز دوڑنے سے عشق کا میدان ختم نہیں ہو گیا اس لئے تو اس کو جتنا قطع کرے گا۔ یہ اتنا بڑھے گا)

مسافت معرفت

میں نے اس مقام میں کلام کو اس لئے طول زیادہ دیا ہے کہ آجکل لوگ کچھ ذکر و شغل کر کے اپنے کو عارف اور شاغل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ راہ پورا ابھی بھی قطع نہیں ہوتا۔ جتنا زیادہ قطع کرو اتنا ہی زیادہ بڑھتا ہے اور بظاہر یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کسی راہ کو جتنا قطع کرتے ہیں وہ تو گھٹا کرتا ہے

بات یہ ہے کہ جس قدر معرفت بڑھتی ہے نظر صحیح ہوتی جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے حقوق اور عظمت کا مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ۔ زم ہے کہ اپنا عجز اور کوتاہی بھی ساتھ ساتھ بڑھے۔ پس سالک کی جس قدر معرفت بڑھے گی اس کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہیچ در ہیچ ہوں۔ اور میں نے راستہ کا ایک قدم بھی طے نہیں کیا اور خدا تعالیٰ کا ایک حق بھی ادا نہیں کیا۔ اگر خدا تعالیٰ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگیں تو کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اس لئے کہ حقوق تو ہم ادا کر ہی نہیں سکتے اسی واسطے اس کا مواخذہ نہ ہوگا کہ ہمارے حقوق پورے کیوں نہیں ادا کئے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ادائے حقوق میں کیوں نہیں لگے۔

مدار نجات

ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر اور دیکھو کہ اس مقام پر عقل تو ادائے تمام حقوق کا فتویٰ دیتی

[1] مسند أحمد ٦: ٥٨، إتحاف السادة المتقين للزبيدي ٢: ٧١

ہے اور حقوق کا ادائے تام ممکن نہیں تو یہ آپ کی عقل جس پر آپ کو ناز ہے آپ کو مجرم بنانا چاہتی ہے اگر شریعت نہ ہوتی جو کہ ادائے حقوق میں لگ جانے پر کفایت کرتی ہے اور عقل ہی پر مدار ہوتا تو سب ہلاک ہو جاتے لیکن حق تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور مدار کار عقل پر نہیں رکھا۔

چنانچہ فرماتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ کسی شخص کو اسی کے عمل سے نجات نہ ہوگی۔ بلکہ رحمت سے ہوگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ **یارسول الله ! ولا انت** یعنی یارسول اللہ! کیا آپ کو بھی عمل سے نجات نہ ہوگی! **قال ولا انا الا ان یتغمد فی الله برحمته**[1] ''فرمایا مجھ کو بھی نجات نہ ہوگی۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔'' اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ممکن الوجود شخص سے عمل نہیں ہو سکتا۔ خواہ نبی ہو یا ولی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہیں الٰہ نہیں ہیں۔ ہاں انسان کامل بلکہ اکمل الکاملین ہیں۔ اسی لئے عمل کسی کا نجات دینے والا نہیں (اور بعض آیات سے جو معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور نعیم جنت اعمال کا بدلہ ہے تو اس کو بدلہ اور جزا بنانا یہی رحمت ہے۔۱۲ جامع)۔

تو دیکھو! ہم نے عقل کو وکیل بنایا تھا۔ مگر حاکم حقیقی نے اس کی وکالت کو نہیں قبول کیا اور اس بیرسٹر کی بکواس کو رد کر دیا اور یہ فرمایا کہ اگر ہم تمہارے بیرسٹر کی تقریر پر فیصلہ کریں گے تو تم سب مقدمہ میں ناکامیاب ہو کر جیل خانہ میں رہو گے لہٰذا ہم اس کی تقریر نہیں سنتے اور اپنے مراحم خسروانہ سے تم کو خلاصہ بخشتے ہیں یعنی ہم اس کو نہیں دیکھتے کہ تم نے ہمارے حقوق ادا بھی کئے۔ ہاں ہم اس کا ضرور انتظار کریں گے کہ حقوق کے اندر مشغول بھی تھے یا نہیں۔ اس لئے ارشاد ہے **هواعلم بمن اتقى** یعنی یہاں تم اپنے کو پاک نہ کہو۔ پاک اور متقی کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کون ہے۔ واللہ ثم واللہ! کہ اگر انسان کو اپنی قدر اور حیثیت کا اندازہ اور صحیح علم ہو جائے تو یہ کہتے ہوئے بھی شرم آئے کہ انا موجود چہ جائیکہ یہ کہے **انا كذا وانا كذا** حق تعالیٰ کی قدرت اور عظمت چونکہ پیش نظر نہیں ہے اس لئے یہ سب کے سب دعوے ہیں۔

تحقیقات جدیدہ اور طاعون

تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ ایک قطرہ پانی میں خوردبین کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس قدر کیڑے ہیں جس قدر کہ تمام دنیا کے آدمی۔ اور چلتے ہیں، پھرتے ہیں کھاتے ہیں

[1] مجمع الزوائد للھیثمی ۱۰: ۳۵۶، ۳۵۷

اور ان میں آنکھ، ناک، منہ، پیر، دماغ۔ سب کچھ ہے اللہ اکبر!

اس مضمون کا تتمہ جو کہ اس کے ایزاد سے مقصود ہے آگے آئے گا۔ مگر درمیان میں ایک مفید مضمون اس کے متعلق یاد آ گیا۔ اس کو پہلے عرض کئے دیتا ہوں کہ دیکھو ایک قطرہ میں اتنے کیڑے ہیں اور پھر وہ قطرے آپ پیتے ہیں خدا تعالیٰ ہی محافظت کرتے ہیں۔ خبر بھی نہیں کہ ہم کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں۔ یہ خوردبین تھوڑے دنوں سے ہوگئی ہے۔ اس سے یہ علم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹروں نے یہ ہانک دیا کہ یہ طاعون ان کیڑوں کی وجہ سے ہے جب پانی خراب ہوتا ہے تو ان میں سمیت آ جاتی ہے لوگوں کو بھی ان کے کہنے کا یقین آ گیا اور چونکہ خدا تعالیٰ کے ساتھ جیسا گمان آدمی کا ہوتا ہے ویسا ہو بھی جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ جب ان کیڑوں میں طاعون کا خیال بندھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی طاعون اس میں پیدا کر دیا۔ ورنہ ان تحقیقات سے پہلے نہ طاعون تھا نہ کچھ تھا۔

مجھ کو اس پر ایک حدیث یاد آئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ اس کو بخار ہے فرمایا لاباس طهور انشا الله تعالیٰ[1]۔ یعنی کچھ حرج نہیں۔ یہ بخار تمہارے حق میں مطہر ہے۔

اللہ اکبر! عیادت کا حق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ادا کرنے والا کون ہوگا۔ عیادت کی غرض اصلی تسلیہ ہے اور تسلی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ کہ جس شے کو وہ ضرر سمجھتا ہو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفع کے افراد میں داخل کر دیں۔ یہ تو ایسے تسلی ہے کہ طبیعت میں اس قدر تسلی اس سے ہونی چاہیے کہ مرض بھی نہ رہے لیکن اس تسلیہ کی اس بیمار نے قدر نہ کی وہ ایک ضعیف الایمان بڈھا تھا کہتا ہے کلابل حمی تقع علیٰ شیخ کبیر تزیره القبور۔ (ہرگز نہیں بلکہ یہ تو ایسا بخار ہے جو ایک بوڑھے کو قبر میں پہنچادے گا) فرمایا اچھا یوں ہی سہی۔ چنانچہ وہ بڈھا اسی میں ختم ہو گیا۔

غرض! تم کو اگر طاعون پسند ہے تو طاعون بھی موجود ہے اور اگر شفا چاہتے ہو تو شفا بھی موجود ہے۔ صاحبو! حق تعالیٰ سے عافیت اور امن مانگنا چاہیے اور یہی گمان بھی رکھنا چاہیے ہاں اگر اس کے بعد بھی بحکمت الٰہیہ ابتلا ہو جائے تو صبر کرنا چاہیے بعض لوگ بہت بے صبر ہوتے ہیں اور مصیبت میں ایسے کلمات بول اٹھتے ہیں کہ ایمان تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ہاں جو اللہ والے ہیں وہ ایسے مواقع میں بھی مستقل رہتے ہیں۔

---

[1] الصحيح للبخارى ۴: ۲۴۶، ۷: ۱۵۳، ۹: ۱۷۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۵۲۹

چنانچہ ایک بزرگ نے دیکھا ہے کہ لوگ بھاگے جارہے ہیں کسی سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہیں کہا کہ طاعون سے بھاگ رہے ہیں۔تو آپ فرماتے ہیں **یاطاعون خذنی الیک** یعنی اے طاعون تو مجھ کو لے لے۔ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ زبان حال سے یوں کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا کبھی نصیب نہ ہو کہ میری تلوار سے ہلاک ہوجائے دوستوں کا سر میری خنجر آزمائی کیلئے سلامت ہے۔

وہم کا اثر

الحاصل طاعون کا سبب موثر کیڑے وغیرہ کچھ نہیں۔یہ محض وہم ہے اگر ایسا ہوتا تو جو لوگ طاعونیوں سے ملے جلے رہتے ہیں ان کو طاعون ضرور ہونا چاہیے تھا۔حالانکہ بہتوں کو باوجود ان کی تمنا کے بھی نہیں ہوتا۔

کانپور میں میرے بعض دوستوں نے طاعون کے ایام میں التزام کرلیا تھا کہ ہم مبتلایان طاعون کی خدمت کریں گے۔چنانچہ انہوں نے اول سے آخر تک تجہیز و تکفین و تدفین سب کچھ کیا لیکن وہ بیمار تک بھی نہ ہوئے۔اچھے خاصے اب بھی موجود ہیں یہ نرا وہم ہے۔وہم سوار ہوجاتا ہے اور وہم ایسی شے ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے تو واقعی اثر بھی ہوجاتا ہے۔

ہمارے استاد مولانا فرماتے تھے کہ دہلی میں ایک ڈوم تھا۔رمضان المبارک کے دنوں میں مسجد میں قرآن سنا کرتا تھا۔مومن خاں شاعر سے اس نے کہا کہ خاں صاحب جب قرآن میں وہ سورۃ آئے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے۔مجھ کو ایک روز پہلے اطلاع کردیجئے گا۔میں اس روز نہ آؤں گا۔ مومن خاں نے کہا کہ بڑے میاں وہ سورۃ تو آچکی فوراً اس کو بخار چڑھ آیا اور مُردوں کی طرح گھر جاکر لیٹ رہا اور ایسا وہم سوار ہوا کہ تیسرے دن مرگیا۔

قاری عبداللہ صاحب مکی نقل فرماتے تھے کہ یہاں ایک سال غالباً جاورہ کے رئیس حج کرنے کیلئے آئے تھے۔اتفاق سے ان کی بی بی کو ہیضہ پڑا۔نئی نئی شادی کی تھی بی بی کو چاہتے بہت تھے۔نواب صاحب کو بے انتہا گھبراہٹ ہوئی۔حتی کہ اسی غم میں ان کی روح تحلیل ہوگئی۔اور بیوی صاحبہ اچھی خاصی ہوگئیں۔ظہر کے وقت نواب صاحب کا جنازہ حرم میں آیا۔ہم کو افسوس ہوا کہ مریضہ مرگئیں۔نواب صاحب کو کیسا رنج ہوگا۔تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب کا جنازہ ہے۔

اسی واسطے شریعت نے بیماری کے لگنے میں بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں بیماری لگتی ہے جب نہیں چاہتے نہیں لگتی اور اسی طرح تمام اسباب کے متعلق شریعت کا یہی فیصلہ ہے کہ

جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں اسباب کے بعد مسبب کو پیدا کر دیتے ہیں اور نہیں چاہتے تو نہیں کرتے۔

اب اس قاعدہ پر کچھ اشکال ہی نہیں اور بغیر اس عقیدہ کے مفر بھی نہیں ہے ورنہ اس قدر اشکالات وارد ہوں گے کہ جواب دیتے دیتے تنگ ہو جاؤ گے اور پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے مولانا فرماتے ہیں ۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ☆ بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

نیارد زمیں تانگوئی بیار ☆ نبارد ہواتانہ مگوئی ببار

(مٹی، ہوا، پانی، آگ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں تیرے اور میرے نزدیک مردہ ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں)

پانی غرق نہیں کر سکتا۔ ہوا اڑا نہیں سکتی۔ طاعون کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ ان کا حکم نہ ہو۔

وحدۃ الوجود

الحاصل! میں یہ بیان کر رہا تھا کہ یہ تحقیق ہوا ہے کہ ایک قطرہ پانی میں کروڑوں جراثیم ہیں۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک قطرہ پانی کو انسان سے کیا نسبت ہے۔ پھر اس ایک قطرہ پانی میں جو جراثیم ہیں ان میں سے ایک کیڑے کو دیکھئے کہ کیا نسبت ہے وہ کیڑا اگر یوں کہے کہ میں انسان کی خدمت کروں گا تو خدمت کرنا تو علیحدہ ہے اس کا یہ مقولہ سن کر ہی بے انتہا ہنسی آئیگی اور بالفرض! اگر وہ کچھ خدمت کرے مثلاً پاؤں دبائے تو کچھ بھی خبر نہ ہوگی۔ پس وہ کیڑا محال ہے کہ انسان کا کوئی حق ادا کر سکے۔ یا کسی درجہ میں اس کو نفع پہنچا سکے اور اگر اس پر وہ انسان کے مقابلہ میں کوئی رائے لگائے یا تحقیقات اور علوم وصنائع کا بھی دعویٰ کرے تو وہ محو کر دینے کے قابل ہے۔

پس جو نسبت ہم کو اس کیڑے سے ہے واللہ العظیم۔ ہم کو بلکہ تمام کو حق تعالیٰ جل جلالہٗ سے اس قدر بھی نسبت نہیں۔ پس آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں بڑا صاف ہوں پاک ہوں۔ ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے جیسے وہ کیڑا انسان کے مقابلہ میں یوں کہے کہ میں ایسا چمکدار ہوں اور ایسا خوب صورت ہوں۔ اگر وہ انسان کو دیکھ لے تو واللہ! اس سے بھی شرمائے کہ یوں کہے کہ میں کوئی چیز ہوں اور جن پر کچھ فضل ہو گیا ہے ان کی یہی کیفیت ہوئی۔

ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کو ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا۔ اور وہ منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے ساتھ کیوں تمسخر کرتے ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اجازت دیدی لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی۔ فرمایا کہ اس وقت مجھ پر اضمحلال وجودی انکشاف ہوا۔ مجھ کو نہایت شرم

معلوم ہوئی اور میں اپنی نظر میں لاشے محض ہو گیا۔

بعض بزرگ جو اپنی خدمت سے منع کرتے ہیں تم تو یہ سمجھتے ہو کہ یہ تنگ مزاج ہیں تم کو کیا خبر ہے۔ان پر کیا گزرتی ہے۔

اے تراخارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ☆ حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(اے وہ شخص کہ جس کا ایک کانٹے سے پاؤں تک زخمی نہیں ہوا تو اس شخص کے حال کو کیا سمجھ سکتا ہے کہ جو بلاؤں کی تلواریں اپنے سروں پر کھاتے ہیں)

تم تو ان کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو حالانکہ ان کی دوسری حالت ہے۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام ☆ پس سخن کوتاہ بایدو السلام

(خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا، بات مختصر چاہیے طویل کلام سے کیا فائدہ والسلام)

پس کاملین کو ہرگز اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیے۔چنانچہ جن بزرگوں پر اضمحلال وجود اور فنا کی حالت ہوتی ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو کافر تک سے بدتر سمجھتے ہیں۔ دعا کرتے ہوئے اور نماز پڑھتے ہوئے ان کو شرم آتی ہے مگر حکم سے کرتے ہیں۔اسی حالت کی نسبت شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند ☆ کہ بارہستیش نام ہستی برند

(ان کا جو کچھ وجود نظر آتا ہے وہ اس سے حقیر تر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ساتھ اپنے وجود کا نام لئے پھرتے ہیں)

یہی حالت ہے جس کا نام وحدۃ الوجود ہے۔حق تعالیٰ کی ہستی ایسی ان کو پیش نظر ہوتی ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا ہوا پاتے ہیں۔اور اس طرح مٹ جاتے ہیں جیسے آفتاب کے سامنے چراغ کہ اس کو باعتبار ذات کے ہست کہہ سکتے ہیں اور آفتاب کے نور کے سامنے اس کو نیست بھی کہا جا سکتا ہے۔حضرت عارف شیرازی بہت واضح مثال میں اس کو بیان فرماتے ہیں۔

مگر دیدہ باشی کہ درباغ وراغ ☆ بتابد بشب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے کرمک شب فروز ☆ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بہ بیں کاتشیں کرمک خاک زاد ☆ جواب ازسر روشنائی چہ داد

کہ من روز وشب جز بصحرا نیم ☆ ولے پیش خورشید پیدا نیم

(باغ میں پھرتے ہوئے دیکھا کہ جگنو چراغ کی مانند چمک رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اے رات میں چمکنے والے جگنو تو دن میں سامنے کیوں نہیں آتا۔ دیکھ اس مٹی میں رہنے والے جگنو نے اپنی چمک دمک کے بارے میں کیا جواب دیا کہ میں تو شب و روز صحرا ہی میں رہتا ہوں لیکن سورج کے سامنے میری روشنی نظر ہی نہیں آتی)

شیخ اکبر اسی مقام کی نسبت فرماتے ہیں۔

واللہ ماشمت الکائنات رائحۃ الوجود

''یعنی خدا کی قسم ہے کہ کائنات عالم نے وجود کی بوتک نہیں سونگھی ہے''۔

پس جب کہ ہماری ہستی ایسی بے بود ہے تو عقلی طور سے سمجھ میں آ گیا کہ ہم کو پاکیزگی کا دعوی کرنا کہاں تک زیب دیتا ہے۔ پس اس تقریر پر لاتزکوا انفسکم اور قدافلح من زکھا۔ میں کوئی تعارض نہ رہا اور شبہ دفع ہو گیا۔

ام المعاصی

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ مجھ کو مقصود بالبیان نفس کا تزکیہ ہے معاصی سے۔ خواہ وہ معاصی ظاہری ہوں یا باطنی۔ اور ہر چند کہ معاصی بہت سے ہیں لیکن منشا ان سب کا صرف دو چیزیں ہیں۔ اول شہوت یا لذت۔ دوسرے کبر یا غضب۔ یہ دو مادہ خبیثہ ہیں کہ جن سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں۔ پس نفس کو اسباب شہوت و کبر سے بچانا حاصل تزکیہ کا ہے۔ شریعت نے ان ہی دو مادوں کا طرح طرح سے معالجہ کیا ہے معالجہ کی دو قسمیں ہیں۔ معالجہ تفصیلی اور معالجہ اجمالی لیکن معالجہ تفصیلی کا مرجع ہمیشہ کوئی امر اجمالی ہوتا ہے۔ جیسے طبیب نے چند اجزاء سے ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ پس بظاہر تو وہ اجزاء متعدد ہیں لیکن حاصل ان کا مثلاً صفرا کا قمع کرنا ایک ہے۔

شریعت نے دونوں قسم کے معالجے کئے ہیں۔ دیکھو بنی اسرائیل کو حب مال اور حب جاہ حق کے اتباع سے سد راہ ہوئی۔ حق تعالیٰ نے دونوں کا معالجہ تفصیلی فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے واقیمو الصلوٰۃ۔ یہ تو حب جاہ کا معالجہ ہے۔ واتو الزکوٰۃ۔ یہ حب مال کا علاج ہے۔ وارکعوا مع الراکعین۔ جو تتمہ ہے اقیموا الصلوٰۃ کا۔ یہ کبر کے زائل ہونے کی تدبیر ہے۔ حق تعالیٰ نے جابجا جو مجاہدات بیان فرمائے ہیں سب کا حاصل ان ہی دو خصلتوں سے تزکیہ ہے۔ میں اسی کی شرح کرنا چاہتا ہوں اور اسی سے اعمال رمضان کی حکمتیں اور روح معلوم ہو جائیں

گی۔اور یہ معلوم ہوگا کہ ہمارا رمضان درحقیقت بری طرح سے گزرتا ہے۔

کلابی تقویٰ

بہت تو اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ ان کے گھر رمضان آتا ہی نہیں نہ دن کو نہ رات کو۔یعنی نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ روزہ رکھتے ہیں اور بعض کے یہاں دن کو تو آتا ہے لیکن رات کو نہیں آتا۔یعنی نماز وتر واتح نہیں پڑھتے اور دن کو بھی جو آتا ہے تو بعض کے آثار کے اعتبار سے آتا ہے یعنی کھانا پینا تو چھوڑ دیتے ہیں لیکن جس شے کا چھوڑنا بڑا ضروری تھا۔یعنی معاصی ان کو نہیں چھوڑتے۔

صاحبو! غضب کی بات ہے کہ جو شے یعنی کھانا پینا کہ فی نفسہٖ مباح ہے دن کو بھی اور رات کو بھی اور رمضان میں رات کو اور معذور کے لئے دن کو بھی جائز ہے جب کہ شارع نے اس کو ماہ مبارک میں چھڑا دیا تو معاصی جو کہ کسی وقت اور کسی حالت میں کسی عذر سے جائز ہی نہیں وہ کیسے ترک کے قابل نہ ہوں گے اور ان کے ترک کا اہتمام کیوں نہ زیادہ کیا جائے گا۔افسوس تو یہ ہے کہ کھانا پینا تو چھوڑ دیا لیکن گناہ نہ چھوڑے۔

ہمارے اس تقویٰ کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے بدکاری کی اور حمل رہ گیا۔کسی نے کہا کہ کم بخت تو نے عزل نہ کرلیا۔کہنے لگا کہ میں نے علماء سنا تھا کہ مکروہ ہے۔تو زنا جو کہ حرام قطعی ہے اس کے ارتکاب میں تو باک نہیں کیا اور عزل میں آپ کو تقویٰ پر عمل ہوا۔

ایسا ہی ہمارا تقویٰ ہے ایسے تقویٰ کو تقویٰ کلابی کہتے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کتا جب پیشاب کرتا ہے تو ٹانگ اٹھا کر کسی دیوار پر کردیتا ہے کہ ایسا نہ ہو مجھ کو چھینٹ لگ جائے لیکن اگر کہیں پلیدی پاتا ہے تو وہ کھالیتا ہے تو ٹانگ تو نجاست سے بچاتا ہے اور منہ کو نہیں بچاتا۔

ایک گنوار عورت کی حکایت مشہور ہے کہ اس سے کسی نے پوچھا کہ تیرا میاں کہاں گیا تو شرم کی وجہ سے منہ سے تو بولی نہیں لہنگا اٹھا کر اور پیشاب کر کے اس کو پھاند گئی مطلب یہ تھا کہ دریا پار گیا ہے۔

ہم اس عورت کی حماقت پر ہنستے ہیں کہ اچھی شرم آئی۔بولنے کی تو شرم کی اور ننگے ہوتے ہوئے شرم نہ آئی۔لیکن ہم سب اس بلا میں مبتلا ہیں۔گو روزہ میں معمولی کھانا کھایا پیا نہیں لیکن مردہ مسلمان کا گوشت کھایا یعنی غیبت کی منہ تو بند کرلیا لیکن غیبت اور بہتان سننے کیلئے کان کھول دیئے۔کھانے سے ہاتھ روکا لیکن ظلم کرنے اور تاش اور گنجفہ اور شطرنج کھیلنے اور جھوٹی دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے خوب چلایا۔زبان کو لقموں سے نہیں چلایا لیکن مسلمانوں کو برا کہنے اور سب

دشنام اور جھوٹی گواہی دینے سے اس کو نہیں روکا۔

اے صاحبو! یہ کیسا تقویٰ ہے یہ کیسا روزہ ہے یہ کیسی دینداری ہے اگر یہی دین وایمان ہے تو **بئسما یامرکم به ایمانکم ان کنتم مؤمنین.**

تفریق وتنفیر

درحقیقت ہم نے روزہ کے معنی اور غرض ہی نہیں سمجھی۔ روزہ کی اصلی غرض تھی کسر قوت بہیمیہ کے واسطے سے معاصی سے بچنا۔ جب معاصی سے ہم عین روزہ کی حالت میں بھی نہ بچے تو بعد میں وہ غرض اور غایت اس پر کیسے مرتب ہوسکتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اس کا روزہ جھوٹ بولنے سے نہ روکے اللہ تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پانی چھوڑے۔ یہ مطلب نہیں کہ جو جھوٹ سے بچتا ہے اس کے روزہ کی اللہ میاں کو حاجت ہے اس لئے کہ ان کی شان تو **ان الله لغنی عن العلمین**۔ بلکہ مقصود ناراضی اور ناخوشی ظاہر کرنا ہے پس جن کے یہاں رمضان المبارک دن کو اس شان سے آتا ہے۔ سو یہ کیا آتا ہے۔ ہاں روپیہ میں سے آنہ ہے اور رات کو تو پوچھو ہی مت۔ رات کو تو شاذ ونادر ہی کسی کے یہاں آتے ہیں اس لئے کہ جو عبادت رمضان المبارک کی راتوں میں مقرر کی گئی ہے اس کے حقوق ادا کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ عموماً بوجھ سا ٹالتے ہیں۔

چنانچہ تراویح کی وہ گت بنتی ہے کہ الٰہی توبہ۔ سب سے اول یہ کوشش ہوتی ہے کہ اذان سب سے پہلے کہی جائے۔ چنانچہ بعض مساجد میں تو عشاء کی اذان رمضان میں مغرب کے وقت ہوتی ہے عشاء کا وقت آتا بھی نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو مغرب ہی کے وقت فارغ ہولیا کریں۔ کہیں تو یہ ستم ہے کہ اذان ہی بے وقت ہوتی ہے اور کہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ فرض بھی عشاء سے پہلے ہی ہوجاتے ہیں۔ اور کہیں صرف اذان بے وقت ہوتی ہے اور بعض ان کے مقابل یہ زیادتی کرتے ہیں کہ وہ تاخیر کے دلدادہ ہیں۔

روزہ افطار کیا اور سور ہے اور مقتدی بچارے سوکھ رہے ہیں یہ زیادہ تر رؤسا کی مسجدوں میں ہوتا ہے کہ وہ رئیس ہیں ان کے ڈر سے کوئی بولتا نہیں جب تشریف لاتے ہیں اسی وقت نماز ہوتی ہے۔ یاد رکھو اس سے تفریق وتنفیر ہوتی ہے۔

امام کا فرض

حدیث شریف میں قصہ آیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں امام تھے

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نفل کی نیت سے شریک ہوتے پھر وہاں جا کر نماز پڑھایا کرتے تھے ایک مرتبہ عشاء کی نماز پڑھانے کے لئے گئے تو سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ ایک محلہ دار غریب دن بھر کی محنت مشقت سے تھکے ہوئے تھے وہ جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنی نماز پڑھ کر چلے گئے۔ اس وقت میں جماعت کے ساتھ شریک نہ ہونا نفاق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ان کو برا بھلا کہا۔ صبح کو یہ مقدمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوا۔ ان اصحابی نے حضرت معاذؓ کی شکایت کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم مزدوری پیشہ لوگ ہیں دن بھر تو مزدوری محنت کرتے ہیں اور رات کو یہ سورۂ بقرہ شروع کر دیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر عتاب فرمایا اور فرمایا۔ افتان انت یامعاذ[1] یعنی ارے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والے ہو۔

والشمس، واللیل، والتین پڑھا کرو۔ فان فیھم الضعیف والسقیم وذوالحاجۃ۔ یعنی مقتدیوں میں ضعیف، بیمار، کاروبار والے آدمی ہیں اس زمانہ میں ہم نے امام بہت دیکھے ہیں لیکن حضرت گنگوہیؒ کے برابر ہلکی اور پھر تمام ارکان کو کمال کے ساتھ نماز پڑھانے والا نہیں دیکھا۔

حضرت قرآن شریف ایسا پڑھتے تھے کہ سننے والے کو تاب نہ ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ سنے جائیں۔ مگر عادت حضرت کی یہ تھی کہ فجر کی نماز میں سورۂ بروج وطارق یا اذا الشمس کورت واذاالسماء انفطرت پڑھتے تھے پس اس قدر تاخیر نماز میں کرنا یا قرات اتنی لمبی پڑھنا جس سے نمازی بھاگ جائیں جائز نہیں ہے۔

تراویح اور حفاظ

بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ رمضان میں نمازی ایک قرآن ہی سننے سے اکتاتے ہوں تو وہاں تراویح الم تر کیف سے پڑھ لیں۔ بعض حفاظ ایسا ستم ڈھاتے ہیں کہ پانچ پانچ پارے پڑھ جاتے ہیں۔ ان حفاظ کو مسائل جاننے کی سخت ضرورت ہے بعض حافظ بہت جاہل ہوتے ہیں عجب نہیں بلکہ غالب ہے کہ سجدہ سہو کے مسائل کی بھی ان کو خبر نہ ہو۔

بعضے نابالغوں کو تراویح میں امام بنا دیتے ہیں۔ نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنے میں اختلاف ہے۔ مختار اور مفتی بہ یہی ہے کہ ناجائز ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو بالغ تمیزدار نہ ہو اور مسائل

[1] مسند أحمد ۳: ۲۹۹، كنز العمال: ۲۲۹۲۵، المصنف لابن أبي شيبة ۱: ۳۵۹

سے واقفیت نہ رکھتا ہو اس کو بھی امام بنانا مناسب نہیں۔ امام یا تو عالم ہو یا علماء کا صحبت یافتہ ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ دونوں امر نہ ہوں تو وہ ضرور نماز کو خراب کریگا۔

مجھے خود ایسا موقع پیش آیا ہے گرمیوں کے رمضان تھے۔ میں اور ایک میرا سامع تھا۔ ہم دونوں ایک مسجد میں قرآن سننے کیلئے گئے۔ ان حافظ صاحب نے ایک رکعت میں آدھا پارہ گھسیٹا۔ ان کو یاد تو رہا نہیں کہ ایک رکعت ہوئی یا دو وہ ایک ہی رکعت پر بیٹھ گئے۔ مقتدی بچارے تھکے ہوئے تھے انہوں نے غنیمت سمجھا یا یاد نہ رہا ہو۔ کسی نے نہ بتلایا۔ میں نے اپنے سامع سے کہا کہ تم شریک ہو کر بتلا دو لیکن انہوں نے جلدی سے سلام پھیر دیا۔ میں نے پکار کر کہا کہ حضرت ایک رکعت ہوئی ہے اعادہ کرو اور یہ قرآن جو تم نے پڑھا ہے اس کا بھی اعادہ کرلو۔ اس وقت امام اور مقتدیوں میں خوب چخ چخ ہوئی۔

ان حفاظ کی ایک یہ بھی عادت ہے کہ اول کی رکعتوں میں بہت کھینچتے ہیں اور آخر کی رکعتوں میں دو دو تین تین آیتیں پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ سب رکعتیں اور سجدہ اور رکوع متناسب ہونے چاہئیں۔

حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارہ میں آیا ہے کان رسول الله صلی الله علیه وسلم قریباً من السواء[1] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز معتدل ہوتی تھی اگر قیام طویل ہوتا تھا تو سجدہ رکوع بھی اس کے مناسب ہوتا تھا۔

اب لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں کہ قیام طویل کرتے ہیں اور سجدہ ورکوع قعدہ نہایت ہی مختصر۔ اس زمانہ میں تو بس تمام نماز مختصر پڑھنا چاہیے۔ اسی واسطے میں شبینہ کو بھی پسند نہیں کرتا۔ پہلے لوگ قوی ہوتے تھے اور نیز ان کو شوق بہت تھا۔

اب تو یہ حالت ہے کہ ایک جگہ شبینہ ہو رہا تھا۔ ایک حافظ چارپائی پر لیٹے ہوئے بتلا رہے تھے۔ سب کی نماز تباہ ہو رہی تھی۔ کسی کی ہمت ہو خود پڑھو۔ لوگوں کو کیوں دق کرتے ہو۔ آج کل لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔

کانپور میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ کہنے لگے کہ نماز جمعہ کی ہم پڑھائیں گے۔ اور وہ خطبہ پڑھیں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول قدوم مدینہ میں پڑھا تھا چنانچہ انہوں نے ایک بڑا لمبا خطبہ پڑھا۔ خطبہ کے بعد نماز شروع ہوئی تو انہوں نے سورۂ کہف شروع کی۔ گرمیوں

---

[1] لم أجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث النبوي الشريف"

کا موسم اور پھر مسجد ایسی کہ اس میں ہوا کا گزر نہیں۔ ایک شخص کو تو قے ہوگئی۔ اور ایک شخص نیت توڑ کر بھاگ گئے اور کہا کہ اسی واسطے تو ہم مسجد میں نماز پڑھنے نہیں آتے۔

ہمارے تھانہ بھون میں ایک شخص تھے وہ نماز نہ پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ میرے ساتھ ان کو سفر کا اتفاق ہوا۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آیا۔ میں نے ان کو تو کچھ کہا نہیں۔ میں لوٹا لے کر وضو کرنے کیلئے گیا۔ دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے آرہے ہیں۔ اور وضو کر کے میرے ساتھ انہوں نے نماز پڑھی پھر کئی روز میرے ساتھ رہے اور برابر نماز پڑھتے رہے کہنے لگے مجھے اگر ایسا امام ملے تو میں نماز نہ چھوڑوں میری نمازوں کی ترک کا بوجھ تو ان اماموں کی گردن پر ہے جو لمبی رکعتیں پڑھ کر گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔

حفاظ اور ائمہ کا فرض

اے حفاظ اور اے امامو! اپنے مقتدیوں کو دیکھ لو کہ کیسے ہیں۔ اگر واقعی ان کو قرآن سننے کا شوق ہو تو سبحان اللہ! قرآن زیادہ پڑھو۔ قرآن تو جس قدر بھی زیادہ ہو باعث نورانیت ہے اور اگر دیکھو کہ شوق نہیں ہے جیسا آجکل ہے تو بس سوا پارہ اچھی مقدار ہے اور بہتر یہ ہے کہ پندرہ پارہ تک تو سوا سوا پڑھو اور پھر ایک ایک پارہ کر دو۔ ۲۷ کو ختم ہو جائیگا اور سب رکعتیں برابر برابر پڑھو۔ دیکھو تم کو ہر شے کے اندر تناسب اور حسن اچھا معلوم ہوتا ہے نماز تو احق ہے اس بات کے ساتھ کہ اس کو حسین کرو۔

داؤد علیہ السلام لوہے کی زرہیں بناتے تھے ان کو حق تعالیٰ نے حکم فرمایا **ان اعمل اسابغات وقدر فی السرد**۔ یعنی اے داؤد! پوری پوری زرہیں بناؤ اور اس کے بنانے میں انداز رکھو یعنی کڑیاں بڑی چھوٹی نہ ہوں۔ جب کہ لوہے کی زرہوں کے اندر تناسب کا حکم ہے تو اے صاحبو! نماز تو بہت بڑی شے ہے اس میں تناسب کیوں نہ مامور ہوگا۔ اگر تم میں یہ رعایت تناسب طبعی نہ ہو تو ذکر اللہ کی کثرت کیا کرو۔ اس سے طبیعت میں نفاست اور اعتدال پسندی پیدا ہو جائے گی اور ہر امر میں تناسب کی رعایت رکھنے لگو گے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں اگر کوئی بدنما مکان دیکھتے تھے تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ مرزا صاحب کی لطافت مزاج کی بہت حکایتیں ہیں ایک حکایت مجھ کو اس وقت یاد آئی۔ ایک شخص مرزا صاحب کے یہاں آیا کرتے تھے وہ کھانا بہت کھاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خود عرض کیا کہ مجھ کو کوئی حکم دیجئے۔ بہت اصرار کے بعد مرزا صاحب نے ان کو فرمایا کہ آپ ایک سال میں

صرف ایک مرتبہ آیا کریں اس لئے کہ جب آپ کھاتے ہیں مجھ کو تمہارے زیادہ کھانے کا تصور ہو کر ثقل ہو جاتا ہے۔ تو مجھ کو مسہل لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے تو سال میں ایک مسہل کا تحمل ہو سکتا ہے دو سے تکلیف ہوتی ہے۔

اسی طرح ہم نے اپنے حضرات کو دیکھا ہے کہ نہایت نفاست اور تناسب ہر شے کے اندر پسند کرتے ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے **ان اللہ جمیل ویحب الجمال** (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں) اور یہ حضرات موصوف ہوتے ہیں صفات حق سے۔ اس لئے ان کو بھی جمال یعنی تناسب (نہ کہ صورت پرستی) ہر شے میں پسندیدہ ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے **نظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود**[1] ''یعنی اپنے گھروں کے صحن کو صاف رکھا کرو اور یہود کے مشابہ مت بنو۔''

یہود اکثر میلے کچیلے رہا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا کہ پریشان بال اور میلا کچیلا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت پر انکار فرما کر کنگھی اور تیل سے بالوں کے درست کرنے کا حکم فرمایا۔ کوئی تواضع نہیں ہے کہ آدمی میلا کچیلا رہا کرے اور نہ ایسی زینت پسندیدہ ہے کہ ہر وقت نواب اور بیگم بنا رہے۔

ایک شخص کو ہم نے دیکھا ہے کہ بہت ہی بنے ٹھنے رہتے تھے اگر وہ گھر میں ہوتے تھے اور کوئی ان کو بلاتا تھا تو اول آئینہ کنگھا منگاتے تھے۔ بالوں میں کنگھا کرتے تھے کئی کئی مرتبہ آئینہ دیکھتے تھے۔ غرض کم از کم ۱۵ منٹ میں وہ دولت خانہ سے برآمد ہوتے تھے۔

بعض نوجوانوں کو میں نے دیکھتا ہوں کہ گرمیوں میں بھی جرابیں پہنتے ہیں۔ یہ اہل یورپ کی تقلید ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ سرد ملکوں کے رہنے والے ہیں اس لئے اس کے مناسب ان کی وضع ہے۔ تم بھی اول اپنے گھروں میں سردی پیدا کرو اس کو کشمیر بناؤ۔ اس کے بعد جرابیں پہنو تو مضائقہ نہیں۔ گرمیوں میں جرابیں پہننے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دماغوں میں خلل ضرور آ گیا ہے۔ غرض نہ تو ایسی زینت کی ضرورت ہے اور نہ اس قدر میلے کچیلے بنو توسط اور تناسب ہر شے میں بہتر ہے۔

خرابیوں کی جڑ

لیجئے جماعت کے اندر تناسب کا حکم ہے کہ صف سیدھی ہو۔ درمیان میں جگہ نہ چھوڑو۔ میں تو یہ

[1] سنن الترمذی: ۲۷۹۹، الدر المنتثرہ فی الأحادیث المشتھرۃ: ۲۰

کہتا ہوں کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں کہ جس میں تناسب ملحوظ نہ ہو۔ جب تناسب ہر امر میں مامور بہ ہے تو نماز کے اندر کیوں نہ ہوگا۔ پس تراویح اور غیر تراویح ہر نماز میں تناسب کی رعایت رکھو۔

غرض رات کو رمضان اکثروں کے یہاں نہیں آتا اور اس تمام خرابی کا منشا رمضان کے اسرار اور اس کی روح کا نہ جاننا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ تزکیہ کے متعلق مضمون بیان کیا جائے کہ اس کے ضمن میں رمضان کے روزہ کی حکمتیں بھی معلوم ہوں گی۔ پس جاننا چاہیے کہ منشا تمام تر معاصی اور خرابیوں کا دو چیزیں ہیں۔

اول لذت جس کو شہوت بھی کہہ سکتے ہیں دوسرے کبر جس کو غنیمت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں جڑ ہیں تمام مفاسد کی۔ پس ان دونوں سے تزکیہ نفس کا یعنی ان کی تعدیل ضروری ہے شریعت نے ان ہی دو مرضوں سے تزکیہ کیا ہے۔ اور تمام احکام ان ہی کے متعلق ہیں اور سبحان اللہ ایسی خوبی سے معالجہ فرمایا ہے کہ کوئی حکم ان احکام میں ایسا نہیں ہے کہ ہمارے طبعی مذاق اور فطری جذبات سے بعید ہو۔ تمام احکام ایسے ہیں کہ ہماری طبیعت انکو قبول کرتی ہے۔

مجاہدہ اور مواد خبیثہ

حکماء اشراقیین نے بھی اخلاق رذیلہ سے تزکیہ کیا ہے لیکن انہوں نے اس کے لئے ایسے سخت مجاہدے کئے ہیں کہ ہر زمانہ میں انسان ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ترک لذات کے خاص خاص طریقے مقرر کئے اور ان کی عادت ڈالی اور نفس کو مہذب بنایا۔ اور یہاں تک اس میں کمال پیدا کیا کہ آدمی کی تصویر دیکھ کر بتلا دیا کرتے تھے کہ اس کے اطوار و اخلاق کیا ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ کسی اشراقی کے سامنے کسی حکیم کی تصویر پیش کی گئی اس نے دیکھا اور کہا کہ یہ شخص زانی ہے لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہا بس جناب! آپ کا ادراک معلوم ہو گیا۔ یہ تصویر تو فلاں حکیم کی ہے اور وہ بڑا عفیف و پارسا شخص ہے۔ اشراقی نے کہا کہ اب تو میں نے کہہ دیا ہے خواہ اس کی تصویر ہو یا کسی کی ہو۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تمہاری نسبت ایسا کہا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ واقعی اس کا تقاضا تو میرے قلب میں بہت ہے لیکن میں نے مجاہدہ ریاضت سے نفس کو قابو میں کر لیا ہے صدور کبھی نہیں ہوا۔ اس تقاضا ہی کا اس کو ادراک ہوا۔ اس لئے کہ قیافہ سے مواد ہی کا ادراک ہو سکتا ہے۔ افعال کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے مواد خبیثہ بالکلیہ زائل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ مغلوب

ہو جاتے ہیں۔ سالک کو اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے جب اول ذکر کرتا ہے تو غلبہ ذکر سے مواد مضمحل ہو جاتے ہیں تو یہ شخص سمجھتا ہے کہ میرے نفس میں سے وہ مواد جاتے رہے حالانکہ وہ موجود ہیں لیکن چونکہ غلبہ دوسری شے کا ہے اس لئے وہ مدرک نہیں ہوتے اور جب وہ حالت غلبہ کی زائل ہو جاتی ہے اور پھر ان مواد کا ادراک ہوتا ہے تو اپنی حالت پر بہت افسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں مردود ہو گیا ہوں۔ حالانکہ یہ اس کی غلطی تھی وہ کیفیت جو زائل ہو گئی ہے اس کی مثال تو صبح کاذب کی سی ہے اور جو کیفیت اب پیدا ہوئی ہے وہ صبح صادق کے مثل ہے۔ پس جو شخص صبح کاذب کو روشنی سمجھے گا وہ صبح صادق کی طرف ملتفت ہونے سے پہلے ضرور متاسف ہو گا کہ ہائے! وہ روشنی کہاں گئی حالانکہ وہ روشنی نہ تھی روشنی تو اب آئی ہے مولاناؒ فرماتے ہیں۔

اے شدہ تو صبح کاذب را رہین ☆ صبح صادق راز کاذب ہم بہ بیں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ درختوں پر اول جھوٹا پھول آتا ہے پھر سچا پھول آتا ہے وہ مثمر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کیفیات وحالات کا قصہ ہے کہ اول اول غلبہ ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میرے اندر سے امراض جاتے رہے۔ اس کے بعد غلبہ جاتا رہتا ہے اور ایک ہلکی مگر پائیدار کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی اس کو وقعت نہیں ہوتی اور وہ امراض جن کو یہ زائل سمجھتا ہے مدرک ہوتے ہیں کہ شہوت بھی ہے۔ غضب بھی ہے، بخل بھی ہے، حرص بھی ہے لیکن پہلے میں اور اس وقت میں فرق اس قدر ہوتا ہے کہ پہلے تو ان کے مقتضا پر عمل کرنے سے بچ نہ سکتا تھا اور اب بعد مجاہدہ کے بسہولت بچ سکتا ہے۔

تہذیب نفس

پہلے نفس کو روکتا تھا اور نہ رکتا تھا۔ اور اب رک جاتا ہے بعینہٖ اس کی مثال شریر گھوڑے کی سی ہے کہ سدھانے سے پہلے تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ اور سوار کو پٹک (پٹخ) دیتا تھا اور بعد شائستہ ہونیکے گو گاہے شوخی کرتا ہے مگر تاہم قابو سے باہر نہیں ہوتا۔ سوار اس کو جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے چون وچرا نہیں کرتا۔ یہی کیفیت نفس کی ہے۔

دوسری شے جس کے تزکیہ کی ضرورت ہے کبر تھی۔ اس کے لئے وہ حکماء اسباب تذلل کو اختیار کیا کرتے تھے اور اس کی اعانت کے واسطے خلوت اور ترک اختلاط کرتے تھے اور اس میں بھی بہت مبالغہ کرتے تھے اور اصل مقصود ان کا صرف یہی تہذیب نفس تھا۔

شریعت نے بھی ان ہی دو خصلتوں کی تعدیل کی ہے اور اس کے لئے طرق ان حکما. کے

ترک سے اسہل اور نفع میں اکمل تجویز کیے ہیں۔ چنانچہ ترک لذات کیلئے تو روزہ مقرر فرمایا جس کی حقیقت ترک اکل وشرب وجماع ہے۔ اس لئے کہ امہات لذات یہی تین چیزیں ہیں۔ جتنی لذات ہیں سب کا حاصل یہی ہے ان کو روک دیا گیا۔ اور سبحان اللہ! کیا رحمت ہے کہ روزہ کو عبادت بنادیا۔ اور اس پر انعام بھی تجویز فرمایا مسہل ہم کو ہمارے امراض کے ازالہ کے لئے دیا جائے اور اس پر انعام بھی تجویز فرمایا۔ پس جب اسباب لذات کو تیس دن انسان چھوڑیگا تو نفس کی سرکشی ضرور کم ہوگی۔ اور مادہ عصیاں کا مغلوب ہو جائے گا۔

اور کیا رحمت ہے کہ مجاہدہ کے لئے ہماری عمر کا صرف بارہواں حصہ مقرر فرمایا اور حکماء برسوں ترک لذات سے مجاہدہ کرتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ ضعیف الجسم ہو جاتے تھے اور نسل ان کی منقطع ہو جاتی تھی اور پھر اس میں خوبی یہ رکھی کہ وہ ایک ماہ بھی ایک ہی موسم میں متعین نہیں رکھا کبھی جاڑوں اور کبھی گرمیوں میں آتا ہے تا کہ نرمی اور گرمی سے سب طرح کے مصالح مرعی ہوں۔

غرض! ایسا سہل اور لطیف مجاہدہ اور نفع میں ان کے مجاہدات سے کہیں زیادہ کہ سب کام کرتے رہو اور مجاہدہ بھی ہوتا رہے بجز صاحب وحی کے اور کسی کی عقل یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

شریعت کا مقصود

ایک اور رعایت عجیب وغریب یہ رکھی ہے کہ روزہ دن کو مقرر فرمایا۔ تا کہ مجاہدہ کا فائدہ حاصل ہو۔ اس لئے کہ مجاہدہ نام ترک عادت ہے اور کھانے پینے کی عادت اکثروں کو ہے۔

اگر یہ مجاہدہ رات کو ہوتا تو خبر بھی نہ ہوتی نہ کچھ نفس پر شاق ہوتا اور اگر حکماء جوگیہ کی طرح شب وروز کا روزہ ہوتا تو ضعیف ہو کر بالکل بیمار ہو جاتے اور قوی بیکار ہو جاتے اور شریعت کا مقصود قوئ شہویہ کا ازالہ نہیں بلکہ ان کی تعدیل ہے۔

نیز رات کو کھانے پینے کی اجازت دینے میں ایک اور دقیق رعایت ہے وہ یہ ہے کہ اس صورت میں مجاہدہ اور مشقت بھی زیادہ ہے کیونکہ بعض لذات کے ایک دم سے چھوڑ دینے میں نفس اسی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ بخلاف حالت موجودہ صوم کے کہ اس میں شب کو متلذذ ہونے سے اس کو لذت یاد رہتی ہے اور پھر ترک کرائی جاتی ہے۔ نفس پر یہ زیادہ بھاری ہے۔ یہ وہ مجاہدہ ہے کہ جو حکماء کے باپ کو بھی نہیں سوجھا۔ حکماء نے جو کچھ تجویز کیا تھا وہ بالکل ناتمام تھا شریعت نے اس کی تکمیل فرمائی ہے۔

مجھ کو کچھ ضرورت اس امر کی نہ تھی کہ حکماء کی مجاہدات اور تزکیہ کو میں ذکر کرتا۔ اس لئے کہ شریعت کے مقابلہ میں ان کے خیالات کا تذکرہ ایسا ہی ہے۔ جیسے آفتاب کے سامنے چراغ

کا بلکہ اس سے بھی بدرجہا کم۔ لیکن وجہ ان کے تذکرہ کی یہ ہوئی کہ آجکل عقل پرست مخلوق بہت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے میں دکھلاتا ہوں کہ روزہ وہ شے ہے کہ جس کی ضرورت کو امم ملیہ نے بھی تسلیم کیا ہے اور جس شخص نے اس کے راز کو سمجھ لیا ہو وہ اس سے دوسری جگہ بھی کام لے گا۔ پس جب کہ آپ حضرات نے روزہ کے حکم و مصالح سمجھ لیے تو اب اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔ جو روزہ نہیں رکھتے ان کو رکھنا چاہیے اور جو رکھتے ہیں اور اس کی حقوق کی رعایت نہیں رکھتے ان کو حقوق کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور نفس کو اس کے حال پر نہ چھوڑنا چاہیے۔ ایک ماہ کے لئے ہی اس سے صلح کرلو اور سمجھا دو کہ بس ایک ماہ تو اپنی خواہشات سے تائب ہو جا۔ ایک ماہ جب اس سے اس طرح کام لوگے تو ان شاء اللہ کام کرنے کی عادت ہو جائیگی۔

نفس کی مثال

نفس کی مثال بچہ کی سی ہے جس طرف اس کو لگاؤ لگ جاتا ہے ؎

والنفس کالعقل ان تھملہ سب علی　　　حب الرضاع وان تعظمہ ینفظم

(نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اگر دودھ چھوڑاؤ نہیں چھوڑے گا اگر چھڑاؤ گے چھوڑ دے گا)

اس سے کام لے کر دیکھو۔ تم دیکھتے ہو کہ اتنے دنوں سے تم نماز روزہ کرتے ہو لیکن اثر کچھ نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ لاپروائی سے کام کرتے ہو۔ یہ نیت نہیں ہے کہ نفس کو ہم عبادت کا خوگر بناویں۔ اب ایک ماہ ہی اس نیت سے کرلو۔ دیکھو تو کیا اثر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے نفقات کے بارہ میں یہی مضمون ارشاد فرمایا ہے ارشاد ہے۔ **ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغآء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم الخ** (اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں کو (اس عمل شاق کا خوگر بنائیں) مال کے خرچ کرنے کی دو وجوہات ارشاد فرمائیں۔

اول تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو طلب کرنا۔ دوسرے اپنے نفس کو نیک کام پر جمانا۔

پس اگر ہم اپنے ہر کام میں ان دونوں باتوں کی نیت رکھیں تو ان شاء اللہ ہم کو یہ کہنے کا موقع نہ ہوگا کہ ہم اتنے دنوں سے نماز روزہ کرتے ہیں، دل پر اثر نہیں ہوتا۔ اور اس کا نفع کو دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت کیلئے تو یہ اعمال صالح پر استقامت حاصل ہو جائے گی۔ نفس کے اندر رسوخ پیدا ہو جائیگا۔ جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ **الاستقامت صد فوق الکرامۃ** استقامۃ اور ثبات بڑی شے ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی کی نسبت فرماتی ہیں **کان خلقہ القران** یعنی حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا یعنی قرآن پر عمل کرنا آپ کا فطری امر تھا۔

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ بعض بزرگوں نے لکھ دیا ہے کہ نفع روزہ کا اس وقت ہے کہ اور ایام سے کم کھائے ورنہ روزہ کا کوئی نفع نہیں۔ حالانکہ کتاب وسنت میں یہ مضمون کہیں نہیں ملتا۔ اگر روزہ کا نفع اسی پر موقوف ہوتا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور کہیں نہ کہیں فرماتے یا قرآن میں کوئی آیت اس کے متعلق ہوتی۔ بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا۔ **کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود.** (اور کھاؤ اور پیو اس وقت تک تم کو سفید خط (نور) صبح صادق کا متمیز ہو جائے۔)

اس لئے کہ کم کھانا کوئی مجاہدہ نہیں بلکہ روزہ سے جو مجاہدہ ہوتا ہے وہ ترک عادت کی وجہ سے ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پیٹ سے زیادہ نہ کھائے۔

تذلل للخالق

بالخصوص ہمارے زمانہ میں تو کم کھانا مفید کیا مضر ہے۔ اس لئے کہ قویٰ ہیں کمزور اور نیز تعلق جبی بھی حق تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو اس طرح کا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ اس لئے زیادہ مجاہدہ کرنے میں کئی قسم کی خرابیوں کا اندیشہ ہے اول تو عجب پیدا ہوگا۔ دوسرے یہ شخص اپنے کو مستحق سمجھے گا کہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں مجھ کو ضرور کچھ ملنا چاہیے۔

تیسرے ضعف اس قدر ہو جائے گا کہ فرائض میں خلل آنے کا احتمال ہے کم کھانے اور کم پینے کے اندر قرب منحصر نہیں نفس کو تنگ نہ کرو۔ اس سے کام لو۔ اور بعض بزرگوں نے جو نفس کو کافر کہا ہے۔ سو یہ کافر کفر سے نہیں کفران سے ہے۔ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی کرو۔

دوسرا رذیلہ تھا کبر اس سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ اس کا حکماء نے یہ علاج کیا ہے کہ اسباب تذلل کو اختیار کرتے تھے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے کہ جس سے لوگ ان کو چھوڑ دیں، ذلیل سمجھیں جوگیوں اور بعض صوفیاء اہل اسلام نے بھی اس طریقہ سے اس مرض کا علاج کیا ہے لیکن شریعت نے ہم کو اس کے خلاف یہ تعلیم فرمایا ہے۔ **لاینبغی للمومن ان یذل نفسه** یعنی مومن کو مناسب نہیں ہے کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے یعنی تذلل للمخلوق کو منع کیا ہے اور تذلل للخالق کی تعلیم فرمائی ہے سبحان اللہ! کیا اعتدال ہے!

لیکن اس میں ایک بات شبہ کی ہے وہ یہ ہے کہ بڑے کے سامنے تو ہر شخص تذلل اختیار کر لیتا ہے کمال اور تواضع تو یہ ہے کہ اپنے کو چھوٹوں سے بھی ذلیل اور ہیچ سمجھے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ جب خالق کے سامنے اپنا ہیچ ہونا پیش نظر ہوگا تو اس کو لازم ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت اس کے قلب میں آئے گی اور جب معرفت و عظمت حق تعالیٰ کی اس کو ہوگی تو چونکہ اپنے نفس کو حاجب اور مانع جانے گا اس لئے سب سے زیادہ ہیچ در ہیچ اپنے ہی کو جانے گا اور ہر ایک کو اپنے سے بہتر یقین کریگا تو یہ مقصود بدوں اس کے کہ مخلوق کے سامنے ذلت اختیار کرے حاصل ہو جائیگا۔

پس ثابت ہوا کہ اس مقصود کے لئے صرف تذلل للخالق کافی ہے۔ اس تذلل للخالق کے واسطے ہم کو شریعت نے نماز تعلیم فرمائی ہے کہ اس کا خاصا ہے کہ انسان کو اپنا عجز پیش نظر ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس میں حکم ہے کہ اشرف الاعضا کو ارذل الاشیاء کے ساتھ ملاحق کرو۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ جب یہ شخص اپنے سر کو جو کہ اشرف الاعضاء ہے زمین پر رکھے گا تو ضرور اس کے اندر سے کبر کم ہوگا۔ اور تواضع اور مسکنت پیدا ہوگی نماز کے اندر عجیب خاصیت ہے اور اس کو بڑا دخل ہے حق تعالیٰ کی معرفت اور قرب کے حاصل ہونے میں۔ اور جب حق تعالیٰ کی عظمت پیش نظر ہوگی تو اپنا ہیچ ہونا پیش نظر ہو جائے گا اور دوسرے کی طرف التفات بھی نہ ہوگا۔

ایسی مثال ہے جیسے ہاتھی کے سامنے مثلاً دو چیونٹیاں ہوں تو اس کے سامنے ہوتے ہوئے ایک چیونٹی دوسری کو نظر بھی نہ آئے گی۔ یا مثلاً وائسرائے کسی جگہ آ جائے تو تحصیلدار بیچارہ دکھائی بھی نہ دے گا۔ اور نہ وہ تحصیلدار کسی دوسرے تحصیلدار کو حقیر یا عظیم سمجھے گا۔

اور پھر ہیئت تذلل ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے اندر اپنے ساتھ ہمکلامی کی بھی اجازت دی ہے ورنہ اگر یہ حکم ہوتا کہ سر جھکا کر بس کھڑے رہو تو نرا مجاہدہ ہی ہوتا اب مجاہدہ بھی ہے اور لذت بھی اور پھر اول سے آخر تک ایک ہیئت نہیں بنائی بلکہ اس کو مختلف افعال سے مرکب بنایا ہے۔ قیام، رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ، قعدہ تاکہ نشاط رہے۔ اکثر مثلاً سجدہ ہی ہوتا یا رکوع ہی ہوتا تو نفس اکتا جاتا۔ سبحان اللہ! ہمارے مذاق کی کیا رعایت فرمائی ہے بخلاف حکماء کے مجاہدوں کے کہ وہ ایسے سخت سخت مجاہدے کرتے تھے کہ ہر شخص سے وہ نبھ نہیں سکتے۔

ترک لذات کا طریقہ

اب ایک شبہ رہا۔ وہ یہ ہے کہ جب تراویح مجاہدہ ہے تو جیسے رمضان میں مشروع فرمایا اور دنوں میں بھی مقرر فرما دیتے۔ جواب یہ ہے کہ اگر اور دنوں میں نماز نہ ہوتی تو بے شک اس کی شان اسی کو مقتضی تھی کہ فرض ہوتی۔ چنانچہ حدیث میں آیا بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی روز رمضان

میں قیام لیل فرمایا۔ اور تیسرے روز یا چوتھے روز آپؐ تشریف نہ لائے اور یہ فرمایا کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے اس لئے میں نہیں آیا لیکن اور دنوں میں بھی فرض نمازیں مقرر ہیں جو مجاہدہ کے لئے کافی ہیں۔ اس لئے رمضان ہی میں اس کو رکھا گیا اور سنت موکدہ بنا دیا گیا۔ الحاصل ترک لذات کے لئے روزہ اور علاج کبر کے لئے نماز شریعت نے مجاہدہ مقرر فرمائی۔

اب تیسری شے تھے خلوت جوان کی معین ہے حکماء کے یہاں تو برسوں بلکہ عمر بھر کی خلوت تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں سخت حرج ہے اور تعلقات اور تمدن کی بیخ کنی ہے۔ شریعت نے سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت رکھی ہے صرف دس دن کی خلوت مقرر فرمائی اور اس کا نام اعتکاف رکھا۔ اور اس میں بھی یہ نہیں کیا کہ بالکل کسی سے نہ بولو نہ ملو۔ بلکہ اس کا ایسا اچھا طریقہ بتلا دیا کہ اس میں خلوت کا جو نفع ہے وہ بھی باقی رہے۔ اور جو لوگ وہاں آئیں ان سے ملنے میں کچھ حرج بھی نہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تعلیم فرمایا کہ اعتکاف مسجد کے سوا اور کہیں جائز نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ مسجد میں اپنے ہم جنس ہی آئیں گے اور بچنا اغیار سے مطلوب ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے خلوت از اغیار نہ از یار پس خلوت ان لوگوں سے ہے جو رہزن ہیں دین کے۔ باقی جو دین میں معین ہیں ان کے پاس بیٹھنا تو خلوت سے بہتر ہے ایسی جلوت کو خلوت پر ترجیح ہے۔

مولانا نے عجیب لطیفہ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز! تو جو خلوت کو مطلقاً جلوت پر ترجیح دیتا ہے اور اس کے فضائل بیان کرتا ہے یہ بھی تو تجھ کو جلوت کی ہی بدولت علم ہوا ہے پھر وہ جلوت پر مطلقاً کیسے راجح ہو سکتی ہے۔ پھر وہ دس دن کا اعتکاف ایسے دنوں میں رکھا ہے کہ اس عشرہ میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی ہزار مہینے اگر ریاضت مجاہدہ کرے تو وہ بات نصیب نہیں ہوتی جو اس ایک رات میں ہو جاتی ہے۔

تو دیکھئے! خلوت کے ایام گو کم تھے مگر اس کا تدارک اس طرح کر دیا گیا۔ یہ محض تائید غیبی ہے اور نور وحی سے ہی اس کا ادراک ہو سکتا ہے حکماء کو یہاں تک کہاں رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے کہ ہم کو ایسا راستہ بتلایا کہ جو بہت آسان اور نفع میں سب راہوں سے بڑھ کر ہے۔

پھر صاحبو! غضب ہے کہ ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس سے منتفع نہ ہوں یہ طریقہ ہے جس سے تزکیہ نفس و تہذیب نفس ہوتی ہے اور جس پر فلاح کا وعدہ ہے۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

التہذیب

مجاہدات شرعیہ کے متعلق یہ وعظ ۲۸ رمضان ۱۳۳۲ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا جو ساڑھے تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔ محمد عبداللہ گنگوہی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

يريد الله بكم اليسر ولايريد بكم العسر ولتكملوا العدة ولتكبروا الله علىٰ ماهدكم ولعلكم تشكرون. (البقرہ:۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کوتمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اورتمہارے ساتھ (احکام قوانین مقرر ہیں) دشواری منظور نہیں تا کہ تم لوگ ایام قضاء کی شمار کی تکمیل کرلیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی (وثناء) بیان کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات صیام رمضان سے محروم نہ رہو گے اور تا کہ تم لوگ (اس نعمت کا) شکریہ ادا کیا کرو۔

مجاہدہ کی اہمیت

یہ ایک آیت ہے جو متعلق ہے صیام کے۔ اس کے قبل چند جمعوں میں روزہ، تراویح، اعتکاف اوران کے اسرار واحکام وحقوق وآداب وخواص مع ان کے شعب ومتعلقات کے ذکر کئے گئے ہیں جن کا حاصل تھا مجاہدہ کہ حق جل وعلا شانہٗ نے نفس کے قویٰ منکسر کرنے کے لئے چند مجاہدات کی تعلیم کی ہے اوروہ مجاہدات تمام قوموں کے مجاہدات سے ممتاز ہیں اور یہ مجاہدات

ہمارے ہی نفع اور مصالح کیلئے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم پر بڑا بار ڈالا گیا ہے۔ مجاہدہ تو وہ شے ہے کہ ہر سلیم المزاج اس کی طرف راغب ہے بلکہ جو مجاہدہ نہیں کرتے ہیں وہ بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔

چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ تمام فساق و فجار مجاہدہ سے خود تو محترز ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اہل مجاہدہ کو محبوب رکھتے ہیں۔ جس شخص کو وہ دیکھتے ہیں کہ زاہد ہے، تارک ہے بالطبع اس کی طرف ان کو بھی میلان ہوتا ہے۔ دنیادار کیسا ہی دنیادار ہو جب وہ لڑے گا طالب دنیا سے لڑے گا۔ تارک دنیا سے نہ لڑے گا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے صرف یہ وجہ ہے کہ اس کو یہ خیال ہے کہ یہ شخص دنیا کا تارک ہے اس خیال نے اس کے سب خیالات کو پست کر دیا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا سے خدا کو بغض ہے اس کا اثر ایسا عام ہے کہ محبین دنیا کے قلوب میں بھی اس کا اثر ہے۔ اگر دنیا کی محبت اچھی شے ہوتی تو ایک محبّ دوسرے محبّ سے ضرور محبت کرتا۔ لیکن یہ بات نہیں۔ بلکہ آپس میں لڑتے ہیں کٹتے ہیں مرتے ہیں۔

بہر حال زہد فی الدنیا بالطبع مرغوب ہے اور تارک تعلقات سے اول تو محبت ہی ہوتی ہے اور اگر محبت نہ بھی ہو تو بغض تو ہرگز نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب دنیا ایسی شے ہے کہ اس کے برے ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ترک دنیا ایسی محبوب شے ہے کہ اس کی محبوبیت پر سب کا اتفاق ہے۔ اسی واسطے اس کا تھوڑا بہت رواج ہر قوم میں ہے۔ عیسائی، ہندو جو کہ منکرین اسلام ہیں وہ بھی اس کو ضروری جانتے ہیں۔ چنانچہ تہذیب اخلاق میں ان کی کتابیں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ تہذیب اخلاق بدوں نفس کشی کے ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ نفس کے موافق کرنے سے بھی تو بہت سی بداخلاقیاں صادر ہوتی ہیں۔

مثلاً ایک شخص ہے اس کا جی چاہا کہ فلاں عورت کے پاس جائے تو اگر وہ نفس کو نہیں روکے گا اور خلاف نفس کے نہ کریگا تو یہ فعل اس سے صادر ہو جائیگا جو کہ تمام ملل میں مذموم و مبغوض و منہی عنہ ہے۔

حکماء میں مجاہدہ ہونے کی ایک حکایت یاد آئی ایک شخص حکیم نے دوسرے یونانی حکیم کی تصویر دیکھ کر یہ کہا تھا کہ علم قیافہ کی رو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص زانی ہے لوگوں نے کہا کہ یہ تو فلاں حکیم کی تصویر ہے۔ اس کو ندامت ہوئی مگر اس نے کہا کہ کسی کی ہو ضرور اس شخص کے اندر یہ عیب ہے۔ لوگوں نے جا کر اس حکیم سے کہا کہ ایک شخص تمہاری نسبت ایسا کہتا ہے سچے لوگ تھے اس نے کہا کہ وہ سچ کہتا ہے میرے اندر مادہ اس فعل خبیث کا ہے لیکن میں مجاہدہ کرتا ہوں

اور نفس کو مغلوب کرتا ہوں ۔ اس لئے عمر بھر میں صدور اس فعل کا کبھی نہیں ہوا۔ تو باوجود ایمان نہ لانے کے ان لوگوں نے نفس کی اتنی بڑی مخالفت کی کہ عمر بھر صدور اس کا نہ ہونے دیا۔

غرض! مجاہدہ وہ شے ہے کہ اس کی پسندیدگی تمام اہل مذاہب کے اندر مسلم ہے بلکہ دہری بھی کسی قدر مجاہدہ ضرور کرے گا۔ بغیر اس کے اس کو بھی چارہ نہیں ہے اگر چہ مقصود اس کا دنیا ہو۔ مثلاً اس کو کسی پر غصہ آیا اور جانتا ہے کہ اگر میں اپنے غصہ جاری کروں گا تو خود مجھ کو یہ شخص ضرر پہنچائے گا تو ایسے موقع پر وہ ضبط سے کام لے گا۔ اور نفس کو روکے گا۔ غرض مجاہدہ کی ہر قوم اور ہر اہل مذہب بلکہ ہر شخص کو ضرورت ہے اور دین میں تو ضرورت ہے ہی۔ دنیا میں بھی ضرورت ہے۔

ماہ رمضان اور ایام شماری

باقی شریعت مقدسہ نے جو مجاہدات ہم کو تعلیم کئے ہیں ان کے جو امتیازات ہیں اور جو ان کے خواص وآثار ہیں وہ کسی قوم اور کسی حکیم وفلسفی کے مجاہدہ میں نہیں ہیں۔ اہل مجاہدہ کی نظر جہاں تک نہ پہنچتی تھی وہاں تک کی شریعت مقدسہ نے رعایت کی ہے ان خواص وحکم اسرار کو بہت مختصر طور سے گزشتہ جمعوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اب موقع اسکا ہے کہ ان مجاہدات کے خاتمہ کا بیان کر دیا جائے کہ یہ بھی قابل اہتمام ہے اور آج رمضان المبارک کا جمعہ اخیرہ بھی ہے اس لئے ان بیانوں کا خاتمہ بھی اس جمعہ کو ہو تو بہتر ہے۔

باقی درمیان میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے گو میرے موضوع کے خلاف ہے کہ اس جمعہ کے لے یہ صفت تو صحیح اور واقعی ہے کہ یہ جمعہ اخیرہ ہے۔ باقی جو خصوصیات زائدہ لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں بڑھائی ہیں ان کا کہیں پتہ ونشان تک نہیں ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ جو بات قابل اعتناء واہتمام کے ہے اس کی طرف تو التفات تک نہیں اور زائدہ تصنیف کر لیے۔

منجملہ ان کے ایک یہ خاصہ مشہور ہے کہ آخری جمعہ کو جس قدر نئے کپڑے پہن لو اس کا کوئی حساب وکتاب نہ ہوگا جواب یہ ہے **ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین**.

ایک خاصہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دن جو خطبہ پڑھا جائے اس میں وداع کا مضمون اور اس قسم کا مضمون جس سے اظہار تاسف وحزن ہو ہونا چاہیے۔ جناب! دل ہی جانتا ہوگا کہ کیسا کچھ افسوس ہے۔ ابھی دل میں امنگیں اور شوق لگ رہا ہے کہ جلدی سے رمضان ختم ہو تو سویاں اور چھوہارے کھائیں اور دل میں کہتے ہوں گے کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ بوجھ اترا۔ دل میں تو خوشی پھر منہ بسورنا تکلف ہی ہے

اورامتحان اس کا یہ ہے کہ اگرتم کوغم ہی ہے اوراللہ تعالیٰ کسی ذریعہ سے یہ حکم بھیج دیں کہ میرے بندوں کورمضان کے جانے سے بہت غم ہے اچھاایک ماہ کے روزے اورہم فرض کرتے ہیں توجناب ابھی سب کے منہ خشک ہوجائیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ رمضان بھرتوایام شماری رہتی ہے کہ آج اتنے روزے ہوئے اتنے باقی ہیں۔اور یہ توعابدوں اورزاہدوں کی کیفیت ہے۔

یادرکھو! جو بات دل میں ہواسی کوظاہرکرنا چاہیے۔ ورنہ ہم بے چارے توکس قطارمیں ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس پر باز پرس ہوگئی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم ،غزوۂ بدر کے بعدتمنا کیا کرتے تھے کہ کاش کوئی دن مثل بدر کے ہواس میں ہم دشمن سے مقابلہ کریں جب غزوۂ احد ہواتو اس میں ہزیمت ہوئی اوربعض صحابہؓ سے کچھ غلطی اجتہادی بھی ہوئی جس کا بڑاقصہ ہےتواس پرحق تعالیٰ ان کومتنبہ فرماتے ہیں۔

ولقد كنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوه فقد رأيتموه وانتم تنظرون.

’’یعنی تم لوگ موت کی لقاء سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے اب توتم نے اس کودیکھ لیا۔ اورتم اس کودیکھ رہے ہو‘‘۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کواس پرتنبیہ ہوئی توہمارا کیامنہ ہے۔

آرزومیخواہ لیک اندازہ خواہ ☆ برنتابدکوہ رایک برگ کاہ

(آرزواتنی چاہئے جتنا کہ ضرورت ہے،جس طرح کہ ایک گھاس کا تنکا بھی پہاڑ کی چوٹی کیلئے کافی ہوتا ہے)

روزہ دار کی خوشیاں

ہم کوچاہیے کہ سنبھل کر بولیں ہم ضعیف ہیں ہم کوچاہیے کہ یوں کہیں کہ الٰہی شکر ہے ہم سے یہ عبادت جس طرح بنی اداہوگئی۔اب آپ اس کوقبول کیجئے۔افسوس اوررنج وغیرہ کا خلاف واقعہ اظہارنہ کرواور کچھ رنج بھی ہوتواس پرمسرت اس قدرغالب ہے کہ وہ رنج قابل اعتبارنہیں ہے اوروہ مسرت یہ ہے کہ غنیمت ہے کہ روزہ ہمارابیچ میں ٹوٹانہیں۔خیروعافیت سے سب پورے ہوگئے۔بجائے رنج کے خوش ہوناچاہیےاورخداجانے یہ رنج کس نے اختراع کرلیاہے۔روزے کے ختم پرتوہم کوتعلیم کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے: **للصائم فرحتان فرحة عندالافطار وفرحة عندلقاء ربه**[1] ’’یعنی روزہ کی دوخوشیاں ہوتی ہیں ایک خوشی توافطار کے وقت اوردوسری اپنے پروردگار کے ملنے کے وقت‘‘۔

اگر ہمارے دعوؤں کی رعایت ہوتی توبجائے فرحت کے افسوس ظاہرکیا جاتا اس لئے کہ

---

[1] سنن النسائی کتاب الصیام باب: ۴۱، مسند أحمد ۲: ۲۵۷، ۳۴۵، کنزالعمال ۲۳۵۹۲

جو علت ہے اس رنج کی یعنی رمضان المبارک کا رخصت ہونا اس کا کچھ حصہ افطار کے وقت بھی ہونا چاہیے۔اس لئے کہ ایک دن اور کم ہو گیا۔لیکن یہ نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ خوشی کی خبر دی گئی۔

راز اس میں یہ ہے کہ روزہ فرض ہے اور تراویح اور تہجد جو شب کی عبادات ہیں وہ سنت ہیں۔اور یہ مسلم ہے کہ جس قدر قرب ادائے فرض سے ہوتا ہے اس قدر ادائے سنت ونوافل سے نہیں ہوتا۔تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ جب روزہ تمام ہو تو ہم کو رنج ہونا چاہیے تھا کہ افسوس ایک رات تک ہم روزہ کے برکات سے محروم رہیں گے کیونکہ رات کو روزہ نہیں ہوتا۔ پس اس خیال کے رفع کرنے کے لئے ہم کو تعلیم فرماتے ہیں فرحت کی۔

باقی جو خوشی ہم کو افطار کے وقت ہوتی ہے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ کون سی خوشی کی خبر دی گئی ہے اور کس بات کی خوشی کی خبر ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دو قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ہم کو اس کی خوشی ہوتی ہے کہ اب کھانے کا وقت آ گیا ہے پھلکیاں کھائیں گے اور جلیبیاں کھائیں گے اور جو اللہ والے ہیں ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری عبادت کو محفوظ رکھا اور بخیریت روزہ ختم ہو گیا۔

بہر حال خواہ کسی قسم کی خوشی ہو سب محمود و مطلوب ہے۔ باقی رنج کے مطلوب ہونے کی تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہر حال رنج نہ واقع ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے پس تاسف اور رنج کرنا اور خطبہ میں الوداع الوداع یا شہر رمضان پڑھنا بالکل بے اصل ہے۔

ہاں رمضان المبارک کے آنے سے پہلے کا تو ایک خطبہ خاصہ منقول ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ شعبان کے جمعہ اخیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا جس میں فرمایا **یایھاالناس قداظلکم شھر عظیم الخ** (اے لوگو تم پر ایک عظیم المرتبت مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے) پس رمضان کے آنے کی خوشی تو ظاہر فرمائی ہے مگر جانے کا غم ظاہر کرنا اور خطبہ وداعی پڑھنا کہیں منقول نہیں۔

یہ سب تقریر جملہ معترضہ کے طور پر آخری جمعہ کے متعلق تھی۔مقصود تو میرا یہ ہے کہ یہ آخری جمعہ ہے اور آخری جمعہ کو یہ ضرور ہے کہ رمضان ایک ہفتہ سے کم رہ جاتا ہے چنانچہ آج ۲۸ تاریخ ہے۔ اور ہاں باقتضاء وقت یہ بھی بتا دینا ضرور ہے کہ ۲۸ تاریخ کو سورج گرہن تخمیناً پانچ بجے سے شروع ہو جائے گا۔حدیثوں میں ایسے وقت نماز آئی ہے جس کا لقب صلوٰۃ الکسوف ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی پڑھی ہے جس میں قراءۃ ، سجدہ ، رکوع طویل تھا۔مگر وقت بہت کم اور نازک ہے اور نیز احتمال ہے کہ عصر کا بعد ہو جائے اسلئے نوافل اس وقت مکروہ ہیں۔ اس لئے بجائے نوافل کے ذکر میں مشغول ہونا چاہیے۔لوگوں نے جس طرح جمعہ اخیرہ رمضان کے کچھ خواص تراشے ہیں۔

ہمارے توہمات

ایسے ہی سورج گرہن کے بھی اپنی طرف سے کچھ احکام مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سورج گرہن کے وقت کھانا نہ کھاؤ۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت جب مشغولی مع اللہ اکبر اور ذکر کا ہے تو ظاہر ہے کہ کھانا خود ہی اس وقت ترک ہو جائے گا لیکن ذکر اللہ اور نوافل کو تو لوگوں نے اڑا دیا۔ اب بجائے اس کے بیکار بیٹھے رہیں گے۔ شطرنج اور گنجفہ کھیلیں گے مگر اتنی توفیق نہ ہوگی کہ اللہ کی یاد کریں۔ اسی طرح جب کوئی محلّہ میں مر جاتا ہے تو مشہور ہے کہ کھانا کھانا جائز نہیں۔ دنیا بھر کے سب کام جائز مگر کھانا ناجائز نہیں۔ غیبتیں کریں گے، دغابازی کی گفتگو کریں گے ہاں کھانا نہ کھائیں گے۔

اس کی اصل یہ تھی کہ ایسے وقت جب کہ اپنے پاس والوں کو غم ہوا اور خود اپنے کو بھی ہوتا ہے تو کھانا کھانا طبعاً مکروہ ہے شرعاً مکروہ نہیں۔ لیکن جب دنیا بھر کے قصے اور گناہ تک تو کریں تو کھانا جو کہ فی نفسہ مباح ہے اس سے کیوں احتراز کیا جائے۔

ایسے ہی یہ بھی مشہور ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاؤ۔ اصل تو اس کی یہ تھی کہ وہ وقت فضیلت کا ہے اور اکثر بزرگوں کی عادت رہی ہے کہ عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر اللہ میں مشغول رہے ہیں۔ جب ان کو عام لوگوں نے مشغول دیکھا تو اس سے یہ سمجھا کہ اس وقت کھانا کھانا ممنوع ہے اور وجہ اس کی یہ تراشی ہے کہ مرتے وقت عصر کا وقت نظر آتا ہے اور شیطان مرنے کے وقت پیشاب کا پیالہ لاتا ہے اور اس شخص کو پیاس بہت ہوتی ہے۔ تو اگر اس وقت کھانے پینے کی عادت ہوگی۔ تو یہ شخص پی جائے گا۔

نعوذ باللہ! بالکل غلط اور جھوٹ بات ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں جن سے ادنیٰ سے ضرر دینی بلکہ اکثر دنیوی کا احتمال بھی ہوا ہے وہ بتلائی ہیں۔ چہ جائیکہ اتنا بڑا نقصان عظیم جس شے سے لازم آتا ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو منع نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک ہم کو منع فرمایا ہے کہ ایک پاؤں میں جوتی پہن کر مت چلو۔ اس لئے کہ اس طرح چلنے سے احتمال گر جانے کا ہے۔ پس جو پیغمبر اتنے بڑے شفیق ہوں کیا وہ ایسے عمل سے منع نہ کریں گے جس کے اختیار کر لینے سے شیطان کے پیشاب پینے کا احتمال ہو۔ بالکل غلط ہے ہاں اتنا آیا ہے کہ قبر میں جب سوال ہوتا ہے تو مثلت له الشمس یعنی دھوپ نکلی ہوئی اس کو نظر آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے نماز کو دیر ہوتی ہے۔ میں نماز پڑھ لوں۔ باقی مرنے کے وقت پیاس دکھائی دینا نہیں آیا ہے۔ اور اگر

بالفرض ایسا ہو بھی تو وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ اس کی عمر کا خاتمہ ہو گیا ہے اس لئے اگر اس کو دن بھی ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہو کچھ تعجب نہیں۔ لیکن یہ پیشاب پینے کا مضمون قابل اعتبار نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے خوب دیکھا ہے کہ مرتے وقت لوگوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے تو جناب خدا خیر کرے ہم نے ایسے مردے بھی دیکھے ہیں کہ جنہوں نے بیان کیا کہ ہم مر گئے تھے اور جب ہماری جان فرشتے لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک بڈھا سا آدمی بیٹھا ہوا ہے اواس کے سامنے ایک رجسٹر کھلا ہوا رکھا ہے اس نے اس میں دیکھ بھال کر کہا کہ اس کو ہم نے نہیں بلایا وہ دوسرا شخص ہے۔ اس لئے واپس کر دیئے گئے چنانچہ وہ زندہ ہو گئے۔

اس حکایت سے لازم آتا ہے کہ عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں اور اگر عزرائیل علیہ السلام غلطی کرتے ہیں تو ان میں جبرائیل علیہ السلام میں کچھ فرق نہیں وہ بھی ضرور غلطی کرتے ہوں گے اور جب کسی کے مارنے میں غلطی کی تو کسی شے کے پہنچانے میں بھی غلطی کا احتمال ہے اور وحی بھی ایک شے ہے۔ اس کے پہنچانے میں جبرائیل علیہ السلام نے ضرور احتمال ہے کہ شاید غلطی کی ہو۔ جناب ایسے احتمالات سے تو قرآن سے بھی نعوذ باللہ ایماں اٹھا جاتا ہے۔ اور غالی شیعوں کا مذہب حق معلوم ہوتا ہے کہ ''جبرئیل غلط کردہ ومقصود علی بود'' (حضرت جبرائیل علیہ السلام نے غلطی کی ورنہ مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے نعوذ باللہ)

توبہ کرو ایسے قصوں سے یہ سب دماغ کا تصرف ہے۔ دماغ میں جیسے خیالات گھومتے ہیں اسی قسم کے نظروں کے سامنے متمثل ہو جاتے ہیں۔ باقی فرشتوں سے غلطی اور خطا کا احتمال نہیں ہے جس کی موت آتی ہے اور جس کی نسبت حکم ہوتا ہے اسی کی جان قبض کرتے ہیں۔ یہ احتمال نہیں کہ دوسرے کی جان قبض کرلیں چنانچہ صاف ارشاد ہے:

حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا وهم لایفرطون

''یعنی یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی جان لیتے ہیں اور وہ اس میں تقصیر نہیں کرتے''۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے جس سے عموماً معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کسی کے حکم کے خلاف نہیں کرتے۔ **لایسبقونه بالقول وهم بامره یعملون** غضب کی بات ہے کہ قرآن کا انکار عقل کے خلاف ایسے امور کا اعتقاد کر لیتے ہیں۔ پس اگر یہ قصہ صحیح بھی ہو تو یہ قوت تخیلہ کا تصرف ہے۔

شیطان اور مومن

اگر فرض کرلیا جائے کہ شیطان اس وقت پیشاب کا پیالہ لئے ہوئے نظر بھی آتا ہو تب بھی اس وقت کھانے پینے کی عادت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس پیشاب کو پی لے۔ اس لئے کہ مرنے کے وقت مردہ کو عالم آخرت کا انکشاف ہو جاتا ہے اور یہ قصہ اگر ہو بھی تو اس عالم کا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک برزخی واقعہ ہوگا اور اس عالم کے خواص وعادات اس عالم میں موثر نہیں ہیں۔ ہاں عبادات نصاً بے شک موثر ہیں جیسا حدیث میں ہے دعونی اصلی (مجھے چھوڑ و میں نماز پڑھ لوں) اور اگر اس سے بھی قطع نظر کی جائے تب بھی شیطان پیشاب نہیں پلا سکتا۔ اس لئے۔

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست (شیطان کا داؤ مخلصین پر نہیں چلتا)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

انه لیس له سلطن علی الذین امنوا وعلیٰ ربهم یتو کلون (النحل:۹۹)

سلطٰن نکرہ ہے تحت میں نفی کے آرہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین متوکلین پر اس کا بالکل قابو نہیں چلتا۔ بلکہ اس وقت مومنین پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ تسلی کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکة ان لا تخافوا ولاتحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون نحن اولیآء کم فی الحیوة الدنیا وفی الأخره ولکم فیها ماتشتهی انفسکم ولکم فیها ماتدعون نزلا من غفور رحیم. "یعنی بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر جم گئے ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس سے خوش ہو ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگانی میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے آخرت میں وہ چیزیں ہیں جن کو تمہارے جی چاہتے ہیں اور تمہارے لئے وہاں وہ ہے جس کو تم مانگو (یہ سب) مہمانی سے غفور الرحیم کی طرف سے۔

اور نیز وہ وقت چونکہ اس شخص پر بہت سخت ہوتا ہے اس لئے اس وقت ضرور رحمت حق متوجہ ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے اناعند المنکسرة قلوبهم[1] (میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتا ہوں) اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ☆ ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

[1] الأسرار المرفوعة لعلی القاری: ۱۱۷، ۳۷۶، کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۲۳۳، ۲۴۹

ہر کجا رنجے شفا آنجا رود ☆ ہر کجا دردے دوا آنجا رود

(جہاں کہیں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے وہیں اس کا حل ہوتا ہے۔ جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفا ہوتی ہے ، جہاں درد ہوتا ہے وہیں اس کی دوا ہوتی ہے)

پس اور فرماتے ہیں ۔

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ ☆ جز شکستہ می نگیر دفضل شاہ

(اپنے دل اور فہم کو گستاخ کر لینا یہ صحیح راستہ نہیں بلکہ شکستہ ہو جانا ہی بادشاہ کے مہربانیوں کے حاصل کرنے کی دلیل ہے)

ایک قصہ منقول ہے ایک نبی علیہ السلام کا چند قبور پر گزر رہوا۔ دیکھا کہ مردے قبور میں معذب ہیں جہاں تشریف لے جارہے تھے جب وہاں سے واپس ہوئے تو دیکھا رحمت ہو رہی ہے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! اس وقت تو میں نے ان کو مبتلاء عذاب دیکھا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد ان سے کوئی عمل صادر نہیں ہوا۔ پھر کیا وجہ رحمت کی ہوئی ؟ ارشاد ہوا کہ ان کے کفن گل گئے ان کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں اس لئے ہم کو رحم آیا کہ ان پر کیا عذاب کیا جائے جب کہ ان پر رحمت ہوئی تو قلوب شکستہ پر تو ضرور ہی رحمت ہوتی ہے۔

غرض وہ وقت رحمت کا ہے۔ شیطان کا داؤ وہاں نہیں چلتا۔ پھر یہ کہ اگر اس وقت حواس باقی ہیں تو جان بوجھ کر پیشاب کیوں پیوے گا۔ اور حواس جاتے رہے اور اس حالت میں شیطان کا پیشاب بھی پی لیا تو حرج کیا ہوا۔ اس سے ایمان میں کچھ خلل نہیں۔ شیطان کے اندر جز و ناری زیادہ ہے اس کا پیشاب آدمی کے پیشاب سے تو بہر حال نجاست میں کم ہوگا۔ اس وقت تو اگر آدمی کا پیشاب بھی پی لے تو ایمان میں خلل نہیں آتا بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا پیشاب کوئی ذی جرم نجس بھی نہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص صبح تک سوتا رہے تو شیطان اس کے کان میں پیشاب کر دیتا ہے اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ کان کو پاک کیا کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ذی جرم نجس چیز نہیں ہے۔ غرض یہ بالکل بے جوڑ اور بے اصل بات ہے۔

سلب ایمان

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مرنے کے وقت اگر رحمت ہوتی ہے تو اس کا کیا مطلب جو بکثرت سنا

ہے کہ مرتے وقت بعضوں کا ایمان مسلوب ہوجاتا ہے۔ یادرکھو! پریشانی اور بدحواسی کی حالت میں کسی کا ایمان سلب نہیں ہوتا۔ ایمان مثل ایک قلعہ مضبوط کے ہے وہ ایسے سیلابوں سے شکستہ نہیں ہوتا یہ ہرگز نہیں کہ مرنے کے وقت بلا اختیار ایمان سلب ہوجائے ہاں پہلے سے جولوگ مسلوب الایمان ہیں زندگی میں اور دنیا کے کاموں میں ان کو اپنی بے حسی سے اپنا مسلوب الایمان ہونا منکشف نہیں ہوتا۔ اور مرنے کے وقت چونکہ ظہور حقائق کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس کو اس کا علم ہوتا ہے اسی لئے مجازاً کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں مسلوب الایمان ہوکر دنیا سے گیا ہے۔

یہ جو مشہور ہے کہ مردہ کے پاس صرف **الا اللہ** پڑھنا چاہیے **لا الہ** اس کے ساتھ نہ ملاوے اس لئے کہ اگر **لا الٰہ** پر دم نکل گیا تو بے ایمان مریگا کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ کوئی معبود نہیں ہے تو اس سے حق تعالیٰ کی معبودیت کی نفی بھی ہوگئی اور یہ کفر ہے۔

یہ بھی بالکل بے اصل اور خلاف عقل ہے اس لئے کہ اگر **لا الٰہ** پر خاتمہ ہوگیا اور دل میں اس کے تھا کہ **الا اللہ** بھی کہوں گا تو کفر کہاں لازم آیا۔ اللہ تعالیٰ تو دل کو ہی دیکھتے ہیں اور نیز ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ **لا اللہ** کہنے نہ پایا۔ اسکو اس قدر وقت ہی نہ ملا۔ باقی یہ ظاہر ہے کہ توحید اس کے ذہن میں پہلے سے تھی۔

ما بروں رانگریم وقال را ☆ مادروں رابنگریم وحال را

(ہم کسی شخص کی ظاہری حالت اور اس کی گفتگو کو نہیں دیکھتے بلکہ ہم اس کی اندرونی کیفیت اور حالت کو دیکھتے ہیں)

توبہ کی اہمیت

یہاں تو فقط ناتمام عبارت ہی تھی وہاں تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص سرتاسر غلط کہہ ڈالے اور دل میں نہ ہو تو کچھ حرج نہیں اور اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندے کے توبہ کرنے پر اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ اس کا اونٹ راہ میں گم ہوجائے اور تمام سامان کھانے پینے کا اسی پر ہو، اور وہ پریشان ہوکر اس کو ڈھونڈتا ہے اور جب ناامید ہوگیا تو ایک درخت کے نیچے تھک کر اوراپنی جان سے مایوس ہوکر لیٹ رہا اور اسی حالت میں اس کو نیند سی آ گئی جب آنکھ کھلی تو دیکھا اونٹ کھڑا ہے تو جوش مسرت کے ساتھ کہتا ہے **اللھم انت عبدو انا ربک اخطاء من شدۃ الفرح** یعنی اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شدت خوشی کی وجہ سے بہک گیا۔

دیکھو! اس نے کلمہ کہا لیکن چونکہ نہ اس کے دل میں تھا اور نہ زبان سے قصد کہنے کا رکھنا تھا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت پر خوشی کے جوش میں زبان بچل گئی۔ اس لئے کچھ کچھ مواخذہ نہیں اور نہ اس کے ایمان میں کچھ فرق آیا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نقل کے وقت انکار فرماتے۔

محبت اور ادب

اور لیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے برخ نام۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بارش کے لئے ان سے دعا کراؤ۔ وہ بزرگ مقام ناز واحلال میں تھے۔ ان سے جب دعا کیلئے کہا گیا تو انہوں نے جو کلمات کہے ہیں اگر کوئی اور شخص کہہ دے۔ تو سخت بے ادبی ہے۔

جنت میں بھی بعض لوگ ایسے کلمات کہیں گے کہ وہ بظاہر بے ادبی ہے لیکن چونکہ دل میں بے ادبی کا قصد نہیں اس لئے کچھ مضر نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے آخر جو شخص دوزخ سے نکلے گا اس سے کہا جائیگا تجھ کو دنیا اور دنیا سے کئی حصے زیادہ جنت میں جگہ دی گئی وہ عرض کرے گا۔

اتستھزیٔ منی وانت رب العلمین.

یعنی کیا آپ مجھ سے ٹھٹھا کرتے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر ہنسی آ گئی۔

اور لیجئے! افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہؓ کی برات نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ابشری یاعائشه ! فقد براک الله**[1] یعنی خوش ہوا ے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تم کو بری کر دیا۔

اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ کھڑی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ کیوں کروں میں تو اپنے اللہ کی حمد بیان کروں گی۔

دیکھئے! بظاہر تو یہ کلمہ بے ادبی کا ہے لیکن حقیقت اور منشا اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے لبریز تھا اور جیسے محبوب ناز کیا کرتا ہے کبھی محب بھی کرتا ہے۔ لیکن ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہے کہ ایسی بات کہے یا جی میں لائے۔ اس لئے کہ ؎

نازراروئے بباید ہمچو ورد ☆ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

(ناز برداری کیلئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تو ایسا حسین نہیں ہے تو بری عادات چھوڑ دے)

---

[1] الصحیح للبخاری ۶:۶ ۱۳، الصحیح لمسلم التوبہ: ۵۶، مسند أحمد ۶: ۱۰۳، ۱۵/ ۵۳۱، کنز العمال

اورحدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عائشہؓ! مجھے معلوم ہوجاتا ہے جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور جس وقت راضی ہوتی ہوتو اس طرح قسم کھاتی ہو **لاورب محمد**، (قسم ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی) اور جب ناراض ہوتی ہوتو کہتی ہو **لاورب ابراھیمؑ**۔ (قسم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی) حضرت عائشہؓ نے فرمایا یارسول اللہ! **لااھجر الااسمک** یعنی یارسول اللہ! میں اس وقت صرف آپ کا نام ہی چھوڑ دیتی ہوں یعنی دل میں تو آپ ہی بسے ہوئے ہیں لیکن صرف نام مبارک زبان سے ترک کردیتی ہوں۔

نام پرایک حکایت یادآئی۔ ہمارے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ شیرخان نامی لوہاری کے رہنے والے تھے۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو ساکت لیٹے ہوئے تھے۔ لوگ کلمہ کی تلقین کرتے تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھے لوگوں کو بہت خیال ہوا کہ افسوس ہے کہ خاں صاحب ہمیشہ تو ذاکر شاغل رہے اور آخر میں یہ کیفیت ہے کہ کلمہ تک زبان سے نہیں نکلتا اور حضرت میاں جی کو جاکر اطلاع کی۔ حضرت تشریف لائے اور پوچھا کہ خان صاحب کس حال میں ہو۔ فرمایا کہ حضرت لوگوں کو روک دیجئے۔ مجھے پریشان نہ کریں۔ یہ مجھ کو مسمّی سے اسم کی طرف لاتے ہیں مشاہدہ مسمّی میں ہوں اور یہ مجھ کو اسم کی طرف کھینچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ؎

درنیابد حال پختہ ہیچ خام ☆ پس سخن کوتاہ باید والسلام

(کوئی کچاپکا حال یعنی اندرونی حقیقت معلوم نہیں کرسکتا بہتر ہے کہ بات مختصر کرکے اجازت لی جائے)

لاورب ابراھیمؑ کہہ کر حضرت عائشہؓ نے نام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑ دیا اور خفا بھی ہورہی ہیں منہ میں۔ تو یہ بات کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ دل تو محبت سے پُر تھا اور اس ناراضی کا منشا بھی وہی محبت تھی۔ پس اگر دل میں ایمان ہے اور زبان سے بدحواسی میں کلمہ کفر کا بھی کہہ دیا تب بھی وہ شخص مومن ہے اس کے ایمان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا یہ کلمہ کفر ایسا ہی ہے ؎

خون شہیداں راز آب اولیٰ تراست ☆ ایں خطا ازصد صواب اولےٰ تراست

(شہیدوں کا خون آب حیات سے افضل ہے اور یہ غلطی سینکڑوں اچھائیوں سے بہتر ہے)

اوقات نزع کے کلمات

بحرالرائق میں لکھا ہے کہ اگر مرتے وقت کسی مسلمان کے منہ سے کلمات کفر نکلیں تو وہ سب معاف ہیں مرنے کا وقت بڑا نازل وقت ہے۔ تھوڑی سی آدمی کو تکلیف ہوتی ہے تو پریشان ہوجاتا ہے اور وہ وقت تو جان نکلنے کا ہے۔ اسی واسطے ایسے وقت میں سمجھدار آدمی پاس ہونا چاہیے تاکہ مردہ

کی حالت کو سمجھیں۔ بعض حالتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ پاس والوں کو بالکل سمجھ میں نہیں آتیں۔

ایک بزرگ تھے جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے یہ کہا **لاالہ الااللہ موسیٰ کلیم اللہ** اور کہہ کر رحلت فرما گئے لوگوں نے شور مچا دیا کہ افسوس یہودی ہو کر مرے ہیں۔

یہودی پر اسی کے مناسب ایک اور حکایت یاد آئی حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ ہیں۔ کبرٰے کا لفظ سن کر طالب علموں کو بڑا خلجان ہوا ہوگا کہ مونث کا صیغہ مذکر کی کیسی صفت بن گیا۔ یہ صفت ان کی نہیں ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے یہ عالم ہیں اور اپنے زمانہ میں مباحثہ کے اندر الطامۃ الکبرے مشہور تھے کثرت استعمال سے موصوف تو اڑ گیا کبرٰی رہ گیا۔

غرض ان کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے ان کے کسی مرید نے ان بزرگ کی زیارت کے لئے ان سے اجازت چاہی۔

یہاں ایک بات سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم وتلقین کا تعلق تو ایک ہی سے رکھے باقی عقیدت ومحبت وزیارت سب بزرگوں سے رکھے تو کچھ حرج نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب ومریض کہ جب تک جم کر ایک کا علاج نہ کریگا تو مرض کا زوال نہ ہوگا اور اگر ہر ایک سے دوا پوچھے تو شفا نہ ہوگی۔

غرض شیخ نجم الدینؒ سے اجازت لیکر ان بزرگ کی زیارت کے لئے گئے۔ چلتے وقت پیر نے کہہ دیا تھا کہ میری طرف سے بھی حضرت کی خدمت میں سلام کہہ دینا۔ جب وہاں پہنچے تو پیر کا سلام عرض کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ تمہارا یہودی پیر اچھا ہے۔ مرید صاحب دل ہی دل میں بہت بگڑے کہ یہ اچھے بزرگ ہیں میرے پیر کو انہوں نے یہودی کہہ دیا لیکن چونکہ پیر سے ان کے مناقب سن چکے تھے اس لئے بولے کچھ نہیں۔ جب واپس پیر کی خدمت میں آئے تو پیر نے پوچھا ہمارا سلام بھی کہہ دیا تھا لیکن وہ تو بہت بے ڈھب آدمی ہیں انہوں نے آپ کو یہودی کہا فرمایا کہ الحمدللہ! آج معلوم ہوا کہ میں کس مقام پر ہوں اور بہت خوش ہوئے اور یہ فرمایا کہ بھائی تجھ کو خبر نہیں ہے کہ اس یہودی سے کیا مراد ہے۔

تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تمام انبیاء کی شانیں جلوہ گر ہیں۔ اسی مضمون کو کسی نے شعر میں نظم کیا ہے۔

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضاداری ☆ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کی پھونک اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا ہے جو کمالات سب انبیاء اسلام کو دیئے گئے تھے وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں)

ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شان جمعیت لئے ہوئے ہیں۔ اب اولیائے امت میں سے ہر ایک کی شان جدا ہے۔ کسی کے اندر ابراہیم علیہ السلام کی شان ہے کوئی موسیٰؑ کی شان پر ہے جو بزرگ جس نبی کی شان لئے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ان کے قدم پر کہا جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ قدم موسیٰ پر ہیں اور فلاں ابراہیم پر ہیں یعنی شان موسویؑ اور ابراہیمیؑ پر ہیں۔ **لکن لامن حیث انه شان ابراهیم وموسیٰ بل من حیث انه شان محمد صلی الله علیه وسلم لانه صلی الله علیه وسلم جامع للشئون کلها.** (نہ اس حیثیت سے کہ یہ حضرت ابراہیم وحضرت موسیٰ علیہما السلام کی شان ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سب شانیں جمع ہیں)

پس جن بزرگ نے مرنے کے وقت **لااله الاالله موسیٰ کلیم الله** پڑھا۔ انہوں نے ظاہر کردیا کہ قدم موسیٰ پر ہوں۔ یہی مطلب یہودی کہنے کا بھی ہے۔ اب بیچارے عوام اس بات کو کیا جانیں۔ اس لئے مرنے کے وقت ایسے لوگ پاس ہونے چاہئیں جن کو دین کی سمجھ ہو۔ بہر حال اصلی مقصود مسمی ہے۔ غلبہ حال میں اگر اسم میں غلطی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ایسے امور سے ایمان نہیں جاتا۔

ایمان کی رخصتی

یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعض عوام الناس کہا کرتے ہیں کہ فلاں نے چمار کا حقہ پی لیا اس لئے اس کا ایمان جاتا رہا یہ بالکل غلط ہے۔ کیا چمار کے حقہ کی نلکی میں ایمان گھس گیا ہے۔ چمار کا حقہ تو در کنار اگر سور کا گوشت بھی کوئی مسلمان کھالے تو ایمان نہیں جاتا۔ ہاں سخت گناہ ہوگا۔ اور اگر بھول کر یا کسی نے بلا اطلاع کھلا دیا تو گناہ بھی نہیں۔ ہاں جان کر اگر کھایا، تو گنہگار ہوگا۔ ایمان ایسی شے نہیں جو ایسی باتوں سے جاتا رہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہیؒ رام پور سے آتے ہوئے اسلام نگر ٹھہرے وہاں ایک خاں صاحب پہلے سے مہمان تھے۔ وہ حضرت کی خدمت میں آ کر بیٹھے۔ اب خاں صاحب کو کچھ خیال ہوا کہ حضرت سے کچھ باتیں کرنا چاہییں اور باتیں بھی ایسی ہونی چاہئیں جو ان کے مذاق کے موافق ہوں۔ تو آپ پوچھتے ہیں کہ حضرت وہ کون سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے ایمان جاتا

ہے حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہمارا ایمان نہیں جاتا بے وقوفوں کا جاتا ہے (چھوٹی باتوں سے آپ کی مراد کیا ہے) خاں صاحب شرمندہ ہوئے اور تاویل کی غرض سے کہا کہ حضرت یہی کفر وشرک کی باتیں ہوجاتی ہیں حضرت نے فرمایا کہ خان صاحب کفر وشرک جب تمہارے یہاں چھوٹی باتیں تو وہ بڑی باتیں کون سی ہوں گی خان صاحب سن کر چپ ہوگئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ایسی شے نہیں ہے کہ شیطان کا پیشاب پی لینے سے جاتا رہے۔ بلکہ اگر شیطان کو کوئی بھون کر کھا جائے جب بھی ایمان نہیں جاتا۔

کانپور میں ایک واعظ آئے تھے انہوں نے **من شر الوسواس الخناس** (وسوسہ ڈالنے والے کی برائی سے) کی یہ تفسیر بیان فرمائی تھی کہ **وسواس** سے مراد تو شیطان ہے اور خناس سے شیطان کا بیٹا اور یہ کہا کہ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے باہر آگئے تو وسواس حضرت حوا علیہا السلام کے پاس اپنے بچہ خناس کو لایا اور کہا کہ یہ رکھ لو میری امانت ہے۔ حضرت حوا نے رکھ لیا۔ آدمؑ جب آئے تو پوچھا یہ کیا ہے۔ حضرت حواؑ نے فرمایا کہ ایک غریب مسکین آیا تھا امانت رکھ گیا ہے آدم علیہ السلام نے فرمایا وہ شیطان تھا۔ غرض اس کو نکال دیا۔ وہ دوسری بار شکل بدل کر پھر آیا پھر ایسا ہی کر دیا۔ کئی بار کے بعد آدم علیہ السلام اس بچہ کا قیمہ بنا کر کھا گئے۔ شیطان مسمی وسواس جب آیا اور کہا کہ میرا بچہ لاؤ۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو ہم کھا گئے۔ وسواس نے پکارا بیٹا خناس! تو اس نے پیٹ کے اندر سے جواب دیا کیوں ابا وسواس پس یہ معنی ہیں **من شر الوسواس الخناس** (وسوسہ ڈالنے والے کی برائی سے) کے یعنی وسواس تو وہ ہے جو باہر سے وسوسہ ڈالے اور خناس وہ جو اندر بیٹھا وسوسے ڈالتا ہے۔

خیر یہ حکایت تو مہمل گپ ہے باقی اگر بالفرض کوئی شخص شیطان کو کھا جائے تب بھی اس کا ایمان نہیں جاتا۔

نشان قدرت

گناہ میں بھی اس امر کا اعتبار ہے جو علم اور شعور اور عقل اور بلوغ کے ساتھ ہو۔ اسی واسطے بچے جو کچھ کریں ان سے مواخذہ نہیں بلوغ کے بعد وہ مکلّف ہوتے ہیں۔ اس کو سن کر لڑکے تو بہت خوش ہوں گے کہ ہمارے ذمہ کچھ نہیں۔ ہم تو خوب چھوٹے۔ یہ تو صحیح ہے کہ تمہارے ذمہ نہیں لیکن ہمارے ذمہ تو ہے کہ تم سے مار کر کام لیں تاکہ بلوغ کے بعد تم کو نیک کام کی عادت ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنے بچوں کو جب وہ سات سال کے ہوں نماز کا حکم کرو اور جب دس سال کو پہنچیں تو مارو۔

غرض اس کی کوئی اصل نہیں ہے کہ عصر و مغرب کے درمیان کھانا نہ کھاؤ یا کہ کسوف کے وقت کھانا نہ کھاؤ البتہ کسوف کے وقت مستحقین کو خیرات دو۔ اب بجائے مستحقین کے بھنگی مانگتے ہوئے پھرتے ہیں۔

خیر ہمارے اطراف میں مسلمانوں سے تو نہیں مانگتے لیکن بعض جگہ مسلمان بھی ان کو دیدیتے ہیں اور بعض جگہ یہ رسم ہے کہ صدقہ میں خاص چیزیں دیتے ہیں۔ ماش کی دال، پیسے، تیل۔ میں نے جوان میں وجہ مناسبت سوچی تو یہ سمجھ میں آیا کہ یہ تینوں چیزیں کالی ہیں اور بھنگی بھی اکثر کالے ہوتے ہیں اور بلا کی صورت بھی کالی ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں میں بلا لپٹی ہوئی ہے ان کے دینے سے بلا جاتی رہے گی۔

یاد رکھو! خیرات اگر دو کسی اپنے بھائی غریب کو دو اور پھر خیرات میں ایسی چیزوں کی تخصیص نہیں ہے۔ یہ شگون اور مشرکین کی رسم ہے۔ مسلمانوں کو جو تعلیم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے وقت صدقہ دیں اور جماعت کا اگر اہتمام ہو سکے تو صلوۃ الکسوف جماعت سے پڑھیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کریں۔ اس لیے کہ اس کی وجہ حدیث شریف میں یہ آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں کہ ہم کو اتنی قدرت ہے کہ بڑے جسم منور کو بےنور کر دیا تو تم گناہ مت کرو ورنہ تم بھی عذاب میں مبتلا ہوگے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

باز گستاخی کسوف آفتاب (چاند کی گستاخی سورج گرہن کا سبب بنتی ہے)

اور حدیث میں آیا ہے کہ جب تم اس قسم کی قدرت کی نشانیاں دیکھا کرو تم فافزعوا الیٰ ذکر الله یعنی اللہ کے ذکر کی طرف ملتجی ہو جایا کرو۔ ایسے ہی اگر آندھی آئے یا آگ لگ جائے تو اس وقت بھی ذکر اللہ کیا کرو۔

ذکر اللہ کی دولت

سبحان اللہ کیا تعلیم ہے اس سے دو فائدے ہیں اول تو گناہ معاف ہوں گے۔ یہ تو آخرت کا ثمرہ ہے اور دنیا میں یہ کہ دل کو اطمینان اور چین ہوگا۔ اس لئے کہ ارشاد ہے

الا بذکر الله تطمئن القلوب ''یعنی خبردار ہو اللہ ہی کی یاد سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں''

سچ ہے خدائے پاک کے نام میں اس قدر حلاوت اور چین ہے کہ کسی میں نہیں۔ بلکہ چین کا تحقق ہی بجز اللہ کے نام کے کسی شے میں نہیں اس لیے کہ الا حرف حرف تنبیہ ہے۔ اور ''بذکر اللہ''

کے تقدیم کے ساتھ جو مفید حصر ہے فرمایا ہے اور اطمینان کے معنی عربی میں سکون کے ہیں۔ چنانچہ اس کا تجربہ ہے کہ جب ذکر اللہ قلب میں رچ جاتا ہے تو اس کو نہ کوئی گھبراہٹ کی شے اور نہ کوئی فرحت کی چیز ہلا سکتی ہے چنانچہ ارشاد ہے **لایحزنهم الفزع الاکبر** یعنی بڑی گھبراہٹ یعنی قیامت ان کو غمگین نہ کرے گی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست ☆ عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو قیامت میں اور کوئی کام نہیں ہوگا سوائے جمال یار کے دیکھنے سے)

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روز قیامت باوجود اس کے کہ پچاس ہزار برس کا دن ہوگا۔ لیکن مومن پر ایسا گزر جائے گا کہ جیسے فرض نماز کا وقت۔ پس جب ایسی شدید گھبراہٹ سے بھی وہ نہ گھبرائیں گے تو دنیا کے ہولناک واقعات تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ان سے مومن کیوں از جارفتہ ہونے لگا ہے حالانکہ قیامت کی گھبراہٹ اور شدت ایسی ہولناک ہے کہ جس کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **یایها الناس اتقوا ربکم ا ن زلزلة الساعة شیءٌ عظیم یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتری الناس سکاری وماهم بسکاری ولکن عذاب الله شدید.** تو جو اس سے مامون ہے یہاں کے اہوال سے کیا متاثر ہوگا۔ چنانچہ شیخ شیرازی اسی کو فرماتے ہیں ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش ☆ چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نہ باشد زکس ☆ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(مؤحد کے پاؤں پر چاہے دنیا کی دولت ڈال دی جائے یا اس کے سر پر تلوار رکھ دی جائے اس کو کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ خوف توحید کی ایسی بنیاد ہے)

غرض کیسی ہی شدت اور پریشانی ہو ذکر اللہ ایسی دولت ہے کہ اس سے سب بھاگ جاتی ہے۔

افلاطون موسیٰ علیہ السلام سے ملا اور پوچھا کہ اگر آسمان کی کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور زمین نشانہ ہو تو آدمی کہاں جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کہ تیرانداز کے پاس جا کر کھڑا ہو جائے۔ افلاطون بولا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا۔

مگر اس کے باوجود اکثر حکماء حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسبت یہ کہتے تھے کہ یہ نبی تو ہیں مگر ہمارے لئے نہیں صرف جہلا کے لئے ہیں۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اور موسیٰ علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ میری نبوت خاص نہیں جہلاء کے ساتھ۔ پس حکماء

کا عذر مہمل محض ہے۔

غرض! ذکر اللہ وہ شے ہے کہ حق تعالیٰ کا اس سے قرب ہوتا ہے۔ اور تمام مصائب کا علاج ہے جب چاہے تجربہ کرلو کہ ایک ہی قسم کا حادثہ اگر دو شخصوں پر نازل ہو تو ان میں سے جو نمازی وصاحب نسبت ہوگا اس پر وہ خفیف ہوگا اور غیر نمازی یا غیر صاحب نسبت پر وہ بہت ثقیل اور شدید ہوگا۔ اس لئے کہ فرمایا کہ کسوف کے وقت اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

خسوف اور نکاح

ایک بات یہ مشہور ہے کہ کسوف وخسوف کا وقت منحوس ہوتا ہے۔ ایسے وقت نکاح یا کوئی شادی کی تقریب نہ کرنا چاہیے۔ میں نظام آباد علاقہ حیدرآباد میں اپنے بھتیجے کا نکاح کرنے گیا تھا جو دن اور جو وقت نکاح کے لئے قرار پایا تھا اس وقت خسوف ماہ ہوگیا۔ اب وہاں کے لوگوں میں کھلبلی پڑی کہ ایسے وقت میں کیا نکاح ہوگا۔ اور اگر ایسے وقت نکاح کیا تو تمام عمر نحوست کا اثر رہے گا۔ بہت سے جنٹلمین بھی ان مہملات میں مبتلا تھے چنانچہ جمع ہو کر میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ عرض کرنا ہے میں نے کہا کہ فرمایئے کہنے لگے کیا چاند گرہن کے وقت بھی نکاح ہوگا۔ میں نے کہا اس وقت تو نکاح کرنا بہت ہی اولیٰ وافضل ہے اور میرے پاس اس کی دلیل بھی موجود ہے۔

وہ یہ ہے کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ ہم ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ خسوف کے وقت ذکر اللہ ونوافل میں مشغول ہونا چاہیے۔

اب سمجھئے کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ نکاح میں مشغول ہونا نوافل میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔ پس ایسے وقت نکاح کا شغل اور بھی افضل واولیٰ ہے ان سب نے اس کو تسلیم کرلیا۔

میں نے بیان تو کر دیا لیکن میرے دل میں ان لوگوں کے خیال سے ایک انقباض رہا اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! جلدی چاند صاف ہو جائے۔ اگر اس حالت میں نکاح ہوا اور بعد میں کوئی حادثہ تقدیر سے پیش آیا تو ان لوگوں کو کہنے کی گنجائش ہوگی کہ ایسے وقت نکاح کیا تھا اس لئے یہ بات پیش آئی۔ اللہ کی قدرت تھوڑی دیر میں چاند صاف ہوگیا۔ سب خوش ہو گئے اور نکاح ہوگیا۔ بہرحال ان اختراعات اور خیالات کو چھوڑنا چاہیے۔

یہ سب مضمون ۲۸ تاریخ پر یاد آ گیا تھا۔ ایک بات اور ضروری یاد آئی وہ یہ ہے کہ آج ۲۸ ہے اور کل ۲۹ اور پرسوں کا دن مشکوک ہے اگر ۲۹ کو چاند نظر آ گیا تو عید ہو جائے گی۔ یہ اسلئے کہا گیا کہ عوام الناس کا شاید شبہ رہے کہ چاند ۲۹ شعبان کو یہاں تو نظر آیا نہیں۔ اس لئے یہاں کے حساب

سے آج ۲۸ تاریخ نہیں بلکہ ۲۷ ہے اس لئے اطلاع کی جاتی ہے کہ باہر سے خبریں معتبر آ گئی ہے اس لئے ایک روزہ ابھی رکھنا چاہیے۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہی فضیحتا ہوتا ہے۔اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ۳۰ شعبان کو ہمیشہ روزہ رکھ لیا کریں۔ اگر خبریں آ گئیں تو رمضان میں محسوب ہو جائے گا۔ ورنہ نفل ہو جائے گا تو یاد رکھو کہ اس دن کے روزہ رکھنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے البتہ خواص کو جائز لکھا ہے اور وجہ فرق کی یہ ہے کہ اگر عوام کو بھی اجازت دیدی جائے تو تھوڑے دنوں میں ایسا ہوگا کہ اگر شعبان کی طرح رمضان بھی تیس دن کا ہوا اور روزہ شروع کیا تھا۔ ۳۰ شعبان سے جس سے ۲۹ رمضان کو پورے ۳۰ دن ہو جائیں گے تو عوام الناس رمضان کی ۲۹ تاریخ پوری کر کے ۳۰ تاریخ کو عید کر لیا کریں گے۔ اور یہ کہیں گے کہ ہم نے تیس روزے تو رکھ لیے۔ اس لئے عوام کو منع کیا جاتا ہے اور خواص کو اجازت ہے۔

بہر حال کل ۲۹ تاریخ ہے۔ یہ سب مضامین اخیر تاریخ کے اوپر یاد آ گئے۔ اب میں اصلی مضمون بیان کرتا ہوں۔ جاننا چاہیے کہ جیسے اختتام مجاہدہ کے متعلق ماقبل مضامین بیان کئے گئے تھے۔

اختتام واکمال مجاہدہ

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختتام مجاہدہ کے متعلق مضمون بیان کیا جائے۔ اختتام کے مناسب یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی ہے۔ میں پہلے یہ بیان کر چکا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے مجاہدوں میں چند کوتاہیاں تھیں۔

اول تو ان کو اختتام نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں یسر یعنی سہولت نہیں تھی اور جس قدر بھی مجاہدات ایسے ہیں کہ ان میں وحی کی اعانت نہیں ہے ان میں تیسیر کی رعایت نہیں۔ بہت دشواری ہے اور کبھی اس مجاہدہ کا خاتمہ نہیں ہے گویا مجاہدہ ہی کو اصل مقصود سمجھتے ہیں۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ اس قدر مجاہدہ جب کوئی کرتا ہے تو اس کو عجب ہو جاتا ہے کہ میں بڑا کام کرتا ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوا تو اس مجاہدہ کو بیکار سمجھتا ہے چنانچہ اہل مجاہدہ کو اس قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں۔ اکثر ذاکر وشاغل شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی نفع نہیں ہوا۔ یہ شکایت وہی شخص کریگا جو اپنے کو مستحق سمجھے گا۔ یہ شکایت فی الواقع دعویٰ ہے استحقاق کا۔ اور دلیل عجب کی ہے۔

چوتھی کوتاہی مجاہدہ میں یہ تھی کہ اگر مجاہدہ میں کچھ ثمرات مرتب ہوں گے تو ان کو حق تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر شکر نہ کریگا۔ بلکہ اس کو ثمرہ اپنے عمل کا سمجھے گا۔

پانچویں کوتاہی یہ ہے کہ چونکہ ان کے مجاہدہ کا اختتام نہیں ہے اس لئے ہمیشہ ہمیشہ کو دنیا کی

لذات سے محروم رہیگا۔ چنانچہ بہت مجاہد ایسے ہیں کہ گوشت، گھی میوہ جات نہیں کھاتے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوں گی۔ تو شکر بھی حق تعالیٰ کا ان پر نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ان سب کا جواب اور مجاہدات ارشاد شدہ کی شان اس آیت میں بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **یرید اللہ بکم الیسر ولایرید بکم العسر** یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔

یہ ابطال ہے اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے۔ وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں۔ (**کما بینا بالادلة فی المواعظ السابقة**) آگے ارشاد ہے **ولتکملوا العدة**. اور تا کہ تم شمار کو پورا کرلو۔

اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا۔ اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع فرماتے ہیں۔ **ولتکبروا اللہ علیٰ ماھدکم**. یعنی تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی **لعلکم تشکرون**. تا کہ تم شکر کرو۔

یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے میں نعم اور لذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکر کرو۔

بعض مفسرین نے "**لتکبروا اللہ علیٰ ماھداکم**" سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے۔

مجاہدہ کی آسانیاں

اب میں تفصیلاً اس کی شرح کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آسانی چاہتے ہیں۔ منجملہ آسانیوں کے آسانی تو یہ ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرما دیا۔ اور خود عین مجاہدہ کے وقت بہت آسانیاں ہیں۔ چنانچہ اعتکاف میں یہ سہولت فرمائی کہ مسجد میں اس کو مشروع فرمایا تا کہ خلوت در انجمن کا مضمون ہو جائے۔ اعتکاف سے آدمی اس کا خوگر ہو جاتا ہے سب سے الگ ایک گوشہ میں بھی بیٹھے ہیں اور سب کے ساتھ شریک بھی ہیں ۔

از بروں شو آشنا واز دروں بیگانہ وش ☆ ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

(کسی کے ظاہر سے آشنا رہو اور اس کے باطن کی کھود کرید مت کرو اور یہ اتنی مناسب روش ہے کہ دنیا میں کم پائی جاتی ہے)

لاخلاو لاملاء دل بیار دست بکار اعتکاف کی شان ہے۔ اگر بالکل تنہائی کا حکم ہوتا تو نفس پر بہت گراں ہوتا۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کو دیکھئے بظاہر اس میں مشقت ہے لیکن واقعہ میں بہت آسان ہے چنانچہ نفل روزہ کا اگر کبھی اتفاق ہوجاتا ہے تو اس میں بہت مشقت معلوم ہوتی ہے اور رمضان المبارک کی ایسی برکت ہے کہ اس میں کچھ بھی مشقت معلوم نہیں ہوتی۔ رمضان کی برکت اس قدر صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ جس کو کچھ بھی احساس ہو وہ بے تکلف اس کا ادراک کرتا ہے۔

شب برات کے دن جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ اس روزہ کا اور رمضان المبارک کے روزہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں۔ اس روزہ میں بہت مشقت معلوم ہوئی تھی اور رمضان المبارک میں کچھ بھی نہیں اہل مجاہدہ یہ بات کہاں سے لائیں گے۔ ان برکات کا علم بجز وحی کی تعلیم کے کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتا۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ☆ لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

(اگر مصور اس محبوب کی تصویر کھینچے گا تو میں حیران ہوں کہ اسکے ناز وادا کی تصویر کیسے کھینچے گا)

تراویح کے اندر جو آسانیاں ہیں وہ بھی مخفی نہیں ہیں آگے ارشاد ہے۔ **ولتکملوا العدة** (تاکہ گنتی مکمل کرو)۔ اس کی ترکیب میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعضے تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا عطف **یریداللہ** (اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں) پر ہے اور تقدیر کلام کی یہ ہے **شرع اللہ هذه الاحکام لارادة التیسیر ولاکمال العدة، الخ**۔ (اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو آسانی اور گنتی پورا کرنے کے لئے فرمایا ہے) بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اور اصل کلام یہ ہے **شرع هذه الاحکام لتکملوا العدة ، الخ**۔ (یہ احکام گنتی پورا کرنے کیلئے شروع ہوئے) اور یہ حذف واؤ کے بعد ہے اور ایک بزرگ کے کلام سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ حذف واؤ کے قبل ہے اور لتکملوا (تاکہ گنتی پورا کرو) کا معطوف علیہ مقدر ہے۔

اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو مسئلہ مشہور و مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہیں لیکن ان میں حکمتیں ضرور ہیں۔ اور کہیں کہیں حق تعالیٰ نے اپنے افعال کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہی حکمتیں مقصود بالذات ہوں۔ احکام فی نفسہا مقصود نہ ہوں۔ اسلئے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کو دفع کیا جائے۔ اس لئے بعض جگہ اس حکمت پر حرف عطف لائے اور معطوف علیہ کو حذف فرما دیا اور چونکہ عطف کا مقتضا مغائرت ہے متعاطفین کی اور معطوف ہے اعتبار حکمت تو معطوف علیہ ہوگا۔ عدم اعتبار حکمت۔ جس

کا ماحصل یہ ہوگا کہ یہ احکام اس لئے بھی وضع فرمائے کہ حاصل اس حکمت کا یہاں یہ ہے کہ تم شمار کو کامل کرلو یعنی مجاہدہ کو ختم کردو اور ختم بھی ایسا کیا کہ اس تاریخ پر اگر کوئی ختم نہ کرے تو مجرم ہوگا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ماں بچہ کو اصرار کرے کہ یہ شے کھالو۔ اسی شفقت سے۔ بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سے حق تعالیٰ اپنے بندوں کو کھلاتے ہیں۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عید کے دن کھانا فرض ہے حالانکہ کھانا فرض نہیں۔

جواب یہ ہے کھانا دو قسم کا ہے ایک بالقوہ دوسرے بالفعل۔ بالفعل تو ظاہر ہے کہ تحقق کھانے کا ہو اور بالقوہ یہ ہے کہ کھانے کی قوت یعنی نیت روزہ کی ہو اگرچہ نہ کھائے۔ پس مجاہدہ ہر حال میں ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مشقت تو نفس کو اسی وجہ سے ہے کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ کھانے کے لئے رات ہی کو ملے گا اور جب جانتا ہے کہ جب چاہوں کھا سکتا ہوں تو مجاہدہ ختم ہو گیا۔

مصلحت الٰہی

ایک بات ضروری قابل اطلاع یاد آ گئی۔ وہ یہ ہے کہ عوام عید کی صبح کو کہا کرتے ہیں کہ روزہ کھول لو۔ ہم بچپن میں بہت دنوں تک یہی سمجھتے تھے کہ آج بھی روزہ ہوتا ہے اور شب میں ہوتا ہے تو یاد رکھو! آج روزہ نہیں ہے رات کو نہ دن کو۔ اور حقیقت اس کہنے کی کہ روزہ کھول لو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک ماہ تک جو روزہ رکھا ہے تو آج یہ ظاہر کردو کہ روزہ نہیں ہے گویا رمضان المبارک کے ہر دن کے ختم پر تو خاص اسی دن کا روزہ افطار ہوتا تھا اور آج تمام مہینے کے دنوں کا ایک افطار ہے یعنی اور دنوں میں افطار اصغر تھا آج افطار اکبر ہے اگر کوئی کہے کہ مجاہدہ تو ساری عمر ضروری ہے اس لئے کہ نفس سے تو کسی وقت بھی امن نہیں ہے مولانا فرماتے ہیں۔

نفس اژدہاست او کے مردہ است ☆ از غم بے آلتی افسردہ ست

(نفس اژدھا ہے وہ کبھی نہیں مرتا البتہ اپنی آگ کے سرد ہونے کی وجہ سے افسردہ رہتا ہے)

اور فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا ☆ ما چو مرغاں حریص بے نوا

دمبدم پابستہ دام نوایم ☆ گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم

(دنیا میں سینکڑوں جال اور دانے بکھرے ہوئے ہیں اور ہماری مثال بھوکے لالچی پرندوں کی طرح ہے اگر ہم شہباز اور سیمرغ ہی کیوں نہ ہو جائیں پھر بھی قدم قدم پر اپنے جالوں میں پھنس جاتے ہیں)

تو جواب اس کا یہ ہے کہ علی الاطلاق مجاہدہ کا اختتام نہیں ہوا کہ اسکے بعد کسی قسم کا مجاہدہ نہیں

ہوگا۔ بلکہ ایک خاص قسم کا مجاہدہ ختم ہوگیا۔ اس لئے کہ اگر وہ متواتر علی الدوام رہتا تو نفس کو اولاً بے حد شاق ہوتا۔ اس لئے اس میں حق تعالیٰ نے تعاقب رکھا ہے کہ چند روزہ مجاہدہ کرو اور چند روز آرام کرو۔ اور بعد بے حد مشقت کے پھر اس مجاہدہ کا اثر ضعیف ہوکر مجاہدہ نہ رہتا۔ بلکہ وہ طبیعت بن جاتا۔ چنانچہ جو لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں ان کی آنتیں اور معدہ خشک ہوجاتا ہے اور ان کو اضطراب اور اشتہا نہیں رہتی تو ان کے نہ کھانے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ سوہان روح اور علاج نفس تو یہ ہے کہ کبھی کھائیں اور کبھی نہ کھائیں۔

اسی واسطے محققین نے مقیمین مکہ کو رائے دی ہے کہ کبھی کبھی ان کو مکہ سے چلا جانا چاہیے کہ نشاط کی تجدید ہوتی رہے کیونکہ دوام کے اندر شوق بھی بجھ جاتا ہے اور عادت سی ہوجاتی ہے۔ اسی واسطے روزہ نفل میں **صوم الدھر** افضل نہیں ہے بلکہ افضل یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے تاکہ نہ بہت شاق ہو نہ بالکل عادت ہوجائے اور اس میں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر بھی رہتی ہے۔

نیز ہم لوگ بہت ضعیف ہیں جو عبادت سہولت سے ہوتی رہے وہ تو ہم سے ہوتی رہتی ہے اور اس میں حق تعالیٰ کی محبت بھی باقی رہتی ہے اور زائد مشقت کے متحمل نہیں ہوتے اور نفس کو کلفت زائد ہونے سے محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے۔

اسی واسطے ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں ذات کے عاشق نہیں ہیں۔ خلاف طبع پیش آنے سے اللہ میاں سے بھی ایک گونہ تکدر ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں آیا ہے جس کو قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندوں کو خوب جانتا ہوں۔ ان میں بعض ایسے ہیں کہ اگر میں ان پر فقر مسلط کردوں تو وہ کافر ہوجائیں۔ اس لئے ان کو فقر سے بچاتا ہوں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو غنی کردوں تو کفر کرنے لگیں۔ اس لئے ان کو محتاج رکھتا ہوں۔

پس اسی واسطے بعض ایسے ہیں کہ ہمیشہ بیمار ہی رہتے ہیں اور بعض تندرست رہتے ہیں جو حالت جس شخص کے لئے تجویز فرمادی ہے وہی اس کے لئے بہتر ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔ دیکھو! ماں اگر بچہ کو مٹھائی نہ دے تو وہ اس کی مصلحت کو جانتی ہے ۔

آنکس کہ توانگرت نمے گرداند ☆ او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو شخص تجھے امیر نہیں مانتا وہ میری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے)

اسی واسطے حق تعالیٰ نے مجاہدہ میں تعدیل فرمائی ہے۔ اگر دائمی مجاہدہ ہوتا تو بندے اکتا جاتے۔ ایک زمانہ آرام کا مقرر فرمادیا۔ اس کے بعد پھر مجاہدہ مقرر فرمایا کہ نفس کو نشاط رہے۔ اور نعمت کی قدر ہو۔ اسی واسطے ہمارے حضرتؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میاں اشرف علی جب پانی پیو ٹھنڈا پیو تاکہ بال

یاں سے شکر یہ ادا ہو۔ اور اگر گرم پانی پیو گے۔ تو زبان سے تو الحمد للہ کہو گے مگر دل سے الحمد للہ نہ نکلے گا۔

مشاہدہ جمال حق

اسی واسطے شکر کی نیت سے اگر کوئی اچھا کھانے کھائے اور اچھا کپڑا پہنے تو اس کے لئے افضل ہے گو ناواقف طعن کریں خسروؒ اسی مضمون کو کہتے ہیں۔

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند ☆ آرے آرے میکنم با خلق وعالم کار نیست

(دنیا کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے ہاں ہاں کرتا ہوں مجھے دنیا ومخلوق سے کوئی کام نہیں ہے)

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دم سے دید یجئے۔ حکم ہوا کہ ہمارے وعدہ پر اطمینان نہیں؟ عرض کیا اطمینان تو ہے مگر شیطان مجھے بہکاتا ہے کہ تو کہاں سے کھائے گا تو میں کہہ دوں گا کہ اس میں سے کھاؤں گا۔

پس باوجود محبوب ہونے کے بعض میں ایک قسم کا ضعف ہوتا ہے اور قوت یقین میں ایسے لوگوں کے فرق نہیں ہوتا۔ یہ ضعف طبعی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اچھا کھائیں اچھا پہنیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ غرض ان کی یہ ہوتی ہے کہ جو ذرہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا قلب میں ہے وہ ضائع نہ ہو جائے ان کے لئے یہ نعمتیں ذریعہ ہو جاتی ہیں مشاہدہ جمال حق کی اور جن کے لئے سبب غفلت کا ہوں ان کے لئے پرہیز لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے علاج جدا ہے۔ سب کو ایک لکڑی ہانکنا یا ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ آگے ارشاد ہے **ولتکبروا اللہ علیٰ ماھداکم** یہ ابطال ہے اس کمی کا جو اہل مجاہدہ کو بعض اوقات مجاہدہ سے پیش آجاتی ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شدۃ مجاہدہ سے بعض اہل مجاہدہ کو عجب پیدا ہو جاتا ہے اور مجاہد یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ بڑی شے ہے اور یہ بہت بڑا مرض ہے اپنے کو یہ شخص مستحق ثمرات سمجھتا ہے اور جب وہ ثمرات نہیں حاصل ہوتے تو دل میں حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے وہ (نعوذ باللہ) ادا نہیں فرماتے حالانکہ کام مقصود ہے۔ ثمرات مقصود نہیں ہیں۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہمارے اعمال

ہمارے حضرتؒ ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم ☆ حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں مگر اسکی جستجو کرتا رہتا ہوں مقصود حاصل ہو یا نہ ہو آرزو کرتا رہتا ہوں)

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ذاکر تھے ہمیشہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے ذکر کرتے ایک مدت گزر گئی۔ ایک شیطان نے بہکایا۔ جی میں آیا کہ اتنے دن ہو گئے اللہ کا نام لیتے ہوئے نہ ادھر سے سلام ہے نہ پیام ہے یہ محنت ہماری اکارت ہی گئی۔ یہ سوچ کر سو رہا۔ خواب میں حکم ہوا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ☆ ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(اسنے کہا ہمارا اللہ کہنا ہی ہماری لبیک ہے اور یہ عاجزی اور سوز و درد ہمارے لئے مقاصد ہیں)

ہمارے حضرت نے اس کی شرح اس طرح فرمائی کہ دیکھو کہ اگر کوئی شخص تمہارے سامنے تمہارا نام لے جس کا نام لینا تم کو برا معلوم ہو تو تم اس کو روک دیتے ہو پس جب تم نے حق تعالیٰ کا نام لیا اور انہوں نے پھر توفیق دی اور روکا نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا وہ نام لینا پسندیدہ اور مقبول ہے۔ یہ معنی ہیں آں اللہ تو لبیک ماست اور یہ حسرت اور افسوس ہے اور تضرع و زاری بھی اسی کی دلیل ہے۔ پس گویا یہ پیک حق ہے۔

حقیقت میں اللہ اللہ کرنا بڑی نعمت ہے اور ثمرات کا انتظار کرنا یہ دل کا چور ہے کہ اپنے عمل کو اس نے قابل استحقاق اجر سمجھا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے اعمال تو اس درجہ کے ہیں کہ اگر ان پر عتاب ہی نہ ہو تو بسا غنیمت ہے کس کے ثمرات اور کہاں کا اجر۔ اگر اعمال کے بعد ثمرات ہوں تو وہ رحمت ہے باقی عمل کرنا تو بندہ کا کام ہی ہے خواہ قبول ہو یا نہ ہو۔ اگر قبول ہو جائے تو عین رحمت ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ہم حج کو جاتے تھے۔ راستہ میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ نہایت آزادی سے جا رہا ہے ان بزرگ نے پوچھا کہ صاحبزادہ تمہارے پاس زاد نہیں ہے تم کو تکلیف ہوگی اس نے کہا ؎

وفد علی الکریم بغیر زاد ☆ من الحسنات والقلب السلیم
فان الزاد اقبح کل شئ ☆ اذا کان الوفود علی الکریم

(کریم کے دروازہ پر جماعت کو نیکی اور سلامت قلبی کے ساتھ بغیر زادِ راہ کے جانا چاہیے اس لئے کہ کسی کریم کے دروازے جماعتوں کا زادِ راہ لے کر جانا سب سے بری چیز ہے)

جب سب لوگوں نے احرام باندھا تو اس نے احرام بڑے سوچ سے باندھا۔ اس سے پوچھا کہ میاں! تم احرام جلدی کیوں نہیں باندھتے۔ کہا کہ اس لئے نہیں باندھتا کہ ایسا نہ ہو کہ میں کہوں لبیک اور ادھر سے آواز آئے **لالبیک ولاسعدیک وحجک مردود علیک**۔ (نہ تیری حاضری منظور ہے نہ تیرے لئے نیک بختی ہے اور تیرا حج تجھ ہی پر لوٹایا جاتا ہے) جب منیٰ میں لوگ قربانی کرنے لگے اس جوان نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور عرض کیا کہ میرے پاس قربانی

کا جانور تو نہیں تو صرف یہ جان حاضر ہے اگر قبول ہو۔ یہ کہتے ہی گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔

اس پر ایک اور حکایت یاد آ گئی۔ ایک صاحب حال حج کو گئے۔ جب بیت اللہ شریف پہنچے تو مطوف نے ان سے کہا کہ یہ ہے بیت اللہ شریف! اس نے یہ شعر پڑھا ؎

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ☆ کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(اگر تیری پہنچ کوچہ جاناں میں ہو جائے تو اپنی بے قرار جان کو نثار کر دینا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس تمنا کے ساتھ تو دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکے) اور یہ کہہ کر گرا اور جان دیدی۔

پس دیکھئے! اس نوجوان عارف نے احرام باندھتے ہوئے خوف کھایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اعمال کچھ بھی نہیں پھر استحقاق ثمرات کیسا۔ بس خدمت کئے جاؤ۔ اپنا کام یہی ہے کہ کام کرتے کرتے جان دیدیں۔ اور کسی شے کی طلب نہ ہو حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن ☆ کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط کے ساتھ بندگی مت کر کیونکہ مالک خود جانتا ہے کہ اپنے بندوں کی پرورش کیسے ہوتی ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے عمل پر نظر نہ ہونا چاہیے۔ اسی خود بینی کو ولتکبروا الله (اور تا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو) الخ سے رد فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ کی بڑائی پیش نظر ہوگی تو اپنے اعمال اور خود اپنی ذات لاشی نظر آئیگی اور بجائے عجب کے شکر کریگا۔

مذاق طبعی کی رعایت

چنانچہ آگے ارشاد ہے ولعلکم تشکرون (اور اُمید کہ تم شکر گزار بن جاؤ گے) اور جیسے دل سے بڑائی کی تعلیم ہے اسی طرح زبان سے بھی سکھلائی گئی ہے کہ عید کے راستہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر زبان سے کہتے جائیں اور نیز پانچوں وقت کی نماز میں بھی اسی واسطے حکم فرمایا اللہ اکبر زبان سے کہیں اور اسی کی نظیر ہے نماز کی نیت کہ اصل نیت تو دل سے ہے لیکن زبان سے کہنا بھی فقہاء نے مشروع فرمایا ہے۔

الحاصل یہ بڑی رحمت ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرما دیا اور وجوبی کا حکم فرمایا کہ عید کے دن ضرور کھاؤ پیو۔ دیکھئے اس میں ہمارے مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے جیسے جمعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض۔ یعنی جب نماز ادا کر لی جائے تو زمین میں متفرق ہو جاؤ۔ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرما دیا۔ اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے۔ گو یہ حکم وجوبی نہیں اور نیز ایسے دلدادہ بھی تھے جو مسجد ہی میں رہ جاتے ہیں۔ بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ ؎

خسرو غریب ست گدا افتادہ در کوئے شما ☆ باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب ایسا فقیر ہے جو تیری گلی میں پڑا ہوا ہے بس اب تجھے کو چاہئے کہ خدا کے واسطے غریبوں کی طرف نظر کرے)

ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں۔ جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے حرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ **فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ** "یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو"۔

علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی وسیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا۔ اس طرح سے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے۔ اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔

یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست مانے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے ہی محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں۔ یہ ناجائز مجمع نہ بن جائے سب کو منتشر کر دیا گیا۔ اس وعظ میں ایک بڑا اعالی رتبہ انگریز بھی تھا۔ اس نے بعد وعظ کے مسرت ظاہر کی۔

الحاصل مجاہدہ کو ختم کر کے کھانے پینے اور عیدگاہ میں جانے اور خوشی منانے کی اجازت دی اور اس میں بھی یہ نہیں کہ کوئی لہو ولعب ہو بلکہ اس دن میں ایک خاص عبادت مقرر فرمائی اور اس کا طرز علیحدہ رکھا کہ شہر سے باہر صحراء میں جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں اور وہاں نماز پڑھیں اور اس نماز کا طریقہ بھی جداگانہ رکھا کہ اور نمازوں سے اس میں چھ مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جوش مسرت میں موحد اور خدا پرست کی زبان سے اللہ اکبر ہی نکلا کرتا ہے۔

غرض ہماری فرحت بھی ایسی ہے کہ اس میں بھی عبادت ہے اور مشقت میں بھی راحت ہے بخلاف اور قوموں کے کہ ان کے یہاں خوشی کے دن لہو ولعب اور بعض قوموں میں فسق وفجور تک ہے اور اس دن میں ایک طریق ادائے شکر اور اظہار خوشی کا یہ مقرر فرمایا کہ اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمایا۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے جو نعمت ہم پر فائز فرمائی کہ ہم سے روزے ادا ہو گئے اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے بھوکے ہونے کو یاد کر کے اپنے بھوکے مسلمان بھائی کی امداد کرے اور کم از کم دو وقت کی کفایت کے لئے اس کو کھانا دیدے اور نیز اس میں اپنی خوشی کی تکمیل بھی ہے۔ اس لئے کہ مجمع میں اگر ایک شخص بھی کبیدہ ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر ہوتا ہے تو اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرما دیا۔ تاکہ سب مسلمان بھائی آج سیر اور خوش نظر آئیں اور خوشی کی تکمیل ہو جائے ورنہ

اپنے بھائی کو افسردہ دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے غرض اس میں ادائے شکر بھی ہے اور فرحت کی تکمیل بھی ہے اور اس کے ساتھ معنی صدقہ کے بھی۔ اس لئے غیر صائمین اور صبیان کی طرف سے بھی ادا کیا جاتا ہے بہر حال رمضان کا تمام مہینہ تو مجاہدہ کا وقت ہے اور عید اس کا اختتام ہے۔

اختتام رمضان

اس اختتام یعنی عید اور مقصود یعنی مجاہدہ رمضان میں چند امور مشترک ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں بعض عبادتیں فرض ہیں بعض نفل میں۔ مثلاً روزہ رکھنا فرض ہے اور تراویح واعتکاف مسنون ہیں۔ عید کے دن میں بھی بعض عبادتیں واجب ہیں بعض مستحب ہیں۔ عید کی نماز واجب ہے۔ صدقہ فطر واجب ہے اور غسل کرنا، عطر لگانا اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے۔ غرض دو قسم کی عبادتیں رمضان شریف میں ہیں ضروری اور غیر ضروری اور یہی دو ہی قسم کی عید کے دن میں ہیں۔ میں نے اپنے ایک وعظ میں اسی رمضان کے مواعظ میں سے وعدہ کیا تھا کہ فرض اور نفل میں جو اثر قرب کا اور اس قرب کے مراتب ہیں جو تفاوت ہے اس کا بیان کروں گا۔ سو آج اس کا ایفاء کرتا ہوں اور وہ مضمون اپنی طرف سے کوئی نکتہ نہ ہوگا۔ بلکہ حدیث شریف ہی کا مضمون ہوگا۔

بغور سنیئے کہ فرائض کی نسبت حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میرا بندہ جس قدر فرض ادا کرنے سے مقرب بنتا ہے اس قدر کسی شے سے نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرض بہت بڑی شے ہے اور نوافل کی نسبت ارشاد ہے: **لایزال عبدی یتقرب الی بالنوا فل حتی احببته[1] فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصربه ویده التی یبطش بها**

"یعنی میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے قرب تلاش کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے سنتا ہوں اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے پکڑتا ہے"

اس کا یہ مطلب نہیں اللہ میاں توبہ توبہ اس کا کان آنکھ ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سے اس سے کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف مرضی نہیں ہوتا۔ اب غور کیجئے کہ فرائض کی خاصیت یہ بیان فرمائی کہ جس قدر قرب ان سے ہوتا ہے اس قدر کسی عبادت سے نہیں ہوتا۔ اور نوافل کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا شیئا شیئا حاصل ہوتا رہتا ہے جیسا لایزال یتقرب اس پر دال ہے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ زیادت قرب دو قسم کی ہے ایک کیفیہ اور ایک کمیہ کا اور وہ دونوں مطلوب ہیں تو فرائض سے تو کیف کے کے اعتبار سے قرب بڑھتا ہے اور نوافل سے کمیہ بڑھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص سرکاری عہدہ دار ہے تو نفس قرب تو اس کو اپنا منصبی کام

---
[1] إتحاف سادة المتقين ۹:۵٦۹، فتح الباری: ۱۰:٣٦٢

انجام دینے سے حاصل ہوگا۔ اور اگر یہ کام نہ کرے تو قرب ہی نہ ہوگا تو یہ منصبی کام بہت بڑی شی ہے کہ اس نے اس کو سرکاری آدمی بنادیا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ میرا قرب حاکم سے اور بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ حاکم کے خوش کرنے کے لئے ایسا کام اختیار کریگا کہ وہ کام اس کے ذمہ نہیں ہے مثلاً اس کے لئے ڈالی لے جائے اور تحائف بھیجے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حاکم کا بہت مقرب ہو جائے گا۔ حتی کہ حاکم کے پاس بیٹھنا بھی اس کو نصیب ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس تشبیہ سے پاک ہیں لیکن بطور تمثیل کے سمجھنا چاہیے کہ عاشق کو نفس قرب کیفی سے تسلی نہیں ہے وہ اپنی استعداد کے اعتبار سے کمال قرب کی کا طالب ہوتا ہے مثلاً محبوب نے اپنے پاس خوش ہوکر بٹھلالیا تو وہ کھسکتا ہوا اور آگے مل کر بیٹھنا چاہتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے دو عبادتیں مقرر فرمائی ہیں۔ فرض اور نفل قرب کیفی کا تعلق تو فرض کے ساتھ ہے۔ فرض کے بعد کوئی درجہ کیف کا باقی نہیں رہتا۔ اور کمیہ کا تعلق نفل سے ہے اور کمیت قرب کے مراتب بے شمار ہیں۔ جس قدر بھی مراتب طے کریگا ختم نہ ہوں گے اور نہ سیری ہوگی۔ برابر دل چاہتا رہے گا کہ اور بڑھے اور بڑھے۔

فرائض اور قرب

خلاصہ یہ ہے کہ فرض کے ادا کرنے سے جو قرب حاصل ہوتا ہے عاشق کو اس مقدار سے تسلی نہیں ہوتی۔ اگر نوافل نہ ہوتے تو وہ یقیناً تڑپ تڑپ کر مرجاتا اس لئے کہ دل کا تقاضا ہوتا کہ مراتب قرب کو طے کرے اور طریقہ کوئی تھا نہیں۔ اس لئے شدت شوق میں اگر جان دیدیتا تو تعجب نہ تھا اور اب نوافل حق تعالیٰ نے مقرر فرمادئے ہیں کہ ان سے درجات طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اذکار اشغال اور روزے ونماز نفل سب اسی واسطے ہیں کہ بندہ قرب کے درجات طے کرے اس لئے فرائض محدود ہیں اور نوافل غیر محدود۔

خلاصہ یہ ہے کہ فرائض کے متعلق جو قرب ہے وہ ایک دم سے حاصل ہوجاتا ہے اور اس نوع میں کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔ اور نوافل کے متعلق جو قرب ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ پس اس حکمت کی وجہ سے بعض عبادتیں فرض مقرر فرمائی ہیں۔ فرض روزہ بھی ہے۔ بعض نفل جن میں نفلی روزے بھی ہیں جو دوسرے ایام میں بھی مشروع ہوئے۔ تاکہ کوئی نوع قرب کی فوت نہ ہو۔ صوفیا کی اصطلاح میں اول کو قرب فرائض کہتے ہیں اور دوسری نوع کو قرب نوافل کہتے ہیں اور چونکہ نوافل سے جو قرب ہوتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔ اسی واسطے حدیث میں اس کو لایزال عبدی الخ سے تعبیر فرمایا ہے۔

بحمد اللہ میں نے بقدر رسائی ذہن کے ان احکام کے اسرار و حکمتیں بیان کی ہیں۔

مقصود میرا اس سے یہ ہے کہ آپ صاحبوں کو ان عبادتوں کو مع ان کے حقوق کے ادا کرنے کی رغبت ہو۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

تمت بحمد اللہ